مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے تفسیری نکات

(تصنیفات گیلانی کی روشنی میں)

۲۰۱۲ء۔۲۰۱۴ء

مقالہ نگار
حنا نسیم
رول نمبر ۱۲۰۹۔MP

نگرانِ مقالہ
ڈاکٹر ابو الوفا محمود
اسسٹنٹ پروفیسر

شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب، لاہور

انتساب

اللہ رب العزت کی بارگاہ میں، خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ نے جس ہستی کے
لئے قبول اسلام کی دعا کی، تاریخ جنہیں خلیفہ ثانی امیر المومنین عمر بن
الخطابؓ کے نام سے جانتی ہے میں اپنی یہ کاوش
اس عظیم ہستی کے نام منسوب کرتی ہوں۔

قال رسول اللہ ﷺ

(لقد كان فيمن كان قبلكم من بنى اسرائيل رجال يكلمون من غير أن يكونوا أنبياء، فان يكن فى امتى منهم أحد فعمر)[صحيح بخارى، كتاب فضائل أصحاب النبى ﷺ ، باب مناقب عمر بن الخطاب أبى حفص القرشى العدوى رضى الله عنه ، ٣٦٨٩]

اظہار تشکر

اظہار تشکر

الحمد لله رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسوله الکریم

دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اللہ رب العزت کے حضور نہایت عجز و انکساری کے ساتھ شکر بجالاتی ہوں جس کی ذات بابرکات نے تعلیم و تحقیق کے دروازے وا کر دیے اور جس کے اکرام و نوازشات کی بدولت ہی میں اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی بے شک اللہ قلوب و اذہان کی گرہیں کھولتا ہے اور علماء و صلحاء کی ہمراہی عطا فرماتا ہے۔

لاکھوں کروڑ درود و سلام ہوں محسن انسانیت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات بابرکات پر جنہوں نے بحکم الٰہی جہالت کی تاریکیوں کو علم کی صبح روشن سے منور کیا اور حصول علم کو امت مسلمہ کے ہر فرد پر فرض قرار دے کر تعلیم کو اولین حیثیت کی سند عطا فرمادی۔

فرمان نبوی ﷺ ہے۔

لا یشکر الله من لا یشکر الناس

[سنن ابوداؤد، اول کتاب الادب، باب فی شکر المعروف، ۴۸۱۱]

اسی فریضے کے پیش نظر میں سب سے پہلے اپنے نگران مقالہ پروفیسر ڈاکٹر ابوالوفا محمود کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے پوری توجہ، محنت اور بے پناہ شفقت سے اس مقالے کو مکمل کرنے میں میری رہنمائی اور معاونت فرمائی اس کا صلہ خدائے بزرگ و برتر کے حضور ان کے حق میں دعاؤں کی صورت میں ہی دے سکتی ہوں اللہ ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور ان کے دن رات میں برکت دے (آمین) اس کے علاوہ میں اپنے تمام اساتذہ ڈاکٹر محمد اعجاز، ڈاکٹر حافظ عبداللہ، ڈاکٹر حافظ عبدالباسط، ڈاکٹر حافظ عبدالقیوم، ڈاکٹر عبداللہ صالح، ڈاکٹر اشتیاق احمد گوندل اور حافظ عثمان احمد کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جن سے میں نے ایم فل کے دوران اکتساب فیض کیا اور جناب امان اللہ راٹھور کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے مقالے کے مواد کی تلاش میں رہنمائی فرمائی۔

میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی بدولت میں اپنے تعلیمی مراحل آسانی سے طے کرنے میں کامیاب ہوسکی اللہ انہیں دنیا و آخرت میں کامیابی سے نوازے (آمین) اپنی تمام سہیلیوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جن کا ساتھ اور معاونت ہمیشہ میرے لئے باعث اطمینان رہی۔

آخر میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لائبریری شیخ زاید اسلامک سنٹر، لائبریری شعبہ علوم اسلامیہ، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری اور ادارہ معارف اسلامی منصورہ لائبریری کے تمام عملے کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے مراجع و مصادر تک رسائی میں ہر ممکن مدد فرمائی اللہ ان اصحاب کو جنہوں نے کسی بھی طور پر میرے ساتھ ہمدردی و تعاون فرمایا اپنی جناب سے دین و دنیا کی رحمتیں برکتیں اور راحتیں عطا فرمائے (آمین)

مقدمه

مقدمہ

قرآن حکیم کے زیر سایہ زندگی بسر کرنا یعنی اس کے معانی و مفاہیم کو سمجھنا ان پر غور و فکر کرنا ایک ایسی عظیم الشان سعادت اور بیش بہا نعمت ہے جس کا تصور صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے اپنے اوقات قرآن فہمی میں لگائے ہوں اور قرآن پر عمل کر کے اپنی زندگی کو پاکیزہ و پاکباز بنالیا۔

قرآن کریم قیامت تک آنے والی نسلوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور سلسلہ رشد و ہدایت کی کامل ترین کتاب ہے اس میں ہر زمان و مکان کے لوگوں کے مسائل کا حل موجود ہے بشرطیکہ قرآن کو رسول اللہ ﷺ کے بیان و تشریح کی روشنی میں دیکھا اور پڑھا جائے اور اس میں پورے تدبر و تفکر سے کام لیا جائے اسی لئے ہر زمانہ کے علماء تفسیر نے اپنے مخصوص ذوق اور عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ کی اس کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کی بھرپور کوشش کی۔

برصغیر میں عربی، فارسی اور اردو میں قرآن فہمی پر بہت کام ہو چکا ہے شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان نے اس کار خیر کا آغاز کیا بعد ازاں ان کے تتبع میں کثیر علماء نے خدمت قرآن کی اور چار دانگ عالم میں دین اسلام کی حقانیت کا ڈنکا بجا دیا انہی علمائے برصغیر جنہوں نے دین اسلام کی سربلندی کو اپنا واحد مقصد حیات بنالیا میں ایک ممتاز نام مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ (۱۹۵۶ء-۱۸۹۲ء) کا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مولانا گیلانیؒ کو سرزمین ہند میں علم و عرفان کا روشن چراغ بنا کر بھیجا انہوں نے اپنی آخری سانس تک امت مسلمہ کی علمی و دینی خدمت کی مولانا تاریخ اور علوم عصریہ سے گہری واقفیت رکھتے تھے انہوں نے علم کے مختلف میدانوں مثلاً حدیث، فقہ، معیشت، سیاست کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن میں بھی تحقیق کے جوہر با کمال دکھائے ہیں۔ مولانا کو قرآن کریم سے خاص شغف تھا اپنے عقائد و خیالات اور علم میں بھرپور رسوخ رکھتے تھے۔ عقائد اور اصول دین کے بارے میں اتنے غیور و حساس واقع ہوئے تھے کہ جب کبھی تحریف دین کی کوئی کوشش یا دین کی ترجمانی میں کوئی بے اعتدالی، آزادی یا غلط اجتہاد دیکھتے تو برداشت نہ کر سکتے اور آپ کا قلم فوراً جنبش میں آجاتا عقائد اور اصول دین کی ہیئت و حقیقت کی حفاظت میں مولانا کا قدم اور قلم کسی بڑے سے بڑے عالم راسخ سے پیچھے نہیں۔

مولانا گیلانیؒ کو سلطان القلم اور رئیس التحریر کے القابات سے بھی پکارا جاتا ہے آپ کا شمار کثیر التالیف مصنفین میں ہوتا ہے آپ نے علم کے مختلف شعبوں کے متعلق گرانمایہ علمی ورثہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے آپ کی تصانیف کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ تحریر میں جا بجا آیات قرآنی سے استفادہ کرتے ہیں یعنی قرآن کریم میں غور و فکر اور منشاء خداوندی کو پا لینے کی جدوجہد کرتے اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہیں مختلف آیات قرآنی کے متعلق مولانا کے افکار و خیالات جو آپ کی مدون و غیر مدون تصانیف میں منتشر صورت میں موجود ہیں ان کا یکجا کرنا بلاشبہ ایک اہم علمی ضرورت ہے تاکہ آپ کی تصانیف میں بصیرت و آگہی کے جو خزینے پوشیدہ ہیں افراد ملت ان سے واقف و مستفید ہو سکیں اسی ضرورت کے پیش نظر مقالہ ہذا

ترتیب دیا گیا ہے اور اس کا عنوان یہ منتخب کیا گیا ہے۔

''مولانا مناظر احسن گیلانی کے تفسیری نکات

تصنیفات گیلانی کی روشنی میں''

مقالہ کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے باب اول مولانا گیلانی کی شخصیت وسوانح کے متعلق ہے اس میں تین فصول ہیں فصل اول مولانا کے حالات زندگی، فصل دوم اخلاق وسیرت اور فصل سوم اساتذہ وتلامذہ پر مشتمل ہے۔

باب دوم تصنیفات مولانا گیلانی سے ماخوذ تفسیری نکات پر مشتمل ہے اس باب میں تین فصول ہیں فصل اول میں مولانا کی تصانیف کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے فصل دوم اور سوم مولانا کے تفسیری نکات پر مشتمل ہیں فصل دوم میں تفسیر سورۃ الکھف کے علاوہ دیگر تصنیفات گیلانی سے ماخوذ تفسیری نکات جبکہ فصل سوم میں صرف سورہ الکھف کی تفسیر شامل ہے۔ چونکہ سورہ الکھف سے متعلق مولانا کے تفسیری نکات کی ضخامت دیگر سورتوں کے تفسیری نکات کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لئے اس سورۃ کے لیے علیحدہ فصل بنا دی گئی ہے۔ تاکہ فصول کی ضخامت میں توازن رہے تفسیری نکات کو قرآنی سورتوں کی ترتیب کے تحت مرتب کیا گیا ہے تفسیری نکات یکجا کرتے ہوئے بعض مقامات پر ضرورت کے تحت مولانا کے حواشی کو بھی تفسیر کا حصہ بنایا گیا ہے حواشی کی شناخت کے لئے (*) کی علامت استعمال کی گئی ہے حواشی کو درج کرتے ہوئے ابتداء اور اختتام پر یہ علامت لگا دی گئی ہے۔ چند مقامات پر اشد ضرورت کے تحت کتاب کے متن میں تبدیلی کے بغیر تقدیم وتاخیر کی گئی ہے تفسیری نکات اخذ کرتے ہوئے اصل کتاب میں چند مقامات پر طباعت اور بعض مقامات پر قرآنی آیات کے متن میں غلطی موجود تھی اسے مقالہ میں درست کر دیا گیا ہے اور تمام آیات، سورۃ کے نام اور آیت کے نمبر کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں احادیث کی بھی ممکنہ حد تک تخریج کی گئی ہے اور تمام تر حوالہ جات فٹ نوٹ کی شکل میں درج کئے گئے ہیں پہلی بار کتاب کا مکمل حوالہ اور دوسری بار صرف مصنف، کتاب کے نام اور صفحہ نمبر پر اکتفا کیا گیا ہے۔

تیسرا باب مولانا کے تفسیری منہج واسلوب پر مشتمل ہے اس میں دو فصول ہیں فصل اول میں تفسیری منہج اور فصل دوم میں مولانا کے منفرد افکار وخیالات کے تحت تفسیری تفردات شامل ہیں۔

آخر میں خلاصہ بحث اور مصادر ومراجع درج کئے گئے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کے ساتھ اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا مکمل اعتراف ہے مگر حتی المقدور کوشش یہی کی گئی ہے کہ موضوع کا حق احسن طریقے سے ادا کیا جا سکے یقیناً اس مقالہ میں بہتری کی گنجائش موجود ہے مگر آنے والے لوگوں کے لئے راہنمائی کی ایک مشعل ضرور روشن کی ہے۔ میں اس مقالہ کی تمام خوبیاں اپنے اساتذہ اور خیر خواہوں کی طرف منسوب اور تمام خامیاں اپنے ذمہ لیتی ہوں۔

مقالہ نگار

حنا نسیم

فہرست عنوانات

فہرست عنوانات

باب اوّل
مولانا مناظر احسن گیلانی کی شخصیت وسوانح

فصل اول

حالات زندگی

فصل اول:

حالاتِ زندگی

خاندان

مولانا سید مناظر احسن گیلانی حسنی و حسینی سادات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔[۱] مولانا مرحوم کے پہلے مورث اعلیٰ جو ہندوستان تشریف لائے وہ سید احمد جاجنیری ہیں۔[۲] سید احمد جاجنیری مدینہ منورہ سے مقام واسط تشریف لائے چند دنے مقیم رہے جو کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک دیہات بنام مقام واسط ملقب ہے اسی وجہ سے ان کا لقب ''واسطی'' ہے۔[۳] مقام واسط میں باعث ظلم وشدت قوم عباسی کے مقام واسط سے کوچ کر کے مقام مشہد مقدس میں تشریف لائے، اور چند روز سکونت پذیر ہوئے بعدہ وہاں سے کوچ کر کے بمقام بغداد شریف بمحلہ جاجنیر تشریف لا کر سکونت پذیر ہوئے یہیں سے جاجنیری آپ کے نام کا جزو بنا۔[۴]

مہاراجہ رائے پتھوڑا یعنی پرتھی راج کے خلاف جنگ میں جب سلطان محمد غوری نے مختلف سادات کو جہاد کی دعوت دی تو سید احمد جاجنیری بھی شریک جہاد ہوئے اور سلطان محمد غوری کو فتح نصیب ہوئی۔

حاصل یہ ہوا کہ سید احمد جاجنیری سلطان محمد غوری کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے اس کی صورت یہ ہوئی کہ اس کامیابی کی خوشی میں سلطان نے جہاں دوسرے شرکاء جہاد سادات کو جاگیریں عطا کیں اور ان کو ملک کے مختلف حصوں میں آباد کیا وہیں اس نے اس موقع سے حضرت سید احمد جاجنیری کو بھی کانپور کے پاس ایک جاگیر دی جس کو سید صاحب نے جاجنیر کے نام سے موسوم کیا جو اب صرف جاج کے نام سے مشہور ہے۔[۵] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سید صاحب کا کسی وجہ سے جی نہیں لگا تو وہ سلطان محمد غوری کے مشورہ سے علاقہ مونگیر میں تشریف لائے اور پھر سلطان نے یہاں موصوف کو معقول جاگیر عطا کی۔[۶]

مولانا مناظر احسن گیلانی کے آباؤ اجداد موضع ''مانے'' علاقہ شیخ پورہ ضلع مونگیر کے سادات میں سے تھے یہاں سادات کی بارہ بستیاں ہیں جن کو بارہ گانواں کہا جاتا ہے۔ یہ سادات سید احمد جاجنیری کی اولاد ہیں۔[۷]

مولانا گیلانی کا نسب نامہ جس قدر معلوم ہو سکا یہ ہے۔

مناظر احسن ولد حافظ ابوالخیر ولد محمد احسن ولد میر شجاعت علی ولد میر شفاعت علی[۸]

میر شجاعت اور میر شفاعت علی تک یہ خاندان ''مانے'' میں مقیم رہا پیشہ کاشت کاری اور زمین داری تھا میر شجاعت علی کی پہلی شادی موضع چواڑہ (نزد شیخ پورہ ضلع مونگیر) میں ہوئی تھی اہلیہ کی وفات کے بعد ان کی دوسری شادی موضع گیلانی ضلع پٹنہ (موجودہ ضلع نالندہ) میں بی بی حیاتن سے ہوئی جو گیلانی کے ایک زمیندار کی دختر تھیں میر شجاعت علی محل اُولیٰ کی اولاد کو اپنی ساری جائیداد چواڑہ میں دے کر خود گیلانی باشی ہو گئے۔ جہاں ان کی اہلیہ کی کافی جائیداد اور زمین داری تھی۔[۹] ان کی دوسری محل سے دو

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے، مکتبہ رشیدیہ کراچی، اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۲۶۷

۲ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۴

۳ ایضاً

۴ ایضاً ص ۲۵

۵ ایضاً ص ۲۶

۶ ایضاً

۷ گیلانی، مناظر احسن، سید، عالم بے بدل، مرتب محمد اکرام چغتائی، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۹۲

۸ ایضاً

۹ ایضاً

لڑکے تولد ہوئے مولانا محمد احسنؒ اور مولوی محمد محسنؒ (وکیل) [۱] گیلانی کے شجاعت علی حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے پردادا ہیں اور شجاعت علی کے فرزند مولانا محمد احسن گیلانیؒ مولانا مرحوم کے جد امجد ہیں۔[۲]

مولانا محمد احسن

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اپنے دادا کے متعلق خود لکھتے ہیں:

''مولانا (محمد احسنؒ) کے والد میر شجاعت علی مرحوم انگریزی پولیس میں سرکل انسپکٹر کے عہدے پر ممتاز تھے بزرگوں سے خاکسار نے سنا ہے کہ میر شجاعت علی کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے بچوں میں کوئی لڑکا عالم ہوتا مگر خدا کی شان جب تک زندہ رہے یہ آرزو پوری نہیں ہوئی مولانا محمد احسنؒ کی شادی ہو چکی تھی بلکہ ایک لڑکا بھی ہو چکا تھا جو فقیر کے بڑے چچا مرحوم تھے اس عمر اور ان حالات میں ''تحصیل علم'' کا سودا سر پر سوار ہوا بیوی، بچے، گھر بار سب کو ایک دفعہ سلام کر کے گیلانی سے روانہ ہوئے اور کامل چودہ سال کے بعد اس وقت واپس ہوئے جب بیٹا جوان ہو چکا تھا چودہ سال کی یہ مدت روپوشی میں نہیں گزری خط وکتابت اور آدمی تک وطن سے ان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا لیکن اس عرصہ میں خود ایک دفعہ بھی گھر نہ آئے مختلف علوم کے اہل کمال جن جن شہروں میں تھے ان کی خدمتوں میں پہنچے علوم رسمیہ کی کتابیں زیادہ تر بنارس کے ایک عالم مولانا واجد علی صدر اعلیٰ سرکار انگریزی سے پڑھی، ریاضی ہیئت، حساب مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے اور حدیث کی سند مولانا عالم نگینوی تلمیذ حضرت شاہ اسحٰق دہلوی سے حاصل کی اس زمانہ میں درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا مختلف مسائل پر رسائل تصنیف کئے۔ جب کامل اطمینان ہو گیا تب گھر لوٹے اور بجائے علم فروشی کے علم پاشی اور معارف بخشی میں ساری زندگی گزار دی۔[۳]

چونکہ مولانا احسن اپنے دور کے پولیس سرکل انسپکٹر کے صاحب زادے اور زمین دار گھرانے کے چشم وچراغ تھے اس لئے جہاں رہے بڑے وقار کے ساتھ رہے حرص اور لالچ سے دامن پاک رکھا[۴] مولانا مناظر احسن گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''مولانا محمد احسن گیلانیؒ خاکسار کے جد امجد ہیں یہ میرے گھر کی بات ہے اس لئے ''صاحب البیت ادری بمافیہ'' کے رو سے میں بتا سکتا ہوں کہ اس کی حقیقت کیا تھی یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم نے اس گاؤں میں تقریباً تیس چالیس سال درس وتدریس کا بازار گرم رکھا نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ کابل تک سے طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد مولانا سے پڑھنے کے لئے آئی اور کامیابی سے ہمکنار ہو کر واپس ہوئی۔[۵]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، عالم بے بدل، ۲۰۰۹ء، ص ۹۳

۲ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، سید، حیات مولانا گیلانی، ص ۳۰

۳ گیلانی، مناظر احسن، سید، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، مکتبہ رحمانیہ، س۔ن، ص ۲/۲۹،۲/۳۰

۴ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۳۲

۵ گیلانی، مناظر احسن، سید، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص ۱/۳۵۲

مولانا محمد احسنؒ کی اولاد

مولانا محمد احسنؒ کی شادی گیلانی ہی میں بی بی آمنہ بنت امام بخش ولد یتیم اللہ ولد میر مقیم سے ہوئی تھی مولانا احسن کے تین لڑکے ہوئے سید ابوظفر، سید ابونصر اور سید ابوالخیر، سید ابوظفر کی جوانی میں موت ہوگئی سید ابونصر جو حافظ عالم اور حکیم تھے لاولد مرے۔ا حافظ سید ابوالنصر گیلانیؒ درس نظامیہ کے عالم تھے درس وتدریس کا مشغلہ تو ان کا کم تھا لیکن مطالعے میں مسلسل منہمک رہتے تھے اس زمانے کے عام مولویوں کے اعتبار سے ان کا دائرہ وسیع تھا عربی فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی علمی کتابوں کا پڑھ لینا اپنی کسر شان نہیں سمجھتے تھے۔۲ انھوں نے پٹنہ اور لکھنو جا کر مروجہ نصاب عربی کی تکمیل کی تھی اور تیسرے صاحبزادے کا نام حافظ ابوالخیر تھا ان کی عمر کا چودھواں سال تھا کہ ان کے والد بزرگوار یعنی مولانا احسنؒ اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے ابوالخیر صاحب نے پہلے حفظ قرآن کیا، پھر فارسی کی تکمیل کی، ابھی عربی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور غالباً اسی وجہ سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔۳

مولانا مناظر احسنؒ کے والد محترم

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے والد محترم کا نام حافظ ابوالخیر تھا جو مولانا احسنؒ کے چھوٹے صاحبزادے تھے..... ان کے متعلق لوگوں کا بیان ہے کہ سادہ مزاج تھے گاؤں والوں کی سی ہی زندگی گزارتے تھے لیکن ان کی سخاوت وفیاضی گیلانی میں مشہور تھی غریبوں کے بہت کام آتے تھے کبوتروں کا شوق تھا مردانہ بیٹھک کے سامنے کبوتر خانہ بنوا رکھا تھا ۱۹۲۹ء میں حافظ ابوالخیر کی وفات ہوئی۔۴

حافظ ابوالخیر کی اولاد

حافظ ابوالخیر کی شادی استھانواں میں فدا حسین کی صاحب زادی سے ہوئی حافظ صاحب مرحوم کو تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں، مناظر احسنؒ، مکارم احسنؒ اور مظہر احسنؒ یہ تین لڑکے تھے صاحبزادیوں میں ایک کی شادی خان بہادر مولانا عبدالعزیز مرحوم مقیم صاحب گنج سے ہوئی دوسری کی شادی موضع کٹنی کول میں مظاہر حسن پیش کار سے تھی اور تیسری صاحب زادی قطب العالم مولانا سید محمد علی مونگیری کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا لطف اللہ صاحب رحمانی المتوفی ۱۹۴۲ء سے منسوب تھیں۔۵

پیدائش مولانا گیلانیؒ

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ۱۸۹۲ء میں ضلع پٹنہ کی ایک بستی (جوانہی کے بزرگوں کی آبادکی ہوئی تھی) گیلانی میں پیدا ہوئے آپ کے نام کے ساتھ گیلانی اس بستی کی نسبت ہے یہ ہرگز باطنی نسبت یعنی شیخ عبدالقدر جیلانی سے متعلق نہیں۔۶

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، عالم بے بدل، ص ۹۳

۲ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۴۹

۳ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۳۶

۴ ایضاً، ص ۳۷

۵ ایضاً

۶ فیوض الرحمٰن، قاری، حافظ مشاہیر علماء دیوبند، المکتبۃ العزیزیہ، ۱۹۷۶ء، ص ۵۹۸

حضرت مولانا گیلانیؒ بہار کی مردم خیز زمین کے درشاہوار تھے، ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو اپنی ننھیال استھانواں میں پیدا ہوئے۔[۱] پرورش و پرداخت کا بڑا حصہ دادھیال گیلانی میں گزرا جہاں مولانا اس وقت ابدی نیند سو رہے ہیں جس سے آپ کو بے انتہا انس ومحبت تھی۔[۲] آپ کی والدہ بھی ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔[۳]

تعلیم وتربیت

مولانا کا خاندان ذی وجاہت تھا مالی فارغ البالی اور علمی اعتبار سے گردونواح میں نمایاں تھا۔[۴] گھر کا ماحول مولوی خاندان ہونے کی وجہ سے دیندارانہ، مومنانہ ومخلصانہ تھا اسی ماحول میں آپ کی پرورش وپرداخت ہوئی آپ کے چچا مولانا حکیم ابو نصر کے کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے آپ کی ساری توجہ اپنے اس ہونہار بھتیجے (مناظر احسن) پر مرکوز تھی کہ کسی طرح یہ خاندان کی عزت وعظمت کا نشان بن جائے اور دادا کی خالی مسند اس سے رونق پذیر ہو۔[۵]

سید مناظر احسنؒ کی تعلیم کی ذمے داری ان کے چچا مولانا حکیم ابو نصر کے سپرد ہوئی ان کی عمر پانچ یا چھ سال تھی کہ حکیم صاحب نے نہایت محبت وشفقت کے ساتھ ان کی بسم اللہ کرائی قرآن مجید کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اردو، عربی، فارسی کی ابتدائی کچھ کتابیں حکیم صاحب قبلہ نے پڑھائیں۔[۶]

ٹونک میں معقولات کی تعلیم

مولانا گیلانیؒ کے دادا محمد احسنؒ پر معقولیت کا رنگ غالب تھا اس لئے ابتدائی عربی تعلیم کے بعد مولانا مناظر احسنؒ کو بھی معقولات کی تعلیم کے لیے ٹونک روانہ کیا گیا اس کے متعلق مولانا خود لکھتے ہیں کہ:

''علوم عربیہ کا ذوق کو ہمارے خاندان کا موروثی ترکہ تھا لیکن اس ذوق پر معقولیت کا رنگ چوں کہ مستولی تھا اس لئے ہمارے عم محترم مولانا الحاج الحکیم سید ابوالنصر نور اللہ مرقدہ جن سے عربی کی ابتدائی تعلیم فقیر حاصل کر رہا تھا انہوں نے آیندہ تعلیمی مراحل کی تکمیل کے لئے مجھے ریاست ٹونک پہنچا دیا جہاں خیرآباد کے معقولی اسکول کے امام مولانا سید برکات احمدؒ اپنے درس کی مسند بچھائے ہوئے زیادہ تر عقلی علوم (منطق وفلسفہ) کی تدریس وتعلیم میں بہ صد ذوق وشوق مشغول ومنہمک تھے۔[۷]

بالآخر ۱۳۲۴ھ میں مولانا گیلانی بہار سے راجپوتانہ کے ریگستانی علاقہ ٹونک پہنچا دیے گئے اس وقت آپ اپنی عمر کے چودہویں سال میں تھے وہاں آپ کو آپ کے استاذ مولانا برکات احمد نے پھر ایسا غوجی سے خود پڑھانا شروع کیا۔ ۱۳۲۴ھ سے لے کر مسلسل ۱۳۳۱ھ تک سات سال تعلیمی سلسلہ وہیں جاری رکھا۔[۸] بقول مولانا گیلانیؒ ٹونک میں بخاری، ترمذی، ہدایہ، تلویح کے

---

۱ رضوی، محبوب، سید، تاریخ دار العلوم دیوبند، ادارہ اہتمام دار العلوم دیوبند، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۸

۲ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۳۸

۳ ایضاً

۴ فیوض الرحمٰن، قاری، حافظ، مشاہیر علماء دیوبند ص ۵۹۸

۵ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۳۸

۶ گیلانی، مناظر احسن، سید، دار العلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۴۱

۷ ایضاً، ص ۶۸

۸ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۴۰

اسباق بھی ہوتے تھے اور حمد اللہ قاضی مبارک، شمس بازغہ، صدرا جیسی عام درسی کتابوں کے سوا شرح تجرید، قوشجی مع حواشی، دوانی و صدر الدین شیرازی، شفاء، اشارات، الافق المبین جیسی کتابیں بھی ہوتی تھیں وہاں کی اصطلاح میں یہ قدما کی کتابیں کہی جاتی تھیں اور ان کا درس بھی اس خصوصیت کے ساتھ جاری تھا کہ اب دنیا کے طول وعرض میں ان کتابوں کے پڑھنے والے اس علمی خاندان کے سوا اور کہیں پڑھ نہیں سکتے تھے۔[۱] بقول مولانا مناظر احسن علم حدیث کے سوا شد بد کی جو کیفیت بھی اپنے اندر پاتا ہوں وہ زیادہ تر اسی مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ ہے میری مراد سیدی الاستاذ حضرت مولانا سید برکات احمد ٹونکی نزیلاً و بہاری وطناً رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم گاہ سے ہے۔[۲] ٹونک میں مولانا برکات احمد صاحبؒ سے مولانا گیلانی نے ابتداء سے لے کر انتہا تک یعنی شرح اشارات تک معقولات کی تمام کتابیں بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھیں بقیہ دوسرے فنون کی کتابیں دوسرے استاذ کی خدمت میں اسی مدرسہ میں رہ کر پڑھیں۔[۳]

مولانا گیلانی پر احیاء العلوم کے اثرات

جنگ طرابلس کے سلسلے میں ترکی کی امداد کے لئے ایک ندوی مولوی صاحب چندہ جمع کرنے کے لئے ٹونک پہنچے مگر کسی نے ان کی طرف کان نہ دھرے مولانا گیلانیؒ نے ان صاحب کی مدد کے لئے ٹونک کی جامع مسجد میں پرزور تقریر کی لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ امداد کے لئے بیش بہا رقم مہیا ہوئی اور مولانا گیلانی اس طرح واعظ شہر بن گئے وعظ کے سرمائے کی فراہمی کے لئے مولانا نے احیاء العلوم کا مطالعہ شروع کیا اور بقول مولانا:

''مطالعہ کلیتاً دوسروں کے لئے کیا جاتا تھا لیکن بجائے دوسروں کے سب سے پہلے غزالی کی گرفت میں خود مطالعہ کرنے والا پھنس گیا اور ایسا پھنسا کہ شاید آخری سانس تک یہ گرفت ڈھیلی ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔[۴]

اس مطالعے کے بعد مولانا کی جو حالت تھی بقول مولانا:

''دماغ الٹ گیا، طبیعت پلٹ گئی، دل بدل گیا جو کچھ اب تک تھا وہ باقی نہ رہا نتیجہ یہ ہوا کہ اب نہ منطق کی کتابوں میں جی لگتا ہے اور نہ فلسفے میں لذت ملتی تھی سب سے دل اچاٹ ہو گیا۔''[۵]

اس اضطرابی کیفیت سے نجات کیلئے مولانا نے خواجہ ہند معین الدین اجمیریؒ کے آستانے پر حاضری دی اور وہاں ''شکوہ خواجہ'' نامی ایک طویل نظم بھی لکھی اجمیر سے ٹونک واپسی کے بعد مولانا ہیضے کی مہلک بیماری میں مبتلا ہوئے صحت یاب ہونے کے بعد اپنے وطن گیلانی روانہ ہوئے اور فیصلہ کیا کہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے بجائے ٹونک کے اب کہیں اور جانا ہے اور اپنے بزرگوں کو اس فیصلے سے آگاہ کیا بالآخر اپنے عم محترم سید ابوالنصر کی رضامندی سے دارالعلوم دیوبند جانے کا فیصلہ کیا بقول مولاناؒ:

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص ۳۵۷

۲ ایضاً ص ۳۵۶

۳ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی ص ۴۷

۴ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۷۳

۵ ایضاً

''بعض مبشرات اور رویائے صالحہ نے میرے تعلیمی سرپرست عم مغفور ومرحوم مولوی حکیم سید ابوالنصر کے قلب کو بھی اسی فیصلے کے ساتھ راضی کر دیا اور طے ہوگیا کہ رمضان بعد بجائے ٹونک کے خاک سار دارالعلوم دیو بند ہی کا احرام باندھے گا'' ۱؎

مولانا دارالعلوم دیو بند میں

مولانا گیلانی نے دارالعلوم دیو بند کے مہتمم کو داخلے کے لئے خط لکھا اور دیو بند سے طلبی کا خط بھی موصول ہوا مولانا کو اس سے بہت مسرت ہوئی چنانچہ طلبی کا خط موصول ہونے کے بعد مولانا دارالعلوم پہنچے دارالعلوم کے تاثر کے متعلق مولانا لکھتے ہیں کہ:

''دارالعلوم کے احاطے میں پہنچ کر ہزار بارہ سو طلباء کے مجمع میں شریک ہو جانا اور طلباء بھی کسی ایک صوبے بلکہ ایک ملک کے بھی نہیں، ان میں جہاں یوپی، بہار کے طلباء تھے جن سے فقیر مانوس تھا یا مانوس ہوسکتا تھا وہیں بڑی تعداد کابل، بخارا، سمرقند، کاشغر، کوقند، وسط ایشیاء کے باشندوں کی بھی تھی اور کبھی کبھی اسی جھمیلے میں عرب اور حبش، عراق سے آئے ہوئے طالبعلموں پر بھی نظر پڑ جاتی تھی'' ۲؎

دارالعلوم دیو بند سے متعلق مولانا کو جن اکابر واساتذہ کا علم ہوا ان کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

''جہاں بیٹھے، جدھر جایئے، ہر مجلس ہر حجرے اور حجروں کے در و دیوار سے حضرت نانوتوی مولانا محمد قاسمؒ، حضرت گنگوہی مولانا رشید احمدؒ، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی، مولانا اشرف علی، مولانا عبدالرحمٰن رائے پوری کے چرچوں کے سوا اور کچھ نہ تھا ان چرچوں کو تو صرف سنتا تھا اور ان ہی کے ساتھ کچھ گرامی اسماء ایسے بھی تھے کہ اسماء کے ساتھ خود ان کے ''مسمّی'' پر بھی دور سے نظر پڑ جاتی تھی یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حافظ محمد احمد صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مولانا شبیر احمد صاحب رحمہم اللہ اجمعین کی مبارک اور قدسی ہستیاں تھیں''۔ ۳؎

بالآخر دورہ حدیث میں باضابطہ داخلے کے لئے تمام مراحل مکمل ہوئے اور مولانا کا امتحان محدث العصر مولانا انور کشمیریؒ نے لیا اور مولانا گیلانیؒ اس امتحان میں کامیاب ہوئے، ۲۰۔۲۱ شوال ۱۳۳۱ھ سے درس شروع ہونے کا اعلان ہوگیا..... مولانا کی یاد کے مطابق دورہ کا پہلا سبق ۲۱ شوال ۱۳۳۱ھ کو حضرت علامہ کشمیری کے یہاں مسلم شریف کا شروع ہوا۔ ۴؎ حضرت کشمیریؒ کے درس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

''باتوں باتوں میں صرف حدیث ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے ایسے اہم کلیات ہاتھ ان کے درس میں آ جاتے تھے کہ اپنے ذاتی مطالعے سے شاید ساری عمر ان تک ہم جیسے نارساؤں کی رسائی آسان نہ تھی۔'' ۵؎

مولانا مزید لکھتے ہیں کہ:

۱؎ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیو بند میں بیتے ہوئے دن، ص ۸۸

۲؎ ایضاً، ص ۹۶

۳؎ ایضاً، ص ۹۸

۴؎ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۴۷

۵؎ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیو بند میں بیتے ہوئے دن، ص ۱۳۸

''درس تو ہوتا تھا حدیث کا لیکن شاہ صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے معلومات کا جو گراں مایہ قیمتی سرمایہ ان کے اندر جمع کر دیا تھا وہ ان کے اندر سے بے ساختہ چھلکتے رہتے تھے''۔[۱]

مولانا گیلانی کو دورہ حدیث کی ابتداء میں ایک عجیب وغریب ذہنی وفکری کشمکش سے دو چار ہونا پڑا اور یہ کیفیت خصوصیت کے ساتھ حضرت شیخ الہند محمود حسنؒ کے درس میں پیش آتی حضرت شیخ الہند کے پاس اس وقت بخاری اور ترمذی شریف کا درس ہوا کرتا تھا مولانا اپنی اس کیفیت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہونے یہ لگا کہ جوں ہی حدیث شروع ہوتی اپنے ذہن میں الجھنوں کے طوفان کو پاتا طرح طرح کے شبہات ہر حدیث میں ہوتے یہ شبہات طالبعلمانہ اور مولویانہ نہ تھے بلکہ مصیبت یہ تھی کہ عموماً ذات رسالت مآب ﷺ ہی سے (العیاذ باللہ) ان خبیث اور گندے وساوس اور خیالات کا عموماً تعلق ہوتا، بدگمانیوں کی ایک آگ تھی جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے دو گھنٹے تک عموماً ترمذی شریف کا یہ درس مسلسل جاری رہتا اور ایک سیاہ کار سیاہ سینہ ان دو گھنٹوں کے اندر ان ہی شکوک وشبہات کی آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا ہر حدیث میرے لئے بدگمانی وسوئے ظن کا چقماق بنتی چلی جاتی تھی دماغ صرف ہرزہ اندیشیوں اور یاوہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا''۔[۲]

مولانا گیلانی ان فاسد خیالات سے انتہائی پریشان تھے، ان وساوس کے علاج ہی کی غرض سے مولانا نے کلیر، منگلور وغیرہ کا سفر کیا اور بزرگوں کے مزار پر پہنچ کر دعائیں کیں کہ ان گندے خیالات کی آمد بند ہو مگر کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔[۳] بالآخر مولانا نے حضرت شیخ الہندؒ سے اپنے اس مسئلے کا تذکرہ کیا تو انہوں نے سننے کے بعد ارشاد فرمایا:

''مولوی صاحب آپ اتنے پریشان کیوں ہیں اپنا یہ حال جب آپ کے لئے اتنا ناگوار ہے تو یہ بے ایمانی کی نہیں آپ کے ایمان کی دلیل ہے ایمان نہ ہوتا تو ان حالات سے اتنے پریشان ہی کیوں ہوتے''۔[۴]

شیخ الہند کے جملے مولانا کے لئے تسکین وتسلی کا باعث بنے اور شیخ الہند نے مولانا سے فرمایا:

''مولوی صاحب جاؤ، اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا''۔[۵]

بالآخر مولانا کے شکوک ووساوس کا خاتمہ ہوا اور اسباق میں جی لگنے لگا شیخ الہندؒ مولانا گیلانیؒ پر بہت مہربان رہے اور ان ہی کے حکم سے مولانا گیلانی نے دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والے رسالوں میں لکھنا شروع کیا اور اس کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ:

''پھر تو ''القاسم'' اور ''الرشید'' دارالعلوم سے شائع ہونے والے دونوں مجلّوں کے ساتھ ایسا رشتہ قائم ہوا کہ بسا اوقات دونوں رسالوں میں فقیر کے ہفوات کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہ تھا''۔[۶]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص۱۴۰

۲ ایضاً، ص۲۰۲

۳ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص۸۰

۴ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص۲۰۶

۵ ایضاً، ص۲۰۷

۶ ایضاً، ص۲۲۴

اس طرح مولانا گیلانیؒ کی تصنیف وتالیف کی زندگی کا آغاز بھی دوران طالبعلمی ہی ہوا مولانا نے حدیث کی چوتھی اہم کتاب ابوداؤد شریف دارالعلوم دیوبند کے مشہور استاد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے پڑھنا شروع کی مگر چند مہینوں بعد ہی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بعض وجوہات کے سبب تدریسی خدمت سے دست کش ہو گئے تو یہ سبق مولانا میاں صاحب اصغر حسینؒ کے یہاں منتقل ہو گیا موطا امام محمد اور موطا امام مالک کے اسباق مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سے پڑھے ابن ماجہ مولانا غلام رسولؒ صاحب اور نسائی شریف مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے پڑھی۔

دورہ حدیث کے سال دو مزید کتابیں آپ نے اور پڑھیں سراجی مولانا گل محمد خان اور ہدایہ آخرین مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔[۱]

۱۳۳۲ھ کی روداد میں جہاں دورہ حدیث کے کامیاب طلبہ کے نام درج ہیں آپ کا نام تیسرے نمبر پر درج ہے دورہ حدیث میں دس کتابوں کا امتحان ہوا کرتا ہے ان کتابوں میں صرف موطا امام محمد میں آپ کا نمبر کم آیا ہے۔[۲]

دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ نمبر پچاس ہے گویا جو حیثیت سرکاری مدارس میں سو نمبر کو حاصل ہے وہی دیوبند میں پچاس نمبر کو دیا گیا ہے آپ کے سالانہ امتحانات کے نمبرات یہ ہیں۔

بخاری شریف	مسلم شریف	ابوداؤد شریف	ابن ماجہ شریف
۵۱	۵۱	۵۰	۵۰
نسائی شریف	شمائل ترمذی	ترمذی شریف	موطا امام مالک
۵۰	۵۰	۴۹	۴۸
طحاوی	موطا امام محمد		
۴۵	۳۹		

اس طرح آپ اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے اور فرسٹ ڈویژن میں تیسری پوزیشن حاصل کی مجموعی نمبر (۵۰۰) میں آپ نے (۴۴۳) نمبرات حاصل کئے۔[۳]

یوں سالانہ امتحان میں کامیابی کے بعد مولانا نے دورہ حدیث سے فراغت پائی اور بعد فراغت گیلانی پہنچے۔

معاشی جستجو

مدرسہ کی زندگی جب ختم ہوئی تو مولانا کو معاش کی فکر لاحق ہوئی اور یہ بھی جانتے تھے کہ جو کچھ پڑھا ہے اسی دائرہ میں کام کرنے کی صلاحیت ہے اس کے سوا نہیں۔

چنانچہ گھر سے نکل کر سیدھے ٹونک پہنچے اساتذہ کرام سے ملے اور بتایا کہ اب ان کو کسی کام پر لگایا جائے جو آپ کے مستقبل کو روشنی بخش سکے اتفاق سے مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں تدریس کی کوئی جگہ خالی نہیں تھی اس لئے وہاں کے لوگوں نے سردست مولانا کو کتب خانہ میں رکھ دیا کہ وہ فہرست سازی کی خدمت انجام دیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ پھر جونہی مدرسہ میں جگہ نکلے گی تم کو لے لیا

۱۔ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۹۰

۲۔ ایضاً ص ۹۱

۳۔ ایضاً ص ۹۲

جائے گا حق الخدمت کتب خانہ سے صرف پانچ روپے طے پایا اور وہ بھی نواب شاہی سکہ سے گویا انگریزی روپے سے پونے چار روپے۔[1]

دو ماہ بعد مدرسہ میں ایک مزید مدرس کی ضرورت ہوئی ارباب مدرسہ نے اس جگہ پر مولانا گیلانی کا تقرر کر دیا، استعداد پر سبھوں کو پہلے ہی سے اعتماد تھا مشاہرہ مدرسہ سے پندرہ روپے طے کیا گیا اس طرح مدرسہ سے ماہانہ بیس روپے ملنے لگے جس کو مولانا نے شروع میں اپنے لئے غنیمت جانا، پانچ دس روپیہ کا ایک ٹیوشن کر لیا۔[2] یوں پچیس تیس روپے کی ماہانہ آمدنی ہونے لگی جسے مولانا نے ابتدا میں غنیمت جانا۔

کچھ وقت بعد اپنی ذہانت اور استعداد پر بھروسہ کرتے ہوئے اطمینان بخش مستقبل کی خاطر مزید تجربہ کرنے کا سوچا اور ٹونک سے حیدرآباد میں مدرسہ نظامیہ اپنے شاگرد وخادم انوار الہ آبادی کے ہمراہ پہنچے مدرسہ نظامیہ میں ٹونک کے ساتھی مولوی شاہ سید مقبول احمد مل گئے جو مولانا گیلانیؒ کو مدرسہ نظامیہ کے سرپرست اور اس زمانہ کے امور مذہبی کے وزیر مولانا انوار اللہ خاںؒ کے پاس لے گئے یہاں اجمیر شریف کے متولی مولوی نثار احمدؒ سے بھی ملاقات ہوئی جو وزیر صاحب کے اس وقت مہمان تھے مولانا گیلانی اس وقت تک مدرسہ نظامیہ میں مقیم تھے کچھ دنوں کے بعد جب راہ ورسم بڑھی تو وزیر صاحب نے مولانا گیلانی کو اپنے یہاں مہمان بننے کی دعوت دی جسے مولانا نے قبول کیا۔

حیدرآباد دکن میں ہی مولانا گیلانی کو ملا مراد نامی بزرگ سے شناسائی کا موقع ملا جو ماشاء اللہ مخلص بھی تھے اور اہل علم کے قدرداں بھی انہی بزرگ نے مولانا گیلانی کو حیدرآباد کے بڑے روسا میں سے ایک ''مہاراجہ کشن پرشاد'' سے ملایا، مہاراجہ علم دوست، علما نواز اور علمی گفتگو کا بڑا عمدہ ذوق رکھتے تھے تصوف کا بھی بہت ہی ستھرا ذوق تھا مسئلہ وحدت الوجود سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔[3]

مہاراجہ چونکہ علماء کے قدرشناس تھے اس لئے مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق مولانا گیلانی نے جب مہاراجہ کے سامنے تقریر کی تو مہاراجہ مولانا کے گرویدہ ہو گئے دونوں میں علمی مسائل پر مفید گفتگو، ہوتی مہاراجہ اپنی تصنیفات کی ایک ایک کاپی مولانا کو دیتے رہے اور ان کے متعلق مولانا کی رائے معلوم کرتے رہے دونوں میں شگفتہ تعلقات قائم ہو گئے۔

اب مولانا حیدرآباد میں اپنے اصل مقصد یعنی ذریعہ معاش کی طرف متوجہ ہوئے لیکن معاشی ذرائع کے امکانات کے متعلق خلاف توقع کافی مایوسیوں کا سامنا ہوا مولانا چاہتے تھے کہ آمدنی کم از کم اتنی ہو جائے کہ آرام وعافیت کی زندگی بسر ہو سکے اس کے ساتھ ہی مولانا اپنے مزاج کے اعتبار سے دین اور علم دین کی خدمت سے دست بردار ہونے کے لئے بھی تیار نہ تھے چنانچہ مولانا نے حیدرآباد میں اپنے قیام کے ارادہ کو بدلنے کا فیصلہ کیا مولانا نے اپنے اس فیصلے کے متعلق ایک دن مہاراجہ کشن پرشاد سے ذکر کیا مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ سننے کے ساتھ ہی کہ میں حیدرآباد سے جانا چاہتا ہوں مہاراجہ نے عجب طرح سے مجھے دیکھا حیدرآباد پہنچنے کے بعد حیدرآباد سے واپس ہو جانے کا فیصلہ شاید ان کے نزدیک کچھ عجیب سا تھا مجھ سے کہنے لگے آخر کیوں،

---

[1] مفتاحی محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانیؒ، ص ۱۱۵

[2] ایضاً

[3] ایضاً، ص ۱۲۱

کیا بات ہے؟ اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہنے لگے کہ میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ مولانا کو نظامیہ کالج جنگ کے یہاں سے اٹھ کر ہمارے یہاں چلے آؤ پھر اصرار کرنے لگے کہ میں تم کو جانے نہ دوں گا گرد و پیش کے مصاحبوں سے کہنے لگے، ان کے رہنے سہنے کا نظم فلاں مکان میں کر دیا جائے۔ مہاراجہ نے یہ واقعہ ہے کہ لہجہ ایسا کا کوئی ایسا طریقہ نہ تھا جسے سمجھانے اور فیصلے کے بدلنے کے سلسلے میں اختیار نہ کیا ہو آخر میں یہاں تک بول اٹھے مولوی صاحب آپ اندازہ نہیں کر رہے ہیں کہ کون آپ کو اپنے یہاں ٹھہرنے پر مجبور کر رہا ہے"۔[۱]

مولانا گیلانیؒ مختلف عذر پیش کرتے رہے لیکن مہاراجہ نے ہر سہولت ہر آسائش و آرام کا اطمینان دلایا مولانا عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے دنیا باہیں پھیلائے ان کی منتظر تھی مگر مولانا کو کوئی اور ہی فکر دامن گیر تھی مولانا لکھتے ہیں کہ:

"دین کی تعلیم میں عمر کا اتنا بڑا حصہ جو صرف ہوا سیدنا شیخ الہندؒ اور حضرت الاستاذ الامام الکشمیریؒ کے حلقہ ہائے درس میں رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کے سننے اور پڑھنے کا آخری انجام میرے لئے کیا یہی تھا کہ ایک غیر مسلم میر کی مصاحبت اور ندیمی میں اپنی زندگی گزاروں گا؟ یہ خیال سامنے آتا اور معلوم ہوتا کہ دنیا مجھ پر تاریک ہو گئی مہاراجہ کی زیر سرپرستی کسی محکمے میں اچھی ملازمت بھی مل سکتی ہے وکالت کا امتحان بھی دے سکتا ہوں چاہوں تو حیدر آباد کے مدرسہ طبیہ میں شریک ہو کر طب بھی پڑھ سکتا ہوں یہ اور اسی قسم کے امکانات قدم میں لغزش پیدا کرتے نفس حیلے حوالوں کے حربوں کے ساتھ سامنے کھڑا ہو جاتا لیکن دل کہتا کہ پھر اس کا کیا جواب ہوگا جب پوچھا جائے گا کہ کیا اسی لئے قرآن و حدیث کی تعلیم تجھے دی گئی تھی؟"[۲]

مولانا اپنے شاگرد و خادم الوار الہ آبادیؒ جو ٹونک سے حیدر آباد مولانا کے ساتھ آئے تھے سے اپنے دل کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"کسی امیر کی گرمی بزم میں اپنی ساری صلاحیتوں کی حرارت جھونک دوں کیا یہ زندگی کی کوئی قیمت ہوئی اس سے کہیں بہتر تھا کہ میں کچھ نہ پڑھتا کسی گاؤں میں ہل جوتتا کسی سڑک پر بیٹھ کر جوتیاں گانٹھتا"۔[۳]

بالآخر اللہ کی رحمت نے مولانا کی دست گیری کی اور تمام ذہنی الجھنوں کا ازالہ کرتے ہوئے واپسی کے فیصلے کو مولانا کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا اور تمام دوست احباب سے رخصت لے کر مولانا حیدر آباد سے واپسی کے لئے نکل پڑے واپسی پر راستے میں منماڑ سٹیشن پر مولانا کے ٹونک کے ساتھی شاہ مقبول احمد سے مولانا گیلانی کی ملاقات ہوئی مقبول احمد پیرزادے تھے اور اپنے والد صاحب کے مریدوں میں گشت کے لئے روانہ ہوئے تھے انہوں نے مولانا گیلانی سے درخواست کی کہ مولانا بھی ان کے ساتھ چلیں تاکہ مولانا کی تقریری صلاحیتوں سے مقبول احمد کو فائدہ پہنچے اور مولانا کی تفریح بھی ہو جائے گی فائدہ کی صورت یہ تھی کہ مریدوں میں وعظ کے بعد رخصتانہ کی جو رقم وصول ہوتی ہے مولانا گیلانی کی پُر تاثیر تقریروں کی بدولت اس رقم میں اضافہ ممکن تھا اخیر مولانا گشتی سفر کے لئے ساتھ چل دیے کچھ ہی دنوں بعد مولانا کے قلب کی جو کیفیت ہوئی اسی کے متعلق لکھتے ہیں:

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۳۲۸
۲ ایضاً، ص ۳۳۰
۳ ایضاً، ص ۳۳۱

''دل کہتا تھا کہ آخر یہ لوگ جو ہماری امیدوں کے مرجع بنے ہوے ہیں نہ جنوں کی اولاد ہیں نہ حور، فرشتے ہیں نہ اور کچھ ہم ہی جیسے آدمی ہیں اور معمولی آدمی زیادہ لکھے پڑھے بھی یہ بے چارے نہیں لیکن جب سعی و کوشش سے اتنا کچھ حاصل کر سکتے ہیں کہ ہم جیسے مولوی لوگوں کی امیدوں کی آماج گاہ بنے ہوئے ہیں غیرت وحمیت کا بخار سا معلوم ہوا کہ مجھ پر چڑھا چلا جاتا ہے اپنے آپ سے دل میں نفرت پیدا ہونے لگی یہ اور اسی نوعیت کے خیالات کا ہجوم اس شدت کے ساتھ ہوا کہ اپنے اسی گشتی سفر کو قطعی طور پر ختم کر دینے کا ارادہ کرلیا گیا۔''[۱]

توفیق الہی نے مولانا گیلانیؒ کی رفاقت کی اور لغزش گاہوں پر پھسلنے سے مولانا کو سنبھال لیا گیا اس گشتی سفر کے بعد مولانا سیدھے دارالعلوم دیوبند پہنچے۔

دیوبند واپسی

دارالعلوم دیوبند پہنچنے کے بعد حکیم منظر حسن جو مولانا کے رفیق تھے ابھی مدرسہ میں تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے تھے ان ہی کے حجرے میں مولانا نے قیام کیا اپنے استاد محترم حبیب الرحمٰن عثمانیؒ سے ملاقات کی جو نہایت شفقت و محبت سے ملے مولانا کے قیام وطعام کا بندوبست انہوں نے کیا اور دس روپے ماہوار مولانا کے نام جاری فرمانے کا حکم یہ فرماتے ہوئے دیا کہ:

''سردست کچھ درس و تدریس کا کام مدرسے میں کرو اور ''القاسم'' و''الرشید'' مدرسے سے نکلنے والے ان دونوں رسالوں میں لکھتے رہو آگے میں کوئی مستقل نظم تمھارے لئے کروں گا''۔[۲]

کچھ وقت مولانا نے یہ خدمت انجام دی اور اس کے بعد مدرسہ میں ملازم ہوگئے مولانا لکھتے ہیں:

''دس روپے ماہوار کی یہ تنخواہ صرف ایک ماہ مجھے ملی اس کے بعد مدرسے میں باضابطہ ملازمت کا آغاز تیس روپے ماہوار سے شروع ہوا جو دارالعلوم کی مجلس شوری نے طے کیا تھا دارالعلوم کے باہر تیس روپے کا وزن کچھ ہی ہو لیکن دارالعلوم کے احاطے میں مجھ جیسے نو آمیز ملا کے لئے شاید یہ کافی امتیاز تھا وجہ امتیاز ہو یا نہ ہو لیکن جہاں تک اپنے دل کو ٹٹولتا تھا اس تنخواہ سے کامل طور پر اگر مطمئن نہیں تو چنداں غیر مطمئن بھی نہ تھا''۔[۳]

مولانا گیلانیؒ پوری محنت سے مفوضہ خدمات انجام دینے لگے ''القاسم'' اور ''الرشید'' کے مضامین کی ترتیب اور مضامین کی کمی کی تکمیل بھی انجام دیتے درس و تدریس کا فریضہ بھی انجام دیتے اور اگر کسی جگہ سے واعظ کی طلبی آتی تو وہاں وعظ وتبلیغ کے لئے بھی بھیج دیے جاتے گویا بیک وقت مدرس، مبلغ اور رسالہ کے مدیر کے فرائض انجام دیتے۔

دیوبند سے بہار

خانگی امور کے سلسلے میں کچھ مہینوں کے لئے مولانا گیلانیؒ دیوبند سے بہار تشریف لے گئے وہیں دارالعلوم دیوبند کے ایک قدیم فارغ التحصیل مولوی سید علی عظیم نے مولانا گیلانی کو اس بات کی طرف راغب کیا کہ آپ بہار میں رہ کر دین کی خدمت انجام دیں دارالعلوم کے لئے بہت سے دیگر اشخاص بھی مل سکتے ہیں مگر بہار کو آپ کی ضرورت ہے وطن کی قربت کی وجہ سے مولانا ان

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۳۳۷

۲ ایضا، ۳۳۹

۳ ایضا، ص ۳۴۲

حضرت کی ہاتوں میں آگئے اور دیو بند سے ایک مہینے کی رخصت پر آئے تھے مگر تین مہینے گزر گئے۔

دیو بند سے طلبی

دیو بند سے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے مولانا گیلانیؒ کی تاخیر کی وجہ دریافت کی پہلے تو مولانا گیلانیؒ ٹالتے رہے پھر آخر کار بتادیا کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ میں بہار میں رہ کر خدمت دین کروں اور اگر آپ (حبیب الرحمٰن عثمانیؒ) اجازت دیں تو میں یہاں رہ جاؤں مگر مولانا عثمانیؒ نے مولانا گیلانیؒ کو تحریر فرمایا کہ آپ دیو بند چلے آئیں جن کاموں کا آپ نے ارادہ کیا ہے دارالعلوم سے زیادہ بہتر جگہ ان کے لئے کوئی نہیں دارالعلوم میں بہترین کتب خانہ ہے القاسم الرشید رسالوں میں لکھ کر یہ خدمت انجام دی جاسکتی ہے اور پریس بھی آپ کے حوالے کردیا جائیگا اور مشاہرہ بھی تیس کے بجائے پچاس روپے کردیا جائیگا۔

مولانا عثمانیؒ چونکہ ایک تجربہ کار عالم دین تھے اس لئے مولانا گیلانیؒ نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور دیو بند لوٹ آئے۔

کلکتہ میں توہین رسول ﷺ کا حادثہ

مولانا گیلانی کو بہار سے دیو بند لوٹے ہوئے ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ بقول مولانا:

''اچانک کلکتہ میں ایک ہنگامہ شروع ہوا مختصر یہ ہے کہ ''ڈیلی نیوز'' نامی غالباً کوئی انگریزی اخبار تھا جس میں سرور کائنات ﷺ کے متعلق بعض ناساز الفاظ شایع ہوئے تھے کلکتہ کے مسلمانوں میں غم اور غصے کی لہر دوڑ گئی بات بڑھتی ہی چلی گئی تا آں کہ کل ہند پیمانے پر فیصلہ کیا گیا کہ باضابطہ ایک مجلس ہی بنائی جائے جس کا مقصد ہی یہ ہو کہ اس قسم کی بے ادبیوں کی راہ ہمیشہ کے لئے مسدود کردی جائے غالباً مجلس تحفظ اسلام کے نام سے یہ مجلس موسوم ہوئی''۔[1]

کلکتہ کے اکابر تجار اور مسلمان اساطین نے ایک خط دارالعلوم پہنچایا کہ دارالعلوم سے علماء اور ذمہ دار حضرات کلکتہ تشریف لائیں چنانچہ دارالعلوم سے حافظ محمد احمد صاحبؒ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور چند دیگر علماء کے ساتھ مولانا گیلانیؒ پر مشتمل ایک وفد مقررہ تاریخ پر کلکتہ کے لئے روانہ ہوا ابھی وفد کلکتہ نہیں پہنچا تھا کہ راستے میں ہی حافظ محمد احمدؒ صاحب کے نام خط موصول ہوا کہ آپ سب لوگ کلکتہ نہ جائیں۔ کلکتہ کے حالات حد سے زیادہ خراب ہیں چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام لوگ راستے میں ہی اتر جائیں البتہ مولانا گیلانیؒ اکیلے کلکتہ روانہ ہوں اگر جلسے میں تقریر کی ضرورت ہو تو شرکت کریں ورنہ واپس آجائیں آخر مولانا اکیلے ہی کلکتہ پہنچے مسلمانوں کا جم غفیر دارالعلوم سے آنے والوں کا استقبال کرنے کے لئے موجود تھا لیکن کلکتہ اسٹیشن پر علماء دیو بند کو نہ پاکر شور وغوغا برپا ہوا مولانا گیلانی نے راہ میں موصول ہونے والے تار کی خبر دی سب متحیر تھے کہ کب، کس نے اور کس کے مشورہ سے تار دیا آخیر مولانا گیلانیؒ کو اس مکان میں پہنچایا گیا جہاں علماء دیو بند کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا یہاں حاجی عبدالصمد نامی ایک شخص مولانا سے ملے اور اطلاع دی کہ حالات کی نزاکت کے تحت وہ خط انہوں نے ہی دیا انہوں نے مولانا گیلانیؒ کو اپنا مہمان بنایا مسلمانوں اور حکومت میں حالات جب انتہائی سنگین ہوئے اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل اور زخمی کیا جانے لگا تو بہار کے بعض

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیو بند میں بیتے ہوئے دن، ص ۳۴۵

انگریزی خواں طلباء جوکلکتہ میں تعلیم پاتے تھے مولانا گیلانیؒ کو اپنے ساتھ لے گئے اور ایک گھر میں آپ کی حفاظت کی خاطر آپ کو بند کردیا حالات سے یہ طالبعلم مولانا کو مطلع کرتے رہے مولانا نے جب وعدہ کیا کہ شہر کے ہنگاموں سے دور رہیں گے تو انہوں نے مولانا کے لئے دیوبند جانے کا انتظام کردیا مولانا دیوبند ابھی پہنچنے نہ پائے تھے کہ راہ میں ہی اضحیٰ کی عید کا دن آپہنچا عید گزارنے کے لئے مولانا اپنے عزیز سید محی الدین حیدرآبادیؒ کے ہاں اتر گئے اورانہیں تمام حالات سے مطلع کیا اور بتایا کہ صرف عید کا دن سفر میں ہی نہ گزرے اس لئے حیدرآباد اتر گئے ہیں اس کے بعد مولانا دیوبند نہ جاسکے اورقدرت نے حیدرآباد میں ہی ان کے قیام کا فیصلہ کردیا تھا۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''ایک دن کی جگہ تیس سال سے زیادہ مدت اسی حیدرآباد میں مجھے گزارنی پڑی اور یہ تقدیر کا کرشمہ تھا کہ پانچ اور دس روپے کی تنخواہ سے جس کی معاشی زندگی شروع ہوئی وہی ہزار روپے ماہوار کی تنخواہ سے وظیفہ یاب ہوکر اب پھر اسی مستقر الی حین کی طرف واپس ہوگیا جہاں کی مٹی سے اس نے سر نکالا تھا دارالعلوم کے احاطہ سے حسی جدائی، اس منزل پر ختم ہوجاتی ہے۔[1]

قیام حیدرآباد

مولانا گیلانیؒ حیدرآباد میں کیوں رہے، کیسے رہے، دیوبند واپسی کیوں نہ ہوئی اس کی مختصر تفصیل صباح الدین عبدالرحمٰنؒ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''راستے میں عید اضحیٰ کا چاند دیکھ کر اتر پڑے، وہاں مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ملاقات ہوئی اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے والی تھی مولانا فراہیؒ نے ان کو یونیورسٹی میں درخواست دینے کا مشورہ دیا وہ دیوبند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن خود دیوبند والوں نے ان کو یہ رائے دی کہ دکن میں دیوبند کے ایک عالم کا قیام دینی حیثیت سے مفید ہوگا اس لئے انہوں نے درخواست دے دی ان کا تقرر ایک سال تک یونیورسٹی میں نہ ہوسکا اس دوران میں وہ مولانا فراہیؒ سے درس لیتے رہے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ صاحب اس زمانہ میں حیدرآباد کے صدر الصدور تھے اور وہاں کے دینی وعلمی سرگرمیوں کے مرکز تھے، مولانا فراہیؒ، مولانا گیلانیؒ کو ان کے پاس لے گئے اور یہ کہا، ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں، شیروانیؒ صاحب نے فرمایا: ''یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی'' مولانا گیلانی اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں: ''ان کے لطف وکرم کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ اس ملاقات کے بعد شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا رہا، امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کردیا''، حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں یہ بیمار ہوگئے، شروانی صاحب ان کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے اور وہاں علاج کرایا اس کے بعد وہ اپنے وطن گیلانی چلے گئے، یہاں آنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے تقرر کا خط ملا اور وہ ۱۹۲۰ء میں شعبہ دینیات میں استاذ مقرر ہوگئے اور ۱۹۴۹ء میں اس شعبہ کے صدر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، پانچ سو پنشن ملی''[2]

---

[1] مناظر احمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۱۴۶

[2] ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۵۷ء

مجلس شوریٰ کی رکنیت

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ارکان ملک کے صاحب فضل وکمال اشخاص ہوا کرتے تھے اور اس شوریٰ کی رکنیت کو ملک کے دیندار طبقہ میں بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا مولانا گیلانیؒ کو بھی اس مجلس شوریٰ کے رکن بننے کا اعزاز بخشا گیا۔

''۱۸ شوال ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۳۰ء کو جب کچھ جگہیں خالی ہوئیں تو مولانا حبیب الرحمٰن شروانیؒ، مولانا عبدالوہاب دربھنگویؒ کے ساتھ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کو بھی مجلس شوریٰ کا باضابطہ رکن منتخب کیا گیا۔[۱]

مجلس شوریٰ سے علیحدگی

مولانا گیلانی قریباً بیس سال اس مجلس شوریٰ کے رکن رہے اور اپنے گرانقدر اور مفید مشوروں سے دارالعلوم کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہے ۱۳۶۷ھ میں مولانا کی رکنیت اس شوریٰ سے ختم ہوئی مجلس شوری سے علیحدگی کی وجہ کے متعلق مولانا کا بیان ہے کہ:

''جب میں نے محسوس کیا شوریٰ میں چند مخصوص حضرات کی رائے پر ہی فیصلہ ہونے لگا ہے دوسروں کے مشوروں کی اہمیت ختم ہوگئی ہے تو سوچا کہ آنے جانے کا کوئی فائدہ نہیں، کام چلنا چاہیے چل رہا ہے لہٰذا میں نے آنا جانا بند کردیا۔[۲]

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں مولانا گیلانی کی خدمات

مولانا گیلانی ۱۹۲۰ء میں جامعہ عثمانیہ میں ''دینیات لازم'' کے لکچرر کی حیثیت سے مقرر ہوئے پھر عرصہ بعد شعبہ دینیات میں منتقل کئے گئے پھر ریڈر رہے، اور پروفیسر ہوئے اور آخر میں اس شعبہ کی صدارت کے عہدے پر فائز ہوئے مولانا گیلانی نے جامعہ عثمانیہ میں گرانقدر علمی و دینی خدمات انجام دیں۔

جامعہ عثمانیہ میں اساتذہ کے تقرر اور گریڈ کے سلسلے میں شعبہ دینیات اور اس کے اساتذہ کرام کو دیگر شعبوں کے مساوی حیثیت دلانے میں مولانا گیلانی نے دشواریوں کے باوجود کامیابی حاصل کی جامعہ عثمانیہ میں مولانا گیلانیؒ کی کیا حیثیت تھی اس کے متعلق مولانا ظفیر الدین لکھتے ہیں:

''حیدرآباد میں جو اہل علم کی دو اہم مجلسیں تھیں ایک فضیلت جنگ حضرت مولانا انوار اللہ خاں صاحب دارالمہام کی اور دوسری یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد پیش کار وزیر اعظم کی، دونوں میں وہاں کے علماء کے سامنے مولانا کی تقریریں یونیورسٹی کے قیام سے دوسال پہلے ہوچکی تھیں پھر دیوبند میں ڈیڑھ سال رہ کر القاسم اور الرشید میں مولانا کے قلم سے علمی اور تاریخی مقالات کافی تعداد میں شائع ہوچکے تھے تقریر اور تدریس کی بھی مشق ہوچکی تھی اور عوام وخواص میں کافی مقبول تھے اس لئے عثمانیہ یونیورسٹی میں کسی استاذ سے کسی اعتبار

---

۱. مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۱۵۶

۲. ایضاً

سے اپنے فن میں نیچے نہیں تھے اور نہ نیچے سمجھے جاتے تھے بحیثیت استاذ جب لکچر دینے لگتے تو طلبہ کی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی، حتیٰ کہ ہندو طلبہ بھی کھنچ کر آجاتے تھے، مولانا کا لکچر علم وفن اور اثر کے اعتبار سے ممتاز ہوا کرتا تھا اور جامعہ کے ہونہار طلبہ لکچر سننے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے''۔[۱]

مولانا گیلانی نے یونیورسٹی کے طلباء میں ذہنی وفکری بیداری کے لئے جو مساعی کیں ان کا مقصد طلباء کو یہ باور کرانا تھا کہ علم کا اصل مقصد ذہنی غلامی سے آزادی حاصل کرنا ہے اور اس میں کوتاہی جرم ہے اور حصول تعلیم کے قیمتی اوقات کا ضائع کرنا کسی طرح جائز نہیں مولانا کی ان بے لوث مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء کو آپ سے انس پیدا ہو گیا اور انہوں نے اپنی تمام تر توجہ طلب علم پر لگا دی۔

مولانا گیلانی نے ایسے دور میں جامعہ عثمانیہ کے طلباء کی ذہنی وفکری اصلاح کی جب انگریزی حکومت اور اس کا نظام تعلیم مسلمان نوجوانوں کو مذہب سے بیزار بنانے کے درپے تھا مولانا نے اپنے باطنی اخلاص اور وہبی وکسبی علم کے ذریعے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں مذہب سے رغبت پیدا کی آپ نے مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں میں دینداروں کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جو آپ کی زندگی میں اور آپ کے بعد بھی دین وملت کی خدمت انجام دیتے رہے اور اس کے خاطر خواہ فوائد حاصل ہوتے رہے ہیں۔

مولانا سید احمد اکبرآبادی مولانا گیلانیؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''یوں تو مولانا کیا نہیں تھے ایک نامور محقق اور مبصر اسلامیات، بلند پایہ مصنف، شعلہ بیاں خطیب، صاحب وجد وحال صوفی، سب کچھ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ جس میں ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فیضان تعلیم وتربیت سے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک دو نہیں کثرت سے ایسے افراد پیدا کردیے جو مغربی علوم وفنون کی اعلیٰ اسناد رکھنے کے باوجود آج اسلامی علوم وفنون کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اور جن کی اسلامی تحقیقات کی گونج یورپ اور امریکہ تک کے علمی حلقوں میں ہے، جو کام خالص علماء کے کرنے کا تھا وہ یہ حضرات کررہے ہیں اور اس خوبی وعمدگی سے کررہے ہیں کہ خود علماء کے طبقے میں اس کی مثالیں کم ملیں گی پھر ان کی زندگیاں بھی اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں''۔[۲]

مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا گیلانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''شاگردوں کا ذکر آگیا تو یہ بھی سن رکھنے اور خوش ہونے کی بات ہے کہ مولانا اپنے ایک نہیں متعدد شاگردوں میں دینی وعلمی ذوق کی روح پوری طرح پھونک گئے ہیں اور لوگوں نے جو اہم دینی خدمات علمی رنگ میں کی ہیں ان کے اجر کے بھی بڑے حقدار خود مولانا ہی ہیں۔''[۳]

۱۔ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۱۶۳

۲۔ ایضاً ص ۱۸۰

۳۔ دریابادی، عبدالماجد، مولانا، وفیات ماجدی، حکیم عبدالقوی دریابادی (مرتب)، مجلس نشریات اسلام، س۔ن، ص ۷۷

مختصر یہ کہ مولانا گیلانی نے جامعہ عثمانیہ میں طلباء کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں ایک اہم خدمت یہ انجام دی کہ اپنے بعد اپنے شاگردوں کی ایسی جماعت چھوڑی جو دین حق کی محافظ اور اشاعت کرنے والی اور آپ کے علمی جذبات کو آئندہ نسل تک پہنچانے والی ہے اور ایک استاد کے لئے یہ بڑا اعزاز ہے۔

ریٹائرمنٹ

مارچ ۱۹۴۹ء میں مولانا گیلانیؒ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ریٹائر ہوئے سید سلیمان ندوی کے نام خط میں مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''آخر وہ گھڑی آہی گئی جس کا تیس سال پہلے انتظار شروع ہوا تھا درمیان میں سبکدوشی یا گلوخلاصی کی کوشش بھی کی گئی لیکن مصلحت الٰہی نے کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا ۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء بعد ظہر جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کی صدارت کا جائزہ دے دیا دو دن بعد اسی گاؤں کی طرف واپسی کا ارادہ ہے جس سے تقریباً نصف صدی پہلے روانہ ہوا تھا''[1]

ریٹائرمنٹ کے بعد مولانا حیدرآباد سے اپنے وطن گیلانی ضلع پٹنہ تشریف لے گئے اور تادم وفات گیلانی ہی میں مقیم رہے۔

گیلانی میں مستقل قیام

ریٹائرمنٹ کے بعد مولانا مستقل طور پر گیلانی میں قیام پذیر ہوگئے اور گھر کی بیٹھک میں اپنے لکھنے پڑھنے کا سارا سامان فراہم کر لیا زیادہ تر وقت بیٹھک میں ہی علمی سرگرمیوں میں مصروف رہتے عشاء کی نماز باجماعت پڑھ کر اندر گھر میں تشریف لے جاتے ورنہ اکثر تنہائی میں لکھنے پڑھنے میں منہمک رہتے۔

اگر کوئی اہل علم ملنے پہنچ جاتا تو اس کے ساتھ علمی گفتگو میں مشغول رہتے اس قیام کے دوران مختلف علمی رسائل کے لئے بے شمار مضامین ومقالات تحریر فرمائے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے اسی زمانہ میں مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب کے اصرار پر سوانح قاسمی تالیف فرمائی جو تین جلدوں میں کئی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا ظفیر الدین مفتاحی کے نام ایک مکتوب میں مولانا لکھتے ہیں:

''دعا فرمائیے کہ یہ آخری کام (سوانح قاسمی) کا اس بندہ ضعیف جہول وظلوم سے بن آئے اور اسی کو لے کر مغفرت کی سند کے ساتھ اصل وطن کی طرف واپسی بخیر وعافیت میسر آئے زیادہ خیال اب اپنے اسی مرجع کا ہے جہاں سے کچھ دنوں پہلے خاک دان ارض پر پٹکا یا گیا تھا''[2]

---

[1] مکتوب ۱۳ اپریل ۱۹۴۹ء، شائع شدہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۶۳ء

[2] مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۲۹۷

تدوین حدیث کی تکمیل بھی اسی زمانے میں کی اور مقالات احسانی کے کئی مقالات اسی زمانے میں لکھے اس کے علاوہ دوست احباب کے خطوط کے جوابات لکھنا اور ان خطوط کے ذریعے ان کی علمی ودینی رہنمائی کرنا بھی مولانا کے اس زمانہ قیام کے مشاغل میں سے تھا نیز بیماری کے باوجود جی بہلانے کی خاطر نئی کتابیں پڑھتے اور اصلاح وتصحیح کی غرض سے ان کے متعلق اپنی رائے بھی لکھ دیا کرتے تھے۔

بیماری

اخیر سالوں میں مولانا مختلف بیماریوں میں مبتلا رہے جس کی وجہ سے صحت دن بدن گرتی ہی رہی ظفیر الدین مفتاحی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یکے بعد دیگرے صحت پر مختلف قسم کے حملے ہوتے رہے، کبھی سینے کا درد کبھی معدے کی خرابی، تا آنکہ اب ادھر پندرہ بیس دنوں سے تنفس کا بھی قدیم مرض۔ جس کے متعلق خیال تھا کہ ختم ہو چکا، اچانک حملہ ہو گیا۔''[۱]

نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا کے قلب پر جو حملہ ہوا تھا اس نے مستقل مرض کی شکل اختیار کر لی مارچ ۱۹۵۴ء میں ان پر اس کا ایسا سخت حملہ ہوا کہ امید زیست جاتی رہی لیکن ان کے جان نثار بھائی مکارم احسن نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا ان کو گیلانی سے پٹنہ ہسپتال لے آئے اور معالجہ میں روپے پانی کی طرح بہائے۔[۲]

وفات

۵ جون ۱۹۵۶ء بمطابق ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ بوقت سات بجے صبح داعی اجل کو لبیک کہا اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے بعد نماز ظہر نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں آس پاس کے تمام مسلمانوں نے شرکت کی۔[۳]

مولانا گیلانیؒ کے منجھلے بھائی مکارم احسن آپ کے متعلق بیان کرتے ہیں:

''بھائی صاحب مرحوم ادھر کئی دن سے بہت اچھے تھے گذشتہ رات اور بھی زیادہ خوش تھے رات کے گیارہ بجے تک قوالی کی دھن میں کچھ غزلیں پڑھوا کر سنتے اور ہر شخص سے لطف ومحبت کی باتیں کرتے رہے بارہ بجے ان کو آرام کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ان کو دیر تک نیند نہیں آئی مگر پھر سو گئے، صبح سویرے اٹھے وضو کیا کھڑے ہو کر فجر کی نماز ادا کی وظیفہ پڑھا، پھر پلنگ پر آ کر لیٹ گئے ملازم سے کہا رات نیند کم آئی تھی اس لئے چادر اڑھا دو، سوؤں گا، سوئے تو ابدی نیند سو گئے اور جب ہم لوگوں نے سانس رکتے ہوئے دیکھا تو ان کا چہرہ جوانوں کی طرح شگفتہ اور شاداب تھا''[۴]

---

۱ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۲۹۸

۲ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ اپریل ۱۹۵۷ء

۳ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۳۰۲

۴ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۵۷ء

مولانا گیلانی کے شاگرد غلام محمدؒ صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت گیلانی کی حسی کرامات زندگی میں خواہ نہ دیکھی گئی ہوں مگر اس عالم ناسوت سے جاتے ہوئے انہوں نے عقلیت کے ماروں اور روحانیت کے بے خبروں کے لئے عجیب کرشمہ دکھایا مکارم احسن (مولانا کے چھوٹے بھائی) کا بیان ہے کہ مرض الموت میں اکثر یہ فرماتے تھے کہ جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائیگا ہر شخص جوان ہوکر جائے گا، چنانچہ جیسے جیسے وہ اپنے وقت موعود سے قریب ہوتے جارہے تھے ان میں جوش ومسرت بڑھتا جارہا تھا یہاں تک کہ جس رات سفر آخرت طے تھا اس میں تو فرط انبساط سے بے قابو ہوتے جارہے تھے اور اسی عالم فرحت میں بظاہر سو بھی گئے جب صبح ان کی روح پرواز کرچکی تھی تو چہرہ پر گوشت تروتازہ تھا سفید داڑھی بالکل سیاہ تھی اور لاغر ونزار جسم بالکل گداز تھا اس منظر کو مکارم احسن صاحب ہی نے نہیں دیکھا بلکہ ہر شریک جنازہ نے حیرت کی آنکھ سے دیکھا اور اس میں لذت روحانی محسوس کی، مولانا کے جنتی ہونے کی اس سے زیادہ نشانی اور کیا ہوسکتی ہے''۔

مرگ مجنوں پر عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے[1]

اولاد

مولانا کی شادی تعلیم سے فراغت کے بعد داروغہ نظیر کی صاحب زادی سے ہوئی تھی ایک بیٹا اور ایک بیٹی اپنے پیچھے یادگار چھوڑی صاحب زادے کا نام سید محی الدینؒ تھا آزادی کے بعد پاکستان گئے تھے پنجاب کی صوبائی انتظامیہ سے متعلق اور گوجرانوالہ میں کمشنر تھے ۱۹۷۰ء میں گوجرانوالہ ہی میں انتقال ہوا لاہور میں آسودہ خواب ابدی ہیں بیٹی ان کے منجھلے بھائی مکارم احسن کے صاحب زادے سے بیاہی گئی تھیں وہ ہندوستان میں رہیں۔[2]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات احسانی، مکتبہ اسعدیہ کراچی، اگست ۲۰۱۱ء، ص ۱۳

[2] گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۳۷۴، ۳۷۵

فصل دوم

اخلاق وسیرت

فصل دوم:

اخلاق وسیرت

۱) بے نفسی

مولانا کے فضائل اخلاق میں بے نفسی کو خاص امتیاز حاصل تھا دوسرے کی غلطی پر خود معافی خواہ ہو جاتے کوئی کھنچنا چاہے تو خود بڑھ کر اس سے قریب ہو جاتے اگر دوستوں میں کسی کے متعلق معلوم ہوتا کہ اس کو آپ کی وجہ سے تکلیف ہوئی ہے تو اس کی شکایت سے پہلے خود معافی طلب کرتے اور اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک وہ راضی نہ ہو جاتا۔

مولانا عبدالباری ندویؒ جنھیں طویل عرصہ تک مولانا گیلانیؒ کی معیت کا شرف حاصل رہا مولانا گیلانی کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ کسی معاملے میں خود راقم نالائق کو شاید کچھ زیادہ ناخوش محسوس فرما کر تو غضب ہی کر دیا دھڑ سے پیروں پر گر پڑے گھبرا کر ان کے سر کو اٹھا کر سینہ سے لگالیا اور دونوں لپٹ کر خوب روئے۔''[۱]

۲) خوش طبعی

مولانا اپنے تمام علمی انہماک اور خشیت باطنی کے باوجود خوش طبع انسان تھے، خود بھی ہشاش بشاش رہتے اور دوسروں کو بھی ایسا ہی دیکھنا پسند کرتے تھے مزاج میں ظرافت بھی تھی اور خوش طبعی بھی جو موقع موقع سے ابھر کر سامنے آتی رہتی تھی۔ مولانا عبدالباری ندویؒ مولانا گیلانیؒ کی ظرافت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''مولانا کی زندگی کا ایک اور گوشہ خوش طبعی اور مزاح پسندی کا تھا جو کبھی مزاح کی حدود سے بہت آگے بڑھ جاتی بلکہ اگر کوئی اس ڈھب کا بزاخفش ہاتھ لگ جاتا تو اس کو کھلا پلا کر مستقلاً تفریح طبع کا مشق بنائے رکھتے حیدر آباد کے اخیر زمانے میں بزاخفش کا یہ منصب سالہا سال تک خود اپنی مسجد الحی کے امام کو عطا رہا''۔[۲]

۳) مہمان نوازی

مولانا گیلانیؒ میں دیگر بے شمار قابل ستائش صفات کے ساتھ مہمان نوازی کا وصف بھی بدرجہ اتم موجود تھا مولانا ظفیر الدین مولانا گیلانیؒ کی اس صفت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''مہمان نوازی اور دل دہی بھی مولانا کا وصف خاص تھا مولانا کی اخیر زندگی میں ان کے دولت کدہ پر خاکسار بارہا حاضر ہوا اور علمی استفادہ کیا میں نے برابر دیکھا کہ مولانا اجنبی سے اجنبی اہل علم سے کشادہ جبینی سے ملا کرتے تھے اور مہمان نوازی کر کے خوش ہوا کرتے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں ایسے مل جاتے اور بے تکلف ہو جاتے کہ معلوم ہوتا بہت پرانی جان پہچان ہے''۔[۳]

۱۔ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۲۷۷

۲۔ ایضاً، ص ۲۹۰

۳۔ ایضاً، ص ۲۸۳

۴) طلباء پر شفقت

مولانا گیلانیؒ پر قدرت کی ایک خاص عنایت یہ بھی ہوئی کہ وقت کے بہترین اساتذہ کی شاگردی آپ کو نصیب ہوئی مولانا برکات احمدؒ، حضرت شیخ الہندؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہم جیسی مثالی شخصیات سے آپ نے کسب فیض کیا ان اساتذہ کی تعلیم وتربیت اور شفقت کا یہ اثر ہوا کہ مولانا گیلانی میں ایک شفیق اور مہربان استاد کی تمام خوبیاں پیدا ہوگئیں مولانا گیلانیؒ کے شاگرد بیان فرماتے ہیں کہ:

''طلباء پر مولانا کی شفقت عہد قدیم کے استاذہ کے لطف وکرم کی ایک زندہ یادگار تھی ان کی شفقت افادہ علم ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اپنے شاگردوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ جامعہ کے اندر اور باہر ہمیشہ پوری قوت صرف فرماتے رہے بلکہ بعض صورتوں میں ان کے نجی معاملات مثلاً شادی بیاہ میں بھی مولانا کے پدرانہ الطاف برابر شامل رہے تھے''۔[۱]

۵) امت محمدیہ کی محبت

مولانا گیلانیؒ خدا کے نیک بندے اور سچے عاشق رسول ﷺ تھے رسول پاک ﷺ سے والہانہ محبت کا یہ اثر تھا کہ مولانا کے قلب میں امت محمدیہ کے لئے خاص درد موجزن تھا امت محمدیہ کی فلاح وکامرانی مولانا کو کس قدر عزیز تھی اس کے متعلق مولانا کے شاگرد غلام محمد لکھتے ہیں:

''مولانا کے قلب اطہر میں امت محمدیہ کی محبت اور اس پر شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتھا وہ مسلمانوں کی فلاح سے ایسے مسرور ہوتے تھے، جیسے خود ان کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچ گیا وہ مشرباً پکے حنفی تھے مگر یہ ان کے جذبہ شفقت کا اثر تھا کہ زبانی بھی اور تحریراً بھی اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ موجودہ حالات میں علمائے کرام کو عام مسلمانوں کے لئے سہولت ہی کا پہلو اختیار کرنا چاہیے خواہ اس میں مسلک حنفیہ کو چھوڑ کر کسی اور مسلک کی اقتداء کیوں نہ کرنی پڑے کیوں کہ فقہاء کے اجتہادات کو بہر حال منصوصات کا درجہ حاصل نہیں ہے''۔[۲]

۶) چھوٹوں کی حوصلہ افزائی

مولانا گیلانی کی شخصیت کا ایک اہم وصف یہ بھی تھا کہ دوسروں کی مثبت اور مفید باتوں کو دل کھول کر قبول کرتے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی فرماتے اور یوں ان کی صلاحیتوں کو مزید ابھارتے مولانا کی اس خوبی کے متعلق مولانا ظفیر الدین لکھتے ہیں۔

''اپنے ہونہار چھوٹوں کی کھل کر حوصلہ افزائی کرتے کوئی علمی مشورہ کے لئے خط لکھتا تو ایسی حوصلہ افزائی کرتے کہ وہ کبھی کبھی دھوکہ میں مبتلا ہو جاتا ورنہ عام طور پر اس کا شعور تو بہر حال بیدار ہو ہی جاتا اور وہ اپنے کو علمی طور پر بنانے سنوارنے میں لگ جاتا اور بسا اوقات وہ زندگی کے علمی میدان میں مولانا کی رہبری سے کامیابی وکامرانی کی دولت سے مالا مال بھی ہو جاتا تھا''۔[۳]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات احسانی، ص ۱۹

۲ ایضاً

۳ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۲۷۵

۷) علماء کا احترام

متقدمین ومتاخرین علماء اور آئمہ اسلام کے مرتبہ شناس اور قدرداں تھے عام طور سے ان میں باہم موازنہ کی بیماری سے پاک تھے اپنے دور کے اہل علم اور علماء مشائخ کے ساتھ بھی حسن ادب کا معاملہ رکھتے تھے اپنے معاصرین کی جی بھر کر مدح وستائش کیا کرتے تھے ان کے فضائل ومناقب کا تذکرہ زبان پر عموماً ہوتا، طبعاً ملن سار اور مرنجان مرنج تھے[۱] مولانا کے شاگرد غلام محمد لکھتے ہیں۔

''اپنے معاصرین کی قدر کرنا اور ان کے کمال کا اعتراف کرنا وہ وصف عالی ہے جو ہر زمانہ میں نادر رہا ہے، مگر مولانا میں یہ نادر وصف بدرجہ اتم موجود تھا''۔[۲]

۸) دوسروں کی مالی امداد

مولانا گیلانی کی ایک عمدہ عادت یہ تھی کہ ضرورت مند جب کچھ مانگتا تو حتی الوسع اسے مایوس نہیں کرتے جو کچھ ہوتا ضرور دیتے لیکن دینے کے بعد جو واپس نہیں کرتا اس سے منہ کھول کر طلب بھی نہیں کرتے کہ تم نے اتنی رقم لی تھی اب تک واپس نہیں کی حد یہ ہے کہ جب خود اپنے پاس رقم نہیں ہوتی اور ضرورت مند کہتا کہ فلاں سے لے کر دے دیجئے تو مولانا ایسا بھی کرتے کہ خود قرض لے کر دوسروں کو قرض کے نام پر دیتے اور لینے والے سے طلب کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے۔[۳] مولانا کے شاگرد لکھتے ہیں:

''مولانا کی تنخواہ معقول تھی آخر زمانے میں ہزار بارہ سو تک پہنچ گئی تھی لیکن اس کا خاصہ حصہ اعزاء واقربا کی امداد اور عام دینی امور کی معاونت میں صرف فرماتے خود اپنی ذات کے لئے سادگی ہی پسند فرمائی تھی ایک عاشق نبوی کا طرز اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے''؟[۴]

۹) ہردلعزیزی

رب تعالیٰ نے مولانا گیلانی کو ایسے کمالات سے نوازا تھا جن کی بدولت آپ ہردلعزیز تھے اساتذہ، تلامذہ، دوست احباب، پڑوسی، رشتہ دار سب آپ کے گرویدہ تھے ابوسلمان شاہ جہاں منصور پوری لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا گیلانی میں اللہ تعالیٰ نے سیرت کے بہت سے محاسن اور اخلاقی کمالات کو جمع فرمادیا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے اقران وامثال کی ایک محبوب ہستی بن گئے تھے''۔[۵]

۱۰) صاف دلی

مولانا گیلانی نیک طینت شخص تھے ہمیشہ دوسروں کی بھلائی چاہتے دوسروں کی ترقی وکامیابی کو دیکھ کر خوش ہوتے دل میں کبھی کسی کے لئے حسد اور بغض کے جذبات پیدا نہ ہوئے مولانا گیلانیؒ کی صاف دلی کے متعلق عبدالباری ندویؒ لکھتے ہیں:

---

۱ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۲۷۵

۲ گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات احسانی، ص ۱۸

۳ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۲۸۹

۴ گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات احسانی، ص ۱۹

۵ شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا مناظر احسن گیلانی شخصیت وسوانح، مکتبہ رشیدیہ کراچی، اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۳۸۵

''ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ شہادت ادا کر رہا ہوں کہ مولانا مرحوم میں جو بھی کمزوریاں رہی ہوں اور معصوم کون بشر ہوتا ہے لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے کہنا چاہیے کہ اس کی تمام بیماریوں سے ان کو پاک ہی پاک پایا، بغض وحسد، انتقام وعداوت، ریا ونفاق، نمود ونمائش، حرص وہوس، طول امل وغیرہ کے نفسانی جذبات کا کوئی داغ دھبہ یاد پر زور ڈالنے سے بھی ان کے آئینۂ دل پر پڑتا خصوصاً ٹھہرتا قطعاً یاد نہیں پڑتا''۔[1]

۱۱) نرم خوئی

مولانا غلظت وشدت سے کوسوں دور تھے اس کے برعکس مزاج میں رفق وملاطفت تھی محبت وہمدردی مزاج کا خاصہ تھی، درشتی وتندخوئی کا شائبہ تک نہ تھا مولانا ظفیر الدین مولانا گیلانیؒ کی اس خصوصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''طبیعت میں غلظت وشدت قطعاً نہیں تھی ہر ایک آنے والے کی باتیں سنتے اور ہر ایک کا کام کرنا اپنی وسعت بھر اپنا اخلاقی فریضہ جانتے جبہ ودستار والے بھی مولانا کے پاس آتے اور ایسے سوٹ بوٹ والے بھی جن کے چہروں پر داڑھی تک نہیں ہوتی کرتے پائجامہ والے بھی خدمت میں حاضری دیتے اور کوٹ وپتلون والے بھی، مولانا کے یہاں کسی کو حقیر جاننے کا سوال ہی نہیں تھا سبھوں کے ساتھ محبت بلکہ محبت کا سلوک فرماتے تھے''۔[2]

۱۲) ظاہری شکل وصورت پر حکم نہیں لگاتے

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مولانا گیلانیؒ کی مذکورہ خصوصیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کے مشاہدہ وتجربہ نے ان کو اس نتیجہ پر پہنچا دیا تھا کہ صرف ظاہری شکل وصورت پر کسی شخص کے قبح باطن یا اس کے بے دین ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے''۔[3]

اسی خصوصیت کی مزید وضاحت کے متعلق مولانا علی میاںؒ مولانا گیلانیؒ کے ایک مکتوب کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

''قالب وقلب میں اختلاف کی یہ صورت جب پیش آجاتی ہے تو قلب ہی پر زیادہ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے میرے خیال میں تو قالب وقلب یا ظاہر وباطن کے اختلاف کی یہ شکل اسلامی تاریخ میں نئی نہیں ہے آغاز تو عہد صحابہ ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ ہو چکا تھا عمامہ پر عقاب لگا کر مدینہ میں داخل ہونے کا واقعہ کیا آج کا ہے''۔[4]

۱۳) سادگی

مولانا گیلانیؒ سادگی پسند انسان تھے سادگی سے مراد یہ ہرگز نہیں تھی کہ خستہ حالی کی زندگی بسر کی بلکہ فخر وغرور کبھی نہیں کیا آپ بارعب وجیہ وشکیل پروفیسر اور عالم تھے لیکن ہمیشہ منکسر المزاج ہی رہے۔ مولانا ندویؒ لکھتے ہیں:

---

[1] شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا مناظر احسن گیلانی شخصیت وسوانح، ص ۳۸۸

[2] مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۲۷۶

[3] ندوی، ابوالحسن علی، مولانا، پرانے چراغ (حصہ اول)، مجلس نشریات اسلام، س۔ن، ص ۸۸

[4] ایضاً، ص ۸۹

''یاد رہے کہ دینی جاہ وجلال اور مال میں ان کا سر اللہ تعالیٰ نے اونچے اونچے ہمسروں سے نیچا نہیں رکھا تھا لیکن نمونہ دنیا کی زندگی میں اللھم احینا مسکینا و امتنا مسلما کا ہی بنے رہے۔ طالبعلمی سے جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کی صدارت تک اس مسکنت میں ذرہ برابر فرق کسی دیکھنے والے نے نہ دیکھا ہوگا بنگلہ میں رہ کر اور موٹر میں چل کر بھی وہ دیوبند کے حجرہ میں رہنے والے اور اس کی گلیوں میں چلنے والے مسکین طالبعلم ہی معلوم ہوتے رہے'' ۱؎

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مولانا گیلانیؒ کی سادگی کا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''مولانا دارالمصنفین اعظم گڑھ کی مجلس انتظامیہ کے رکن تو عرصہ سے تھے پنشن پانے کے بعد مجلس عاملہ کے بھی رکن بنائے گئے مارچ ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا ایک اہم جلسہ تھا اس میں شرکت کے لئے وہ گیلانی سے اعظم گڑھ تشریف لائے، میری مسرت کی انتہا نہ رہی، جب انھوں نے میری قیام گاہ میں قیام فرمایا اس جلسہ میں مولانا کے علاوہ ڈاکٹر سید محمودؒ، مولانا دریا آبادیؒ اور مولانا عمرانؒ بھی تشریف لائے تھے جب ہم لوگ ان حضرات کی پیشوائی کے لئے اسٹیشن گئے تو مولانا کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے ان کے ساتھ صرف ایک دری، ایک چادر، ایک تکیہ، المونیم کا ایک لوٹا اور ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے ایک دو جوڑے تھے'' ۲؎

۱۴) شیریں گفتاری وخندہ پیشانی

گفتگو میں شیرینی اور مزاج میں خندہ پیشانی مولانا گیلانی کی شخصیت کا خاص وصف تھا مولانا علی میاںؒ لکھتے ہیں:

''ایک ان کی شیریں گفتاری، شگفتہ بیانی، دوسرے ان کی نورانی صورت، خندہ پیشانی، ان دونوں صفتوں نے مل کر ان کی شخصیت میں عجب دلآویزی اور دل کشی پیدا کر دی تھی، اور کسی طرح ان کی موجودگی یا گفتگو طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی قدیم مشرقی سوانح نگار اور ادیب اسی کو ''سبک روحی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی مقابل صفت کو ''گراں جانی'' کہتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس لطافت سے خوب نوازا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنے حلقۂ احباب میں بڑے محبوب اور اپنے حلقۂ تلامذہ ومستفیدین میں بڑے مقبول تھے اور جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا وہ یہ کہتا ہوا اٹھتا

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی'' ۳؎

۱۵) خطابت

مولانا گیلانیؒ کو سلطان القلم اور رئیس التحریر کہا جاتا ہے تحریر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقریر کا ملکہ بھی بدرجہ اتم عطا

۱؎ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۲۸۸
۲؎ معارف اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۵۷ء
۳؎ ندوی، ابوالحسن علی، پرانے چراغ (حصہ اول)، ص ۶۴

کیا تھا آپ جو بات کہتے دل سے کہتے اور چاہتے تھے کہ ان کی بات سامعین کے دلوں میں اتر جائے آپ کی تقریر پرسوز بھی ہوتی تھی اور جاں گداز بھی۔

مولانا کے شاگرد غلام محمد لکھتے ہیں:

''یوں تو مولانا کی تحریر میں بھی بڑا زور اور اثر ہے لیکن ان کی تقریر تو اس سے بھی کہیں زیادہ پرسوز و جاں گداز ہوتی تھی اور تقریر کا رنگ واعظانہ نہیں بلکہ خطیبانہ ہوتا تھا درمیان درمیان میں لطائف وظرائف اور منتخب اشعار اس موزونیت سے آجاتے تھے کہ عالمانہ تقریر عوام کے لئے بھی نہایت دلچسپ و دل نشین بن جاتی تھی حالاں کی نکتہ آفرینی اور علمی معلومات کا سیلاب تھا جو امنڈا چلا آتا تھا حقیقت یہ ہے کہ تقریر میں خود بے خود ہو جاتے تھے جس کے اثر سے سامعین پر بھی ایک کیف طاری ہو جاتا تھا''۔[۱]

۱۶) قرآن سے شغف

مولانا گیلانیؒ کو قرآن سے خاص شغف تھا اس کتاب مقدس میں غور وفکر کرتے اور منشاء خداوندی کو پالینے کی جدوجہد کرتے اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی تھے قرآن سے مناسبت کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ کا ذہن قرآن کے صحیح مفہوم ومطلب تک پہنچنے میں بڑی سرعت اختیار کرتا تھا اور ایسے معانی تک پہنچ جاتا جہاں تک عام علماء کے ذہن جلد نہیں پہنچ پاتے۔

آپ نے بچپن میں قرآن حفظ نہیں کیا تھا لیکن حیدرآباد کی زندگی میں آپ نے پورا قرآن پاک حفظ کر لیا تھا نماز میں جب آپ قرآن پڑھتے تو آپ پر ایک خاص کیف طاری ہوتا اور سننے والا اس کی تاثیر میں کھو جاتا۔

مولانا دریاآبادی، مولانا گیلانی کی قراءت نماز کے متعلق لکھتے ہیں:

''عشاء کا وقت آیا تو آواز بھی سریلی اور مترنم، دردو گداز لئے ہوئے سننے میں آئی قراءت شاید سورۃ الملک کے دوسرے رکوع کے نصف آخر کی تھی جوں ہی انھوں نے افمن یمشی مکبا علی وجھه سے شروع کی معلوم ہوا کہ کسی نے دل ہلا دیا ہے''۔[۲]

۱۷) ذہانت

مولانا کو قدرت نے نہایت اخاذ ذہن عطا فرمایا تھا آپ کے ذہن کی تیزی و دراکی کی تعریف کرتے ہوئے مولانا علی میاںؒ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا نکتہ رس اور نکتہ آفریں ذہن عطا فرمایا تھا قرآن مجید کی وہی آیات اور صحاح کی وہی احادیث اور تاریخ کے وہی بیانات جو ہم آپ بیسیوں بار پڑھ چکے مولانا ان سے ایسے حقائق ثابت کر دیتے اور ان سے ایسے عجیب لیکن صحیح نتائج نکال لیتے کہ حیرت ہوتی''۔[۳]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات احسانی، ص ۱۷

۲ دریاآبادی، عبدالماجد، مولانا، معاصرین، گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور، س۔ن، ص ۱۸۲

۳ ندوی، ابوالحسن علی، پرانے چراغ (حصہ اول)، ص ۶۶

فصل سوم

مولانا گیلانیؒ کے اساتذہ وتلامذہ

فصل سوم:

مولانا گیلانیؒ کے اساتذہ و تلامذہ

مولانا گیلانیؒ کو وقت کے نامی گرامی اور قابل ترین اساتذہ سے تحصیل علم کی سعادت حاصل ہوئی مولانا کے اساتذہ کرام کی مختصر تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱) حکیم ابونصرؒ

حکیم ابونصرؒ، مولانا گیلانیؒ کے عم محترم تھے انھوں نے مولانا کی تعلیم و تربیت اور پرورش و پرداخت پر خصوصی توجہ کی۔ ابونصر صاحب نے اپنے بھتیجے کی عربی اور دینی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لی۔ ابتدائی تعلیم قرآن، اردو، فارسی اور عربی صرف و نحو کی کتابوں کا بڑا حصہ مولانا نے اپنے چچا سے ہی پڑھا۔

۲) حکیم سید برکات احمدؒ

ابتدائی تعلیم کے بعد معقولات کی تعلیم کے لئے مولانا گیلانی کو ٹونک میں حکیم دائم علی صاحب کے فرزند ارجمند مولانا حکیم سید برکات احمدؒ کے پاس بھیجا گیا، حکیم دائم علیؒ مولانا گیلانیؒ کے دادا مولانا احسنؒ کے تلمیذ رشید تھے۔

ٹونک میں مولانا برکات احمد صاحب سے مولانا گیلانی نے ابتداء سے لے کر انتہا تک یعنی شرح اشارات تک معقولات کی تمام کتابیں بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھیں۔[۱]

بقول مولانا منطق کی کچھ کتابیں کو پڑھ چکا تھا لیکن مولانا برکات احمد صاحبؒ نے غیر معمولی شفقت اور توجہ کی وجہ سے اس فن کا ابتدائی رسالہ ایساغوجی ہی سے مجھے پڑھانا شروع کیا۔[۲]

مولانا برکات احمد کی درسگاہ کی اہمیت کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''علم حدیث کے سوا شدبد کی جو کیفیت بھی اپنے اندر پاتا ہوں وہ زیادہ تر اسی مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ ہے میری مراد سیدی الاستاذ حضرت مولانا برکات احمد ٹونکی نزیلاً و بہاری وطناً رحمۃ اللہ کی تعلیم گاہ سے ہے''۔[۳]

۳) مولانا محمد اشرفؒ

مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں مولانا گیلانیؒ کو مولانا محمد اشرفؒ سے بھی کسب فیض کی سعادت حاصل ہوئی محمد اشرف صاحب کو عربی ادب اور ریاضی سے خاصی مناسبت تھی مولانا گیلانیؒ اپنے استاذ مولانا محمد اشرفؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

''خاکسار نے مولانا مرحوم سے بہت فائدہ اٹھایا، عربی ادب کی نصابی کتابیں، حریری، متنبی، حماسہ، معلقہ، سب انہی (مولانا اشرفؒ) سے پڑھیں اور ریاضی، ہیئت اور ہندسہ کی کتابیں بھی انہی سے پوری کیں۔''[۴]

---

۱ مفتاحی، ظفیر الدین، محمد، حیات مولانا گیلانی، ص ۴۷

۲ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۶۹

۳ گیلانی، مناظر احسن، سید، مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ص ۳۵۶

۴ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۴۷

مولانا گیلانی یہ بھی لکھتے ہیں:

''ہدایہ اولین کا کچھ حصہ ٹونک میں اپنے پنجابی استاذ سمیہ (ملتان) کے رہنے والے مولانا محمد اشرف مرحوم سے خصوصی طور پر فقیر نے پڑھا تھا۔''[۱]

۴) مولانا انور شاہ کشمیریؒ

دارالعلوم دیوبند میں مولانا گیلانیؒ کا دورہ حدیث میں داخلے کا امتحان مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے لیا اور مولانا اس امتحان میں کامیابی سے سرفراز ہوئے صحیح مسلم شریف کا درس مولانا گیلانیؒ نے حضرت کشمیریؒ سے پڑھا مولانا گیلانیؒ کے قلب میں حضرت کشمیریؒ کے درس کی جو اہمیت تھی اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

''پہلے دن کے پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات یکا یک میرے سامنے آ گئے..... یہ پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا مبناتی نظام میرے لئے یقینی وقطعی ہو گیا اور جیسے جیسے تمیز وشعور میں سن کے لحاظ سے اضافہ ہوا بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا خاک سار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا مسلمانوں کے دینی اختلافات کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اس انوری تحقیق سے پیدا ہوا''[۲]

حضرت شاہ صاحبؒ کی درسی تقریر کی اہمیت کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''باتوں باتوں میں صرف حدیث ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے ایسے اہم کلیات ہاتھ ان کے درس میں آ جاتے تھے کہ اپنے ذاتی مطالعے سے شاید ساری عمر ان تک ہم جیسے نارساؤں کی رسائی آسان نہ تھی۔''[۳]

حضرت شاہ صاحبؒ نے مولانا گیلانیؒ کے ساتھ ہمیشہ محبت وشفقت کا سلوک روا رکھا اور اپنے ہونہار طالبعلم کی ہمیشہ قدر اور حوصلہ افزائی کی مولانا پر حضرت شاہ صاحبؒ کی جو عنایات ونوازشیں تھیں ان کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

''اُف زنگی کو اس کا آقا کافور ٹھہرا رہا تھا حال آں کہ زنگی پہلے بھی زنگی ہے اور بعد کو بھی زنگی اس وقت تک زنگی ہونے کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے سوچتا ہوں استاذ مرحوم کی قدر شناسیوں کا دھیان آتا ہے دل کہتا ہے

ع براین قول گر جاں بہ بازم رواست

علم معرفت کا احتساب ایک ذرے کو چمکا رہا تھا حال آں کہ ذرے کے پاس تھا بھی کیا؟ اور جو کچھ تھا سب آفتاب کا تھا''[۴]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص۱۱۴

۲ ایضاً، ص۱۳۱

۳ ایضاً، ص۱۳۸

۴ ایضاً، ص۱۸۲

۵) شیخ الہند محمود حسین عثمانی

دورہ حدیث کے سال میں بخاری اور ترمذی شریف کا درس مولانا گیلانی نے شیخ الہند حضرت محمود حسنؒ سے پڑھا۔

شیخ الہند استاذ الکل کی حیثیت رکھتے تھے درس گاہ میں مختصر اور جامع تقریر فرماتے تھے مگر عظمت کا حال یہ تھا کہ جس دن بخاری شریف کا پہلا سبق اس سال پڑھایا دارالعلوم کے تمام اساتذہ بھی طلبہ کے ساتھ شریک ہوئے خود مولانا کشمیریؒ بھی شریک درس ہوئے ان اساتذہ نے درس میں سوالات بھی کیے اور شیخ الہند نے ان کے جوابات بھی دیے[۱]

حضرت شیخ الہندؒ کے درس میں مولانا گیلانیؒ جب مختلف شکوک ووساوس میں مبتلا ہوئے تو شیخ الہندؒ کی تشفی وتسلی سے ان وساوس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا شیخ الہندؒ کی اس زندہ کرامت کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''گویا کہ کوئی کیل ٹھونک دی گئی کہ وہی دل جو لرزاں وتپاں رہتا تھا کچھ ایسا بیٹھ گیا کہ خواہ کچھ بھی گزرے وہ اپنی جگہ پر سے نہیں ہلتا اسی لئے سیدنا حضرت شیخ الہندؒ کی ایک زندہ کرامت خود اپنے آپ کو اپنے دل ودماغ کو اپنے ذہنی رجحانات ومیلانات کو سمجھتا ہوں میں کیا تھا اور کیا ہوگا؟''[۲]

حضرت شیخ الہندؒ کے درس کی کیفیت واہمیت کے بیان میں مولانا گیلانی رقمطراز ہیں۔

''جس وقت تراجم ابواب کی بحث شیخ الہندؒ کے حلقے میں چھڑ جاتی تھی تو حضرت والا پر بھی خاص حال طاری ہو جاتا تھا اور سننے والے بھی محو حیرت بن جاتے تھے وجد کی سی کیفیت میں معلوم ہوتا تھا کہ سارا مجمع ڈوب گیا کان علی روسھم الطیر کا منظر قایم ہو جاتا تھا خود وہ بھی کھل جاتے تھے اور سننے والے بھی کھلے جاتے تھے نئے معارف جدید حقایق جو نہ کبھی سنے گئے اور نہ پڑھے گئے معلوم ہوتا تھا ان سے پردے ہٹ رہے، ہیں دل کی گرہیں وا ہوتی چلی جاتی، ہیں اپنے تراجم میں امام کا قاعدہ ہے کہ قرآنی آیتوں کو بھی حسب ضرورت شریک کرتے چلے گئے اسی بہانے سے ان قرآنی آیتوں کے نئے پہلوؤں کے جاننے ہی کا موقع نہیں ملتا تھا بلکہ قرآن فہمی کی نئی راہیں بھی کھلتی تھیں''۔[۳]

مولانا گیلانیؒ پر حضرت شیخ الہند کی ایک اہم عنایت یہ تھی کہ آپ ہی کی ترغیب سے مولانا نے اپنی علمی زندگی کی ابتداء کی اور القاسم رسالے میں لکھنا شروع کیا اور پھر اس کے بعد مختلف رسائل میں مولانا گیلانیؒ کے بے شمار قابل قدر وقابل ستائش مقالات کا سلسلہ چل نکلا جو تادم حیات جاری رہا۔

مولانا گیلانیؒ کو اپنے استاذ مکرم حضرت شیخ الہندؒ سے بے حد عقیدت ومحبت تھی، بعد فراغت سب سے پہلے آپ نے شیخ الہندؒ کے دست مبارک پر بیعت کی اور آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔[۴]

---

[۱] ملتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص۸۳

[۲] دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص۲۰۷

[۳] ایضاً، ص۲۱۲

[۴] ملتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص۷۷

حضرت شیخ الہند کے ساتھ اپنی وابستگی وتعلق کو بیان کرتے ہوئے مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''سیدنا شیخ الہندؒ کے ساتھ تلمذ و بیعت کی سعادتیں اس کوتاہ بخت، سیاہ کار کے لئے جس حد تک سرمایہ افتخار و ناز ہوں کم ہیں، لیکن اسی کے ساتھ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ حضرت والا کے دامن دولت کی وابستگیوں کی طویل وعریض صف میں اس فقیر کا شمار کسی زمانے میں بھی نہ قبیل ہی میں نہ دبیر میں، نہ اگلوں میں وہ کبھی گنا گیا اور نہ پچھلوں میں علماً وعملاً اپنی ہیچ میرزی نے امتیاز کا موقع حاصل نہ ہونے دیا۔''[۱]

۶) مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

دورہ حدیث میں ابوداؤد شریف کا درس مولانا گیلانیؒ نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے پڑھنا شروع کیا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے متعلق مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''زندگی میں جن جن بزرگوں کے تلمذ کا شرف فقیر کو مختلف ادوار حیات میں حاصل ہوتا رہا ہے ان میں جہاں تک سوچتا ہوں شاید سب سے زیادہ میرے نوعمر استاد مولانا عثمانی قدس اللہ سرہ تھے جس زمانے میں ان کے حلقہ درس میں شریک ہوا مولانا کی عمر غالباً اس وقت تیس پینتیس (سال) کے درمیان تھی بہ مشکل مجھ سے آٹھ دس سال عمر میں وہ بڑے ہوں گے لیکن یہ خدا کی دین تھی کہ اس عمر میں وہ دار العلوم کے صف اول کے اساتذہ میں شریک ہو چکے تھے اور دورہ حدیث کی اہم ترین کتاب ''سنن ابی داؤد'' کا درس ان ہی سے متعلق تھا''[۲]

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا درس معرکۃ الآراء ہوتا تھا اور ان کا انداز بیاں بہت دلکش اور معلومات افزاء ہوتا تھا مولانا عثمانیؒ کے درس کے متعلق مولانا گیلانی اپنا تاثر یوں بیان کرتے ہیں:

''ان کے بولنے کا طرز حد سے زیادہ سنجیدہ، خطاب کا طریقہ غیر معمولی طور پر دل آویز تھا چند کلمات کے بعد محسوس ہونے لگتا کہ کچھ نئی باتیں کان میں پڑ رہی ہیں جو حضرت عثمانی سے پہلے میں نے نہ کسی سے سنی تھیں نہ کتاب یا مضمون میں ان کا سراغ لگا تھا درس کا یہ حصہ میرے لئے حد سے زیادہ دلچسپ اور لذیذ ثابت ہوا مولانا جس طریقے سے ان چیزوں کو ادا کرتے تھے ان میں بڑی حلاوت اور شیرینی تھی''[۳]

۷) مولانا سید اصغر حسینؒ

مولانا گیلانیؒ کے دورہ حدیث کے سال میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے کچھ وجوہات کی بنا پر تدریسی خدمت سے استعفیٰ دے دیا اور ابوداؤد شریف کا درس مولانا سید اصغر حسینؒ کے سپرد کیا گیا اور یوں ابوداؤد کا درس سید اصغر حسینؒ کے یہاں تکمیل کو پہنچا۔

میاں سید اصغر حسینؒ کے درس کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''سید صاحب یوں بھی خاموش آدمی تھے ان کی یہی فطری خاموشی درس کے حلقے میں بھی نمایاں رہتی لیکن اسی کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ مہر سکوت کے توڑنے کی جہاں جہاں واقعی ضرورت ہوتی طویل تقریر تو اس

---

[۱] گیلانی، مناظر احسن، سید، دار العلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۲۲۴

[۲] ایضاً، ص ۲۳۷

[۳] مظاہری، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۸۵، ۸۶

وقت بھی نہیں کرتے لیکن چند ہی فقروں میں جو کچھ بھی کہہ دیتے تھے اصل مسئلے کے لحاظ سے شاید ان ہی فقروں میں سب کچھ آجاتا تھا۔'' [۱]

۸) مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ

دار العلوم کے اساتذہ میں مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ سے مولانا گیلانیؒ نے موطا امام محمد اور موطا امام مالک کے اسباق پڑھے مفتی صاحب کے اسباق کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''موطا امام محمد و امام مالک کے درس کا تعلق مفتی صاحب سے تھا ملتے میں ایک دن بطور دورے کے ان کتابوں کا سبق ہوتا تھا یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان کے درس میں حاضری کی سعادت سے کلیتاً محروم رہا لیکن جس قسم کے فوایدان کے انفاس طیبہ سے حاصل ہو سکتے تھے عمر بھر اس کا افسوس ہی رہے گا کہ اس کی طرف توجہ کیوں نہ ہوئی'' [۲]

۹) مولانا غلام رسولؒ

دورہ حدیث کے سال میں مولانا غلام رسولؒ صاحب سے سنن ابن ماجہ کا درس مولانا گیلانیؒ نے پڑھا مولانا غلام رسولؒ کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب موصوف بڑے معقولی آدمی ہیں اسی شہرت کی وجہ سے ان کے اسباق میں بھی حاضری کے مواقع کم ہی میسر آتے تھے'' [۳]

۱۰) مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مولانا گیلانیؒ جس سال دار العلوم دیوبند میں دورہ حدیث میں داخل تھے اسی سال مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مدینہ منورہ سے دار العلوم دیوبند تشریف لائے تھے اور ان کی تشریف آوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مدرسہ والوں نے نسائی شریف کا درس ان کے سپرد کر دیا تھا اس طرح مولانا گیلانیؒ کو شیخ مدینہ سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہوا اس کے علاوہ شیخ مدینہ حسین احمد مدنیؒ شیخ الہند کے درس بخاری میں بھی بطور شاگرد شمولیت فرماتے تھے اس بنا پر مولانا گیلانیؒ کو ان سے درسی رفاقت کا شرف بھی حاصل رہا مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''بخاری کے سبق میں رفاقت کا اور نسائی میں تلمذ کا ان دوگونہ نسبتوں کا شرف حضرت مدنی کی ذات گرامی سے بحمد اللہ اس ذرہ ناچیز کو حاصل ہوا جن کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔'' [۴]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دار العلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۲۵۳

۲ ایضاً، ص ۲۵۲

۳ ایضاً

۴ ایضاً، ص ۲۲۰

۱۱) مولوی گل محمدؒ اور مولانا محمد حسنؒ

مولانا گیلانیؒ نے خارج از مدرسہ کچھ حضرات سے کسب فیض کیا ان میں دارالعلوم کے مطبخ کے داروغہ مولوی گل محمدؒ اور شیخ الہندؒ کے بھائی حکیم مولانا محمد حسنؒ تھے ان حضرات کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

''فقیر نے یہ بھی واقعہ ہے کہ دارالعلوم کے مطبخ کے سابق داروغہ مولوی گل محمد صاحب مرحوم منگلوری سے خارج از مدرسہ چند دوسرے طلباء کے ساتھ علم فرایض کی کتاب ''سراجی'' بھی پڑھی تھی نیز ہدایہ آخرین حکیم مولانا محمد حسنؒ صاحب سے پڑھی جو حضرت شیخ الہندؒ کے بھائی تھے مدرسہ کے طبیب بھی تھے شکار کا خاص شوق رکھتے تھے''۔ [۱]

۱۲) مولانا حمید الدین فراہی

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں استاد مقرر ہونے سے پہلے مولانا گیلانیؒ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے درس قرآن میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا فراہی کے اس درس قرآن کے متعلق لکھتے ہیں:

''مغرب کے بعد یہ مجلس ہوتی تھی مولانا تقریر فرماتے تھے، لوگ شکوک پیش کرتے تھے وہ جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد یہ مجلس ختم ہو جاتی تھی، ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن گیلانی جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہیں وہ اس مجلس کے خاص لوگوں میں تھے''۔ [۲]

مولانا گیلانیؒ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ درس وتدریس میں گزارا آپ نے مدرسہ خلیلیہ ٹونک اور دارالعلوم دیوبند میں بھی کچھ عرصہ تدریس کے فرائض انجام دیے اور جامعہ عثمانیہ دکن میں تو قریباً تیس برس درس وتدریس کے شعبے سے منسلک رہے آپ سے فیض پانے والے تلامذہ کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ آپ کے چند تلامذہ کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

سید ابوالحسن علی ندویؒ

سید ابوالحسن علی ندویؒ کا شمار مولانا گیلانیؒ کے باقاعدہ شاگردوں میں تو نہیں ہوتا لیکن علی میاں خود کو مولانا گیلانیؒ کے شاگردوں میں شمار کرتے ہیں اس بارے میں لکھتے ہیں۔

''مجھے تفسیر کے تفصیلی مطالعہ کا شوق ہوا بھائی صاحب نے ارادہ فرمایا کہ مجھے کچھ عرصہ کے لئے مولانا گیلانیؒ کے پاس حیدرآباد بھیج دیں مولانا نے بھی اس پر مسرت کا اظہار فرمایا لیکن یاد نہیں کس اسباب وموانع کی بنا پر ایسا نہ ہوسکا لیکن مولانا نے مشفقانہ ومربیانہ اور میں نے شاگردانہ نیازمندانہ تعلق آخر تک قائم رکھا''۔ [۳]

مولانا غلام محمدؒ

مولانا غلام محمدؒ کا شمار مولانا گیلانیؒ کے نمایاں ترین شاگردوں میں ہوتا ہے ان ہی کے ساتھ مولانا گیلانی کا خطوط کے ذریعے اخیر وقت تک تعلق رہا۔

۱۔ گیلانی، مناظر احسن، سید، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن، ص ۲۵۱

۲۔ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص ۱۴۸

۳۔ ندوی، ابوالحسن علی، پرانے چراغ، حصہ اول، ص ۶۵

مولانا غلام محمد ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو ریاست حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے مولانا غلام محمد کو مولانا گیلانیؒ سے تلمذ کا شرف گریجویشن کی تعلیم کے دوران جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ۱۹۴۳ء میں حاصل ہوا آپ نے ۱۹۴۶ء میں ایم ڈی ہومیو پیتھک کی ڈگری بھی حیدر آباد دکن سے ہی حاصل کی آپ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی آپ نے بہت سی کتب بھی تصنیف فرمائیں اس کے علاوہ مولانا گیلانیؒ کی تصانیف تدوین حدیث، مقالات احسانی اور تذکیر سورۃ الکہف کی تدوین بھی مولانا غلام محمدؒ نے کی۔ ۱

آپ کی تصانیف میں حیات بہادر یار جنگ، حیات اشرف، تذکرہ سلیمان، موت الابرار، رموز سورہ یوسف، سکرات سے موت تک، جواہر الفوائد، ارمغان سلیمان، رقعات ماجدی وغیرہ شامل ہیں۔ ۲

مولانا ڈاکٹر غلام محمد ۱۸ دسمبر ۱۹۹۳ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ ۳

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ ۱۹ فروری ۱۹۰۸ء کو حیدرآباد کے محلہ فیل منڈی میں پیدا ہوئے آپ نے درس نظامی کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ۱۹۳۰ء میں ایم۔اے کیا۔ ۴ یہاں آپ کو مولانا گیلانی سے کسب فیض کا موقع ملا اس کے علاوہ یہاں آپ نے پروفیسر عبدالقدیر صدیقی، مفتی عبداللطیف، شاہ مصطفیٰ قادری، مولوی محمد صبغت اللہ، ڈاکٹر سید عبداللطیف، پروفیسر حسین علی خاں، پروفیسر حسین علی مرزا سے استفادہ کیا۔ ۵

آپ نے ایل ایل بی ۱۹۳۰ء میں جامعہ عثمانیہ سے کیا، ڈی فل ۱۹۳۳ء میں بون یونیورسٹی جرمنی اور ڈی لٹ و پی ایچ ڈی ۱۹۳۵ء میں سوربون یونیورسٹی پیرس سے کی آپ نے عملی زندگی کا آغاز ۱۹۳۵ء میں کیا اور جامعہ عثمانیہ میں شعبہ دینیات اور قانون میں درس و تدریس کرتے رہے یہاں ۱۹۴۸ء تک آپ نے قیام کیا۔ ۶

۱۹۴۸ء کے بعد آپ نے مستقل قیام پیرس میں کیا اور آپ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ء کو آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ۷ بدھ ۱۸ دسمبر ۲۰۰۲ء کو ظہر کی نماز کے بعد آرلنگ ٹن کی مسجد کے امام پروفیسر ڈاکٹر یونس کوچی نے جیکسن ول کی اسلامی مرکزی مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی۔ ۸

مولانا گیلانیؒ کی تصنیف ''امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' پر آپ نے مقدمہ لکھا ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''عموماً مولف اپنے اساتذہ یا مشابہ اساتذہ علماء سے کوئی تعارف یا پیش لفظ حاصل کرتے ہیں فاضل استاد کی گراں مایہ تصنیف ان کے سب سے ادنی وحقیر تلمیذ کے پاس آئی ہے تو ایک پیش لفظ کے ذریعے سے خود سعادت اندوز ہونے کے سوا اور تو کوئی سوال نہیں اگر ناشر کا بیان نہ ہوتا کہ خود استاد محترم نے مجھ سے کچھ لکھوا لینے کا حکم دیا ہے تو شاید اس طرح کی سعادت اندوزی کو بھی گستاخی سمجھتا''۔ ۹

---

۱ لطیف اللہ، پروفیسر، مولانا ڈاکٹر غلام محمد، بینات، ماہنامہ، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۴ء، ص ۵۲، ۵۳

۲ ایضاً

۳ ایضاً

۴ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، مرتب: سید قاسم محمود، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بہترین تحریریں، بیکن بکس لاہور، ۲۰۰۷، ص ۱۹، ۲۰

۵ ایضاً، ص ۵۲

۶ ایضاً، ص ۲۰

۷ ایضاً، ص ۱۹

۸ ایضاً، ص ۴۷

۹ گیلانی مناظر احسن، سید، مولانا، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، المیزان ناشران و تاجران کتب لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کا شمار بھی مولانا گیلانیؒ کے تلامذہ میں ہوتا ہے انہیں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ جہاں سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ سے ایم اے تک کے امتحانات پاس کئے۔

مولانا ظفیر الدین مفتاحیؒ

مولانا ظفیر الدین مفتاحیؒ مولانا گیلانیؒ کے باقاعدہ شاگرد نہیں بلکہ شاگرد نما ہیں آپ نے ''حیات مولانا گیلانی'' کے نام سے مولانا کی شخصیت، سوانح، اخلاق وشمائل اور تصانیف کے متعلق ایک قابل قدر کتاب بھی تحریر فرمائی ہے اسی کتاب میں مولانا گیلانیؒ سے اپنی ملاقات کے متعلق آپ لکھتے ہیں:

''بندہ کی پہلی ملاقات شعبان ۱۳۶۸ھ میں مولانا کے مکان پر ہوئی چوں کہ یہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا مولانا نے سمجھا کہ کوئی طالبعلم ہے، پوچھا کہاں پڑھتے ہیں کیا پڑھتے ہیں، جب میرے ساتھی مولانا محمد یحییٰ ندوی سلمہٗ نے بتایا کہ یہ ہمارے دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر کے صدر مدرس ہیں پھر مولانا نے علمی گفتگو شروع کردی اور جب تھوڑی دیر بعد عرض کیا گیا کہ ایک کتاب کا مسودہ ساتھ لایا ہوں میری خواہش ہے کہ اس پر آپ نظر ثانی فرمادیں کہ اس میدان میں یہ میرا پہلا قدم ہے تو بڑی خوشی سے فرمایا لایئے مسودہ دیکھوں، میں نے ''نظام مساجد'' کا مسودہ نکال کر مولانا کے ہاتھوں میں دے دیا مولانا نے اسی آن پڑھنا شروع کردیا دوران مطالعہ فرماتے رہے کہ اس مسئلہ کو فلاں مصنف نے اس طرح لکھا ہے اور کتابیں کھول کھول کر دکھاتے بھی رہے مشورہ بھی دیتے رہے جب عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپسی ہوئی تو فرمایا، الحمدللہ! آپ نے محنت کی ہے پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی پسند کریں تو اپنی رائے لکھ دوں، میں نے عرض کیا یہ تو میری دلی خواہش ہے مولانا گیلانی نے قلم اٹھایا اور دو صفحے کا گرانقدر مقدمہ تحریر فرمادیا۔''[۱]

مولانا ظفیر الدین کا مولانا گیلانی سے مکتوبات کے ذریعے بھی تعلق رہا۔

مولانا گیلانیؒ نے مولانا ظفیر الدین کو جو خطوط لکھے ان میں سے ایک کو مولانا ظفیر الدین نے نقل کیا ہے۔

''میرا پہلا خط جب پہنچا تو مولانا نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا، ملنے کے بعد آپ سے دل مل گیا تھا اس لئے کبھی کبھی خیال آپ کا آتا رہا برہان میں آپ کے مضمون کی متعدد قسطیں نظر سے گذریں ماشاءاللہ آپ نے بڑی محنت کی ہے ان شاءاللہ آپ سے آئندہ توقع ہے کہ زیادہ بہتر کام قدرت لے گی۔''[۲]

مولانا گیلانیؒ کی وفات کے دن مولانا ظفیر الدین، گیلانی ہی کی طرف تشریف لے جارہے تھے مگر بدقسمتی سے مولانا کے جنازے میں شریک نہ ہوسکے مولانا ظفیر الدین اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

''نماز پڑھ کر گیلانی بھاگا دیکھا لوگ قبرستان سے واپس ہورہے ہیں۔ سب سے پہلے قبر پر حاضر ہوکر سلام بجا لایا دیدہ نم کیساتھ فاتحہ پڑھی دیر تک غمزدہ وہاں کھڑا رہا پرانی یادیں اور مولانا کی باتیں ذہن میں گونجنے لگیں''۔[۳]

---

۱. مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، ص۲۸۴

۲. ایضاً، ص۲۸۵

۳. ایضاً، ص۳۰۱

محمد انیس الرحمٰن ایڈووکیٹ

انہوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے پاس کیا جہاں انھیں مولانا گیلانی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کا موقع ملا انھیں نہ صرف مولانا سے استفادہ کا موقع ملا بلکہ انہیں مولانا کے ساتھ ان کے گھر میں رہنے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔

باب دوم
تصنیفات مولانا گیلانیؒ سے ماخوذ تفسیری نکات

فصل اول

تصنیفاتِ مولانا گیلانی کا اجمالی تعارف

فصل اول:

تصنیفات مولانا گیلانیؒ کا اجمالی تعارف

مولانا گیلانیؒ زندگی بھر تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ چنانچہ ان کا شمار اپنے دور کے کثیر التصانیف علماء میں ہوتا ہے ان کی فہرست تصنیفات خاصی طویل ہے ان میں بعض خاصی مقبول ہیں اور وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں علاوہ ازیں ان کے تحریر کردہ مجلاتی مضامین کی تعداد بھی سینکڑوں سے متجاوز ہے جو برصغیر کے مختلف رسائل و جرائد میں منتشر صورت میں موجود ہیں مولانا گیلانیؒ کی مدون و غیر مدون تصنیفات کا اجمالی تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

الدین القیم

ضخامت:

کتاب ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور دو حصوں میں کتاب کو تقسیم کیا گیا ہے۔

سبب تالیف:

الدین القیم مولانا گیلانیؒ کی ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو جامعہ عثمانیہ میں تدریس کے دوران اپنے طلباء کے لئے تعلیمی نوٹس کی حیثیت سے قلمبند فرمائی تھیں۔

موضوع:

حصہ اول میں وجود باری تعالیٰ، ذات، صفات، توحید، ربوبیت، حقیقت محمدیہ، قانون مجازات و مکافات، مسئلہ جبر و اختیار اور مسئلہ شفاعت سے متعلق ضروری تفصیلات موجود ہیں جبکہ انسان کی پیدائش کا مقصد اور اس کے حقیقی مقام کی جستجو حصہ دوم کا موضوع ہے۔

اسلامی معاشیات

مولانا گیلانیؒ کی یہ کتاب پہلے معارف (اعظم گڑھ) میں اپریل تا اکتوبر ۱۹۴۳ء اور اپریل تا دسمبر ۱۹۴۴ء سولہ قسطوں میں شائع ہوئی صفر ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۴ء) سے تقریباً ایک سال تک اس کے مختلف حصے الفرقان بریلی میں بھی شائع ہوئے تھے مئی ۱۹۴۷ء میں پہلی بار کتابی شکل میں حیدر آباد دکن سے اور اس کے بعد دار الاشاعت کراچی سے شائع ہوئی۔[1]

ضخامت:

کتاب دو حصوں میں ۴۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

اسلام کے معاشی نظام کے اساسی کلیات آیات قرآنی کی روشنی میں حصہ اول میں بیان کئے گئے ہیں جبکہ حصہ دوم ان قانونی ابواب پر مشتمل ہے جو معاشی نظام کے متعلق اسلام نے نافذ کئے ہیں نیز قرآن و سنت کی روشنی میں فقہائے اسلام نے ان قانونی ابواب سے متعلق جن جزئیات کو پیدا کیا ہے ان جزئیات کی تفصیل بھی حصہ دوم میں شامل ہے۔

---

[1] شاہ جہاں پوری، ابو سلمان، ڈاکٹر، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ شخصیت و سوانح مکتبہ رشیدیہ کراچی، اپریل ۲۰۰۹ء، ص ۴۳۵۔۴۳۶

النبی الخاتم

یہ کتاب جناب عبدالمجید قریشی، ایڈیٹر اخبار''ایمان''(ضلع امرتسر) کی فرمائش پر مقالہ کی صورت میں لکھی گئی تھی اور اولاً اسی اخبار میں یہ مضمون شائع بھی ہوا بعد میں بعض ترامیم واصلاحات کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ضخامت:

کتاب ۱۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب دو حصوں مکی اور مدنی زندگی میں منقسم ہے۔

موضوع:

کتاب میں محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے ہر واقعے کو نہایت جامعیت واکملیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس کتاب کے متعلق فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمۃ العالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ موثر کتاب نہیں پڑھی کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم وانشا پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے اس کے اندران کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے۔''[1]

اور مولانا اشرف علی تھانویؒ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد لکھتے ہیں:

''مناظر احسن کے سارے مناظر احسن ہیں''۔[2]

امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی

ضخامت:

کتاب ۵۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

بنوامیہ کے آخری اور بنوعباس کے ابتدائی دور کی مفصل سیاسی ودینی تاریخ بیان کرتے ہوئے فقیہ اعظم اور تاجر اعظم امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی کا مفصل بیان اس کتاب کا موضوع ہے یہ کتاب اس بات کی عکاس ہے کہ امام ابوحنیفہ نہ صرف سب سے بڑے فقیہ تھے بلکہ ایک بلند مرتبہ سیاسی رہنما بھی تھے۔

اس کتاب کے متعلق ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں منصور پوری لکھتے ہیں:

''امام اعظم پر اردو زبان میں بے شمار مواد موجود ہے لیکن یہ کتاب اپنے موضوع پر سب سے مختلف اور نادر ہے تاریخی، سیاسی، سوانحی معلومات اور علمی نکات سے بھری ہوئی ہے۔''[3]

اس کتاب کو سب سے پہلے نفیس اکیڈمی کراچی نے ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر حمید اللہ کے تعارف کے ساتھ شائع کیا۔

۱۔ علی ندوی، ابوالحسن، حصہ اول، پرانے چراغ، ص ۶۷

۲۔ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، عالم بے بدل، محمد اکرام چغتائی (مرتب)، ص ۱۱۰

۳۔ شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا مناظر احسن گیلانی شخصیت وسوانح، ص ۴۲۳

پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت

اولاً یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کی تھی اور پاکستان میں اسے مکتبہ رحمانیہ لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

ضخامت:

کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے جلد اول ۳۹۲ صفحات اور جلد دوم ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

سبب تالیف:

مولانا گیلانی سے دارالعلوم دیوبند کے ایک مجلّہ کے لئے چار پانچ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مضمون لکھنے کی گزارش کی گئی تھی مگر یہ مختصر مضمون طوالت اختیار کرتے ہوئے ۷۵۰ صفحات کی ضخامت اختیار کر گیا مولانا دیباچے میں اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

''پانچ صفحوں کے لکھنے کے لئے بیٹھا تھا وہی اس وقت ۷۵۰ صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے''۔

موضوع:

ہندوستان میں مسلمانوں نے تعلیم وتربیت کا جو نظام قائم کیا تھا اس کتاب میں اس نظام کی خصوصیات مثلاً طریقہ تعلیم، نصابی تغیرات، اساتذہ وطلباء کے تعلقات، طلباء کے قیام وطعام کے بندوبست، کتابوں کی فراہمی کے انتظامات، کتابت میں مسلمانوں کی مہارت، اشاعت کتب کے طریقے، سلاطین وعلماء کا تعلیم سے تعلق، ہندوستانی تعلیمی نصاب کی افادیت کے لحاظ سے برتری، ہندوستانی علماء کا اسلامی ممالک میں تفوق وامتیاز جیسے اہم حقائق کو مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے نیز مسلمانان ہند کی تعلیمی مشکلات کے حل کے متعلق تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔

تدوین حدیث

یہ کتاب مولانا گیلانی کے ان چار لیکچرز کا مجموعہ ہے جو آپ نے جامعہ عثمانیہ کی تدریس کے دوران قلمبند فرمائے۔

مولانا گیلانی کے یہ لیکچرز اولاً جامعہ عثمانیہ کے ریسرچ جنرل میں چھپے تھے پھر یہ اپریل تا جون ۱۹۴۱ء میں معارف اعظم گڑھ کے تین نمبروں میں چھپے پھر جنوری ۱۹۴۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۱ء کے برہان دہلی میں اکتیس قسطوں میں بہت ترمیم واضافے کے ساتھ شائع ہوئے تھے ۱۹۵۶ء میں مجلس علمی کراچی نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔[1]

مولانا کے شاگرد ڈاکٹر غلام محمد نے اسے کتابی شکل میں مرتب کیا تھا۔

ضخامت:

کتاب ۴۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

اس کتاب میں حدیث کی شرعی حقیقت، اس کی دینی اہمیت وضرورت، اس کی تدوین وحفاظت اور اس کے معیار رد وقبول کے متعلق مباحث پر تحقیقی وتفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے ان شکوک وشبہات کا بھی اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے جن کی وجہ سے بعض لوگ حجیت حدیث کا انکار کرتے ہیں نیز خبر احاد پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

---

1. شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا مناظر احسن گیلانی شخصیت وسوانح، ص ۴۲۶

تدوین قرآن

مولانا گیلانی نے تدوین قرآن کے موضوع پر جو مستقل کتاب تحریر فرمائی تھی ان کے شاگرد رشید و رفیق مولوی غلام محمدؒ (ایم اے عثمانیہ) نے اس کتاب کو پڑھ کر اس کا خلاصہ تیار کیا جسے مولانا گیلانیؒ نے پسند فرمایا اور اس پر جو پیش لفظ لکھا اس میں مولوی غلام محمدؒ کی کوشش کو سراہا اور اپنی ضخیم کتاب کا اسے ''جوہری خلاصہ'' قرار دیتے ہوئے اصل تالیف سے ہاتھ اٹھالیا۔[1]

ضخامت:

یہ کتاب ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

سبب تالیف:

مولانا گیلانیؒ نے پروفیسر محمد اجمل خاں کے بعض خیالات کے رد میں یہ کتاب تالیف کی۔

موضوع:

جامع القرآن کے متعلق عوام الناس کے یہاں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اس کتاب میں مولانا نے نہایت خوش اسلوبی سے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے قرآن کی کتابت، اس کی ابتدائی حالت، ابتداء میں قرآن کس چیز پر لکھا گیا اور لکھنے والے کون تھے ان جیسے دیگر مضامین پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ

یہ ایک مقالہ ہے جو مولانا نے ۱۳۵۹ھ (اکتوبر ۱۹۴۰ء) میں لکھا تھا اور پہلی بار محرم ۱۳۶۰ھ (فروری ۱۹۴۱ء) میں الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہؒ نمبر میں بہ عنوان ''آغوش موج کا ایک درتابندہ یا اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا ایک وفادار بندہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا یہ مقالہ الفرقان کے ۱۴۳ صفحات پر پھیلا ہوا تھا الفرقان کا نمبر شائع ہوتے ہی ختم ہوگیا تھا اس کے بعد دوسرا ایڈیشن ایک ماہ کے وقفے سے ربیع الاول ۱۳۶۰ھ (اپریل ۱۹۴۱ء) میں شائع ہوا..... یہ نمبر بہت مقبول ہوا تھا اس لئے اس کے بعض مقالے بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہوئے ان میں مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا یہ مقالہ بھی تھا جو سب سے پہلے کتب خانہ الفرقان نے شائع کیا پھر حیدرآباد سے اور ۱۹۴۷ء کے بعد نفیس اکیڈمی کراچی سے کئی بار شائع ہوا۔[1]

ضخامت:

یہ کتاب ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے کتاب کی ضخامت کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

''ایک شہری مجلہ کے لئے مختصر سا مقالہ لکھا گیا تھا باوجود انتہائی اختصار کے لوگوں کا خیال ہے کہ کافی پھیل گیا ہے اس لئے مستقل کتاب کی شکل میں اسی کو وہ شائع کر رہے ہیں''۔[2]

موضوع:

کتاب میں ہندوستان کی تاریخ یعنی حضرت شاہ ولی اللہ سے پہلے ہندوستان کے حالات، انگریزوں کی ہندوستان آمد، عالمگیر کے بعد ابھرنے والے فتنے، مرہٹہ اور سکھ تحریک کے مقاصد و مظالم، احمد شاہ ابدالی کی ہندوستان آمد، جنگ پلاسی میں انگریزوں

---

۱ شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر مولانا مناظر احسن گیلانی، شخصیت و سوانح، ص ۴۲۴

۲ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ، نفیس اکیڈمی کراچی، جون ۱۹۶۵ء (طبع چہارم) ص ۲۸

کی جیت، نادر شاہ کا ہندوستان پر حملہ ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان تاریک حالات میں حضرت شاہ ولی اللہ کی خدمات، ان کی اولاد کی خدمات اور مسلمانوں کی دینی بیدار کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ کی مساعی جمیلہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس مقالے کے بارے میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا ہے:

''یہ بھی مولانا کی وسعت نظر اور دقت فکر کا شاہکار ہے اور جیسا کہ ان کے مقالات کا عموماً انداز ہوتا ہے معلومات کا ایک بحر مواج ہے..... اس میں بھی مولانا..... نے بڑی تفصیل کیساتھ اس تاریک ماحول اور طوفانی عہد کا نقشہ کھینچا ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت ہوئی اور جس میں آپ کی ابتدائی زندگی گزری..... مولانا کی باریک بینی اور دقیقہ رسی کا بصیرت افروز منظر دیکھ کر اسلامی ہند کی تاریخ کا طالب علم حیران رہ جاتا ہے۔''[1]

حیات مولانا حکیم سید برکات احمدؒ

مولانا گیلانیؒ نے اپنے استاذ مکرم حضرت مولانا حکیم سید برکات احمدؒ کے سوانح میں ایک مفصل مقالہ حضرت مرحوم کی وفات کے بعد لکھا تھا جو معارف اعظم گڑھ میں کئی نمبروں میں چھپا تھا اب یہ اہم علمی وسوانحی مقالہ حضرت مرحوم کے بڑے پوتے پروفیسر ڈاکٹر سہیل احمد برکاتی نے کتابی شکل میں افادہ عام کے لئے برکات اکیڈمی کراچی کی جانب سے شائع کر دیا ہے۔[2]

ضخامت:

کتاب ۱۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

یہ کتاب مولانا سید برکات احمد کے ابتدائی حالات، عملی زندگی، طلباء کی تربیت، تصنیف وتالیف، سیرت واخلاق، اخلاف وعیال، اور وفات جیسے موضوعات پر مشتمل ہے نیز کتاب کے آخر میں چند ضمیموں کے اضافے نے کتاب کی علمی شان میں اضافہ کر دیا ہے۔

احاطہ دار العلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن

یہ سلسلہ مضمون ماہ نامہ دار العلوم دیوبند میں اکتوبر ۱۹۵۱ء سے اگست ۱۹۵۵ء تک تیس قسطوں میں چھپا تھا اور ۱۹۹۸ء میں کراچی اور ملتان سے کتابی صورت میں شائع ہوا..... اب اس کی ایک اشاعت کا اہتمام مکتبہ اسعدیہ کراچی نے کیا ہے۔[3]

ضخامت:

یہ کتاب ۳۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

سبب تالیف:

یہ آپ بیتی مولانا نے اپنے استاذ محترم حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے جانشین مولانا سید ازہر شاہ قیصر کی خواہش پر قلمبند فرمائی۔

۱۔ الفرقان، افادات گیلانی نمبر، جولائی ۱۹۵۷، ص ۶، ۷

۲۔ شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا مناظر احسن گیلانی شخصیت وسوانح، ص ۴۴۳

۳۔ ایضاً، ص ۴۴۰

موضوع:

یہ کتاب مولانا گیلانیؒ کی زندگی کے بارے میں ان کی اپنی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔اس کتاب کی یادداشتیں دارالعلوم دیوبند میں مولانا کے زمانہ قیام کے علاوہ،ٹونک کے زمانہ طالبعلمی اور حیدرآباد میں ملازمت تک کے حالات پر مشتمل ہیں۔

دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال (تذکیر بسورۃ الکھف)

اولاً یہ مقالہ الفرقان (لکھنو) کی ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ سے جمادی الآخر ۱۳۷۱ھ (اکتوبر ۱۹۴۹ء تا مارچ ۱۹۵۲ء) تک دجالی فتنہ اور سورہ کہف کے عنوان سے اکیس قسطوں اور دوسوساٹھ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔دوبارہ مولانا کے انتقال کے بعد کچھ ترمیمات ودرستگی کے بعد اسی رسالے کے''افادات گیلانی نمبر''میں شامل کیا گیا ہے بعد میں حیدرآباد دکن سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔[1]

ضخامت:

کتاب ۱۰۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

اس کتاب میں مغربی تہذیب وتمدن اور ملحدانہ علوم وافکار کے فتنہ کا دجالی فتنہ سے تعلق ظاہر کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس فتنہ کی بنیاد پر کاری ضرب لگانے اور اپنے سفینہ ایمان کو غرقابی سے بچانے کے لئے اس سورہ میں کیا کیا ہدایات وارشادات پنہاں ہیں۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولانا نے اس مضمون میں سورہ کہف کی تفسیر ایک نئے انداز سے کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں انھوں نے ایک خاص نقطہ نظر سے مدتوں غور کیا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون تدبر قرآن کی ایک نئی راہ کھولتا ہے''۔[2]

سوانح حضرت ابوذر غفاریؓ

یہ سوانح مولانا گیلانیؒ کی زمانہ طالبعلمی کی تصنیف ہے اور ابتداء میں رسالہ القاسم دیوبند سے مقالے کی شکل میں شائع ہوئی بعدازاں کتابی شکل میں اس کی اشاعت ہوئی۔

ضخامت:

کتاب ۱۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات،سفر مکۃ المکرمہ،قبول اسلام،فریضہ تبلیغ،مسئلہ کنز سے متعلق آپ کے مذہب کی تفصیل،ربذہ کی طرف آپ کا آخری سفر اور وفات سے متعلق تفصیلات کے علاوہ اس کتاب میں حضرت ابوذرؓ کی سیرت سے اہم اخلاقی نتائج کا استنباط معتبر تاریخی بیانات کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

---

[1] شاہ جہان پوری،ابوسلمان،ڈاکٹر،مولانا مناظر احسن گیلانی،شخصیت وسوانح،ص ۴۱۸

[2] الفرقان،افادات گیلانی نمبر،جولائی ۱۹۵۷ء،ص ۱۳

سوانح قاسمی

ضخامت:

کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے جلد اول ۶۱۲ صفحات، جلد دوم ۵۱۶ صفحات اور جلد سوم ۱۵۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

سبب تالیف:

یہ کتاب مولانا گیلانی نے مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا قاری محمد طیبؒ کی گزارش پر تحریر فرمائی تھی۔

موضوع:

جلد اول میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے خاندان ونسب، تاریخ ولادت وحلیہ مبارک، تعلیمی زندگی اور آپ کی سیرت و اخلاق سے متعلق تمام تر تفصیلات موجود ہیں جلد دوم میں مولانا قاسم نانوتویؒ کے اصلاحی اقدامات وخدمات پر مفصل بحث کی گئی ہے جبکہ جلد سوم میں آپ کے آخری سفر حج، علالت وعلاج اور آپ کی وفات سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔

ظہور نور ﷺ

یہ مقالہ اولاً ماہ نامہ الہند (دکن) میں شایع ہوا تھا بعد میں ہفت روزہ ''سچ'' لکھنو میں بھی نقل ہوا اور الہدیٰ بک ایجنسی، حیدر آباد دکن سے کتابچے کی صورت میں چھپا تھا۔[1] اس کے علاوہ اسلامک پبلیکیشنز سوسائٹی حیدر آباد دکن سے بھی شائع ہوا۔

ضخامت:

قریباً ۳۹ صفحات پر یہ مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

اس مختصر مقالہ میں مولانا گیلانی نے میلادی روایات کے متعلق اپنے خاص نقطہ نظر کو پیش کرتے ہوئے سید الانبیاء محمد ﷺ کے میلادناموں کے متعلق مستند کتابوں سے تیس واقعات کا انتخاب کر کے ایک خاص طریقے سے مرتب کر دیا ہے۔

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

یہ مقالہ فروری ۱۹۵۲ء تا جنوری ۱۹۵۳ء برہان دہلی کی بارہ قسطوں میں شائع ہوا یہ سبق آموز سلسلہ مضمون ندوۃ المصنفین دہلی نے کتابی شکل میں بھی چھاپ دیا تھا اس کی نقل ادارہ اسلامیات لاہور نے ۱۹۷۶ء میں شائع کر دی ہے۔[2]

ضخامت:

یہ کتاب ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مسلمانوں میں فرقہ بندیوں کے آغاز پر بحث کرتے ہوئے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے نظریات اور اختلافات کو تحقیقی حقائق اور مذہبی معلومات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے نیز اس حقیقت کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں بنیادی طور پر قابل ذکر مذہبی فرقے صرف دو یا تین ہیں۔

---

[1] شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا مناظر احسن گیلانی شخصیت وسوانح، ص ۴۲۱

[2] ایضاً، ص ۴۴۱

مقالات احسانی

یہ کتاب مولانا گیلانی کے چھ مقالات کا مجموعہ ہے جو پہلے ہندوستان کے مختلف رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے بعد میں مولانا کے تلمیذ رشید مولوی غلام محمدؒ کی توجہ سے کتابی شکل میں ان کا مجموعہ مقالات احسانی کے نام سے شائع ہوا۔

ضخامت:

کتاب ۳۹۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

کتاب میں تصوف کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے امام غزالی کی احیاء العلوم پر تبصرہ کرتے ہوئے خلفاء، سلاطین ووزراء اور علمائے دین پر تعلیمات غزالیہ کے انقلابی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے ابن تیمیہ کے نظریہ مخدومیت پر بھی بحث کی گئی ہے اور کرامات اولیاء کو ثابت کیا گیا ہے نیز شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور مولانا روم نے تصوف کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس کا تذکرہ موثر انداز میں کیا گیا ہے۔

مقدمہ تدوین فقہ

یہ کتاب مولانا گیلانی کے چند مضامین کا مجموعہ ہے جو دہلی کے معروف علمی پرچے "برہان دہلی" میں جنوری ۱۹۴۵ء سے ستمبر تک شائع ہوتے رہے اس سے قبل حیدرآباد کے مجلہ علمیہ میں شائع ہوئے۔ بعدازاں سید ابوالخیر مودودی کی رائے اور مساعی سے یہ مضامین کتابی صورت میں شائع ہوئے[۱]

ضخامت:

کتاب ۳۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

علم منقول اور معقول کی حیثیت، فقہ کی تعریف، فقہا کے اختلاف رائے اور ان کی حقیقت، فقہ اور فقہاء کا مقام ومرتبہ اس کتاب کے بنیادی موضوعات ہیں۔

ہزار سال پہلے

مسلمان سیاحوں کے سفرناموں سے ماخوذ معلومات ومشاہدات کا جامع ایک سلسلہ مضمون غالباً دارالعلوم دیوبند (ماہ نامہ) میں نکلا تھا دارالعلوم دیوبند کی انجمن ثمرۃ التربیت نے ۱۹۵۰ء میں کتابی شکل میں چھاپ دیا تھا کراچی سے نفیس اکیڈمی نے

[۱] گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مقدمہ تدوین فقہ، ص ۱۸۔۱۹

اسے ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۵ء میں تین بار شائع کیا گیا تھا۔[۱] اس کتاب کے مضامین جو مولانا گیلانیؒ نے مسلمان جغرافیہ و تاریخ نویس مولفین کی کتب کے مطالعے کے دوران اپنے پاس قلمبند کئے تھے دارالعلوم دیوبند کے طلباء کی کوششوں اور مولانا ازہر شاہ قیصر کی سفارش سے ان منتشر مضامین کو کتابی شکل میں یکجا کیا گیا۔

ضخامت:

کتاب ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مسلمان سیاحوں کے سفرناموں کی مدد سے آج سے ہزار سال پہلے کے ہندوستان، چین، عراق، ایران، ترکستان، اور شمالی افریقہ کے بعض علاقوں کے مذہبی، معاشرتی، تمدنی حالات اس کتاب میں قلمبند کئے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا مدونہ کتب کے علاوہ مولانا گیلانیؒ کی تصانیف کی ایک کثیر تعداد مختلف رسائل میں مقالات کی صورت میں موجود ہے ان کا اجمالی تعارف درج ذیل ہے۔

مقالات صدق (ہفت روزہ، لکھنو)

۱) جمع وترتیب قرآن

تاریخ اشاعت:

۱۵ تا ۲۹ اپریل ۱۹۴۰ء

ضخامت:

مقالہ چھ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

قرآن کی کتابت، قرآن کی موجودہ کتابی شکل کس کی عطا کی ہوئی ہے اس کے علاوہ سورتوں اور آیات کی ترتیب سے متعلق معلومات کو مدلل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۲) تاریخ اندلس سے سبق

تاریخ اشاعت:

۲۸ جولائی ۱۹۵۰ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

ملک اندلس سے مسلمانوں کے اخراج کے اسباب اس مقالہ میں مجمل انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

---

[۱] شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا مناظر احسن گیلانی شخصیت وسوانح، ص ۴۴۲

۳) خدا کا برگزیدہ رسول (دیکھنے والے اندھوں میں)

تاریخ اشاعت:

۱۱ مارچ ۱۹۳۷ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

ابراہیم خلیل اللہ کے عہد کی مذہبی و معاشرتی حالت، راہ خدا میں حضرت ابراہیمؑ کی قربانیاں، آپ کا عزم مصمم اور آپ کے بلند مقام و مرتبہ کا بیان اس مقالہ کا موضوع ہے۔

۴) طب کی تاریخ

یہ مولانا کی ایک تقریر ہے جو بعد ازاں مقالہ کی صورت میں شائع ہوئی۔

تاریخ اشاعت:

۲۲ دسمبر ۱۹۴۱ء

ضخامت:

قریباً تین صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

فن طب کا عہد بہ عہد ارتقاء اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے نیز ایک قرآنی آیت کی تشریح طبی نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔

۵) معراج و اسرار معراج

یہ مولانا کی ایک تقریر تھی جو بعد ازاں مقالہ کی شکل میں شائع ہوئی۔

تاریخ اشاعت:

۱۰، ۱۷ فروری ۱۹۴۱ء

ضخامت:

قریباً تین صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

سفر معراج جو دینی و مذہبی حقائق کا حیرت انگیز معجزہ ہے مقالہ میں نبی ﷺ کے اسی سفر معراج کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

۶) **حقوق مادری اور اسوہ عثمانی**

تاریخ اشاعت:

۱۱،۱۸اگست۱۹۴۱ء

ضخامت:

مقالہ قریباً چار صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

حقوق والدین خصوصاً ماں کے ساتھ حسن سلوک اور ادب واحترام کو احادیث نبوی کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

۷) **مسئلہ ہجرت کا علمی جائزہ**

تاریخ اشاعت:

مارچ، اپریل ۱۹۴۹ء

ضخامت:

قریباً آٹھ صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

بقائے اسلام کی خاطر مسلمانوں کے لئے مسئلہ ہجرت کب اور کن حالات میں فرض اور کن حالات میں اختیاری عمل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس موضوع پر مدلل ومفصل بحث کی گئی ہے۔

۸) **مسلم عہد حکومت میں**

تاریخ اشاعت:

۱۶جون ۱۹۵۰ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

ملک ہندوستان میں ہندو مسلم دوستی کے عکاس چند تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

۹) **حدود حجاب**

تاریخ اشاعت:

۲۱ستمبر۱۹۳۸ء

ضخامت:

مقالہ چار صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

نقلی دلائل (قرآن وسنت) کی روشنی میں خواتین کے پردے سے متعلق بنیادی احکام کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۱۰) شریعت اسلامی کا اثر ہندوستان کی اسلامی حکومتوں پر

تاریخ اشاعت:

ستمبر ۱۹۴۵ء

ضخامت:

مقالہ بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے عدالتی معاملات میں علم فقہ کو بطور قانون جو غیر معمولی اہمیت و پذیرائی حاصل تھی تاریخی واقعات کی روشنی میں اس اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

۱۱) مردوں کے انتفاع کا قرآنی قانون

تاریخ اشاعت:

۲۸ اگست ۱۹۴۵ء

ضخامت:

تقریباً تین صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

وہ مومنین جو ابھی عمل کی دنیا میں موجود ہیں اپنے اعمال کے منافع سے تمتع کا موقع ان افراد کو دے سکتے ہیں جن کا تعلق عمل کی دنیا سے منقطع ہو گیا ہے بشرطیکہ فائدہ حاصل کرنے والا خود ایمان و توحید کی دولت سے سرفراز تھا ورنہ دوسروں کا عمل تو درکنار خود اس کے اعمال سے اسے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

۱۲) قوم نوح اور عہد حاضر (عبرتیں اور بصیرتیں)

تاریخ اشاعت:

۴ جولائی ۱۹۴۵ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

عہد جدید کی یورپ وامریکہ کی نام نہاد ترقیوں کو عہد نوح کے حالات و واقعات پر منطبق کرتے ہوئے عبرت و بصیرت کا سامان پیدا کیا گیا ہے۔

۱۳) احتضاری مکاشفات

تاریخ اشاعت:

۲۹ مئی ۱۹۴۵ء

ضخامت:

مقالہ قریباً تین صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

احتضاری (بوقت موت) و برزخی واقعات کا ظہور اس دنیا میں کم ہوا ہے لیکن بالکل نہیں ہوتا یہ درست نہیں ہے مقالہ میں بھی ایک احتضاری مکاشفے کا بیان مدلل انداز میں کیا گیا ہے۔

۱۴) فرنگی مورخ کی زبان

تاریخ اشاعت:

۱۵ جنوری ۱۹۴۵ء

ضخامت:

مقالہ ایک صفحے پر مشتمل ہے۔

موضوع:

ایک انگریز مورخ ہنٹر کی کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق جو زہر افشانیاں کی گئی ہیں مقالہ میں اس کے چند نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

۱۵) تعلیم و اشاعت قرآن

تاریخ اشاعت:

۱۶ نومبر، ۷ دسمبر ۱۹۴۲ء، ۱۸ جنوری، ۸ فروری ۱۹۴۳ء (چار اقساط میں مقالہ شائع ہوا)

ضخامت:

مقالہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

ماہ نامہ دارالاسلام کے مدیر کے استفسار کے جواب میں لکھے گئے اس مقالے میں مولانا گیلانیؒ نے قرآن کی اشاعت عام کے لئے نہایت مفید چند تجاویز پیش کی ہیں۔

۱۶) شہادۃ حسنیٰ

تاریخ اشاعت:

۱۶، ۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء

ضخامت:

مقالہ چار صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ میں کربلا کے واقعات کو صحیح تاریخی وثائق کی روشنی میں جمع کیا گیا ہے حق و باطل میں فرق کرنے والے اس واقعہ سے عبرت وبصیرت کے مختلف پہلو بھی پیدا کئے گئے ہیں۔

۱۷) اسلام کا جشن یوم تاسیس

مذکورہ مقالہ مولانا کی عید الفطر (۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲) کو نشر ہونے والی تقریر ہے جو بعد ازاں مقالہ کی صورت میں شائع ہوئی۔

تاریخ اشاعت:

۱۹،۲۶ اکتوبر ۱۹۴۲ء

ضخامت:

مقالہ چار صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ میں مسلمانوں کے مذہبی تہوار عید الفطر سے متعلق پر مسرت لحات و واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے نیز ماہ مبارک یعنی رمضان میں مسلمانوں کو تقویٰ وقربت الٰہی کی جو صورتیں میسر آتی ہیں ان کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

۱۸) آج کی مشکلات کا حل کل کے آئینے میں

تاریخ اشاعت:

۱۱ مئی ۱۹۴۲ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ میں اس حقیقت کو آشکار کیا گیا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کی زندگی کا ہر شعبہ بلاشبہ اہل ایمان کے لئے اپنے اندر بہترین نمونہ رکھتا ہے اور اسوہ نبی ﷺ کو ہی مشعل راہ تسلیم کر کے اہل ایمان اپنی تمام مشکلات کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

۱۹) نبی العالم ﷺ

تاریخ اشاعت:

۱۲۱ اپریل ۱۹۴۲ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ میں نبی پاک ﷺ کا حلیہ مبارک اور آپ ﷺ کی عادات و خصائل کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

۲۰) فکر سندھی پر تبصرہ

تاریخ اشاعت:

جون، جولائی ۱۹۴۵ء

ضخامت:

مقالہ ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ میں فقہ، حدیث، قرآن سے متعلق مولانا عبید اللہ سندھی کے خود تراشیدہ افکار و خیالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۲۱) وقت کا تقاضا اور قرآن کی رہنمائی

تاریخ اشاعت:

۲۱ دسمبر ۱۹۳۷

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

جب ایمان و کفر (مسلموں اور غیر مسلموں) میں مقابلے کی نوبت آ جائے اس وقت مسلمانوں کو جو راہ عمل اختیار کرنا چاہیے سورہ انفال کی روشنی میں اس پر بحث کی گئی ہے۔

۲۲) دلی اور مابعد

تاریخ اشاعت:

۲۱ نومبر ۱۹۴۷ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

دلی کے دگرگوں حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

۲۳) سچی باتیں

تاریخ اشاعت:

فروری ۱۹۴۶ء

ضخامت:

مقالہ ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔

موضوع:

امام شافعی وامام احمد بن حنبل کے مابین فقہی اختلافات کے باوجود خوشگوار باہمی تعلقات کی نوعیت کو بیان کیا گیا ہے۔

۲۴) مسئلہ تکفیر وتفریق پر ایک نظر

تاریخ اشاعت:

جولائی، اگست ۱۹۴۳ء (۴ اقساط میں یہ مقالہ شائع ہوا)

موضوع:

مقالہ ہذا میں مولانا گیلانی نے کفر کے فتوے دینے والوں اور تفریق کرنے والوں کا علمی انداز سے جائزہ لیا ہے۔

۲۵) وقت کی اہم پکار

تاریخ اشاعت:

۳ مارچ ۱۹۵۰ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مسلمان بچوں میں قرآنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے مفید تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

۲۶) روسی جانبازیاں کیا ان کا تعلق اشتراکیت سے ہے؟

تاریخ اشاعت:

۲۹ نومبر ۱۹۴۳ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

انگریز بحری کپتان "رچرڈ چانسلر" نے سولھویں صدی کے روسی ممالک کے باشندوں کے متعلق اپنی کتاب میں جو چشم دید حالات وواقعات بیان کئے ہیں ان کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

۲۷) فاطمہ بنت رسول ﷺ

تاریخ اشاعت:

۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء، ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء

ضخامت:

مقالہ چار صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی حیات مبارکہ کے حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

۲۸) موت میں استثناء

تاریخ اشاعت:

۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء

ضخامت:

ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے اس دعوے کو بیان کیا گیا ہے کہ موت میں استثناء ممکن ہے۔

۲۹) ہماری تعلیم دینیات

تاریخ اشاعت:

۵ مارچ ۱۹۴۸ء

ضخامت:

قریباً ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مصارف محکمہ اوقاف کی نگرانی کی طرف حکومت کی توجہ اس مقالہ کا موضوع ہے۔

۳۰) قیصریت وکسریت

تاریخ اشاعت:

۲۵ جون ۱۹۴۸ء

ضخامت:

قریباً ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

قیصر و کسریٰ کی جانشین مشرق و مغرب کی قوموں کے دین کے متعلق شاہ ولی اللہ کی تنقیحات کو بیان کیا گیا ہے۔

۳۱) پاکستان کا دستور اسلامی

تاریخ اشاعت:

۲ جولائی ۱۹۴۸ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

اسلامی حکومت کے نصب العین، اساسی بنیادوں اور قانونی سرچشمے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

۳۲) ایک عجیب معیار شرافت

تاریخ اشاعت:

۲۰ مارچ ۱۹۴۶ء

ضخامت:

ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

عصمت فروشی کو شرافت و بڑائی کا معیار بنانے کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

۳۳) تقویٰ میں غلو

تاریخ اشاعت:

۲۷ مارچ ۱۹۴۶ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

اصحاب رسول ﷺ کے تقویٰ و پرہیزگاری کے واقعات کا بیان مقالہ کا موضوع ہے۔

۳۴) گاندھی جی اور عقیدہ نبوت

تاریخ اشاعت:

۱۹ جون ۱۹۴۲ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو گاندھی جی ہادی عالم تو تسلیم کرتے ہیں لیکن عالم کے اس ہادی کی ہدایت کو گاندھی جی خود اپنے اور اپنی قوم کیلئے کیوں قبول نہیں کرتے۔

۳۵) تاتاریت اور فرنگیت میں مماثلت

تاریخ اشاعت:

ستمبر ۱۹۴۶ء

ضخامت:

مقالہ پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

آئین و قوانین اور تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے تاتاریت اور فرنگیت میں مماثلت کو ظاہر کیا گیا ہے۔

۳۶) اسلامی صحافت کی تنظیم قرآن کی روشنی میں

تاریخ اشاعت:

۲۹ نومبر ۱۹۴۶ء

ضخامت:

ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

سورہ نساء کی ایک آیت کی روشنی میں خبر کی تشہیر کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔

۳۷) بولوشویک حکومت سے سبق

تاریخ اشاعت:

اپریل ۱۹۴۴ء میں تین اقساط میں مقالہ شائع ہوا۔

ضخامت:

پانچ صفحات پر مقالہ پیش ہے۔

موضوع:

بولشویک حکومت کے ماتحت مختلف علاقوں کے مسلمانوں خصوصاً روسی مسلمانوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

۳۸) ایک مرحوم کی یاد میں

تاریخ اشاعت:

مارچ ۱۹۴۴ء

ضخامت:

قریباً پانچ صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مولانا گیلانیؒ نے اپنے ایک تلمیذ و رفیق مولوی عبدالقادر صدیقی کی زندگی کے حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

۳۹) دین کی خاتمیت و اکملیت

تاریخ اشاعت:

۱۷ جون ۱۹۴۰ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

دین اسلام کے متعلق اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اسلام غیر فانی، لازوال اور کامل دین ہے نیز سابقہ مذاہب کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ تکذیب۔

۴۱) قربانی کا فلسفہ

تاریخ اشاعت:

۳ جنوری ۱۹۴۴ء

ضخامت:

مقالہ ایک صفحے پر مشتمل ہے۔

موضوع:

قربانی جو کہ ایک مستقل عبادت ہے اس عبادت کے متعلق چند اہم باتیں بیان کی گئی ہیں۔

۴۲) دین کی اہمیت

تاریخ اشاعت:

۱۷ جنوری ۱۹۴۴ء

ضخامت:

مقالہ دو صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ میں انسان کے لیے دین و مذہب کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

۴۳) تاریخ عالم میں فتح مکہ کی اہمیت

تاریخ اشاعت:

۱۵ جنوری ۱۹۴۰ء

ضخامت:

قریبا دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

۴۴) جنت و جہنم

تاریخ اشاعت:

یکم جولائی ۱۹۴۰ء

ضخامت:

مقالہ تین صفحات پر مشتمل ہے۔

موضوع:

قرآنی جنت کے عجائبات کی ذات و صفات پر بحث کرتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں نے قرآنی جنت کے متعلق جو غلط تصورات قائم کیے ہیں ان پر تنقید کی گئی ہے۔

۴۵) چند قرآنی نکتے

تاریخ اشاعت:

۲۰ جون ۱۹۴۷ء

ضخامت:

ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

۴۶) اولین قربانی

تاریخ اشاعت:

۱۰ جنوری ۱۹۴۷ء

ضخامت:

قریباً چار صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

حضرت اسماعیلؑ ذبیح اللہ کے قصہ قربانی سے متعلق مختلف معنوی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ کسی چیز

کی صحت کے لئے اتنی دلیل کافی نہیں کہ ماننے والے کے آباؤ اجداد اس کو صحیح مانتے تھے اسی طرح کسی چیز سے انکار کے لئے اتنی دلیل کافی نہیں کہ ماننے والے کے آباؤ اجداد اس کو غلط ٹھہراتے تھے بلکہ جانچنے کا معیار نقلی وعقلی دلائل ہیں یعنی مسلّمات۔

۴۷) نئی خارجیت

تاریخ اشاعت:

۱۱۶ اکتوبر ۱۹۴۴ء

ضخامت:

قریباً تین صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

قدیم وجدید خارجی عناصر کے غلط عقائد واعمال کی مذمت کی گئی ہے۔

۴۸) ہمارے سپہ سالار

تاریخ اشاعت:

۲۲ مارچ ۱۹۴۳ء

ضخامت:

قریباً تین صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مسلمانوں کے مختلف جنگی معرکوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں قلت تعداد اور نا کافی سامان حرب کے باوجود مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی نیز بتایا گیا ہے کہ ان تمام فتوحات کے پیچھے ایک ہی قوت کارفرما تھی یعنی توکل علی اللہ۔

۴۹) ہارون محمدی

تاریخ اشاعت:

یکم، ۸ نومبر ۱۹۴۳ء (دو اقساط میں مقالہ شائع ہوا)

ضخامت:

قریباً چار صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

حضرت موسیٰ سے حضرت ہارونؑ کو جو نسبت تھی اسی نسبت کو محمد مصطفیٰ ﷺ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے درمیان قائم کرتے ہوئے قوم موسیٰ اور امت محمدیہ کے حالات میں مماثلت اور امت محمدیہ کے لئے حضرت علیؓ کی خدمات بیان کی گئی ہے۔

۵۰) پاکستان اور ہندوستان ایک نئے نقطہ نظر سے

تاریخ اشاعت:

۶ جولائی ۱۹۴۶ء

ضخامت:

قریباً چار صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

ہندوستان کے مسلمانوں کی بقاء واستحکام کے لئے قرآن کی روشنی میں مختلف تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

۵۱) دم واپسیں

تاریخ اشاعت:

۳ مارچ ۱۹۴۶ء

ضخامت:

قریباً ۳ صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

دو ایسے افراد کی موت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جن میں سے ایک مرنے کے لئے جیتا تھا اور دوسرا جینے کے لئے مرنا نہیں چاہتا تھا مگر انہیں مرنا پڑا۔

۵۲) روشن خیالوں کی تاریخ خیالیاں

تاریخ اشاعت:

۲۰ دسمبر ۱۹۴۳ء

ضخامت:

دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

انگلستان کے مذہبی بادشاہوں کی تاج پوشی کی رسومات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

۵۳) سائنس سے تائید

تاریخ اشاعت:

۲۰ دسمبر ۱۹۴۳ء

ضخامت:

قریباً ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

زمین کی گردش کے متعلق فلکیات کے علماء کا ایک نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے اس پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۵۴) بوسیدہ جدتیں

تاریخ اشاعت:

۸ نومبر ۱۹۴۳ء

ضخامت:

قریباً ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

اہل یورپ کی غلط باتوں کو ماننے اور انہی لوگوں کی صحیح باتوں پر کان نہ دھرنے والوں سے شکایت و خفگی کا اظہار کیا گیا ہے۔

۵۵) بدنام ملوک وسلاطین

تاریخ اشاعت:

۲۰ ستمبر ۱۹۴۳ء

ضخامت:

قریباً دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مسلمان ملوک وسلاطین کی بداعمالیوں اور بدمستیوں کے متعلق عوام میں جو شکوے اور گلے پائے جاتے ہیں مستند تاریخی وثائق کی روشنی میں شاہ جہاں بادشاہ کے حالات وواقعات پیش کرتے ہوئے ان شکووں کا ازالہ کیا گیا ہے۔

۵۶) تقریر تعزیت

تاریخ اشاعت:

۱۲۳ اگست ۱۹۴۳ء

ضخامت:

قریباً دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

یہ مقالہ مولانا اشرف علی تھانوی کی وفات پر کی گئی تعزیتی تقریر ہے۔

۵۷) قارون اور قانون

تاریخ اشاعت:

۲۷دسمبر۱۹۴۳ء

ضخامت:

قریبا دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

۵۸) وقت کے اہم ترین سوال کا جواب

تاریخ اشاعت:

جولائی۱۹۴۹ء

ضخامت:

قریبا آٹھ صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

قرآن و حدیث کی روشنی میں آپ ﷺ پر ایمان لا کر اطاعت کرنے والوں اور آپ ﷺ کا انکار کر کے سرکشی کرنے والوں کی جزا اور سزا کے متعلق مولانا نے اپنی ذاتی رائے اور نقطہ نظر کو بیان کیا ہے۔

۵۹) جماعت مودودی اور جمہوریت

تاریخ اشاعت:

۱۸اگست۱۹۵۰ء

۶۰) مسلم خروج حکومت میں

تاریخ اشاعت:

فروری۱۹۵۵ء

۶۱) قربانی کا فلسفہ

تاریخ اشاعت:

۱۹۴۳ء

مقالات ہفت روزہ صدق جدید (لکھنو)

۱) ایک تاریخی حقیقت

تاریخ اشاعت:

۲۴ ستمبر ۱۹۵۴ء

ضخامت:

ایک صفحہ پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

ہلاکو خان کے پوتے ارغوں خاں کے عہد کے ایک تاریخی قصے کا بیان اس مقالہ کا موضوع ہے۔

۲) سورہ یوسف سے سبق

تاریخ اشاعت:

۲۵ مئی ۱۹۵۱ء

ضخامت:

قریباً دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

سورہ یوسف کی ایک آیت کی تشریح وتوضیح مقالہ میں کی گئی ہے۔

۳) معارف قرآنی

تاریخ اشاعت:

۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء

ضخامت:

قریباً ایک صفحہ پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ مذکور مولانا گیلانی کے ایک مکتوب کا اقتباس ہے جس میں سورہ ہود کی ایک آیت کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔

۴) مقدار صدقہ فطر

تاریخ اشاعت:

۲۱ ستمبر ۱۹۵۱ء

ضخامت:

ایک صفحہ پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

صدقۂ فطر کی مقدار کی تعیین پر بحث کی گئی ہے۔

۵) مسئلہ رویت ہلال

تاریخ اشاعت:

۲۳ نومبر ۱۹۵۱ء

ضخامت:

قریباً دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مسئلہ رویت ہلال اور اس مسئلے کے متعلق ریڈیو کی نشریات کی نوعیت پر بحث کی گئی ہے۔

۶) سکرۃ الموت

تاریخ اشاعت:

۱۲، ۱۹ ستمبر ۱۹۵۲ء

ضخامت:

چار صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

سکرات الموت کے شدائد اور سختیوں کے متعلق جو روایتیں مشہور ہیں ان کی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے سکرات الموت کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

۷) خارجیت کا نیا مظاہرہ

تاریخ اشاعت:

۱۵ فروری ۱۹۵۲ء

ضخامت:

دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

اس مسئلے پر مدلل انداز میں بحث کی گئی ہے کہ مسلمان زوجین کا نکاح دارین کے اختلاف سے متاثر ہوتا ہے یا نہیں۔

۸) ایک نامسلمان، مسلمان

تاریخ اشاعت:

۵نومبر۱۹۵۴ء

ضخامت:

مقالہ ایک صفحے پر مشتمل ہے۔

موضوع:

ایک شفیق و مہربان سکھ اور ایک چغل خور مسلمان کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

۹) اسلامی سزائیں

تاریخ اشاعت:

۴دسمبر۱۹۵۳ء

ضخامت:

ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

۱۰) ایک اسماعیلی دیندار

تاریخ اشاعت:

۴فروری۱۹۵۵ء

ضخامت:

ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ میں ایک اسمٰعیلی کی دینداری اور خدمات دین کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۱) مسلم حکومت پر خروج

تاریخ اشاعت:

۲۵فروری۱۹۵۵ء

ضخامت:

ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

۱۲) شرعی کنیزیں

تاریخ اشاعت:

۲۴جولائی۱۹۵۳ء

ضخامت:

قریباً دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مسئلہ غلامی کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لونڈیوں کی ملکیت کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔

١٣) رویت ہلال اور ریڈیو

تاریخ اشاعت:

٣ جولائی ١٩٥٣ء

ضخامت:

ایک صفحے پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

ریڈیو کے ذریعے رویت ہلال کی خبر کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

١٤) آدمیت کی تعلیم

تاریخ اشاعت:

١٣٠ کتوبر ١٩٥٣ء

ضخامت:

قریباً دو صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

انسان کے لیئے دینی علوم کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

١٥) قانونی شہادت ٨ فروری ١٩٥٢ء

١٦) افادات گیلانی ٢٢ جون ١٩٥٦ء

١٧) ایک تاریخی حقیقت ٢٢ ستمبر ١٩٥٣ء

١٨) سچی باتیں ١٢٢ گست ١٩٥١ء

١٩) ایک تعزیت نامہ ١٦ نومبر ١٩٥١ء

٢٠) سر علی امام ٢٨ جون ١٩٦١ء

٢١) قادیانیت ١١٢ کتوبر ١٩٥٢ء

٢٢) ایک ناکام تمنا ١٥ جون ١٩٥٦ء

٢٣) بودی بنیاد ١١٥ گست ١٩٥٢ء

٢٤) ہندو دھرم اور اسلام ٣٠ مئی ١٩٥٢ء

مقالات ماہنامہ القاسم (دیوبند)

۱)	الجنۃ والنار اور نشاہ روحانیہ	ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ۔اگست ۱۹۱۶ء تا ۱۳۳۷ھ۔اکتوبر ۱۹۱۸ (چھ اقساط)
۲)	فصل لربک وانحر	ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ/ جون ۱۹۲۳ء
۳)	الشہب القرآن	ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ/ جون ۱۹۲۳ء
۴)	ضرورۃ القرآن	ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ/ جون ۱۹۲۳ء
۵)	اعجاز القرآن	ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ/ جون ۱۹۲۳ء
۶)	قرآن کے طرز استدلال پر ایک نظر	ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ/ جون ۱۹۲۳ء
۷)	کرشن کے ساتھ آریوں کی عداوت پر ایک نظر	شعبان ۱۳۳۵ء
۸)	کائنات روحانی	
۹)	جدید تمدن کا ماتم	۱۳۳۴ھ
۱۰)	مذہب کی ضرورت	ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ
۱۱)	خوارق عادت کے وقوع پر یورپ کی بعض شہادتیں	ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ
۱۲)	واقعہ حضرت زینب	جمادی الآخر ۱۳۳۵ھ
۱۳)	مسئلہ جذب وکشش پر ایک تنقیدی نظر	جمادی الآخر ۱۳۳۵ھ
۱۴)	قاسم العلوم اور اس کا لائحہ عمل	شعبان ۱۳۵۳ھ
۱۵)	وامغات الاغلوعات کا سر شکن	ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ
۱۶)	مسئلہ تناسخ پر ایک تاریخی نظر	ربیع الاول، جمادی الاول ۱۳۳۵ھ

مقالات ہفت روزہ سچ (لکھنو)

۱)	جاہلیت قدیم وجدید	۱۸ نومبر ۱۹۲۷ء
۲)	مسئلہ سود و قرض مزید تشریح	۴ جولائی ۱۹۴۵ء
۳)	دنیا کے دو بھائی دین کے دو بھائی	مارچ ۱۹۳۱ء (دو اقساط)
۴)	سوانح حضرت اویس قرنی	اکتوبر ۱۹۳۱ء
۵)	اکابر تصوف کا تصوف	۱۶ دسمبر ۱۹۳۲ء
۶)	جدید تمدن کا ماتم	مئی ۱۹۲۶ء
۷)	تقلید واقتداء	اگست ۱۹۳۱ء (چار اقساط)
۸)	ماہ جنون پرور یا شہر رمضان	جنوری ۱۹۴۶ء

۹)	حل مشکلات کی زندہ تدبیریں	۱۲اکتوبر۱۹۳۱ء
۱۰)	منصور حلاج	اپریل۱۹۴۲ء
۱۱)	تعزیت نامہ (بروفات مولانا محمد علی)	۱۶جنوری۱۹۳۱ء
۱۲)	اسلام اور سود (مقدمہ کتاب ڈاکٹر انور اقبال قریشی)	اکتوبر۱۹۴۵ء
۱۳)	ایام جاہلیت کا جاہلیت حاضرہ سے موازنہ	جولائی، اگست۱۹۳۳ء
۱۴)	دور فتن	فروری مارچ۱۹۲۷ء وبعدہ
۱۵)	نصرانی تہمتیں	اکتوبر۱۹۴۵ء

مقالات ماہنامہ الرشید (دیوبند)

۱)	اسلاف سے فائدہ اٹھانے کا جدید طریقہ	جمادی الآخر ورجب۱۳۳۵ء
۲)	مناظرہ	۱۳۳۶ھ
۳)	تاثیر الادویہ	محرم۱۳۳۵ھ
۴)	خصائل الفطرۃ	رجب۱۳۳۵ھ
۵)	نام، کنیت، لقب پر اسلامی تعلیمات کا اثر	جمادی الآخر ورجب۱۳۳۵ھ

مقالات ماہنامہ برہان (دہلی)

۱)	تورات کے دس احکام اور قرآن کے دس احکام	مارچ تا جون۱۹۵۱ء اور ستمبر تا دسمبر۱۹۵۱ء (آٹھ اقساط)
۲)	خطبہ جمعہ کی زبان	مارچ۱۹۴۶ء
۳)	مسلمانوں کے دنیوی مصائب کے دینی اسباب	جنوری۱۹۴۹ء
۴)	حج ابراہیمی اور نمرودی مغالطہ	مئی۱۹۴۶ء
۵)	تاریخ چین کا ایک ورق	اگست۱۹۵۶ء
۶)	مرزا رحیم بیگ محمد درویش عظیم آبادی شہید	اگست۱۹۵۸ء
۷)	حجازی عربی کا سامی زبانوں میں مقام	مئی۱۹۴۴ء

مقالات ماہنامہ الفرقان (لکھنو)

۱) وفاداری کے دو نمونے (حجاج بن یوسف کی عبدالملک اور ولید سے، ابراہیم تیمی کی ابراہیم نخعی سے وفاداری کے حیرت انگیز واقعات) ۱۳۷۲ھ

۲)	روزہ اور قرآن	شعبان۱۳۷۱ھ/اپریل۱۹۵۲ء
۳)	ان دیکھی قوت ایک پوشیدہ خزانہ	ذی الحجہ۱۳۶۴ھ

۵) چاند کے بارے میں ریڈیو کی خبر

۶) حج کیا ہے؟ (حج نمبر) ۱۳۶۹ھ

۷) راہ کعبہ کے احساسات وواردات ۱۳۶۹ھ

۸) دربار نبوت کی حاضری ۱۳۷۰ھ

۹) اللہ کے گھر پہنچ کر ۱۳۷۱ھ

۱۰) ہادم اللذات یعنی موت ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ، فر۲ ۱۳۷۲ھ

۱۱) روشن خیالی یا حماقت ۱۹۴۷ء

۱۲) ایک سیاسی قوال کا عبرت ناک انجام جمادی ۴ ۱۳۷۴ھ

۱۳) ہندوستان کی ایک قدیم پنج سالہ سکیم (عہد شیر شاہ سوری میں رفاہ عامہ کے کام)
جمادی الاخری ۴ ۱۳۷۴ھ

۱۴) ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق چند مشورے اور تجویزیں ۱۳۶۴ھ

۱۵) یادگار گیلانی ذی الحج ۱۳۷۵ھ

مقالات ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ دار المصنفین)

۱) قرآن کے صابئین کیا بدھ مذہب کے ماننے والے تھے؟

تاریخ اشاعت:

یہ مضمون فروری اور مارچ ۱۹۵۳ء کو دو اقساط میں شائع ہوا۔

ضخامت:

قریباً ستائیس صفحات پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

قرآن میں مذہبی اقوام یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں کے ساتھ قوم صابی (صابئین) کا ذکر کیا گیا ہے ان صابئین سے کون لوگ مراد ہیں، تفسیری وتاریخی حقائق کی روشنی میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے

۲) اسلام اور ہندومت کی بعض مشترک تعلیمات

تاریخ اشاعت:

اپریل ۱۹۵۲ء

ضخامت:

قریباً چوبیس صفحات پر مضمون مشتمل ہے۔

موضوع:

اسلام اور ہندو مذہب کی مشترک تعلیمات کا بیان اس مقالہ کا موضوع ہے۔

۳) مسئلہ سود مسلم و حربی میں

تاریخ اشاعت:

نومبر ۱۹۴۵ء و دسمبر ۱۹۴۶ء (چار اقساط)

ضخامت:

مقالہ اکتالیس اوراق پر مشتمل ہے۔

موضوع:

اموال معصومہ و غیر معصومہ اور سود کے مسئلے سے متعلق تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

۴) جدید علم کلام قدیم زبان مسلم و حربی میں

تاریخ اشاعت:

جولائی و دسمبر ۱۹۳۵ء (دو اقساط)

ضخامت:

مقالہ پندرہ اوراق پر مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ ہذا میں مولانا مناظر احسنؒ نے اپنے جدامجد مولانا محمد احسن گیلانیؒ کے ایک قدیم مخطوطہ کے چند اہم مسائل اور حقائق پر اجمالی تبصرہ کیا ہے۔

۵) میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ

تاریخ اشاعت:

جولائی ۱۹۴۵ء

ضخامت:

قریباً سات اوراق پر یہ مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مقالہ ہذا میں مسلمانان ہند کی تعلیمی مشکلات کے حل کے متعلق تجاویز پیش کی ہیں۔

۶) انسانی تاریخ کی ایک مثالی حکومت

تاریخ اشاعت:

مارچ ۱۹۵۰ء

ضخامت:

قریباً پانچ اوراق پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

اس مختصر مقالے میں مسلمانوں کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی حکومت کے خصائص، آپ کے عدل وانصاف اور رعایا پروری کے چند نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

۷) اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی ایک بے جا شکایت

تاریخ اشاعت:

اگست تا دسمبر ۱۹۴۸ء (پانچ اقساط)

ضخامت:

قریباً پچاس اوراق پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

بعض عصری مصائب میں مبتلا ہو کر مسلمانوں کی عمومیت میں یہ چرچا جو کیا جاتا ہے کہ غیر اسلامی قوتوں کے ساتھ جس قسم کی مہیب کش مکش میں مسلمان آج مبتلا ہیں یہ صورت ہرگز پیش نہ آتی اگر اپنے مطلق العنانہ اختیار واقتدار سے ہمارے گذشتہ سلاطین کام لیتے یا یہ کہ باوجود اقتدار واختیار کے اسلامی فرمانرواؤں نے اپنے مقبوضہ ومفتوحہ ممالک میں غیر مسلم طبقات کو باقی رہنے کا موقع کیوں دیا۔ دلائل وواقعات کی روشنی میں مسلمانوں کی اس شکایت کا ازالہ کیا گیا ہے۔

۸) مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام

تاریخ اشاعت:

نومبر ۱۹۵۰ء، جنوری وفروری ۱۹۵۱ء (چار اقساط)

ضخامت:

چونتیس اوراق پر مقالہ مشتمل ہے۔

سبب تالیف:

مقالہ کی تالیف کا سبب مولانا گیلانی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"قطع نظر ایک علمی خدمت کے ایک غرض مضمون نگار کی یہ بھی ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کے طرز عمل کے متعلق جو عام غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کا بھی ازالہ ان شاء اللہ ان شہادتوں سے ہوسکتا ہے۔"

موضوع:

مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام کو جو غیر معمولی مقام ومرتبہ حاصل تھا تاریخی شہادتوں کی روشنی میں اسے بیان کیا

گیا ہے۔

۹) مسلمانوں کا اندلس خود مسلمانوں کی نگاہ میں

تاریخ اشاعت:

نومبر دسمبر ۱۹۵۳ء (تین اقساط میں)

ضخامت:

قریباً پچیس اوراق پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

۱۰) شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا نظریہ علم

تاریخ اشاعت:

فروری و مارچ ۱۹۴۵ء (دو اقساط میں)

ضخامت:

مقالہ قریباً چودہ ورق پر مشتمل ہے۔

موضوع:

شیخ اکبر کا اجمالی تعارف اور ان کا نظریہ علم بیان کیا گیا ہے۔

۱۱) علامہ سید مرتضیٰ زبیدی

تاریخ اشاعت:

جنوری و جون ۱۹۲۷ء (دو اقساط میں)

ضخامت:

قریباً سولہ اوراق پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی کی شخصیت و سوانح اور آپ کی کتاب النفحۃ القدوسیہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

۱۲) ہندوستان کا ایک مظلوم مولوی

تاریخ اشاعت:

اکتوبر نومبر ۱۹۵۱ء، جنوری ۱۹۵۲ (تین اقساط)

ضخامت:

مقالہ ستائیس اوراق پر مشتمل ہے۔

موضوع:

ہندوستان کے ایک مولوی، محمد حسن امروہوی کی علمی وفکری خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۳) مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ

تاریخ اشاعت:

دسمبر ۱۹۵۰ء

ضخامت:

قریباً دس اوراق پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مولانا حبیب الرحمان خانؒ کی زندگی کے مختلف واقعات کا بیان مقالہ کا موضوع ہے۔

۱۴) حضرت حکیم سید مولانا برکات احمدؒ ٹونکی

تاریخ اشاعت:

مارچ واپریل ۱۹۲۹ (تین اقساط)

ضخامت:

قریباً ستائیس اوراق پر مقالہ مشتمل ہے۔

موضوع:

مولانا برکات احمد کے حالات، خاندان، تحصیل علم، تدریس، طرز تعلیم اور اخلاقی اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔

۱۵) تاریخ ارض القرآن (تبصرہ)

تاریخ اشاعت:

مئی ۱۹۵۵ء

فصل دوم

تصنیفات گیلانی میں تفسیری نکات

﴿الفاتحہ﴾

آیت : ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ (الفاتحہ:۱)

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

قرآن مجید کی پہلی سورت سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت ہے جس میں بجائے ذات کے (جو متفقہ مسئلہ ہے) خدا کی صفات کے اثبات سے مذہب کے درس کی ابتدا کی گئی ہے کیوں کہ مذہبیت ولا مذہبیت کے اختلاف کا پہلا اصولی نقطہ معلوم ہو چکا یہی ہے۔

اسی مقام سے اس راز کا انکشاف ہوسکتا ہے کہ قرآن نے اپنے درس کی ابتدا اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ سے کیوں کی؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا ذات کی حد تک تو خدا کے ماننے والوں اور اور نہ ماننے والوں میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔[1] دونوں ہی عالم کے اس نظام کو ایک خود بخود ہستی کا نظام مانتے اور اسی خود بخود پر اس نظام کو ختم کرتے ہیں، پس مانی ہوئی چیز کے منوانے کی حاجت ہی کیا تھی، اختلاف کا نقطہ تو صفات سے شروع ہوتا ہے اسی لیے قرآن نے اسی سے اپنی بحث کا آغاز کیا۔

آیت کا حاصل یہ ہے کہ جس کسی کی جہاں کہیں بھی کوئی تعریف وستایش کی جائے وہ اسی اللہ کے لیے ہے جو عالمین (یعنی تمام وہ چیزیں جو ہمارے علم کی گرفت میں آرہی ہیں) کی تربیت کرنیوالا ہے یعنی بتدریج کسی کمال الٰہی کا اسے مظہر بنا رہا ہے، مثلاً ایک نطفہ میں بتدریج ان کمالات کی نمایش کرتا ہے جسے ہم انسانی کمالات کہتے ہیں۔ لوگ جب ابتدا میں قرآن کے اس دعوے کو سنتے ہیں تو انہیں حیرت ہوتی ہے کیوں کہ اس دنیا کا ہر ذرہ کوئی نہ کوئی کمال رکھتا ہے اور ہر ایک اپنے کمال کے مطابق سراہا جاتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ سارے کمالات اور ان کمالات کی ساری تعریفیں خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، ایک عجیب سی بات ہے لیکن بات سمجھی نہیں گئی یہی تو قرآن پوچھنا چاہتا ہے کہ ہستی کے ہر ذرہ میں جن کمالات اور خوبیوں کی نمائش ہورہی ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ نہ تھے اور ہوگئے ہیں؟ کیا تمہاری عقل اس بات کو سوچ سکتی ہے کہ نیستی سے ہستی بنی؟ پس جب ایسا نہیں ہے تو یقین کرو کہ جہاں کہیں، جس کسی میں جب کوئی ایسا کمال نظر آتا ہے، جس کی تعریف کی جاتی ہے تو ان سب کا مرجع اور سرچشمہ وہی ازلی وجود ہے، جو ان کمالات سے ازلاً وابداً موصوف تھا اور ہے، اور جو ہمارے تمام محسوسات ومعلومات (عالمین) کے آئینہ میں اپنے کمالات کو مختلف طریقوں سے چمکا رہا ہے۔ اور جو کائنات کے ہر ذرہ کی ستایش وحمد کے گیت گاتے ہیں لیکن اپنی بدعقلی سے جو ان کا بنیادی وجود اور حقیقی سرچشمہ ہے اس کا مادہ نام رکھ کر ہر قسم کے کمالات سے اسے بے بہرہ سمجھتے ہیں یا سمجھنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ جو نہ تھا اس کے ہونے کا دعویٰ کر کے انسان کے اندرونی احساسات کو زیر وزبر کررہے ہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو فطرت پر ان کے جاہلانہ مظالم کا سلسلہ بہت وسیع نظر آئے گا۔[2]

قرآن کی تعلیم کا سب سے پہلا ابتدائی سرا: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ جو بہتوں کے لئے صرف تقلیدی معرفت کی حیثیت رکھتا ہے مگر جاننے والوں کے لئے حقیقت کے آغاز کا ابتدائی نقطہ یہی ہے جس نے یہ پالیا وہ ان شاء اللہ آخر تک پاتا چلا جائے گا لیکن جسے الفاظ کے علاوہ قرآن کی اس اساسی وافتتاحی تعلیم میں معنی کا کوئی حصہ نہ ملا اسے آئندہ بھی مشکل سے کوئی ایسی چیز مل سکے جس کا ملنا دراصل ملنا ہے بہر حال بجائے تفصیل کے اس مسئلہ میں ہمارے لئے اجمال بھی ہے۔[3]

---

[1] ذات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، مکتبہ اسعدیہ کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۷۱۔۷۵

[2] ایضاً ص:۸۷۔۸۸

[3] ایضاً ص:۱۱۵

آیت : ﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۝ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ﴾ (الفاتحہ:۶،۷)

''راہ ان لوگوں کی جن پر تو انعام کیا، نہ ان کی جو غضب میں مبتلا کیے گئے اور نہ گمراہوں کی۔''

سورہ فاتحہ کی آخری آیتوں پر غور کیا جائے۔ تو منجملہ اور پہلوؤں کے ایک کھلا ہوا یہ پہلو پیدا ہوتا ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جن پر خدا کا انعام ہوا، یعنی جو جنت کے مستحق ہیں، دوسرا گروہ جن پر غضب کیا گیا یعنی جہنم جن کا ٹھکانا ہوگا، آگے ''ولا الضالین'' کی صفت ہے یعنی صحیح سیدھی راہ جنھیں نہ مل سکی اور بھٹک گئے۔ قرآن میں ضلالت (گم گشتگی راہ) کا اطلاق بظاہر دو حالات پر کیا گیا ہے، کبھی تو اس کا انتساب ان لوگوں کی طرف کیا گیا ہے، جن کی حق تعالیٰ نے سزا کے طور پر راہ ماروی، جیسے سزا کے طور پر قلوب پر ختم کر دیا جاتا ہے، سمع وابصار پر ''غشاوہ'' اور غلاف چڑھا دیا جاتا ہے۔ گویا ایسی مثال ہوئی کہ مثلاً بادشاہ کسی پر خفا ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں نکلوا لیتا ہے تو جیسے بیرونی حاسوں سے محروم کر کے کبھی سزا دی جاتی ہے یوں ہی قدرت بعضوں کے اندرونی احساسات کو باطل کر کے اسے اپنی سرکشی اور طغیان کی سزا چکھاتی ہے۔ سورہ بقرۃ کی ابتدائی آیات میں اہل نفاق کے متعلق ذکر ہے کہ

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ﴾ (البقرہ:۱۰)

''بڑھا دیا اللہ نے ان کو بیماری میں اور ان کے واسطے دردناک سزا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے''۔

جھوٹ بولنے کی سزا میں دل کے روگ اور قلب کے مرض میں اللہ تعالیٰ اضافہ فرما دیتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ باطنی احساسات کی بربادی ہی کی سزا ہے۔

بہر حال ''ضلالت'' اور گمراہی کی ایک تو سزائی شکل ہے۔ دوسری شکل قرآن ہی سے ''ضلالت'' ہی کی یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہدایت کی راہ کسی کو نہ مل سکی، سب جانتے ہیں کہ وحی سے پہلے خود صاحب نبوت کبریٰ کے اس حال کی تعبیر بھی قرآن میں ''ضلالت'' ہی سے فرمائی گئی ہے۔

﴿وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ (الضحیٰ:۷)

''اور پایا (اللہ نے) تجھے ضال (گم کردہ راہ) پس اس نے ہدایت کی (یعنی وحی سے سرفراز فرمایا)''۔

اور یہ کوئی جرم نہیں ہے، بلکہ ہدایت کے اسباب کے فقدان کا قدرتی نتیجہ ہے، جب تک وحی کے ذریعہ سے ہدایت کی راہ نہ کھولی جائے۔ آخر اس حال کی تعبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ راستہ تمہارے سامنے نہ تھا۔ اگر راستہ رہتا تو پھر وحی سے کون سی راہ کھولی گئی؟ بہر حال یہ ایک کھلی ہوئی صاف بات ہے۔ راستہ جب سامنے نہ تھا تو یہ کیسے کہہ دیا جاتا کہ تمہارے سامنے راہ تھی! پس فضول اور دور از کار تاویلوں کی قطعاً حاجت نہیں، ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ اب ظاہر ہے کہ سورۃ الحمد میں جب انعام والوں کا بھی ذکر ہو چکا اور غضب والوں کا بھی تو تیسرا گروہ وہی ہو سکتا ہے جو ان دونوں سے کچھ اپنی جداگانہ نوعیت رکھتا ہو، بخاری میں بھی، المغضوب علیہم کا یہود کو اور الضالین کا نصاریٰ کو مصداق قرار دیتے ہوئے اس کی توثیق کی گئی کہ دونوں ایک نہیں ہیں۔ پس وہ ضلالت جو غضب کا نتیجہ ہو سکتی ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ ضلالت نہیں ہے، بلکہ اس سے یہ کوئی علیحدہ چیز ہے، یعنی یہی بات کہ اسباب ہدایت کے فقدان کی وجہ سے جنھیں راستہ نہ مل سکا، خواہ اب راہ نہ ملنے کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ اس راہ تک رسائی کے لیے جس

خارجی ساز وسامان کی ضرورت ہے وہ مہیا نہ ہوسکا جیسا کہ مجدد صاحبؒ نے فرمایا کہ:

بے آنکہ ابلاغ مبین بہ توسط انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات فرمایند

پیغمبروں سے پوری کامل تبلیغ کے بغیر (خدا کی رحمت) کسی کو ابدی عذاب میں مبتلا نہیں کرتی۔

وہ بے چارہ جو کسی ایسے ماحول میں گرفتار ہے کہ حق اس تک نہ پہنچ سکا یا، وہ حق تک نہ پہنچ سکا، یا راہ اس لیے نہ مل سکی کہ حق تک پہنچنے کے لیے جس عقل وفہم یا حواس کی سلامتی کی ضرورت ہے۔ وہ اس کے پاس نہ تھی۔ مثلاً وہی لوگ جن کا ذکر روایتوں میں آیا ہے کہ قیامت کے دن وہ عذر خواہ ہوکر آئیں گے، کہ میں نپٹ بہرا تھا، یا مجھے اتنی عقل ہی نہیں دی گئی تھی جو دین کو سمجھتا، یا پانے کے بعد بوڑھاپے یا مرض کی وجہ سے عقل اس کی غائب ہوگئی۔ مثلاً مجانین یا کھوسٹ خرف بڈھوں کا جو حال ہو جاتا ہے یا عقلی نشو ونما کا وقت ہی اس کو نہ مل سکا اور بچپن ہی میں مرگیا۔

ظاہر ہے کہ نسل انسانی میں شریک ہونے کے باوجود یہ سارے طبقات بنی آدم کے ایسے ہیں، جنھیں راہ نہ مل سکی یعنی الضالین کے یہ مصداق ہیں پس میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت مجددؒ کے پیش کردہ بیان کے متعلق علما ظاہر کا یہ خیال کہ وہ صرف کشفی ہے، اگر سورہ فاتحہ کے الفاظ پر غور کیا جائے تو غالباً کشف سے اس کا درجہ کچھ آگے بڑھ جاتا ہے اور ایک گروہ ایسا قرآن ہی سے نکل آتا ہے اور اس کی پہلی صورت سے نکل آتا ہے، جس کے متعلق قرآن نہ انعام کی تصریح کرنا چاہتا ہے اور نہ غضب کی اور یہ ایک تیسری قسم انسانوں کی پیدا ہوتی ہے۔

حقیت تو یہ ہے کہ کسی معدوم کو بغیر کسی استحقاق کے صرف موجود کرنا موجود کی نعمت اور لذت سے سرفراز فرمانا خواہ وہ ایک سیکنڈ ہی کے لیے کیوں نہ ہو، حق تعالیٰ جل مجدہ کا ایسا انعام ہے جسے ان کے سوا آسمان وزمین کی کوئی طاقت کسی کو عطا نہیں کرسکتی۔ سائنس اور کیمیا کے ہوشربا ایجادات صرف ان صلاحیتوں کا پتہ چلا سکتے ہیں جو قدرت نے اشیا میں ودیعت فرمائی ہیں۔ لیکن ایجاد (وجود بخشا) یہ انسان کے بس سے باہر ہے۔ پانی اور ہوا کے جراثیم جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ منٹوں میں پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں، یا مکھیاں جو ایک ہی ہفتہ میں دادی پردادی تک کی پشتوں تک پہنچ جاتی ہیں اور یوں ہی ایک نسل آتی رہتی ہے، جاتی رہتی ہے۔ * مرتی رہتی ہیں اور جیتی رہتی ہیں بجائے ان الفاظ کے میں نے قصداً آتی جاتی رہتی ہیں کے الفاظ استعمال کیے اس لیے کہ بجز ان حیوانات کے جوانسی کہلاتے ہیں یعنی آدمی سے ان کا ملکی تعلق پیدا ہوگیا ہے یہ سوال نہایت پیچیدہ ہے کہ حیوانات کی پیدائش کا جو اوسط ہے اس کے حساب سے چاہیے تھا کہ دنیا ان میں سے کسی ایک ہی حیوان سے بھر جائے لیکن جب سے دنیا قائم ہے، پرندوں اور وحشی حیوانات وغیرہ کی ایک خاص تعداد ہے جو زمین پر پائی جاتی ہے حشرات بھی موسمی حالات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور ایک طوفان امنڈ آتا ہے، مچھروں، پتنگوں، کھٹملوں کی خاص موسم میں کثرت ہوجاتی ہے، پھر یکایک معلوم ہوتا ہے کہ غائب ہوگئے آدمی رات دن زمین پر چلتا پھرتا ہے جھاڑو دیتا ہے لیکن ان چیزوں کی لاش طبعی موت والی نہیں ملتی، گویا چڑیا جو بارہ مہینے گھروں میں رہتی ہے ایک اوسط تعداد ان کی پائی جاتی ہے لیکن جس نسبت سے ان کے توالد، تناسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے پھر یا یہ ہوتا کہ گھروں میں اس چڑیا کے سوا کچھ نہ ہوتا یا ہر روز جھاڑو دینے میں بیسیوں لاشیں طبعی موت سے مرنے والی چڑیوں کی ملتیں وہ نہ ملتیں تو ان کے پر ان کے کچھ ایسے اجزا جنہیں نہ بلیاں کھاتی ہیں نہ دوسرے جانور لیکن گھروں میں ہو یا جنگلوں میں پھلوں کا انبار ملتا ہے۔ آم کے زمانہ میں آموں کے ڈھیر ٹپکے ہوئے ملتے ہیں حالاں کہ ان کے کھانے والے زیادہ ہیں لیکن پرندوں یا جنگلی جانوروں کی طبعی موت

کی لاشوں کا پتہ آج تک کسی نے نہیں دیا ہے یہ کیا قصہ ہے واللہ اعلم بالصواب ان کے وجود وعدم کا کیا قانون ہے۔﴿مَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا هُوَ﴾ (المدثر:۳۱)*

ان مکھیوں یا حشراتی حیوانات میں اعضا کا باضابطہ نظام ہوتا ہے، ان میں باصرہ، شامہ، سامعہ ہر قسم کے حواس بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں، سال، ماہ، ہفتہ، دن، گھنٹہ، سیکنڈ، جتنی دیر کے لیے بھی ان نعمتوں سے لذت اندوزی کا ان کو موقعہ ملتا ہے، بلاشبہ دینے والے کا یہ صرف احسان ہی احسان ہے وجود اور ہستی فطرت کا ایک ایسا مطالبہ ہے کہ پانی کی جونکوں اور کیچوؤں تک کی یہ حالت ہے کہ ایک زندہ کھال کے سوا ان کے پاس وجود کا کوئی سرمایہ نہیں ہوتا لیکن اپنی حد تک حفاظت خود اختیاری میں سارا زور ایسی چیزیں بھی لگا دیتی ہیں۔ ایک بیمار بستر مرگ پر آخری حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن جس قیمت پر بھی چند سانسوں کے لینے کا موقع اسے ملتا ہے اپنی اپنی حد تک کوئی اس میں کمی نہیں کرتا۔ پس بقول حضرت مجدد” اگر بعض انسانی افراد بجائے جنت اور دوزخ کے معدوم محض کر دیے جائیں گے تو یقیناً حق تعالیٰ نے دنیا میں ان کو جینے کا اور موجود ہونے کا جتنا بھی موقعہ دیا، صرف انعام ہی انعام، رحمت ہی رحمت ہے۔ ایسی رحمت کہ اگر کسی طبیب کے متعلق کسی کو معلوم ہو جائے کہ وہ مقررہ وقت سے ایک دن یا دو دن آدمی کی موت ٹال دیتا ہے، تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے قدموں پر دولت کی کتنی مقدار نثار ہو، پھر چند دنوں کی زندگی کی اگر یہ قیمت ہے تو جن لوگوں کو بیرونی یا اندرونی موانع کی وجہ سے سیدھی راہ نہ مل سکی اگر دنیا میں وجود اور وجود کے لوازم کی نعمتوں سے متمتع ہو کر دوسری زندگی میں دینے والا ان کو ابدی زندگی نہ عطا کرے تو جہاں لاکھوں اور کروڑوں جراثیم، حشرات، پرند، چرند، درند جانداروں کے ساتھ قدرت کا یہ سلوک سراسر فضل واحسان ہے، وہیں ان چند انسانوں کے ساتھ بھی اگر یہی برتاؤ کیا جائے تو اس کے فضل وکرم میں اس کا شمار بھی کیوں نہ ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ جہنم کے عذاب سے بچالینا یہ خود ارحم الراحمین کی کیا کم رحمت ہے۔ اور وہ سطحی وسوسہ کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی عقل یا زندگی یا حواس وغیرہ کا وہی حصہ کیوں نہ عطا کیا یہ ایسی بات ہے کہ اللہ میاں سے ساری انسانیت اس لیے بگڑ بیٹھے کہ آپ نے ہمیں اپنی جیسی قوت وقدرت کیوں نہ عطا کی خود تو خدا بنے ہوئے ہیں اور ہمیں خدا نہ بنایا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ بلا استحقاق وجود کا جتنا حصہ بھی جس کسی کو ملا ہے صرف فضل ہی فضل ہے۔

البتہ حق تعالیٰ سے اس کی دعا ضرور کرنی چاہیے کہ پروردگار! جب آپ نے بجائے حیوانات کے مجھے انسانی نسل میں پیدا فرمایا اور یہ صرف آپ کا فضل ہے تو اسی کے ساتھ ان لوگوں میں مجھے نہ بنا جنہیں انسانی توانائیوں سے سرفراز ہونے کے بعد بھی ان توانائیوں کے قیمت حاصل کرنے اور نرخ بڑھانے کا موقع نہ مل سکا، کہ پیدا تو ہوئے آدم کے گھرانے میں لیکن حشر ہوا جانوروں کے مانند۔

خلاصہ یہ ہے سورہ فاتحہ میں دعا مانگی ہی جاتی ہے، اس بات کی کہ انسانیت کو وہ راہ دکھائی جائے جس پر چل کر وہ اپنی ممکنہ صلاحیتوں کی قیمت حاصل کر سکے، یعنی وہی جس کی تعبیر قرآن نے انعام سے کی ہے اور جس کا ظہور ”الجنۃ ورضوان اللہ“ کی شکل میں ہوگا۔

اب اس کے بالعکس دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یعنی وہ راہ سامنے آجائے، معلوم بھی ہو جائے کہ انسان کا نرخ جس راہ پر چلنے سے مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے، وہ یہی ہے۔ لیکن جان بوجھ کر بغاوت وطغیان کی راہ اختیار کر کے غضب الٰہی کا آدمی ((العیاذ باللہ) مورد بن جائے۔ یہ تو پہلی صورت ہوئی۔ اسی حال کو قرآن نے المغضوب علیہم کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ دوسری صورت یہ

ہے کہ کسی اندرونی یا بیرونی رکاوٹ کی وجہ سے آدمی کے سامنے راہ ہی نہ آسکی ظاہر ہے کہ صراط المستقیم کی درخواست دینے والے کے لیے ناگزیر ہے کہ ان دونوں شکلوں سے پناہ مانگے اور یہی دعا حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سکھائی۔

باقی یہ مسئلہ کہ صراط المستقیم سے محروم ہونے والوں کی ان دونوں قسموں کے ساتھ حق تعالیٰ کا برتاؤ کیا ہوگا؟ ان میں سے ایک کا حال تو قرآن نے بیان کر دیا کہ غضب الٰہی ان سے متعلق ہوگا۔ اور عہد نبوت میں یہ حال ان یہودیوں کا تھا جنہیں مدینہ منورہ میں آں حضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے تجربہ کرنے کا براہ راست کھلا ہوا موقعہ ملا اور جان بوجھ کر انہوں نے کفر کی راہ اختیار کی۔ نصاریٰ عموماً نہ مکہ میں تھے نہ مدینہ میں، بلکہ ان کی تعداد زیادہ تر بیرون عرب میں تھی، یا عرب کے دور دست علاقوں میں تھے۔ کچھ بھی ہو یہود مدینہ کو تجربات کے جو مواقع میسر آئے وہ نصاریٰ کو نہ تھے۔ اسی لیے بخاری میں عہد نبوت کے ان دو فرقوں میں سے ایک کو مغضوب علیہم اور دوسرے کو الضالین کے تحت داخل کیا گیا، تو ان الفاظ کی یہ ایک اچھی توضیحی مثال ہو سکتی ہے۔

بہر حال نہ راہ پانے والوں میں ایک طبقہ کا مغضوب علیہم ہونا تو بدیہی ہے، اب رہا دوسرا طبقہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ قرآن نے اس کی تصریح نہیں کی۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۱۸۲ تا ۱۸۷

﴿البقرہ﴾

آیت : ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ وَ عَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (البقرہ:۱۸۳:۱۸۵)

’’اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو، گنتی کے چند ہی دن ہیں لیکن تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ اور دنوں میں گنتی کو پورا کر لے اور اس کی طاقت رکھنے والے فدیہ میں ایک مسکین کو کھانا دیں، پھر جو شخص نیکی میں سبقت کرے وہ اسی کے لئے بہتر ہے لیکن تمہارے حق میں بہتر کام روزے رکھنا ہی ہے اگر تم باعلم ہو، ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے اسے روزہ رکھنا چاہیے، ہاں جو بیمار ہو یا مسافر ہو اسے دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں وہ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرلو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائی بیان کرو اور اس کا شکر کرو۔‘‘

ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ روزہ آدمی میں ’’تقویٰ‘‘ کے جذبہ کو ابھارتا اور بیدار کرتا ہے۔ اس کے بعد اطلاع دی گئی ہے کہ رمضان ہی کے مہینے میں چونکہ قرآن کے نزول کی ابتدا ہوئی، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس مہینے کو روزے کے ساتھ گزاریں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ’’تقویٰ‘‘ کا مطلب کیا ہے، روزے سے اس کا کیا تعلق ہے اور تقویٰ کے جس جذبہ کو روزہ ابھارتا اور جگاتا ہے، انسانی فطرت کے اس جذبہ سے قرآن کا کیا تعلق ہے؟ ایک مثال اپنے سامنے رکھ لیجئے: روشنی سے وہی مستفید ہوسکتا ہے، جس کی بینائی کی قوت آلائشوں سے پاک و صاف ہو۔ اس مثال کے پیش نظر غور کیجئے، قرآن کیا ہے؟ آدمی کی آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل ہی کا نام قرآن ہے۔ اسی طرح تقویٰ جس کا ترجمہ عموماً پرہیزی ڈر، وغیرہ الفاظ سے کر دیا جاتا ہے، فطرت انسانی کے اس خاص رجحان کی تعبیر ہے، جس نے آدمی کو آئین پسند بنا دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک جنون سے کسی کا دماغ ماؤف ہی نہ ہو، ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اعمال و افعال میں ہم مطلق العنان بن کر نہیں پیدا کئے گئے ہیں۔ یعنی جو جی میں آئے اسے کہہ گزریں، جسے چاہیں مار بیٹھیں، قتل کر دیں، جن کا مال چاہیں اڑالیں، سڑکوں پر ننگے ہو کر ناچیں، تھرکیں۔ یہ یا اسی قسم کے بہت سے کام کرنے پر ہم آمادہ ہو جائیں تو انہیں کر تو سکتے ہیں، لیکن اندر کی آواز ہمیں ٹوکتی ہے اور حدود میں رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جو کئے جائیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نہ کئے جائیں، یہ تقسیم ہمارے اعمال و افعال کی سچ سے پوچھیئے، تو تقویٰ

ہی کے فطری جذبہ کی پیداوار ہے۔

کون کون سے کام کرنے کے ہیں اور کون سے نہ کرنے کے تفصیلات میں تو اختلاف ممکن ہے لیکن ان دو حصوں میں اعمال کی تقسیم، انسان کا فطری احساس ہے۔ کسی شخص کے متعلق جوں ہی پتا چلتا ہے کہ اعمال وافعال کی حد بندی کے تقاضوں سے آزاد ہوگیا ہے، اس کے پاگل ہو جانے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اگر تقویٰ کی واقعی حقیقت یہی ہے جو عرض کی گئی، تو پھر کتنی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کو، یعنی: آئینی زندگی کے قدرتی دستور العمل کو سپرد کرتے ہوئے تقویٰ کے احساس کو چونکانے والے اور جگانے والے عمل، یعنی: روزے کی پابندی کا بھی ٹھیک اسی مہینے میں کیوں مکلف بنایا گیا، جس میں قرآن کے نزول کی ابتداء ہوئی۔ آئین و دستور کی پابندی کا مطالبہ باہر سے جن پر پیش ہو رہا تھا، ضرورت تھی کہ ان کے اندر بھی احساس اور جذبے کے اجاگر کرنے کا حکم کیا جائے، جس پر آدمی کی آئینی زندگی کا دارومدار ہے۔

یہ ہے ''تقویٰ'' اور ''قرآن'' میں تعلق، گویا آئین کے ساتھ آئین پسندی کے جذبے کو بھی بیدار رکھنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آدمی میں آئین پسندی، یعنی: تقویٰ کا جو جذبہ فطرتاً پایا جاتا ہے، اس کے ابھارنے اور اس کو تر و تازہ رکھنے میں روزہ سے کیوں مدد ملتی ہے؟ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں بار بار جس چیز کی ضرورت آدمی کو ہوتی ہو، روزمرہ کی اسی ضرورت سے اچانک دست بردار ہو جانے پر آمادہ ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آئینی حدود کے اندر اپنے آپ کو روکے رکھنے کی پوری قوت اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ سال کے گیارہ مہینوں میں جو کھا رہا تھا، پی رہا تھا، جنسی تقاضوں کی تکمیل پر جس کے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، وہی بارھویں مہینے میں اس امتحان میں کامیاب ہو کر نکلتا ہے کہ ساری چیزیں، جن کا گیارہ مہینوں میں عادی تھا ان کو چھوڑ بیٹھا۔ آئینی جذبے کی مشق کی اس سے زیادہ بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی۔

اب پڑھیے روزہ والی آیتوں کو۔ انصاف سے بتایا جائے کہ خود قرآن نے روزہ کے قانون کو نافذ کرتے ہوئے جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا ہے، دل آویزی اور دل نشینی کی جتنی غیر معمولی خنکی اس میں پائی جاتی ہے، کیا عقل کے ناخن تراشوں کی تاویلوں میں اس کے بعد کچھ بھی جان رہ جاتی ہے؟ اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ روزہ اور اس کے اسرار و حکم اور وجوہ و مصالح کے سمجھنے کے لیے بجائے قرآن کے غیر قرآنی راہوں سے مدد لینے کی قطعاً حاجت نہیں۔

روزے کے مطالبے کو مسلمانوں پر عائد کرتے ہوئے گذشتہ ادیان و مذاہب کو ماننے والی امتوں کے ساتھ اپنے تاریخی رشتہ کا اعادہ ''كما كتب على الذين من قبلكم'' کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

اس سے مسلمانوں میں یہ نفسیاتی اثر پیدا ہوتا ہے کہ اس حکم الٰہی کا بار اٹھانے میں وہ تنہا نہیں ہیں، بلکہ جو انسانی نسلیں ان سے پہلے گزری ہیں، وہ بھی اس میں ان کی شریک ہیں۔ اسی سے خود بخود یہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ روزے کا مطالبہ کوئی ایسا مطالبہ ہے بھی نہیں، جسے بار سمجھا جائے۔ آخر جس کام کو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے انسانیت برداشت کرتی چلی آئی ہے، اس کو بار اور بوجھ قرار دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں، گویا برداشت کے لحاظ سے یہ تجربہ کیا ہوا، جانچا اور پرکھا ہوا عمل ہے، سمجھا جائے، تو یہ

اشارہ بھی قرآن کے الفاظ سے ہمیں مل سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حیوانی ضرورتوں کے لیے حرارت، روشنی، ہوا، پانی وغیرہ جیسی قدرتی امدادوں کا آدمی ہر زمانے میں ہر جگہ محتاج رہا ہے، یہی نوعیت قدرت کے ان قوانین کی بھی ہے، جن کی پابندی کے بغیر انسان انسان نہیں رہ سکتا۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''اگلوں پر بھی روزہ واجب کیا گیا تھا'' تو اس سے یہ بھی سمجھا جا تا ہے کہ روزہ بھی قدرت کے ان ہی قوانین میں شریک ہے، جن سے نہ اگلے بے نیاز ہو کر رہ سکتے تھے اور نہ پچھلے اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں۔ ۱

مسلمانوں پر روزے کو عائد کرتے ہوئے بجائے یہ فرمانے کے کہ مسلمانوں کے دین کا یہ کوئی امتیازی سرمایہ ہے، قرآن نے صاف لفظوں میں یہ اطلاع دی ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ پہلے بھی لوگ اسی کی پابندی کرتے چلے آئے ہیں۔ قرآن اگر یہ کہتا ہے کہ بچھڑے ہوؤں کو ملانا اور اپنے بزرگوں کی راہ سے جو ہٹ گئے ہیں، اسی راہ پر ان کو واپس لانا، یہ بھی اس کا نصب العین ہے، تو روزہ کے بارے میں اس بیان کی تعبیر اور کیا کی جائے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دین کی دعوت میں لوگ دل آزاری کی راہوں کو چھوڑ کر قرآنی راستے پر اگر چلتے، تو جن قوموں کی اسلام سے محرومی کی مدت دراز سے دراز تر ہوتی چلی جا رہی ہے، بہت مختصر ہو جاتی ہے۔ ۲

روزے کے متعلق یہ طریقہ تعبیر اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے تو ایام معدودات، یعنی: چند گنے چنے دن روزہ فرض ہوا اور بعد کو پھر رمضان کا مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے جدا سمجھے جاتے ہیں، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں دو مستقل مطالبے نہیں ہیں، رمضان ہی کے مہینے کو روزے کے حکم کی تعمیل کا مہینہ مقرر کرنا مقصود تھا، لیکن اسی مقصد کو پہلے عام الفاظ میں ادا کیا گیا، یعنی: بڑی مدت روزے کے لیے نہیں، بلکہ چند گنے چنے دن کی حد تک اس عمل میں مسلمانوں کو مشغول ہونا پڑے گا، پھر ان ہی گنے چنے دنوں کی تفصیل یہ کی گئی کہ وہ ''رمضان کا مہینہ'' ہے۔ یہ یسر کی وضاحت ہے۔

روزہ کی یہ حقیقت قابل غور ہے کہ سب سے زیادہ آدمی جن چیزوں کا عادی ہوتا ہے، روزے کی وجہ سے اپنی اسی دوامی عادت سے دست برداری کی مشق پیدا ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین ہو یا دنیا، زندگی کے تمام شعبوں میں اس مشق سے یہ مدد ملتی ہے کہ عادت کے خلاف کسی قسم کے مشکلات سے دوچار ہونے کا موقعہ سامنے آجائے، تو روزے کی مشق ان مشکلات کو قدرتاً روزہ رکھنے والوں کے لئے آسان بنا دیتی ہے، اس لیے یہ فرماتے ہوئے کہ جن رعایتوں اور جن شروط کے ساتھ روزہ کا مطالبہ واجب کیا گیا ہے، ان ہی کو دیکھ کر تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ مشقت اور دشواری میں مبتلا کرنے کا ارادہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے مقابلے میں روزے کی مشق سے زندگی کے عام عادی مشکلات میں مدد ملتی ہے، خصوصاً قمری مہینے کی وجہ سے ہر موسم اور سال کے ہر حال میں روزہ رکھنے کی عادت سہولت کے دائرے میں جس وسعت کو پیدا کرتی ہے اور مشقت کی برداشت کی قوت کو بڑھاتی ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ روزے سے آسانی پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات گیلانی، حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری (مرتب)، مکتبہ عمر فاروق کراچی، اگست ۲۰۱۲ء، ص ۹۷-۹۹

۲ ایضاً، ص ۱۰۱

انسانیت ہدایت کے جس نظام کی پابندی کر کے اپنے صحیح انجام تک پہنچ سکتی ہے۔ یقیناً اس کا علم ساری انسانی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ روزہ اس غیر معمولی، انمول نعمت سے سرفراز فرمانے والے کی بڑائی کے اقرار کی بہترین عملی شکل ہے کہ آدمی سب سے زیادہ جن چیزوں کا رسیا اور عادی ہے، ہر ایک کو ٹھکرا کر اس بڑے کے حکم کی تعمیل کیلئے کھڑا ہو جاتا ہے، ''تا کہ بڑائی کرو اللہ کی اس نعمت کے مقابلہ میں کہ تمہاری رہنمائی اس نے کی''۔

سچ تو یہ ہے کہ زندگی بھر جو ہمیں کھلاتا پلاتا رہتا ہے اور طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے آدمی کا جی چاہتا ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ کوئی شک نہیں کہ شکر اور گن گانے کی صورتیں یہ بھی ہیں کہ زبان سے شکر کے الفاظ ادا ہوتے ہوں، یا دل میں تشکر وامتنان کے جذبات پیدا ہوں، لیکن کھلانے پلنے والے کے شکر کی یہ شکل..... جتنی دیر کے لیے کھانا چھوڑ دینے کا حکم کھلانے والے، پلانے والے نے دیا، اتنی دیر کے لیے ہم اس کو چھوڑ بیٹھیں۔ حق تو یہ ہے کہ زبان اور دل والے شکریوں سے شکر کا یہ عملی قالب خود شکر کرنے والوں ہی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہے، اس کی طرف آخر میں ''تا کہ تم شکر ادا کرو'' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا تھا۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات گیلانی، حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری (مرتب)، ص ۱۰۲-۱۰۳

آیت : ﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ (البقرہ:۲۰۱)
''اے ہمارے مالک دیجئے ہمیں الدنیا میں بھی بھلائی اور الآخرۃ میں بھی بھلائی اور بچا لیجئے ہمیں عذاب سے آگ کے۔''

جو حق کو معاشی و معادی دونوں کناروں سے پکڑتے ہیں۔ معاش میں بھی ان کا حقیقی رخ حق ہی کی طرف رہتا ہے اور معاد میں بھی ان کی ٹکٹکی فضل حق ہی کے ساتھ بندھی رہتی ہے، اُن کے لئے کس بات کا خطرہ ہے؟ معاشی جہات میں بالفرض، اگر ان کو ناکامی بھی محسوس ہو، اگر چہ واقع میں وہ بھی کامیابی ہوتی ہے جس پر بظاہر ناکامی کا غلاف چڑھا رہتا ہے۔ لیکن یہ ظاہری ناکامی بھی ان کو خدا سے اس لئے جوڑے رکھتی ہے کہ ان کا دوسرا رخ یعنی معادی رشتہ تو خدا سے بہر حال باقی رہتا ہے بڑی سے بڑی معاشی محرومیاں بھی ان کو خدا کے قدموں سے دور نہیں کر سکتیں۔ وہ اپنی ہر معاشی ناکامی کو معادی کامیابیوں کا ذریعہ، صبر و رضا، تسلیم و تفویض وغیرہ مختلف قرآنی تدبیروں سے بناتے چلے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ معادی امور سے بے پرواہو کر حق تعالیٰ سے صرف یک رخی معاشی نسبت اگر چہ بہتوں کے لئے آج مذہبی امتیاز اور دینی برتری کی سند بنی ہوئی ہے لیکن قرآن نے جن عواقب اور خمیازوں پر متنبہ کیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی ان کی غلط مذہبی زندگی مذہبی زندگی قرار پانے کی مستحق ہو سکتی ہے؟

پس صحیح بات یہی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو جو خدا اور جو معبود اللہ کے نام سے عطا کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کا الہ المعاش بھی ہے اور الہ المعاد بھی۔ اسی لئے ایک مسلمان کا صحیح دینی مقام یہی ہو سکتا ہے کہ ''الہ المعاش'' ہونے کے ساتھ جو رب بندوں کا ''الہ المعاد'' بھی ہے، اسی کے قدموں پر سر ڈالے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۷۹

آیت : ﴿ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (البقرہ:۲۱۹)
''اور (لوگ) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں کہہ ''عفو''۔
جیسا کہ میں نے عرض کیا
مَاذَا یُنْفِقُوْنَ
کا سوال پوچھا گیا۔اس کے جواب میں ارشاد ہوا
قُلِ الْعَفْوَ
یعنی ''عفو'' خرچ کریں، یہ ''عفو'' کیا چیز ہے؟ اس کا جواب بعد کو دیا جائے گا۔ پہلے دوسری آیتوں کو بھی نقل کرلوں۔سورہ اسرائیل میں ارشاد ہے۔
﴿وَ لَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَ لَا تَبْسُطْهَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۲۹)
اور تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں نہ ڈالو اور نہ اس کو اتنا کھولو کہ بالکل کھل جائے (کیونکہ اگر ایسا کرو گے) تو بیٹھ جاؤ گے اس حال میں کہ لوگوں کی ملامت کے نشانہ بنے ہوئے ہو اور درماندہ ہو۔
پھر سورۃ الفرقان میں ہے
﴿الَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَ کَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا﴾ (الفرقان:٦٧)
''جو لوگ خرچ کرتے ہیں تو نہ حد سے گذرتے ہیں اور نہ تنگی پیدا کرتے ہیں بلکہ ہوتا ہے خرچ ان کا درمیان ان دونوں راہوں کے اندازہ کے ساتھ''۔
عموماً سمجھا جاتا ہے کہ تینوں آیتوں میں قریب قریب ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔''العفو'' کا عام طور پر مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جو بآسانی ہو سکے اور پچھلی دو آیتوں میں تو ظاہر ہی ہے کہ خرچ کے باب میں ''اعتدال'' کی فہمائش ہی کی گئی ہے۔امام رازی اور ان کے سوا بھی عموماً العفو کا مطلب یہی کہتے ہیں کہ اس کا تعلق
فما یفضل عن حاجۃ الانسان فی نفسہ و عیالہ
آدمی کی ذات اور اہل وعیال کی ضرورت سے جو بچ جائے۔
یعنی اپنے اور اپنے اہل وعیال وزیر پرورش لوگوں کے مصارف سے جو بچ جائے قرآن حکم دیتا ہے کہ ان سب کو خرچ کردو۔
مگر حدیث میں حضور ﷺ نے شدت کے ساتھ سونے کے ڈلے والے آدمی کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ:
خیر الصدقۃ ما کان عن ظهر غنی [1]
بہترین صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو۔
مشہور شارح حدیث امام خطابی ''ظهر غنی'' کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں۔

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، ابی عبداللہ، صحیح البخاری، کتاب النفقات باب وجوب النفقۃ علی الاهل والعیال [٥٣٥٦]، ص ٩٥٦، مکتبہ دارالسلام، الریاض، الطبعۃ الثانیۃ ذوالحجۃ ١٤١٩ھ

ای عن غنی یعتمد علیه و یستظهر به علی النوائب التی تنوبه

یعنی ایسی تونگری جس پر بھروسہ کر سکتا ہو، اور جس کی پشت پناہی حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب مصائب اور حوادث کا وہ شکار ہو۔

خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں

خیر الصدقة ما ابقت غنیٰ[1]

بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی تونگری کو باقی رکھے۔

جس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ ''صدقہ'' یا ''انفاق'' یا ''خرچ'' کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی حاصل کرنے یا مصارف پیش آنے میں مدد لے۔ خطابی کے الفاظ یستظھر به (یعنی جس سے پشت پناہی حاصل کر سکے) کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ماسوا اس کے سمجھ میں نہیں آتا کہ خود قرآن نے جب یہ ممانعت کی ہے کہ آدمی کل البسط کے طور پر یوں خرچ نہ کرے کہ گھر میں جا کر ذلیل و رسوا، تھکا ماندہ بن کر اسے بیٹھنا پڑے۔ حدیث میں بھی حضور نے یہی فرمایا کہ لوگوں کے سامنے اس کے بعد ہاتھ پھیلاتا پھرے۔

سعد بن ابی وقاص کی حدیث میں رسول اللہ نے کل مال کے صدقہ سے یہ کہتے ہوئے منع فرمایا کہ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ تمہاری اولاد تمہارے بعد ہاتھ پھیلاتی پھرے۔

علی الخصوص جب ہم دیکھتے ہیں بعضوں کا ذریعہ معاش کوئی سرمایہ مثلاً تجارت کی پونجی یا زمین یا باغ یا مکان وغیرہ ہوتا ہے اور بعض لوگ محنت و مزدوری نوکری کر کے زندگی گذارتے ہیں۔ ثانی الذکر طبقہ اگر روز جو کچھ کمائے خرچ کر دے تو چونکہ دوسرے دن یا دوسرے مہینہ اس کو پھر آمدنی کی توقع ہے اس لئے اس کو تو شائد کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے لیکن اول الذکر طبقہ اگر ''العفو'' کا وہی مطلب سمجھ کر جو عام طور پر سمجھا گیا ہے اپنی پونجی یا زمین و مکان، باغ کو بھی ختم کر دے۔ کیونکہ بال بچوں کے کھلانے پلانے کے بعد اس کا یہ سرمایہ تو باقی ہی رہ جاتا ہے تو کیا اس کو دوسرے دن ملول و محسور ہو کر بیٹھنا نہ پڑے گا۔

میرے خیال میں اسی لئے ''العفو'' کا مطلب وہی ہے جو واحدی سے امام رازی نے نقل کیا ہے۔

اصل العفو فی اللغة الزیادة قال اللہ تعالیٰ خذ العفو ای الزیادة قال ایض حتی عفو ای کثروا

''العفو'' کے معنی لغت میں زیادتی کے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوگوں سے ''العفو'' یعنی زیادتی، نیز ارشاد ربانی ہے حتی عفوا یعنی اس قوم کے لوگ جب بڑھ گئے اور بہت ہو گئے۔

مطلب یہ ہے کہ گذشتہ بالا طبقوں میں سے وہ طبقہ جس کی گذر بسر کسی ''سرمایہ'' یا ''جائیداد''، ''زمین''، ''مکان'' وغیرہ کی آمدنی پر ہے یا معاشی اصطلاح میں یوں کہئے جو شخص اصل کی منافع سے اپنی معاشی ضرورتیں پوری کرتا ہے ان کے متعلق تو اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ ''العفو'' یا (''الزیادة'') کی حد سے آگے نہ بڑھیں۔ یعنی اصل کو محفوظ رکھتے ہوئے جو زائد آمدنی ہو اس کو خرچ کرتے رہیں کہ ان کا یہی خرچ عن ظھر غنی ہو سکتا ہے۔

---

[1] احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، اول مسند المکیین والمدنیین، حدیث حکیم بن حزام عن النبی (۱۵۶۶۲)، [۳/۴۳۴] م ص ۳۶۲/۵، عالم الکتب للطباعة والنشر والتوزیع، بیروت لبنان، الطبعة الاولی، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء

مشہور امام لغت الفراء سے منقول ہے،

قوله تعالی قل العفو و هو فضل المال

اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو قل العفو ہے۔ اس سے مراد المال (سرمایہ کا) فضل یا بڑھوتری ہے۔

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ''العفو'' مال کی زیادتی اور آمدنی کو کہتے ہیں۔ پھر صاحب لسان العرب ہی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

لا اعفی قتل بعد اخذ الدية

دیت (خوں بہا) لینے کے بعد لینے والوں نے عفو نہ کیا۔

پھر ''اعفی'' کے لفظ کا ترجمہ کرتے ہیں،

ای لا کثر ماله و لا استغنی

یعنی اس کا مال نہ بڑھے اور نہ وہ خوشحال ہو۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''سرمایہ'' کی آمدنی یا ''اصل'' کے ''منافع'' کو ''العفو'' کہتے ہیں پس اس قسم کے لوگوں کے لئے میرے خیال میں ادائے فرائض کے بعد عام مصارف و انفاق میں اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ حتی الوسع اصل کو ضائع نہ کریں۔

یہ حدیث جو مسند احمد ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا

لا يبارک فی ثمن ارض و لا دار لا يجعل فی ارض و لا دار[1]

نہ برکت دے اللہ اس زمین اور اس گھر کی قیمت میں جو پھر زمین ہی یا گھر ہی میں نہ لگادی جائے۔

ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں۔

من باع داراً أو عقاراً فلم يجعل ثمنه فی مثله کان قمن أن لا يبارک فيه[2]

جو شخص کوئی گھر یا جائداد جب فروخت کرے اور پھر اسے اسی جیسی چیز یعنی گھر یا جائداد کے خریدنے میں نہ لگا دے تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے مال میں برکت نہ دی جائے۔

یحییٰ ابن آدم القرشی نے اپنی مشہور مستند کتاب ''الخراج'' میں بھی اس حدیث کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

لا يبارک فی ثمن ارض او دار الا ان يجعل فی ارض او دار

نہیں برکت دی جاتی زمین اور گھر کی قیمت میں مگر یہ کہ پھر اس قیمت کو زمین یا گھر ہی میں لگا دیا جائے۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں جو ''اصل'' کی حیثیت سے کام کرتی ہیں اولاً ان کو الگ ہی نہ کرنا چاہئے اور اگر کسی ضرورت (مثلاً تبدیل مقام یا اور کسی وجہ سے) آدمی ان کو الگ کرے بھی تو چاہیے کہ ان کے روپے کو پھر کسی ایسی چیز میں لگا دے جو ''اصل'' کا کام دے سکیں۔

---

1. احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، مسند سعید بن زید بن عمر بن نفیلؓ [۱۶۵۰] (۱/۱۹۰)، ص ۱/۵۰۸ عالم الکتب للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت لبنان، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء

2. القزوینی، محمد بن یزید الربعی ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، ابواب الرھون، باب من باع عقارا ولم یجعل ثمنہ فی مثلہ [۲۴۹۰]، ص ۲۶۲۶، دارالسلام للنشر والتوزیع الریاض، الطبعۃ الثالثۃ محرم ۱۴۲۱ھ/ اپریل ۲۰۰۰ء

یہ حکم تو ان لوگوں کے لئے ہوا جن کے مال میں ''الاصل'' اور ''العفو'' کی صورت بھی پیدا ہو سکے باقی جن کی گذر اوقات کسی ''اصل کی آمدنی پر نہیں ہے مثلاً ملازم پیشہ لوگ جو یا مزدوری وغیرہ کرتے ہیں ان کو اپنے مصارف میں کسی قانون کی پابندی کرنی چاہیے اس کا جواب سورہ بنی اسرائیل کی آیت

﴿لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾ (بنی اسرائیل:۲۹)

''نہ ڈالو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن اور نہ کھولو اس کو پورے طور پر کھول دینا''۔

اور سورہ الفرقان کی آیت

﴿الَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا﴾ (الفرقان:٦٧)

جو لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ صرف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں ہوتی ہے راہ ان کی ان کے درمیان ''قوام''۔

''قواما کی تفسیر کرتے ہوئے بیضاوی نے قوام یعنی قاف کے زبر کی صورت میں اس کا ترجمہ ''وسطاً عدلاً'' کیا ہے۔ وجہ یہ لکھی ہے کہ

لا ستقامة الطرفين

چونکہ دونوں پہلو اس میں سیدھے ہوتے ہیں۔

اور ''قوام'' قاف کے زیر سے اس کا ترجمہ

مايقام به الحاجة لا يفضل عنها

جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور قدر حاجت سے نہ بڑھے۔

خلاصہ یہی ہے کہ درمیانی حالت اختیار کرنی چاہیئے لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی معین بات نہ ہوئی جس کا مطلب یہی ہوا کہ یہ ہر شخص کے اختیار تمیزی کے سپرد ہے کہ اپنے مصارف کو حد اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دے نہ روکنے میں نہ خرچ کرنے میں اور واقعہ یہی ہے کہ جن لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ کوئی اصل نہیں ہے۔ بجز ان کے اختیار تمیزی کے اور اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے کہ خود ان ہی کے سپرد ان کا معاملہ کیا جائے اور یہی کیا گیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۴۴۹۔۴۵۳

آیت : ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ﴾ (البقرہ : ۲۴۳)

''کیا نہیں دیکھا تو نے ان لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے پھر فرمایا ان کو اللہ نے کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

اس آیت کے تحت مولانا لکھتے ہیں:

آپ جانتے ہیں کہ بندہ کا تعلق اس فرقے سے بھی کسی نہ کسی حد تک ہے جو قرآنی آیات کے متعلق اعتبار و اشارہ سے بھی کام لینے کا عادی ہے یعنی یہ نہیں کہ خدا کا مطلب کیا ہے بلکہ آیت کے پڑھنے سے پڑھنے والے کا ذہن جس مطلب کی طرف کبھی کبھی منتقل ہو جاتا ہے اسی کو اشارہ کہتے ہیں اسی سلسلہ میں چند اور آیتوں کے ساتھ ایک آیت یہ بھی ہے کہ پڑھنے کے ساتھ ذہن کا انتقال ہمیشہ ادھر ہوتا رہا کہ ایسی قومیں جو باوجود کافی عددی قوت رکھنے کے اپنے اوطان و دیار سے بھاگ جانے پر محض جان ہی لینے کے لئے جو آمادہ ہو جاتی ہیں مثلاً پاکستان اگر قائم ہو جائے اور اقلیت والے غیر پاکستانی علاقوں کے مسلمان ہم الوف (ہزار ہا ہزار) بلکہ لاکھوں لاکھ ہونے کے باوجود اگر پاکستان کی طرف بھاگنا شروع کر دیں تو اس وقت مسلم اقلیت والے صوبوں کے ان مسلمانوں کی زندگی کا واحد راستہ یہ ہوگا کہ ان کو موتوا (مر جاؤ) یا مر جانے پر جوں ہی کہ وہ آمادہ ہو جائیں گے حق تعالیٰ ان کو ان کے ان ہی ''دیار'' اور ''اوطان'' میں زندگی بخشنے کا، ثم احیاھم کا تماشا ان کے سامنے پیش ہوگا گویا حاصل یہی ہوا کہ ''وہی جلایا جائے گا جو مرنے پر آمادہ ہوگا'' اسی تجربی مقدمہ کی طرف مذکورہ بالا آیت سے فقیر کا ذہن منتقل ہوتا رہا ہے ''الناس'' اور بنی آدم پر اسی کو اگر اللہ کا فضل قرار دیا جائے زندگی جیسی دشوار چیز کا آسان نسخہ جس پر ہر شخص قادر ہے یعنی موت؟ اس سے اس چیز کا پیدا ہونا جس پر کوئی قادر نہیں یعنی زندگی، قدرت کا یہ قانون یقیناً اس کا فضل عظیم ہے لیکن اس قانون سے نفع اٹھانے والے بہت کم ہیں۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، پاکستان قرآنی روشنی میں (صدق لکھنو) ۱۵ جون ۱۹۴۶ء

آیت : ﴿كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (البقرہ:۲۶۴)

''(احسان کرنے کے بعد احسان جتلانیوالوں کی مثال) اس شخص کے جیسی ہے جو خرچ کرتا ہے اپنے مال کو لوگوں کو دکھانے کے لئے، اور نہ مانتا ہے وہ اللہ کو اور نہ پچھلے دن کو (یعنی قیامت کے دن جو بدلہ کا دن ہے اس کے یقین سے بھی وہ محروم ہوتا ہے۔''

سرمایہ داروں میں بعضوں کو جو دیکھا جاتا ہے کہ ''العسریٰ'' کی زندگی بسر کرتے کرتے اچانک کبھی کبھی کچھ دن کے لئے ایک ہی دن دو دن کے لئے سہی کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ بہ ظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اب ان پر گویا ''الیسریٰ'' کی زندگی آسان کی گئی ہے، مثلاً کسی تقریب کے موقعہ پر وہی شخص جس نے ساری عمر ایسی گذاری جس کا گذارنا شاید کسی ادنیٰ درجہ کے غریب قدری معیشت رکھنے والے کے لئے بھی دشوار ہو، لیکن یہی غریبوں سے بھی غریب تر زندگی رکھنے والا چند دنوں کے لئے امیر بننے کا مظاہرہ کرتا ہے، یا وہی جو ''جمع وعد'' کے جالوں اور چالوں سے کام لے لے کر تمام عمر غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنے کا ذریعہ اپنے سرمائے کو بنائے رکھتا ہے۔ ایک ایک روپے کو غریبوں کی جیبوں میں پہنچا کر سیکڑوں اور ہزاروں روپے وصول کرتا رہتا ہے، اس طور پر وصول کرتا رہتا ہے کہ وصولی کی اس مہم میں کسی غریب کی غربت کسی لاچار کی لاچاری پر لحہ بھر کے لئے بھی اس کا دل ترس نہیں کھاتا، لیکن ناگاہ دیکھا جاتا ہے کہ شہر کے کسی موڑ اور چوراہے پر یا کسی بڑا ودیا اسٹیشن کے سامنے ''دھرم'' کے نام سے کسی بلند و بالا اونچی عمارت کی تعمیر میں وہی اس لئے مصروف ہے کہ تھکے ماندوں کو آرام ملے گا، مسافر اس میں ٹھہرائے جائیں گے، یا ازیں قبیل چیرٹی Charity اور خیرات خانے کے نام سے کسی بڑی رقم کا اعلان اس احساس کے ادعا کے ساتھ کرتا ہے کہ اس کا دل آدم کی بے سرمایہ اولاد کے لئے روتا رہتا ہے۔ مفلوک الحالوں کے لئے اس کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے، انسانی ہمدردی کے ان ہی شریفانہ جذبات سے بے کل ہو ہو کر کبھی ہسپتال کھولتا ہے، کبھی محتاجوں کے لئے مشہور کرتا ہے کہ اس نے سدا برت جاری کیا ہے، غریبوں میں غلہ تقسیم کرتا ہے، حالاں کہ یہ واقعات آئے دن دنیا میں پیش آتے ہیں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ دلوں میں یہ سوال کیوں پیدا نہیں ہوتا کہ نظریہ ابتلائیت کے انکار کے بعد کرنے والے یہ سب کچھ جو کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں، خدا اور خدا کی ذمہ داریاں ہی اگر انہیں یاد رہتیں تو سرمایہ کے جمع کرنے میں وہ خدا کی مرضیات سے بے پروائی ہی کیوں برتتے، یہ نہیں تو کیا واقعۃً غریبوں کی غربت پر واقعی کیا ان کا دل دکھا ہے؟ انسانی برادری کے متعلق ان کے دل میں کیا رحم کا کوئی جذبہ حقیقۃً متلاطم ہوا ہے؟ جن کی مالی فربہی سراسر غریبوں کے خون ہی کے چوسنے سے پیدا ہوئی ہے، کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ ان کا دل غریبوں کی غربت پر تڑپ سکتا ہے، افلاس پھیلا پھیلا کر ملک کے عام باشندوں سے امراض کے مقابلہ و مقاومت کی قوت جن کے کرتوتوں کی بدولت سلب ہوئی ہو، کیا ان ہی بے دردوں کو ان بیچاروں کی بیماریوں سے بھی کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے؟ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے جب وہ خرچ کرتے ہیں، تو یقینا سوال ہوتا ہے کہ کیوں کرتے ہیں؟ آیئے سیکھیے، قرآن کی آیتیں سیکھیے، آپ خود نہیں سوچتے تو قرآن جو کچھ کہتا ہے خدارا اسے تو سوچا کیجئے، ارشاد ہے،

﴿كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

جس سے معلوم ہوا ہے کہ خرچ کرنے والے صرف اسی لئے خرچ نہیں کرتے کہ خدا ان کے اس خرچ سے خوش ہوگا یا خدا کی مخلوق کو اس سے فائدہ پہنچے گا، بلکہ خرچ کی ایک صورت وہ بھی ہوتی ہے، جس میں نہ یہ مقصود ہوتا ہے نہ وہ بلکہ ریاء الناس (لوگوں کو دکھانا) یہی ان کے مصارف کا نصب العین ہوتا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ دیکھنے اور دکھانے کا تعلق خدا سے جو توڑ چکا ہے اب وہ دکھائے بھی تو آخر کسے دکھائے، جن کو غریب بنا کر وہ اپنی امیری پیدا کرتا ہے، ان ہی غریبوں کی آنکھ میں اپنے دھرم سالوں اپنے ہسپتالوں سے، سچ پوچھئے تو سرمایہ داروں کا یہ طبقہ خاک جھونکنا چاہتا ہے۔ ''تکذیب بالحسنی'' سے پیدا ہونے والی لعنتوں کو اس تدبیر سے چاہتا ہے کہ لوگوں کی ستائشوں اور مدح سرائیوں سے بدل دے اور اس لئے سینکڑوں چوہوں کی نگلنے والی یہ بلی دراصل ''حج'' کے لئے کر سکتی ہے، بلکہ سب نہیں تو ایک بڑا گروہ ان میں ایسے بد باطنوں، سیاہ سینوں کا بھی ہوتا ہے جو ''ریاء الناس'' کی اس کمان سے بھی غریبوں کے قلوب کو ہمز ولمز کے تیروں اور برچھیوں سے گھائل کرنا چاہتا ہے۔ تا کہ دوسروں کی تسلی ہو، جیسے اس خیال سے باوجود قدرت واختیار کے اللہ کے خاص بندے غربت کی زندگی گذارتے ہیں، ٹھیک اسی کے مقابلہ میں دوسروں کو تلملانے اور جلانے کے لئے اپنے مالی زور اور سرمایہ کی قوت کا یہ مظاہرہ کرتے ہیں اور جن کی نیت یہ نہ بھی ہوتی ہو، لیکن ''نظریہ ابتلائیت'' سے ہٹ کر خرچ کرنے والوں کے سامنے یہ بات تو ضرور رہتی ہے کہ دوسروں پر ان کی دولتمندی کا رعب قائم ہو، ان کی بڑائیوں کا دنیا میں چرچا ہو، وہ کتنا بڑا آدمی ہے، محفلوں اور مجلسوں میں اس کا تذکرہ کیا جائے۔

بہر حال اب یہ ہو یا وہ ہو، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عمر بھر کی غربت کی زندگی کے بعد چند دنوں کی امیری کے اس مظاہرے سے جو اغراض ان کے پیش نظر ہوتے ہیں، ان میں کہاں تک کامیاب ہونے کا موقعہ ان کو دیا جاتا ہے، قرآن نے ایک مثالی بیان سے بایں الفاظ اس کو واضح کیا ہے۔

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرۃ:۲۶۴)

''تو اس کی (ریاء الناس) کے لئے خرچ کرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چٹان ہو اس پر گرد جمی ہے تو برسی اس پر بارش پس چھوڑ دیا اس کو (یعنی گرد بجھی ہوئی چٹان) سپاٹ نہیں ہاتھ لگتی ان کو اپنی کمائی اور اللہ نہیں راہنمائی فرماتا ہے ناشکروں کی''۔

ایک مطلب تو اس کا وہی ہو سکتا ہے، جس کا ذکر قرآن ہی کی دوسری آیتوں میں آیا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو جاتا ہے، اس طور پر برباد ہو جاتا ہے کہ ان مصارف کا کوئی ثمرہ ان کے ساتھ نہیں جاتا، آخر خدا کو دکھانے کے لئے جو خرچ نہیں کرتا، تو اس وقت جب خدا ہی سے بدلہ پانے کی گھڑی سامنے آئے گی، اسے کیا مل سکتا ہے، جن لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے، ظاہر ہے کہ قیامت کے دن وہ تو بدلہ دے نہیں سکتے، اور جو بدلہ اس وقت تقسیم کرے گا اسے دکھایا نہیں گیا تھا

قرآن کی اس قسم کی آیتیں مثلاً

﴿مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۱۷)

''مثال اس کی جو خرچ کرتے ہیں اس پست زندگی میں اس ہوا کے مانند ہے جس میں پالا (مارنے والی ٹھنڈک تھی) پہنچی یہی پالا مارنے والی ہوا ان لوگوں کی کھیتی پر جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔ پس برباد کردیا اسی ہوا نے اس کھیتی کو، اور نہ ظلم کیا خدا نے ان پر، لیکن اپنے آپ پر وہ خود ظلم کرتے رہتے ہیں''۔

یا

﴿فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً﴾ (الانفال:۳۶)

''پس وہ خرچ کرتے ہیں، پھر بن جاتا ہے یہی خرچ ان کے قلوب کی حسرت''۔

ظاہر ہے کہ غیر ابتلائی انفاق کے یہ وہ نتائج ہیں جو مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ان کے سامنے پیش آئیں گے۔

لیکن صفوان یعنی چٹان والی مثال جو دی گئی ہے، جس پر گرد جمی ہوئی ہو، پانی کی ایک بوچھاڑ آتی ہے اور دھو دھا کر پھر اسے صاف ستھرا سپاٹ بنا دیتی ہے، اس مثال پر اگر غور کیا جائے تو ریاء الناس والے مصارف یعنی بجائے خدا کے لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرنے والے جو خرچ کرتے ہیں، اور جس جس قسم کے اغراض شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ ان سارے اغراض پر موجودہ زندگی ہی کے حساب سے یہ مثال صادق آتی ہے، آخر میں پوچھتا ہوں کہ پبلک کی آنکھوں میں دھرم سالوں اور ہسپتالوں کی خاک جھونکنے والے سود خواروں کو باوجود یہ سب کچھ کرنے کے دنیا نے کیا کبھی اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا؟ ممکن ہے کہ وقتی طور پر سپاس اور شکر کے الفاظ پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہو جاتے ہوں، لیکن تشکر و امتنان کی یہ گرد لوگوں کے قلوب پر کتنی دیر تک جمی رہتی ہے، جوں ہی کہ ان دھرم سالے بنانے والوں ہسپتال کھولنے والوں کے متعلق یہ خبر شہر میں پھیلتی ہے کہ ہزار روپے دیکر آج فلاں بیچارے کی لاکھ روپے کی کوٹھی نیلام کرادی گئی، اس کا یہ سارا کیا کرایا کیا دھل کر نہیں رہ جاتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ وہ حکومتیں بھی تو جگہ جگہ ہسپتال قائم کرتی پھرتی ہیں، سڑکیں بناتی ہیں، پل بھی تعمیر کرتی ہیں، جن کے ظالمانہ مطالبوں، بھاری بھاری محصولوں کے ذکر سے دنیا چیخ اٹھی ہے، عدالت و انصاف تعلیم اور ذرائع تعلیم کے ان سوداگروں کے متعلق آخر دلوں میں کیوں رواداری نہیں پیدا ہوتی؟ جم جم کر آخر وہ گرد کیوں دھل دھل جاتی ہے، جسے بنی آدم کے قلوب پر مختلف ترکیبوں اور تدبیروں سے اس قسم کی چالاک حکومتیں بچھاتی رہتی ہے، کیا یہ دلیل نہیں ہے اس بات کی کہ ''ریاء الناس'' کے مصارف کا اثر قائم بھی ہوتا ہے تو بہت جلد زائل ہو جاتا ہے، دلوں کی گہرائیوں میں جو خیالات ان کے متعلق جاگزیں رہتے ہیں، دب جانے کے بعد وہی ابھر کر ان پر مسلط ہو جاتے ہیں، اسی طرح ریاء الناس کے جس خرچ میں آنکھوں کا دکھانا اور دلوں کا دکھانا مقصود ہو، یا دکھانا نہ سہی، اپنے مالی جلال اور سرمایہ کی قوت کا رعب جمانا مقصود ہو، خود ہی خیال کیجئے کہ دکھانے یا جمانے کے ان دونوں عمل کے اثر کی عمر بھی کتنی ہو سکتی ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۲۲۲-۲۲۵

آیت : ﴿ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ إِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ﴾ (البقرہ:۲۷۱)

''اگر صدقات کھلے بندوں ادا کرو تو یہ بھی اچھا ہے، اور اگر اسے چھپاؤ اور دو ناداروں کو تو یہ بہتر ہے تمہارے لئے اور زائل کرے گی یہ پوشیدہ خیرات تمہاری برائیوں کو۔''

صدقات کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جسے علانیہ کھلے بندوں دیا جائے اور یہ بات اسی صدقہ میں پائی جا سکتی ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اور دوسری قسم ''الصدقات'' کی وہ ہے جسے چاہئے کہ آدمی چھپا کر ادا کرے، قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے کہ ان باتوں کا ازالہ اس خفیہ صدقہ سے ہوتا ہے جو آدمی کو بری معلوم ہوتی ہوں کہ ''السیات'' بری باتوں ہی کو کہتے ہیں، اُن حدیثوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے جن میں خبر دی گئی ہے کہ بلاؤں کو صدقہ کے ذریعہ سے ٹالا جا سکتا ہے یا صدقہ خدا کے غصے کو بجھا دیتا ہے، غالباً یہ خاصیت خفیہ صدقات ہی کی بیان کی گئی ہے۔ تجربہ بھی اسی کا شاہد ہے۔ صدقات کی اسی قسم کے متعلق غالباً آنحضرت ﷺ کا حکم ہے کہ انھیں اس طریقہ سے لوگوں کو دیا کرو کہ داہنے ہاتھ کی خبر بائیں کو نہ ہو۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص:۱۸۴

آیت : ﴿فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِه﴾ (البقرہ:۲۷۹)

''اگر ایسا تم نہیں کرتے (یعنی ربوا کے کاروبار کو ترک نہیں کرتے) تو پھر اعلان جنگ دے دو اللہ اور اس کے رسول کو''۔

قصہ یہ ہے کہ قرآن نے ربوا کی ممانعت کرتے ہوئے منجملہ اور دھمکیوں کے جو یہ دھمکی دی ہے کہ:

﴿فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِه﴾

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ربوا کو اسلام نے ان جرائم کی فہرست میں داخل کیا ہے، جن کا انسداد اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ یعنی صرف وعظ و نصیحت ہی سے کام نہیں لیا جائے گا، بلکہ بزور شمشیر بھی اس کے لیے انسداد کی کوشش اسلامی حکومت کو کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو مذہبی آزادی کیساتھ ساتھ اس کی بھی آزادی حالانکہ بخشتی ہے کہ باہم مسلمانوں میں جو معاملات ناجائز ہیں، مثلاً شراب نوشی، خنزیر فروشی وغیرہ لیکن ذمیوں کے مذہب میں وہی معاملات اگر جائز ہوں تو اجازت دی گئی ہے کہ باخود ان معاملات کو وہ اسلامی حکومت میں بھی کر سکتے ہیں اور ان کے اعتبار سے یہ افعال غیر آئینی نہیں قرار دیئے جاتے ہیں لیکن اس قسم کے تمام معاملات میں سے صرف الربوا یعنی سود کے معاملہ کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کا قاعدہ تھا کہ غیر مسلم ذمیوں سے جب معاہدہ فرماتے تو مذہبی امور اور معاملات کی آزادی کے ساتھ ساتھ اس کی تصریح بھی معاہدہ نامہ میں کر دی جاتی تھی کہ سود کا کاروبار ہمارے علاقہ میں نہیں کریں گے۔ نجران کے عیسائیوں سے عہد ذمہ کا معاملہ جب طے ہوا تو منجملہ اور باتوں کے عہد نامہ میں لکھا گیا جیسا کہ کتاب الاموال میں ابو عبید نے نقل کیا ہے اس کے یہ الفاظ بھی تھے:

علی ان لا یا کلو الربا فمن اکل الرباء من ذی قبل فذمتی منه بریئة

''عیسائی عہد ذمہ جن کا قبول کیا گیا ہے ان پر حکم بھی عائد کیا جاتا ہے کہ وہ سود نہ کھائیں گے پس ان میں جو سود کھائے گا تو میرا یہ عہد ذمہ ان سے الگ ہو جائے گا یعنی باقی نہ رہے گا۔''

شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے کہ علاوہ نجران والوں کے ہجر کے ذمی مجوسیوں کو بھی آنحضرت ﷺ نے لکھ کر بھیجا تھا:

ان تدعوا الربا او یا ذنوا الحرب من الله و رسوله

''یہ کہ سودی کاروبار کو ترک کر دیں یا پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ پر تیار ہو جائیں۔''

اسی بنیاد پر ہمارے فقہا نے طے کر دیا ہے کہ اسلامی قلمرو میں سودی کاروبار کی اجازت کسی کو نہیں دی جائے گی حتی کہ ان غیر مسلموں کو بھی نہیں جو امن کا معاہدہ کر کے ہمارے علاقہ میں تجارت وغیرہ کے لیے آئیں یعنی مستامنوں کو بھی اس معاملہ سے بزور حکومت روکا جائے گا۔ اسلامی عدالت ہر حال میں اس کو مسترد کر دے گی خواہ معاملہ جن لوگوں پر بھی ہوا ہو۔

سود کے ساتھ جب اسلامی آئین کا یہی نقطہ نظر ہے تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ ہر وہ شخص جو اسلامی حکومت کے حدود میں مقیم ہے اس کے متعلق اسلامی حکومت یہ طے کیے ہوئے ہے کہ ربوا کے اعتبار سے سب کا مال معصوم ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات گیلانی، شیخ زاید اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۲-۱۴۴

آیت : ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ:۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔

مذہبی حقائق اور غیبی امور جن کے جاننے کے لیے انسانی فطرت بے چین ہے اور رہے گی، ان کے براہ راست جاننے کی تو عام انسانوں میں صلاحیت نہیں ہے، لیکن ماننے کی صلاحیت ہر فطرت میں ہونی چاہیے۔ شیخ اکبر نے اس کا اظہار کرنے کے بعد کہ عقل سے حق تعالیٰ کا علم حاصل کرنے والا اتلہ اور گمراہ ہے، ارقام فرمایا ہے کہ عقل کا کام علم نہیں بلکہ انما حسبه التهيو والقبول مايهبنه الله من ذالک فالهم۔ یعنی عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ خدا کے عطا کیے ہوئے معلومات کو قبول کرے۔

کیوں کہ ایسا مذہب جو ہم پر ایسے معلومات پیش کرتا ہو جس کے ماننے کی بھی فطرت انسانی میں گنجائش نہ ہو تو وہ جنوں یا فرشتوں کا مذہب تو ہو سکتا ہے، انسانوں کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے مذہب حق کے اسی معیار کا ذکر اپنے مشہور اصول ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ میں کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو بھی اس کی فطری گنجائش سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی ہے۔ ایمان ہو یا عمل، ہم میں جس چیز کی صلاحیت پیدا کر دی گئی ہے اسی کا ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔[1]

[1] گیلانیؒ، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۶۱

﴿آل عمران﴾

آیت : ﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ﴾ (آل عمران:۱۴)

''سنواری گئی ہے آدمی کے لئے خواہشوں کی چاہ یعنی عورتوں کی، اور بیٹوں کی، ڈھیروں ڈھیر سونے اور چاندی کی، خوبصورت گھوڑوں کی اور مویشیوں اور کھیتوں کی''۔

جس قدرت نے انسان اور انسان کی فطرت بنائی ہے۔ اسی نے آدمی کی جبلت میں ان امور کی گوارائی پیدائشی طور پر پیدا کی ہے۔ جیسا کہ لفظ ''زین'' کے مجہول صیغہ کا اقتضاء ہے۔ یعنی ان امور کی پسندیدگی اور ان کے حب و میلان کو آدمی نے خود اپنے اختیار سے اپنے اندر نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ پیدا کرنے والے نے آدمی کو ان امور کے میلان اور حُب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اور جو آدمی کی فطرت سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ واقعہ یہی ہے، اور ان امور کو تو کسی نہ کسی حد تک ضروریات معاشی میں بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قرآن تو صاف صاف لفظوں میں مالا بدمنہ (Necessaries) ضروریات سے گذر کر آسائش و راحت، رفاہیت و زینت وغیرہ کے ساز و سامان تک کے متعلق صرف جواز کے فتوی ہی پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ ''زینت اللہ'' اور ''الطیبات من الرزق'' (Lurury) کے استعمال سے گریز کرنے والوں کو اس عتابی استفہام

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الاعراف:۳۲)

''بولئے کس نے حرام کی ہے اللہ کی آرائش کو جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا اور صاف ستھری روزی کو''۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو لوگ قدرت کی ان نعمتوں سے ''الحیوۃ الدنیا'' اور اس معاشی زندگی میں ان سے بھاگ بھاگ کر اپنے اندر عادتی چڑ اور کراہت پیدا کرلیں گے ان کے کراہت زدہ قلوب پر اخروی نعمتوں کی قدر و قیمت کا کتنا وزن باقی رہ سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ مسلمانوں کے سب سے بڑے روحانی پیشوا سید الانبیا علیہ الصلوۃ والسلام تک کو

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾ (التحریم:۱)

''اے نبی! کیوں حرام کرتے ہیں آپ اس چیز کو جسے حلال کیا ہے اللہ نے آپ کے لئے''۔

کے الفاظ سے حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا، جس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ ''روحانیت'' کے بلند سے بلند مقام تک میں ان چیزوں سے گریز، جنھیں قدرت نے معاشی استفادہ کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے مفید تر کیا ہوگا۔ بلکہ باعث ضرر ہی ہو سکتا ہے۔ علامہ ابوبکر بن الجصاص اس بنیاد پر فرماتے ہیں۔

ان لا فضيلة فى امتناع اكلها

جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ حلال فرما چکا ہو ان کے کھانے سے پرہیز کرنے میں کسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ جب شاہی ساز و سامان کو بھی قرآن انسانیت کے ارتقا کی آخری منزل یعنی ''نبوت'' کے منافی نہیں خیال کرتا، باوجود پیغمبر اور خدا کے رسول ہونے کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق مختلف مقامات میں شیش محل، عرش و تخت و کرسی، محاریب و تماثیل قدر و راسیات (بڑی بڑی دیگیں) صافنات الجیاد (قیمتی گھوڑے) ہر قسم کے بناء (معمار) غواص (غوطہ زن) جنود (افواج) سب ہی چیزوں کا ذکر کرتا ہے اور ان تمام امور کو قرب الٰہی کے مقامات عالیہ کے منافی نہیں قرار دیتا۔ تو مجھے

ان پر تعجب نہیں ہے جو اپنے جہل کی وجہ سے بعض مسلمانوں کے طرز عمل کو دیکھ کر اسلام کو بھی ایک قسم کا راہبانہ مذہب قرار دینا چاہتے ہیں۔ بلکہ حیرت ان پر ہے جو یہ جاننے کے باوجود کہ ''اسلام میں رہبانیت نہیں ہے''۔ اس بدیہی دعوی کو نظری قرار دے کر اس کے ثبوت میں بلا وجہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں، اور بعض کمزور یا ضعیف روایتوں سے استدلال کر کے گویا باور کراتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر یہ چند روایتیں نہ ہوتیں تو اعتراض کرنے والوں کا گویا اعتراض باقی رہ جاتا، میرے خیال میں تو اسلام رہبانیت نہیں ہے۔ اس کو دعویٰ قرار دیکر دلیل پیش کرنے کی زحمت اٹھانی ایسی بات ہے۔ جیسے کوئی دعوی کرے کہ روشنی تاریکی نہیں ہے۔ اور اس پر استدلال کے لئے بھی تیار ہو جائیے۔ السیوں کے لئے جو اسلام کی طرف رہبانیت کو کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال کی تردید کے لئے قرآن کو جہاں سے بھی کھول کر دکھایا جائے گا۔ غالباً یہ کافی ہو سکتا ہے۔ جس کتاب کی جوہری تعلیم ہی اس پر مبنی ہو کہ قدرت نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے۔ انسان ہی کے لئے پیدا کیا ہے، اور اس نظریہ کو مختلف پیرایہ میں بار بار ہر تھوڑی دیر کے بعد دہرایا گیا ہو۔ اس کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی ''معاش گریز'' خیال کا اندیشہ کیا جائز ہو سکتا ہے۔[1]

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۳۔۵

آیت : ﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ (آل عمران:۱۵)

"بولئے کیا خبر دوں تمہیں اس چیز کی جو بہتر اور خیر ہے اس سے (وہ چیز یہ ہے) یعنی جنھوں نے پارسائی اختیار کی، ان کے مالک کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہیں (ان باغوں میں وہ) اور (تمام عیوب ونقائص سے صاف وپاک جوڑے، اور اللہ کی رضامندی، اور اللہ اپنے بندوں کا بینا ہے۔"

نقائص سے صاف وپاک جوڑے اور اللہ کی رضامندی اور اللہ اپنے بندوں کا بینا ہے۔

انسانی فطرت کے لئے حقیقی الخیر دراصل وہی "رضوان من اللہ" یا "اللہ کی رضامندی ہے، یعنی لامحدود قدرت وطاقت والے کا انسانی فطرت کے لامحدود احساسات وخواہشوں کے ساتھ کامل موافقت وتطابق تام، اسی کا نام "رضوان من اللہ" یا خدا کا راضی ہوجانا ہے، اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یوں بھی کی گئی ہے۔

﴿لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ﴾ (حم سجدہ:۳۱)

"(الخیر والی اس زندگی میں) تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو گے اور وہ سب کچھ جو تم مانگو گے، (کہ لامحدود قوتوں اور قدرتوں والا، لامحدود طلب رکھنے والے سے راضی ہو چکا ہے، پس اب یہ جو چاہے گا، وہ اسی کو پورا کرے گا)۔"

الجنات، ازواج مطہرات، یا اسی قسم کی اور چیزیں دراصل اسی اجمال کی بعض تفصیلی وتمثیلی شکلیں ہیں، الخیر کی جن جن شکلوں کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے، بہ ظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ موجودہ زندگی میں انسانی فطرت کے اندر لامحدود تمناؤں کی جو بھٹی جوڑی گئی ہے، اور محدود شکلوں میں بعض آرزوئیں یہاں آدمی کی جو پوری ہو جاتی ہیں، تو غرض اس سے یہی ہے کہ آئندہ کی لامحدود طلب کا جذبہ آدمی میں پیدا ہو، پیاس بھی ہے اور پیاسے کو پانی کے چند گھونٹ پلا بھی دیئے گئے ہیں، پینے کی اس لذت سے مانوس ہونے، بلکہ پیاس کے بھڑک اٹھنے کے بعد اس وقت تک جب تک اس پیاس کی کامل تسکین کا سامان نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ پیاسے کو نہ قرار مل سکتا ہے، ورنہ اسے ملنا چاہیئے۔ پس آرزوؤں اور تمناؤں کے گلا گھونٹنے کی راہبانہ وجوگیانہ تدبیریں فطرت کے قانون سے کھلا ہوا مقابلہ ہے۔ صحیح راہ یہی ہے کہ بجائے دبانے اور بجھانے کے ان آرزوؤں کو صحیح رخ پر لگانے کی کوشش کی جائے، جس کی عملی صورت یہی ہے، اور یہی ہو بھی سکتی ہے کہ اپنی نہ ختم ہونے والی لامحدود تمناؤں اور آرزوں کے متعلق ایک طرف تو یہ قطعی فیصلہ کر لینا چاہیے کہ متاع الدنیا کے محدود سرمایہ سے ان کی تسکین ناممکن ہے، اور دوسری طرف نکل جانا چاہئے۔ آدمی کو اس قوت و قدرت کے لازوال سرچشمہ کی تلاش میں جس کی لامحدودیت کی شہادت کائناتی حقائق کا ذرہ ذرہ اپنے لامحدود کمالات کے مظاہرہ سے ادا کر رہا ہے۔

دل من مسافر من کہ خداش یار بادا،

قرآن ہی میں ایک موقعہ پر الآخرۃ کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے پہلے تو یہ فرمایا گیا کہ

﴿لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ (الکھف:۱۰۸)

''یعنی (آلاخرۃ کی بہشتی اور فردوسی زندگی، سے لوگ منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔''

اسی کے بعد مشہور آیت ہے

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکھف:۱۰۹)

''بتادو کہ اگر سمندر بھی روشنائی بن جائے میرے رب کے کلمات (کے لکھنے کے لئے) تو سمندر (کا پانی) ختم ہو جائے گا، قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگرچہ ہم اس سمندر کے مانند دوسرے سمندر کو بھی لائیں۔''

پڑھنے والے پڑھتے ہیں، لیکن مقدم الذکر اور مؤخر الذکر دونوں آیتوں میں ربط کیا ہے، شاید اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، حالانکہ یہاں بھی اسی مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے میں بیان کر رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ فردوسی زندگی سے لوگ منتقل اسی لئے ہونا نہیں چاہیں گے کہ اُس زندگی میں لامحدود کمالات رکھنے والی ذات اپنے ان ہی لامحدود کمالات کو لامحدود کلمات کے ذریعہ سے ظاہر کرتی رہے گی، انسانی احساسات اپنے اردگرد، پس و پیش، اندر و باہر ہر لمحہ، ہر لحظہ ایسے نت نئے تجلیات کو مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پاتے چلے جائیں گے، جن کی نہ کوئی حد ہوگی نہ انتہاء اور یوں لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطلوبات سے متمتع اور لذت گیر ہونے کا موقعہ ابدالا باد تک ملتا جائے گا، اس وقت تک جس کی کوئی انتہا نہیں اور جس کا کوئی اختتامی نقطہ نہیں ہے اور یوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسان کی جدت پسند فطرت نو بہ نو شکلوں میں اپنے اس جذبے کی تسکین کا سامان حاصل کرتی چلی جائے گی، گویا

ہر لحظہ جمال خود نوع دگر آرائی　　　شورِ دگر انگیزی، شوقِ دگر افزائی

کا ایک نہ ختم ہونے والا تماشا ہوگا عجیب تماشا اور یہ سب دراصل ''رضوان من اللہ'' کے حصول میں کامیابی ہی کی تفصیلات ہوں گی جو ''المفلحون'' (کامیاب ہونے الوں) کے سامنے لامحدود شکلوں میں پیش ہوتے رہیں گے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۳۹۔۱۴۱

آیت : ﴿ وَ لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَ اخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾ (آل عمران : ۱۰۵)

''اور نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جو ایک دوسرے سے جدا جدا ہوئے اور مختلف ہوئے بعد اس بات کے ان کے پاس ''بینات'' آ چکے تھے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے۔''

آپ دیکھ رہے ہیں اختلفوا سے پہلے ''تفرقوا'' کا لفظ ہے جس سے اشارہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں بظاہر اسی طرف کیا گیا ہے کہ لوگ دراصل تفریق کو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنا چاہتے ہیں، تب اس جدائی کا ذریعہ مذہب کے اختلافات کو بنا لیتے ہیں حالانکہ ''البینات'' ان کے پاس موجود رہتا ہے۔

اسی آیت کو پیش نظر رکھ کر اسلام کا نقطۂ نظریہ سمجھ میں آتا ہے کہ دین کے جس حصہ کی حیثیت ''بینات'' کی ہو یعنی دین سے جس کا تعلق بالکل واضح اور روشن ہو، مثلاً وہ ساری چیزیں جو عمومیت کی راہ سے منتقل ہوتی ہوئی مسلمانوں میں چلی آ رہی ہیں اسلام کے ساتھ ان کا تعلق اتنا واضح اور اتنا بین اور کھلا ہوا ہے کہ جو اسلام اور ان چیزوں کو جانتا ہے خواہ مسلمان ہو یا نہ ہو شاید اسلام کا ان کے بغیر وہ تصور ہی نہیں کر سکتا مثلاً قرآن یا حج یا نماز، رمضان کے روزے وغیرہ ان کا یہی حال ہے۔

بہر حال ان ہی ''البینات'' پر متفق و متحد ہو جانے کے بعد ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے ''غیر بیناتی'' حصہ کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کی حرکت جدا کرنے والوں کو عذاب عظیم کی مستحق بنا دیتی ہے۔ حاصل یہی ہوا کہ قدرتی طور پر جن اختلافات کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ان سے نہیں منع کیا گیا ہے۔ اور نہ ان سے منع کیا جا سکتا ہے کہ اختیاری حدود میں وہ داخل ہی نہیں ہیں بلکہ ان ناگزیر قدرتی اختلافات کو چاہئے کہ باہم ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے ممانعت کا حقیقی رخ انسان کے اسی ارادی فعل کی طرف ہو سکتا ہے اور اسی کی طرف اس کا رخ ہے بھی۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، تدوین حدیث، مکتبہ اسحاقیہ کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۳۰۲

﴿النساء﴾

آیت : ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا﴾ (النساء:۲۸)

''انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ آدمی ہو یا آدمی کے سوا دوسری جان رکھنے والی ہستیاں، زندگی کی مدت جن کی جتنی بھی ہو، اس مدت کو گذارنے کے لئے جن ضرورتوں کی وہ محتاج ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا حصول زیادہ تر جسمانی توانائیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب مقابلہ کر کے دیکھئے کہ جسمانی توانائیوں میں اس غریب انسان کا اسی جیسی زندگی رکھنے والی دوسری ہستیوں کے مقابلہ میں کیا حال ہے۔ مشاہدہ کی بات ہے بے سروسامانی اور بے نوائی کے جس حال میں آدمی اس دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ مشکل ہی سے دوسرے زندہ وجودوں میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ آخر جو اون، بال، کھر، پر، بازو، سینگ، چنگل اور از یں قبیل بیسیوں قدرتی ساز وسامان کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ گویا ان میں ہر ایک اپنی چادر، اپنا اوڑھنا بچھونا، اپنا لباس، اپنی کھڑاؤں کہئے یا بوٹ اپنی سواری وغیرہ وغیرہ لے کر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ بھلا اس کا مقابلہ وہ غریب کیا کرسکتا ہے۔ جو ایک زندہ لوتھڑے کے سوا ابتداء میں گویا کچھ نہیں ہوتا اور ننگا، ہر قسم کے سامانوں سے خالی جسد بھی جو اس کو ملتا ہے سوا تنا نازک وناتواں، حساس، اثر پذیر جسد ہوتا ہے کہ اپنے طبعی مسکن (کرہ ہوا) کے موسموں کی معمولی شدت کا مقابلہ بھی بآسانی نہیں کرسکتا۔ گرمی ہو یا سردی۔ ان موسمی تغیرات کی ہلکی سی شدت آدمی کو بوکھلا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ حالانکہ زمین کے کرہ پر اسی انسان کے ساتھ کتنے آنے والے آئے، رہے اور آباد ہوئے۔ ان کا مسکن بھی وہی ہے جو انسان کا مسکن ہے، لیکن موسمی تکلیفوں سے بچنے کے لئے ان کو ان دردسریوں میں مبتلا ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ جن میں غریب آدمی مبتلا رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عموماً جتنی بھی جان رکھنے والی ہستیاں ہیں، پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان میں بھی وہ ساری قوتیں اچانک ظہور پذیر نہیں ہوتیں۔ جن سے آئندہ اپنی زندگی کی ضرورتوں کی فراہمی میں وہ کام لیتی ہیں، بلکہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دن اس کیلئے گذارنے ہی پڑتے ہیں۔ اسی لئے ابتداء میں قدرت کی طرف سے ان کے ماں باپ میں اس کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا ہے کہ اپنے اپنے طریقہ سے اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش ونگرانی کریں مگر اس لحاظ سے بھی جب آدم زادوں کا مقابلہ دوسرے حیوان زادوں سے کیا جاتا ہے تو آسمان وزمین کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک مرغی کے ہی بچوں کو دیکھئے ،کوئی شبہ نہیں کہ مہینے دو مہینے تک ان کو اپنی ماں کی نگرانی کی حاجت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس نگرانی میں جو آدم زاد کو اپنی ماں کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اور اس نگرانی میں جو مرغی کے بچوں کو اپنی ماں کی ہوتی ہے کوئی نسبت بھی ہے۔ انڈا کھٹکنے کے ساتھ ہی مرغی کے بچے دانہ چگنے لگتے ہیں۔ ان کی ماں کا کام صرف تلاش کرنا اور بلا کر ان کی خوراک کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کتنے سلیقے سے دو دن کے بچے ان دانوں کو چگتے ہیں۔ مرغی کے ان سعید وباتمیز بچوں کو خیال تو کیجئے، گوشت کے اس لوتھڑے سے کیا تعلق جس کا نام آدمی کا بچہ ہے اور فرق اسی نقطہ پر ختم کب ہوتا ہے؟ آدمی کے سوا جتنے بھی ہیں، جتنی کم مدت میں ان کا پیدائشی ضعف قوت کے انتہائی مدارج تک پہنچ جاتا ہے۔ اس مدت کو اس طویل زمانہ سے کیا سروکار جو آدمی کے بچوں کو اسی قوت کے حاصل کرنے میں صرف کرنا پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن مدارج کو دوسرے دنوں میں طے کرتے ہیں آدم زاد مہینوں میں ہی نہیں، بلکہ برسوں میں طے کرتا ہے۔ ماں باپ کی اعانت وامداد سے آزاد ہو کر خود اپنی معاش کے متکفل ہونے کے لئے آدمی کو عام حالات میں کم از کم پندرہ سولہ سال کی مدت تو چاہئے لیکن اس سولہ سال کی مدت میں دیکھا جاتا ہے کہ انسان کے سوا تقریباً جتنے بھی ہیں خود وہی نہیں بلکہ ان کی چند پشتیں ضعف کے مدارج کو طے کر کے قوت کے اسی مقام پر ہوتی ہیں۔ جہاں ہانپتے کانپتے گرتے پڑتے بہ ہزار خرابی آدمی کا بچہ پہنچتا ہے۔ پھر جب اس پر غور کیا جائے کہ پیدائشی ضعف کے ازالہ کے بعد دوسروں میں معاشی ضرورتوں کے حصول کی جو قوتیں

بروئے کار آتی ہیں۔ عموماً آخر عمر تک ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ ماں باپ کی نگرانی سے الگ ہونے کے بعد یہی وجہ ہے کہ زندگی گذارنے کے لئے ان میں سے کسی کو کسی دوسرے کی قطعاً حاجت نہیں ہوتی ہر ایک اپنی خود مکتفی زندگی گذارتا ہے۔ اپنی قوت بازو سے آخر وقت تک خود کھا کھا کر اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ لیکن بنی آدم کا کیا حال ہے۔ ایک تو خدا خدا کر کے ان کے ضعف کا ازالہ ہی برسوں کے بعد ہوتا ہے اس کے بعد حصول معاش کی جو قوتیں انسان کے دست و بازو میں نمایاں ہوتی ہیں۔ زیادہ زمانہ گذرنے نہیں پاتا کہ بتدریج دبے پاؤں پھر وہی پیدائشی ضعف مختلف راستوں سے، مختلف بھیس میں سر لکالنا شروع کرتا ہے اور بالآخر ایک ایسے نقطہ تک پہنچ کر رہتا ہے کہ تقریباً وہی حال جس حال میں آدمی پیدا ہوا تھا، دیکھا جاتا ہے کہ پھر اسی کی طرف پلٹ گیا۔ جیسے شروع میں نگرانوں کا ماں باپ کی شکل میں محتاج تھا۔ آخر میں وہی آدمی ان ہی نگرانوں کا بیٹے اور بیٹیوں، پوتے اور پوتیوں کا دست نگر نظر آتا ہے۔ پیدائشی ضعف کی طرف جیسے قرآن میں خلق الانسان ضعیفا کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ظہور قوت کے بعد دوسرا ضعف جو اس پر طاری ہوتا ہے مندرجہ ذیل آیۂ کریمہ

﴿خَلَقَكُم مِّن ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّ شَيْبَةً﴾ (الروم:۵۴)

''پیدا کیا خدا نے تمہیں ضعف سے پھر ضعف کے بعد قوت (نمایاں ہوتی ہے) اور قوت کے بعد پھر ضعف اور پیرانہ سری (آدمی پر مسلط ہو جاتی ہے)''۔

میں ذکر فرمانے کے بعد قوت کے بعد والے طاری ہونے والے ضعف کے ان آثار کا تذکرہ جو آدمی کے ظاہر جسد میں نمایاں ہوتے ہیں، بایں الفاظ فرمایا گیا کہ

﴿وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ (یٰس:۶۸)

''اور جسے ہم معمر کرتے ہیں۔ پلٹاتے ہیں ہم اسے اس کی خلقت میں''

یہ تو باہر ہوتا ہے کہ لمبے لمبے ہاتھ پھولی پھولی گردنیں، مچھلیاں نکلے ہوئے بازو، قوت و زور سے بھری ہوئی پیٹھیں، پٹھوں سے جکڑی ہوئی ٹانگیں بتدریج گھٹتے گھٹاتے، گھلتے گھلاتے ایک لپٹی ہوئی گٹھڑی کی شکل میں بدل جاتی ہیں۔ گویا وہی گوشت کا ایک زندہ لوتھڑا جیسے آدمی شروع میں معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں بھی وہی کیفیت بلکہ شاید اس سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اس لوتھڑے پر جو ابتداء میں پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کو پیار آتا ہے اور اس جھری پڑے ہوئے کانپنے والے اور تھرتھرانے والے مضغہ گوشت کے دیکھنے سے تو نگاہوں کو دکھ پہنچتا ہے۔ طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔ بسا اوقات دیکھنے والوں میں گھن پیدا ہوتی ہے۔ تنکیس اور پلٹاؤ کی یہ کیفیت تو باہر میں طاری ہوتی ہے، اور اندر میں جو انقلاب برپا ہوتا ہے، باطنی قوتوں کی ساری آبادیاں جس طرح اجڑ کر برباد ہوتی ہیں قرآن ہی نے۔

﴿يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ (النحل:۷۰)

''پھر پلٹا دیتے ہیں ہم اس کو بدترین سن کی طرف (یہ اس لئے ہم کرتے ہیں تا کہ نہ جانے جاننے کے بعد کسی چیز کو۔''

کے الفاظ میں اس واقعہ کا اظہار کیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۰۲۔۱۰۴

آیت : ﴿لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (النساء:۲۹)

''اور باطل (یعنی غیر آئینی طور پر) باہم ایک دوسرے کا مال نہ کھایا کرو، الا یہ کہ باہمی رضامندی سے تجارت کا طریقہ لین دین میں اختیار کیا جائے''۔

مذکورہ بالا قرآنی آیت میں جن اموال کے احترام کا مطالبہ کیا گیا ہے ان سے مراد وہی اموال ہیں جو اسلامی آئین کی رو سے عصمت وحفاظت کے دائرے میں داخل ہو چکے ہیں یعنی اموال معصومہ ہی سے ان کا تعلق ہے اور وہی ان احکام کے مورد خاص ہیں۔ اموال کے لین دین میں قرآن نے چونکہ باہمی رضامندی کو مشروط کر دیا ہے اس لئے غنیمت اور فئی کے نام سے دوسروں کا مال لینا ناجائز ہے اگر کوئی اس قسم کی بات کرے تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ اموال کے احترام کا جن نصوص میں مطالبہ کیا گیا ہے آپ نے سمجھا ہی نہیں کہ ان کا تعلق معصومہ اموال سے ہے ورنہ غیر معصومہ اموال کے متعلق تو قرآن ہی میں

﴿فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ (الانفال:۶۹)

''پس کھاؤ (اس مال کو جو بہ غنیمت حاصل ہوا) حلال اور پاک وطیب (سمجھ کر)''۔

کا فتویٰ موجود ہے یہ فتویٰ ان ہی اموال کے متعلق دیا گیا ہے جنہیں مسلمان نہ خرید وفروخت کی راہ سے حاصل کرتے ہیں اور نہ ہبہ ووراثت وصدقہ وخیرات کی راہ سے یعنی مال والوں کی رضامندی کے بغیر بزور وقوت جو مال چھین لیا جاتا ہے اس کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ کھاؤ اس کو حلال اور صاف ستھرا طیب و پاک سمجھ کر اس سے معلوم ہوا کہ باہمی رضامندی کی شرط جن اموال میں لگائی جاتی ہے ان کے دائرے ہی سے اموال کی یہ دوسری قسم خارج ہے جن کے متعلق مال والوں کی رضامندی کے حاصل کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مقالات گیلانی، شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب، لاہور، ص ۸۱۔۸۰

آیت : ﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾(النساء : ۲۹)

"نہ قتل کرو باہم اپنے آپ کو"۔

احترام نفوس کے متعلق مذکورہ بالا قرآنی آیت میں جن جانوں کے احترام کا مطالبہ کیا گیا ہے ان سے مراد وہی نفوس ہیں جو اسلامی آئین کی رو سے عصمت وحفاظت کے دائرے میں داخل ہو چکے ہیں یعنی نفوس معصومہ ہی سے ان کا تعلق ہے اور وہی ان احکام کے مورد خاص ہیں۔

اسی لئے اس قسم کا استدلال کہ جہاد میں مسلمان کو چونکہ قتل نفس کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور قتل نفس نص قطعی کی رو سے حرام ہے اس لئے جہاد بھی حرام ہے ایک مضحکہ خیز استدلال ہے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کیونکہ جہاد میں جن نفوس کے قتل کا ارتکاب ناگزیر ہے وہ اس آیت کے دائرہ خطاب میں داخل ہی نہیں ہیں جن کا احترام اور جن کی حفاظت مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید مولانا، مقالات گیلانی، شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب، لاہور، ص ۸۱۔۸۰

آیت : ﴿وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (النساء:۳۲)

''اور نہ آرزو کیا کرو ان چیزوں کی جن کی وجہ سے برتری بخشی ہے خدا نے بعض کو تم میں بعض پر۔''

آیت قرآنی میں جہاں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ بعض کی بعض پر برتری خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں، وہیں برتری اور ترجیحی سلوک کے ان قصوں میں آرزو آفرینیوں سے حق تعالیٰ نے منع فرما کر یہی چاہا ہے کہ پیائشی مغالطوں سے پیدا ہونے والے خواہ مخواہ کی اس غیر ضروری کوفت سے مسلمانوں کو نجات عطا فرمائی جائے۔ حاصل یہی ہے کہ اپنی اپنی واقعی ضرورتوں اور حاجتوں کی حد تک سوچنا اور اسی کے مطابق جدوجہد کرنا یہ اور بات ہے، اور فیتے لگا لگا کر اپنے آپ کو دوسروں سے ناپ ناپ کر بیٹھے بٹھائے لوگ جو ''غم نداری بُز بخر'' کے عارضہ میں خود اپنے ہی ہاتھوں مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ قطعاً دوسری چیز ہے، سعی و عمل کے تو ہم مکلف ہیں۔ لیکن ناپا ناپی کے ان قصوں میں مبتلا ہو کر لوگ جو ہانپ رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، اور اسی کا نام انھوں نے دنیاوی فکر اور معاشی تردد رکھ چھوڑا ہے، کسب معاش کی ٹھوس، مادی ضرورتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ ایک خود ساختہ غم، خود پرداختہ الم ہے۔ جس میں اپنی سبک مغزی کی وجہ سے وہی مبتلا ہو جاتے ہیں، جن میں زندگی کے واقعی اور غیر واقعی حقیقتوں میں تمیز کا سلیقہ نہیں ہوتا۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۴۵

آیت : ﴿الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا﴾ (النساء:۳۸)

''جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال کو لوگوں کو دکھا کر اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور جس کا ساتھی شیطان ہو، اس کا بہت برا ساتھی ہے۔''

جس طرح دنیوی مصارف ''احتساب'' کے قانون کی بناء پر دینی مصارف بن جاتے ہیں۔ بعینہ ہمارے تمام دینی مصارف دنیوی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ یعنی ''تبذیر'' کے تحت داخل ہو جاتے ہیں، یہ کیسے ہوتا ہے؟ قرآن ہی نے اس کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔

﴿الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا﴾

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نیکی کے بہترین کام ہی میں کیوں نہ خرچ کرے۔ لیکن اگر اس نے یہ سارا خرچ ''الناس'' (لوگوں) کو دکھانے کے لئے کیا ہے اور اس کے سامنے نہ خدا ہے اور نہ روز جزا ہے بلکہ صرف چند لوگوں پر اپنی دولت کی دھونس جمانا، محلہ، ٹولے، بستی یا شہر، ملک یا دنیا میں نام آوری حاصل کرنا، اپنی بڑائی اور کبریائی کا اعلان مقصود ہے تو جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا اس شخص کے ساتھ وہی بر خود غلط طاقت یعنی شیطانی قوت ساتھ لگ گئی ہے، اپنی مالی طاقت کو غلط محل پر اسی طریقے سے خرچ کر رہا ہے جیسے شیطان نے اپنا استعمال غلط کر دیا۔ دوسری جگہ اسی ''ریاء الناس'' والے خرچ کے متعلق ارشاد ہے کہ

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ﴾ (البقرہ:۲۶۴)

''اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ چٹان پر گرد ہو، اور اس پر بارش برسے پھر اسے سپاٹ بنا چھوڑے ایسے لوگ جو کچھ کماتے ہیں اس کے کسی حصہ پر قابو نہیں رکھتے اور ناشکروں کی خدا رہنمائی نہیں کرتا۔''

ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اور اس کے انعام کے دن کو چھوڑ کر جو محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے وہ یہی کرتا ہے کہ اپنی امیری اور دولت مندی کے نشانات لوگوں کے حافظوں اور دلوں پر قائم کرنا چاہتا ہے، اپنے بچوں کی شادیوں میں دھوم مچانے والے تقریبات پر روپے لٹانے والوں کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ان لوگوں کی یہ ساری مالی زور آزمائیوں کا اثر عوام کے قلوب پر چند دنوں سے زائد قائم نہیں رہتا۔ ٹھیک اس کی مثال وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے کہ چٹان پر گرد بیٹھی، پانی کا ایک چھینٹا آیا اور سب صاف، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ چاندی اور سونے کے گرزوں اور لاٹھیوں سے یہ لوگ عوام کے دل و دماغ میں جو اپنے لڑکے کی ختنہ یا شادی کی یاد ٹھونسنا چاہتے ہیں خواہ مخواہ کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے جو اپنے حافظوں کو ان بوالفضولوں کے مصارف کی یاد کے لئے ہمیشہ بیدار رکھے، تماشا ہوا، دیکھ لیا گیا اور لوگ بھول گئے۔

الحاصل ''الناس'' کو پیش نظر رکھ کر جو دکھاوے کا خرچ کرتے ہیں یہ اپنے تمام مصارف خواہ بہ ظاہر وہ کتنے ہی دینی نظر آتے ہوں، مثلاً کسی مدرسہ کو دیں، مسجد بنائیں، پبلک ورکس میں دیں، ہسپتالوں پر خرچ کریں، کچھ بھی کریں، قرآن کی رو سے یہ سب دنیوی، بلکہ شیطانی خرچ بن جاتا ہے۔

اور یہی میرا دعویٰ تھا کہ اسلام نے دینی اور دنیوی مصارف کی ان دو قسموں کو ختم کر کے صرف دینی یا صرف دنیوی خرچ میں دولت کے مصارف کو منحصر کر دیا ہے۔

یہاں ایک نکتہ کا ذکر ضروری ہے، اسلام نے جہاں اس قسم کے عجیب قوانین پیش کئے ہیں ان ہی میں اس کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسانی فطرت کے طبعی رجحانات اور جبلی عواطف ومیلانات کی بھی ساتھ ساتھ رعایت کرتا جاتا ہے اور کوئی ایسی تدبیر نکال لیتا ہے جس کے ذریعہ سے اصل مقصد جو اس کا ہے وہ بھی فوت نہ ہو اور عام انسانی کمزوریوں کا بھی نباہ ہو جائے۔

یہی ''ریاء الناس'' والا قانون ہے۔ عقلاً اس کے بے نتیجہ ہونے اور غلط مصرف ہونے میں کیا شبہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا۔ مگر کیا کیجئے کہ انسان میں دولت کی نمائش کا جذبہ بھی تقریباً فطری ہے۔ دولت کمانے والے بہر حال کچھ اس کی نمائش بھی چاہتے ہیں، اسی جذبہ کی رعایت ہے جس کا سراغ ان حدیثوں سے ملتا ہے جن میں آنحضرت ﷺ نے بعض دولت مندوں کو پھٹے اور برے حال میں دیکھ کر دریافت فرمایا کہ

الک مال (کیا تمہارے پاس مال ہے) جواب میں کہا گیا نعم (ہاں) آپ نے فرمایا من ای المال (کس قسم کے اموال تمہارے پاس) جواب ملا من کل المال (ہر قسم کا مال) مثلاً اونٹ، گھوڑے، بکریاں، غلام سب ہی کچھ ہیں، یہ اس شخص نے کہا آنحضرت ﷺ نے تب اس سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا۔

فاذا اتاک الله مالا فلیر اثر نعمة الله علیک و کرامته ۱

جب خدا نے تمہیں مال دیا ہے تو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور جو تمہیں سرفراز کیا ہے وہ دکھایا جائے۔

ظاہر ہے کہ دکھایا جائے گا تو الناس ہی کو دکھایا جائے گا جس کے معنی یہی ہوئے کہ لوگوں کو اپنی مالی حیثیت دکھانی چاہیئے اس کا حکم ہے، لیکن برائی کی تصحیح کے لئے احتساب کا ایک پہلو جو حضور ﷺ نے نکال لیا وہ یہ ہے کہ اپنی دولت ونعمت کو خدا کا عطیہ قرار دے کر اور اس نیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر دولت کی نمائش کی جائے گی تو یہ دکھانا اور ''ریاء الناس'' بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوا۔ اس لئے جس بربادی یا دولت کے غلط استعمال کا جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا۔ اسی نقطہ نظر کو ایک اور حدیث میں اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے کہ

ان الله یحب ان یری اثر نعمته علی عبده ۲

اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اپنی نعمت کے نشانات کو اپنے بندے پر دیکھیں۔

گویا ''الناس'' کو یہ دکھانا، الناس کو دکھانا نہیں ہے بلکہ اپنے مالک ہی کو دکھانا ہے خدا کی یہ نعمتیں ہم پر ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہی انما الاعمال بالنیات کے قانون سے ''ریاء الناس'' جیسا لغو بلکہ شیطانی فعل بھی ملکوتی صفت بن جاتا ہے اور ان سارے معاملات کا تعلق باطن اور اندر سے ہے۔ کون کس لئے کیا کر رہا ہے۔ اس کا فیصلہ یوم تبلی السرائر ہی کے دن ہوگا کہ اب تک سائنس کسی ایسے آلہ کی ایجاد میں کامیاب نہیں ہوئی ہے جس کے ذریعے سے لوگوں کی نیتوں کا حال معلوم ہو سکے۔ ۳

۱ السجستانی، ابی داؤد سلیمان بن الاشعث، سنن ابی داؤد، کتاب اللباس باب فی الخلقان وفی غسل الثوب (۴۰۶۳)، دار السلام للنشر والتوزیع الریاض، ص ۱۵۲۰

۲ الترمذی، ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ، جامع الترمذی، ابواب الادب ما جاء ان اللہ تعالیٰ یحب أن یری أثر نعمته علی عبده (۲۸۱۹)، ص ۱۹۳۴، دار السلام للنشر والتوزیع الریاض

۳ گیلانی، مناظر احسن سید، اسلامی معاشیات، ص ۴۴۴-۴۴۶

آیت : ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء:۴۸)

''قطعاً خدا نے بخشے گا اس امر کو کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور بخش دے گا اس کے سوا (یعنی شرک کے ماسوا) جس کے لیے چاہے گا''۔

زندگی کے تمام شعبوں میں خالق تعالیٰ جل مجدہ کے مرضیات اور اس کی ہدایتوں کی رہنمائی و اطاعت کو جو اپنے وجود کا آخری اور واحد نصب العین یقین کرتے ہوئے خدائی احکام و مرضیات کے مقابلے میں ہر قسم کے غیر خدائی آراء اور مشوروں سے آزادی اور کنارہ کشی کو ایک مختتم اور نہ بدلنے والے فیصلے کی صورت میں قبول کر چکا ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام کے کلمہ دعوت ''لا الہ الا اللہ'' پر ایمان لا کر ہر چھوٹی بڑی مخلوق کے الہ ہونے کا قطعی طور پر انکار کرتے ہوئے، صرف اللہ ہی کو اپنا اللہ بنا چکا ہے، اپنی تمام حاجتوں اپنے نسک، اپنی صلاۃ کا مرجع سارے جہان کے پالنے والے ''اللہ رب العالمین'' ہی کو یقین کرتا ہے اور اسی پر جینا، اسی پر مرنا چاہتا ہے۔ اسی کی اجمالی تعبیر یہ ہے کہ عبدیت کے کلی دستور کے آگے سر تسلیم وہ خم کر چکا ہے، تو میں اس قسم کے آدمی کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کے ایمان کے بعد اگر جزئیات اور تفصیلات میں عملاً کبھی کبھی اس کی مرضی، حق کی مرضی سے متصادم ہو جاتی ہے، تو گو قانون مجازات کی رو سے وہ مستحق سزا ضرور ہے، لیکن جس کا رحم اس کے غضب سے آگے بڑھ جاتا ہے، اگر وہی مجازات کے ان نتائج سے اس کو بچا لے، تو پیغمبروں نے ماں کی مامتا اور باپ کی محبت سے بھی زیادہ، بہت زیادہ چاہنے والے جس ارحم الراحمین کو باور کرایا ہے، رحم سے بھری ہوئی اسی ذات کے ساتھ اگر یہ حسن ظن قائم کیا جائے تو مذہب نے اس حسن ظن کی حوصلہ افزائی کی ہے، بلکہ قرآن کی مذکورہ بالا مشہور آیت کا جو مفاد ہے، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو خدا کی مرضیات کی اطاعت اور اس کی بندگی کو صرف اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھتا، بلکہ دوسروں کو بھی اس میں شریک قرار دیتا ہے، یعنی وہی بات کہ عبدیت کے کلی دستور کو اپنے وجود کا نصب العین نہیں ٹھیراتا اور حق کے سوا دوسرے کو بھی الہ بناتا ہے، قرآن کی رو سے قانون مجازات کی زد سے ایسا آدمی کسی طرح بچ نہیں سکتا کہ وہ بغاوت کلی کا مرتکب ہے۔ حق تعالیٰ کی حکومت میں رہنے والے بندوں پر خدا کے سوا غیر خدا کے قانون کو نافذ کرتا ہے اور غیر خدا کی اطاعت و عبادت کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اور یہی مطلب ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ﴾

''یعنی خدا نہیں بخشتا اس کو جو اس کے ساتھ شریک ٹھیراتا ہے۔''

کا لیکن عبدیت کے کلی دستور پر جس کا ایمان ہے اور اللہ ہی کو جو اپنا الہ دل سے بغیر تذبذب اور شک کے مان چکا ہے لیکن باوجود اس کے اس دستور کی جزئی دفعات سے اس کی زندگی کا کوئی عملی رخ کبھی متصادم ہو جاتا تو چوں کہ کلی بغاوت کے نہ مٹنے والے داغ سے اس کا دامن پاک ہے، اس لیے مذکورہ بالا آیت میں اعلان کیا گیا ہے کہ خدا چاہے تو قانون مجازات سے اس مجرم کے جرم کو مستثنیٰ فرما دے، بہر حال وہ باغی نہیں مجرم ہی ہے، بغاوت کا نہیں صرف خطا و قصور کا مرتکب ہے:

﴿یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾

اور بخش دے اس کے یعنی (شرک) کے ماسوا جسے چاہے۔

بہر حال جب شرک کی یہ نہ ٹلنے والی سزا ہے، یعنی جب خدا کے ملک اور حکومت میں اس کے بندوں پر کسی دوسرے کی حکومت و اطاعت و بندگی و عبادت کو جائز ٹھیرانے والوں کے باغی ہونے کی وجہ سے یہ ان کی قدرتی سزا ہے، تو جو اپنے کو سرے سے

خدا کے لیے نہیں سمجھتا، اس کی مرضی کی پابندی کو اپنا فرض خیال نہیں کرتا یعنی سرے سے حق تعالیٰ کو اپنا الٰہ ہی نہیں تسلیم کرتا، یا العیاذ باللہ خدا کے وجود ہی کا وہ منکر ہے، ظاہر ہے کہ ایسے سخت باغیوں کے سامنے خدا کا مجازاتی قانون جتنی بھی ہولناک اور مہیب شکلوں میں نمایاں ہو، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ نجات کی راہیں جب شرک ہی سے ہمیشہ کے لیے مسدود ہو جاتی ہیں تو بغاوت کی ان شدید تر قسموں کی جو سزا بھی ہو کم ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۱۶۰، ۱۶۲

آیت: ﴿ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴾ (النساء:۷۸)

''اگر ان کو کوئی اچھائی پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں یہ خدا کی جانب سے ہے اور اگر کوئی برائی پہنچتی ہے، تو کہتے ہیں تیری جانب سے ہے۔ کہو کہ سب کچھ خدا کی جانب سے ہے۔ اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرد بھی نہیں پھٹکتے''۔

خداوند تعالیٰ نے ''صدور'' اور ''خلق'' کے تفرقے کو ان لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴾ (النساء:۷۸)

اس آیت میں تو خداوند تعالیٰ نے حسنات (اچھائیاں) اور سیئات (برائیوں) کے خلق کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور خلاف مرغوبات کفار تعلیم دی۔

﴿ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾

''سب خدا کی جانب سے ہے''۔

اور پھر ارشاد کیا کہ خلق شر و خیر میں کوئی برائی نہیں، بلکہ عین کمال، بلکہ اس کے خلاف ہونا نقص ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴾

'' آخر اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات سمجھنے کے گرد نہیں پھٹکتے۔''

البتہ اگر نقص ہے، تو شر کا مصدر ہونا ہے اور مصدر شر کا انسان ہی ہے، جیسا کہ اسی کے بعد فرمایا:

﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾ (النساء:۷۹)

''اچھی بات جو تجھے پہنچتی ہے، تو خدا سے ہے اور جو بری بات پہنچتی ہے، تو وہ تیرے نفس سے۔''

کیونکہ پہلی آیت میں لفظ من ''عند'' پر داخل ہے اور ''عند'' لفظ اللہ پر اس سے مقصود یہی ہے کہ خداوند تعالیٰ کی صفت خلق سے دونوں چیزیں موجود ہوئیں اور دوسری آیت میں نفس ذات پر ''من'' داخل کیا۔

﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ﴾

''جو اچھائیاں پہنچتی ہیں، وہ خدا سے ہیں۔''

یعنی: نفس ذات الٰہیہ مصدر خیر ہے، یعنی: خداوند تعالیٰ کی ذات خیر و حسنات کی مصدر ہے۔ شر کی مصادر مخلوقات کی ذاتیں

ہیں، کما قال عزمن قائل :

"فمن نفسک "

''تیری طرف سے ہیں''۔

یعنی: نفس ذات امکانی مصادر سیئات ہیں کہ وہی مدخول لفظ ''من'' ہیں۔

اور خالق و مصدر میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔ آفتاب روشنی کا مصدر ہے، خالق نہیں، شعبدہ گر شعبدہ کی چیزوں، مثلاً: روپیہ، کبوتر، سانپ کا خالق (مجازاً) ہے، مصدر نہیں، پس یہی حال وہاں بھی ہے۔ آتش کدوں کے موبدوں سے جو کچھ غلطی ہوئی ہے، وہ صرف مصدر و خالق کے باہمی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ [1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات گیلانی، حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری (مرتب) ص ۷۵-۷۶

آیت : ﴿مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَ مَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ﴾ (النساء:۷۹)
"تجھے جو بھلائی ملتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے"۔

شر کا وجود کیوں ہے؟ قرآن پاک نے متعدد مقامات پر اس کا صاف اور واضح جواب دیا ہے ان میں سے مشہور آیت یہ ہے:

﴿مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَ مَآ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ﴾

جس کا حاصل یہ ہے جن چیزوں سے انسان کو راحت وسکون ملتا ہے یا اچھی معلوم ہوتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں لیکن جن چیزوں سے تکلیف واذیت ہوتی ہے یا بری معلوم ہوتی ہیں گو اس کا بھی خالق خدا ہی ہے لیکن اس کی پیدائش کی وجہ خود انسان ہی ہے اور وہی اس کا ذمہ دار ہے۔ کیسی عجیب بات ہے، غم اور اسباب غم کو پیدا تو خدا کرتا ہے لیکن ان کا ذمہ دار انسان ہے مسئلہ تقدیر کا یہی تضاد ہے جس نے مذہب کے اس عجیب وغریب دعوے کو عوام کی نگاہوں میں سخت پیچیدہ بنا دیا ہے۔

حق تعالیٰ کی ذات تو برتر ہے کسی ادنیٰ آدمی کی طرف بھی اس امر کے انتساب کی جرات مشکل ہے، صرف یہی نہیں کہ عقل وفطرت سے مسئلہ اچٹ جاتا ہے بلکہ سچ پوچھو تو تقدیر کے جو معنی عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، اگر واقعہ بھی وہی ہے تو ساری مذہبی تحریک بے معنی ہو جاتی ہے، بلکہ اگر منصب نبوت صداقت کے تحت نہیں بلکہ کسی مصلحت کے زیر اثر ہوتا تو جس مسئلہ کو سب سے زیادہ چھپانا انبیا کا فرض تھا وہ یہی مسئلہ ہوتا لیکن از آدم تا خاتم ﷺ پیغمبروں نے اس مسئلہ کی تبلیغ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف واقعات کے شارح ہیں جو، جو واقعہ تھا اس کا اظہار مسلسل وہ کرتے چلے آئے ہیں۔ البتہ مسئلہ چوں کہ پیچیدہ تھا اس لیے عوام الناس کو تاکید کر دی گئی کہ اس پر زیادہ غور وفکر نہ کریں، اور سچی بات بھی یہی ہے کہ باوجود نہ سمجھنے کے پھر بھی اگر اکثریت پر نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو وہ بخوبی سمجھے ہوئے ہیں، نہ صرف مسلمان بلکہ تمام مذہبی دنیا والے تقدیر کو بھی مانتے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنے اعمال وافعال کا اپنے آپ کو ذمہ دار بھی سمجھتے ہیں۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفصیلی طور پر نہ سہی لیکن اجمالی طور پر انسانی فطرت ان دونوں عقیدوں میں کوئی تضاد محسوس نہیں کرتی، چاہیے تو یہی تھا کہ ہم بھی اس مسئلہ میں خاموشی اختیار کرتے، لیکن تکمیل درس کے لیے کچھ کہا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایک طرف جہاں مذہب نے یہ بتایا ہے کہ آفاق وانفس میں جو کچھ ہے سب خدا کی مخلوق ہیں، اور اسی لیے یقین کیا جاتا ہے کہ یہاں کے ہر ذرہ کی حرکت وسکون، خیر وشر براہ راست خالق کی توجہ والتفات کے دست نگر ہیں۔ لیکن اسی کی ساتھ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ سلسلہ تخلیق وایجاد یا ظہور اسما وصفات میں انسان کا کیا مرتبہ ہے اور پھر اس لحاظ سے تمام آفاقی کائنات کے مقابلہ میں اس کی فطرت کے اقتضا اور تقدیر کی کیا نوعیت ہونی چاہیے؟ کہا گیا تھا اور قرآن کے رو سے کہا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں انسان کا مقام، مقام خلافت ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ سرچشمہ کائنات کے تمام اسما وصفات کا مختلف مدارج کے لحاظ سے اجمالی طور پر جس حقیقت میں ظہور ہوا ہے، اسی کا نام انسان ہے اور وہی تکوین وتخلیق کی آخری ارتقائی شکل ہے۔ اب سوچنا چاہیے کہ اس سلسلہ میں جہاں حیات وعلم اور ارادہ وغیرہ صفات الٰہیہ کا ظہور انسان میں ہوا تھا، اسی کے ساتھ کیا اس میں خدا کا وہ کمال نہ اترتا جس کا نام قدرت واختیار ہے؟ خدا میں جو کچھ ہے جب بالا جمال ہی سہی، سب کا عکس انسان میں آ گیا ہے (اور

خلافت کے یہی تو معنی ہیں) تو انسان اس خدائی کمال کے پرتو سے کیوں محروم رہ سکتا تھا؟ پس انسان بھی اگرچہ خدا کا ایک کن فیکونی مخلوق ہے جس طرح ساری آفاقی کائنات اس کے مخلوق ہے، لیکن منصب خلافت نے اس کی حقیقت کے اقتضا اور تقدیر کو اسی صفت اقتدار و اختیار کی بنا پر سب سے الگ کر دیا ہے، سب کی تقدیر جبر تھی اور وہی ان میں نمایاں کہ آفاق اور ان کے آثار و خواص و افعال و وظائف کے درمیان میں کہیں انتخاب یا قوت فیصلہ کی جھلک تک نظر نہیں آتی، لیکن انسان کی تقدیر یا اس کی حقیقت یعنی خلافت کا اقتضاء اختیار تھا جو تقریباً اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے۔ فطرت انسانی کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اس کو ان تمام اعمال و افعال کا ذمہ دار بنا دیا ہے، جن میں اس کی قوت انتخاب کو کسی نہ کسی حیثیت سے دخل ہو، ایسے لوگ جو انسانی حقیقت سے اختیار کے عنصر کا انکار کرنا چاہتے ہیں حقیقت میں خدا کی تقدیر اور اپنی فطرت کے اقتضا کو جھٹلاتے ہیں، رعشہ کی جنبش اور ارادی حرکت میں فرق نہ کرنے والا دیوانہ ہے، انسان مجبور ہے یا مختار؟ ان دو پہلوؤں میں سے کسی پہلو کی ترجیح یا انتخاب خود اپنی قوت فیصلہ سے اختیار کا کیا اقرار نہیں ہے؟ عارف رومی نے سچ فرمایا ہے:

جہد حق است دوا حق ست و درد
منکر اندر نفی جہدش جہد کرد

واقعہ تو یہ ہے کہ عدالتی قوانین، اخلاقی آئین، بلکہ حکومتوں اور سلطنتوں سب ہی کی بنیاد انسان کے اسی نمایاں امتیاز اور عنصر خاص پر قایم ہے، ورنہ درختوں پہاڑوں جانوروں اور حیوانوں پر فرد جرم لگانے کے لیے عدالت کی کرسی کسی نے بچھائی؟

بہر حال اپنے اعمال و افعال کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کا انتخاب یا ترجیح اسی کو اختیار کہتے ہیں اور فطرت انسانی میں اس کا ہونا عقلاً مشاہدۃً اور شرعاً ثابت ہے، یہی اس کا اقتضا ہے اور یہی اس کی تقدیر تھی، اسی حقیقت کی تعبیر یوں کی جاتی ہے کہ ''سب کی تقدیر جبر تھی اور ہماری تقدیر اختیار ہے۔''

لیکن ابھی اس کی تقدیر اور اقتضا کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، خلافت نے اس میں اختیار پیدا کیا، یہی وہ مقام تھا جس نے انسانی پوزیشن کو نازک ترین منزل پر پہنچا دیا خلافت یعنی خدا کی نمائندگی کا اقتضا یہ ہے کہ انسان اپنے اختیار کا مالک بن کر کسی دوسرے کی مرضی کے مطابق نہیں، بلکہ اپنی مرضی کے مطابق انہیں استعمال کرے، اور اختیار کا اقتضا ہے کہ اس کے استعمال صحیح کے لیے علم صحیح سے اس اختیار کا دامن جوڑ دیا جائے اور یوں ہر ایک انسان اپنے اختیار کی تصحیح کے لیے اپنے ناقص علوم کا نہیں، بلکہ خدا کے کامل محیط علم کا محتاج ہو گیا۔

ملائکہ کو بھی آفرینش آدم کے موقع پر یہی جواب دیا گیا تھا کہ آدم میں حق تعالیٰ کی شاگردی اور علم حاصل کرنے کی فطری صلاحیت ہے، یعنی خدا سے علم پا کر وہ اپنے اختیار کے استعمال کی تصحیح کر سکتا ہے۔ * مطلب یہ ہے کہ انسان کے خلیفہ ہونے کی خبر جب فرشتوں کو سنائی گئی تو ملائکہ نے یہ پیش گوئی کی کہ ''یہ زمین میں فساد و خون ریزی برپا کرے گا۔ بظاہر اس پیش گوئی کی وجہ یہی تھی کہ الانسان جیسے جہول وظلوم کو جب اختیار دیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ اختیار کو وہ غلط طریقہ سے استعمال کر کے فساد و فتنہ ہی برپا کرے گا۔ جواب میں دکھایا گیا ہے کہ آدم حق تعالیٰ کی تعلیم کو قبول کر لیتا ہے، گویا یہ اشارہ تھا کہ خدا سے علم لینے کی چوں کہ اس میں صلاحیت ہے اس لیے اپنے اختیار کی تصحیح یہ حق تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے علم یعنی مذہب سے کر لے گا۔ *

انسانی فطرت کے اسی تعلیمی اقتضا نے اس قانون کو پیدا کیا جسے ہم تکلیف وتشریع کہتے ہیں جس کا ظہور انسان کی مختلف آبادیوں میں نبوت کی شکل میں ہوتا رہا ہے، یعنی ہم میں بلند ترین فطرت رکھنے والے نفوس (الرسل والانبیاء علیہم السلام) تو براہ راست حق تعالیٰ کے شاگرد بننے اور علم پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے واسطے سے ان کی امت خدائی تعلیم کو حاصل کر کے اپنے اختیارات کی حدود کو پہچانتی اور اس پر عمل کرتی ہے۔

پھر اس تعلیم الٰہی کی صلاحیت پیدا کرنے ہی کا یہ اقتضا ہوا کہ انسان میں امانت کا جذبہ رکھا جائے جس سے اس میں اس کا احساس پیدا ہوا کہ وہ اپنی مرضی کا نہیں، بلکہ اپنے اعمال وافعال میں اس کی مرضی کا پابند ہے جس کا یہ امین ہے، *امانت کا یہی جذبہ ہے جس کی تعبیر کبھی کانشنس (ضمیر) حاسہ اخلاقی، احساس فرض، وغیرہ مختلف الفاظ سے کی جاتی ہے، ہمیں اپنی خواہش کی نہیں بلکہ اپنے فرض منصبی کی تعمیل کرنی چاہیے۔ انسانی فطرت کا یہ ایسا بدیہی احساس ہے کہ جو خدا کے قائل نہیں ہیں، وہ بھی اپنے اندر اس مطالبہ کا پتہ دیتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے فرض کا احساس سب کو ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس فرض کا عائد کرنے والا کون ہے؟ جب اپنی خواہش کی پابندی نہیں بلکہ فرض منصبی کی پابندی ہی انسان کا فریضہ ہے تو قدرتاً اپنے سوا اس کو ڈھونڈنا چاہیے، جس کے فرض کی بجا آوری کا مطالبہ ہمارا ضمیر کرتا ہے، یہی میرا مطلب ہے کہ جذبہ امانت ہی نے آدمی میں مرضی حق کی تلاش کی یہ تڑپ پیدا کی اور یہی چیز آدمی کو ان بزرگوں کے قدموں پر جھکاتی رہی ہے، جو خدا کا پیغام لے کر بنی آدم میں آتے رہے ہیں۔*

اگر انسان میں امانت کا جذبہ نہ ہوتا تو تعلیم الٰہی کی تلاش کا جذبہ بھی اس میں پیدا نہ ہوتا، اور یہ مطلب ہے اس حدیث کا جس میں وارد ہوا ہے:

لا ایمان لمن لا امانة له [۱]

''جس میں امانت نہیں اس میں ایمان بھی نہیں ہے''۔

قرآن میں جہاں امانت کے اس جذبہ کا ذکر ہے، وہاں بیان کیا گیا ہے کہ ''امانت کا جذبہ انسان میں نہ ہوتا تو وہ ظلوم وجہول بن کر رہ جاتا''۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ اگر انسان کے اختیارات پر امانت کی میخ نہ ٹھونک دی جاتی تو علمی وعملی قوتوں میں اپنے اختیار کے غلط استعمال سے آدمی جاہل ہی نہیں جہول (بڑا سخت جاہل) اور ظالم نہیں ظلوم (بڑا سخت ظالم) بن جاتا۔ اور دیکھا گیا ہے کہ جذبہ امانت سے جو تھوڑا بہت کبھی ہٹے ہیں، انہوں نے اپنی ظلومیت اور جہولیت کا ہمیشہ ثبوت دیا ہے۔ آخر فلسفہ اور متھالوجی میں انسان کی جہولیت اور چنگیزیت وتیموریت، فرعونیت ورومانیت میں ظلومیت کی تصویریں جو جھلک رہی ہیں، کیا ان کے تماشے کے بعد قرآن کے اس دعوے میں کوئی شک کر سکتا ہے * واقعہ یہ ہے کہ صداقت ودیانت کی ضرورت، جیسے عمل میں ہے، ویسے ہی علم وتحقیق میں بھی آدمی ان امور کا ذمہ دار ہے۔ فلسفہ میں کیا ہوتا ہے؟ بے جانے ہوئے ان امور کے متعلق دعائی آرا قائم کیے جاتے ہیں جن کے جاننے کا کوئی صحیح ذریعہ ان لوگوں کے پاس نہیں ہے، جو عقل وحواس کے سوا اپنے پاس علم کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں رکھتے۔ متھالوجی یعنی اقوام قدیمہ کے خرافات جنہیں دیومالا بھی کہتے ہیں اس میں کیا کیا جاتا ہے یقیناً بغیر کسی ذمہ داری کے جو کچھ چاہا جاتا ہے، مان لیا جاتا ہے اور یہی میرا مطلب ہے کہ جذبہ امانت کے اقتضا سے آدمی ہٹ کر جب سوچنے، بولنے، لکھنے لگتا ہے، تو پھر وہ

---

[۱] احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، مسند انس بن مالک (۱۲۴۱۰) [۳/۱۳۵] ص ۴/۳۴۹، عالم الکتب للطباعة والنشر والتوزیع، بیروت لبنان ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء

صرف جاہل ہی نہیں جہول بن جاتا ہے، یوں ہی اعمال وافعال میں جب امانت کی ذمہ داریوں کو کوئی ٹھکرا دیتا ہے، تو وہ ظالم ہی نہیں بلکہ ظلوم بن جاتا ہے، چنگیز، ہلاکو وغیرہ عملی خائنوں ہی کی زندہ مثالیں ہیں۔ *

الحاصل جذبہ امانت بھی فطرت انسانی ہی کا اقتضا تھا امانت کے ہی معنی ہیں کہ وہ اپنی مرضی کا نہیں بلکہ جس کا امین ہے اس کی مرضی کا پابند ہے۔[۱]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۱۶۰۔۱۶۲

آیت : ﴿ وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ﴾ (النساء:۸۳)

''اور جب آتی ہے امن یا خوف کی کوئی بات انکے پاس، تو پھیلا دیتے ہیں اسکو اور اگر (بجائے خود پھیلانے کے) سپرد کر دیا کریں اسے رسول کے یا ان لوگوں کے حوالہ کر دیا کریں جو ان میں (عام مسلمان ہیں) امر اور حکم کا اختیار رکھتے ہیں تو جو واقعہ ہے اسے جان لیا کریں گے۔ وہ لوگ جن میں صحیح نتائج کے نکالنے کا سلیقہ ہے۔''

۱) کسی قسم کی خبریں ہوں، امن کی ہوں یا خوف کی، جس کسی تک جس ذریعہ سے بھی وہ پہونچیں، ذمہ دار بنایا جائے۔ انکے ہر سننے والے کو کہ کسی دوسرے سے انکا ذکر نہ کریں اسکا یقین دلایا جائے کہ ایسا کر کے وہ اپنے خدا کی ناراضگی خریدیں اور اپنے الرحمٰن الرحیم مالک کے مشورہ سے بے اعتنائی برت کر اسکی لاہوتی عنایتوں اور رحمتوں کے سایہ کو کھو بیٹھیں گے۔

۲) اس سلبی ذمہ داری کے احساس کو پیدا کرنے کے بعد لوگوں میں دوسری ایجابی ذمہ داری یہ پیدا کی جائے کہ وقت کے رسول اور رسول نہ ہوں تو جن لوگوں کو حکم اور امر کا اختیار حاصل ہو گیا ہو جنکے امر اور حکم سے سرتابی عوام جرم خیال کرتے ہوں، انہیں لوگوں تک اس قوم کی تمام خبریں پہونچا دی جائیں۔ مثلاً آج جو حال ہے اس لحاظ سے ہر شہر میں مسلمانوں کی کے جو ذمہ دار ارکان ہیں عوام نے جن کے متعلق طے کر لیا ہے کہ انھیں کے مطابق قدم اٹھائینگے، انھیں تک ان خبروں کا پہونچانا قرآنی فریضہ ہر اس شخص کا قرار دیا جائے جسے کسی ذریعہ سے بھی امن یا خوف کی خبریں ملی ہوں۔

۳) پھر امر و حکم والی یہ جماعت ان چیزوں پر غور و فکر کرنے کے لیے اور اسے ہر مناسب مقام میں چیدہ چیدہ اور برگزیدہ دماغوں کا ہی انتخاب کرے اور یہ کام انکے سپرد کر دیا جائے یعنی ہر طرح کی ان خبروں کو سامنے رکھ کر ممکن حد تک صحیح نتائج تک خود پہونچنے کی پہلے خود کوشش کریں اور پہونچ جانے کے بعد دوسروں تک اپنے نکالے ہوئے اور استنباط کے نتائج کو پہونچائیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج جو حال ہے خبروں کے ذریعہ سے فساد اور فتنہ کی جہنم ملک کے ہر گوشہ میں جو بھڑکا دی گئی ہے۔ کیا ان اخباری فتنوں کے انسداد کی راہ میں اس سے بہتر کوئی مشورہ ہو سکتا ہے جو حضارت و مدنیت سے دور، بہت دور، پہاڑوں اور ریگستان میں رہنے والوں کو اسوقت دیا گیا تھا، جب ان کے یہاں نہ خبروں کی تجارت کا کاروبار ہوتا تھا اور نہ گپ فروشی کی لمیٹڈ کمپنیاں قائم کی گئی تھیں، اور نہ چند لوگ اپنے خون کو بڑھانے کے لیے خدا کی بے گناہ لاکھوں مخلوق کے خون بہانے کا منظر دل کی طمانیت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کا تو یہ قرآنی فریضہ ہے کہ ان میں خبروں کی اشاعت کا نظام مذکورہ بالا مشورہ کی روشنی میں قائم کیا جائے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی صحافت کی تنظیم قرآن کی روشنی میں (صدق لکھنؤ) ۲۹ دسمبر ۱۹۴۶ء

آیت: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًاO اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا﴾ (النساء:۱۵۱،۱۵۰)

''جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور رسولوں میں جدائی پیدا کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ درمیان میں ایک راہ نکالیں یہ لوگ پکے واقعی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے دکھ بھرا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اپنے بندوں سے جس توحید کا مطالبہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کی تسلیم و عدم تسلیم پر انسانیت کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہے، وہ وہی بات ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا الٰہ نہ بنایا جائے یعنی از آدم تا خاتم ﷺ سارے جہاں کے پیغمبروں کا جو سب سے پہلا دعوتی کلمہ اور سب سے پہلا مطالبہ ہے، اس مطالبے کی تعمیل کی جائے اور اللہ کو الٰہ بنانے کا مطلب یہی ہے کہ حق تعالیٰ ہی کی مرضی کی اطاعت اور اسی کی بندگی و عبادت کو اپنے وجود کا آخری مطلب اور اپنی پیدائش کا حقیقی مقصد یقین کیا جائے۔

اب ظاہر ہے کہ مطلوبہ توحید جس پر نسل انسانی کی نجات اور آخری کامیابی مبنی ہے، جب اس کا یہی مطلب ہے اور قطعاً یہی ہے، تو پھر وہی بات ہوئی کہ جب تک خدا کی مرضی کا صحیح علم، کمال وثوق اور کسی قطعی غیر مشکوک ذریعہ سے حاصل نہ ہو، آدمی خدا کی مطلوبہ توحید کی تعمیل سے، یعنی اس کو حقیقی معنوں میں الٰہ بنانے سے قطعاً قاصر رہے گا، اس کا لا الٰہ الا اللہ صرف زبانی، چند ہوائی ارتعاشات کا ایک مجموعہ ہوگا جو اپنے معنی سے قطعاً بے تعلق ہے، درحقیقت بجائے اللہ کو الٰہ بنانے کے ایسا آدمی خود اپنے آپ کو یا اپنے ہی جیسے انسان کو جسے خدا نے اپنی مرضی پر مطلع نہیں کیا ہے الٰہ بنائے بیٹھا رہے گا، اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی موحد نہیں، مشرک ہے اور بعض صورتوں میں معاذ اللہ وہ خدا پر جھوٹ باندھنے والا اور اقرار کرنے والا بھی ہے اور اسی لئے اب یہ ایک واضح، ناقابل انکار، نہ صرف دینی و اعتقادی بلکہ قدرتی اور عقلی حقیقت بھی ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے کلمے میں جس توحید کا واقعی مطالبہ کیا گیا ہے، اس کی تعمیل اس دور میں محمد رسول اللہ پر ایمان لائے بغیر ناممکن ہے، اللہ کا رسول محمد ﷺ کو نہ مان کر جو لا الٰہ الا اللہ کی توحید کا آج مدعی ہے وہ مشرک ہے، مفتری علی اللہ ہے، اپنے دماغی وسوسوں یا ایسی چیزوں کو جن میں قطعاً خدا کی مرضی انسانی خواہشات کے ساتھ غلط ہو چکی ہے، وہ انہی کو خدا کی مرضی قرار دے رہا ہے، اور محض اپنی ذاتی خواہشوں کی بنا پر، بجائے خدا کے انہی کی پیروی کر رہا ہے۔ میں نے اسی لیے کہا کہ وہ خدا کی مرضی کی نہیں، بلکہ اپنی مرضی، اپنی خواہش اپنے ذاتی فیصلوں کی اطاعت و پیروی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے ہے، اس کا جینا بھی خود اپنے لیے ہے اور مرنا بھی اپنے ہی لیے ہے، پھر جو خدا کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے لیے جیتا رہا اسے بجائے خدا کے خود اپنی ذات سے اجر کا امیدوار رہنا چاہیے۔ لیکن اس کی باغیانہ زندگی جو مسلسل حق اور حق کے مرضیات کے ساتھ جنگ اور تصادم میں گزری ہے تو اگر بروز مجازات (قیامت کے دن) حق کے ارادوں کو بھی یہ اپنے ساتھ مسلسل اور دوامی تصادم کی شکل میں پائے اور تصادم کا ظہور اس روز ''عذاب الیم'' کے قالب میں ہو تو بتایا جائے کہ قدرتاً اس کے سوا اور کس نتیجے کی توقع ہو سکتی ہے؟ اور یہی مطلب ہے قرآن کی مذکورہ بالا آیت کا۔

پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انتخابی تصرفات کا اپنے آپ کو حق دار سمجھتے ہوئے جو رسول کے پیش کردہ پیغام کی جس چیز اور جس دفعہ کو چاہتا ہے، رد کرتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق جن باتوں کو پاتا ہے انہیں باقی رکھتا ہے۔ تو رد و قبول کے اس صریح باغیانہ

طرزِ عمل کے ساتھ کہ خدا نے جس راہ پر چلنے کا اپنے رسول کے ذریعے سے بندوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، خدا کی عائد کردہ اس ذمہ داری سے من مانے طور پر اپنے کو مستثنیٰ کر کے اپنے لیے اور اپنے ماننے والوں کے لیے اپنی تجویز، اپنے منشا اپنے رجحانات کے مطابق جو نئی راہ بنا رہا ہے۔

مذکورہ بالا آیت قرآن جس کی زندگی کا کھلا ہوا خود اعترافی دستور ہے، اس پر وہی لوگ پکے اور قطعی کافر ہیں، کسی تنگ خیال، تنگ دل، سبک مغز، کافر گر ملا کی طرف سے کفر کا فتویٰ نہیں ہے بلکہ قرآن یہ اپنا ناطق فیصلہ صادر کر رہا ہے، تو قرآن کے اس ناطق اور قطعی فیصلے کے باوجود محض اس لیے کہ قرآنی نیکیوں اور دینی سعادتوں کے بعض صالحہ عناصر کا اس کی سیرت سے چوں کہ مظاہرہ ہو رہا ہے، مجھے اوروں سے بحث نہیں بلکہ ان سے پوچھنا ہے جو قرآنی فیصلے کو خدائی فیصلہ یقین کرتے ہیں انہی سے سوال ہے کہ صرف اس مظاہرے سے متاثر ہو کر اس کے کفر میں تذبذب کے اظہار سے بھی آگے بڑھ کر جو لوگ ایسوں کو ایمان و نجات کی سند دینے کے لیے بے چین نظر آ رہے ہیں اور ان کے قدموں پر جنت کی کنجیاں نثار کرنے کے لیے مضطر ہیں، ضمیر کے ٹوک کو، قرآنی آیت کی غلط تاویلوں[1] سے روکنا چاہتے ہیں تو ان سے پوچھنا ہے کہ غلط رواداری کے ان بیماروں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ کفر کی یہ تقدیس کہیں قرآن کے صریح نصوص کی تکذیب تو نہیں بن رہی ہے؟ بہر حال میرا خطاب اس خاص مسئلے میں اس وقت انہی لوگوں کی طرف ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کو واقعی خدا کا رسول اور قرآن کو واقعی خدا کا کلام یقین کرتے ہیں، ورنہ اپنے خود تراشیدہ خیالات کو خدا کی مرضی قرار دینے کی کن میں جرات ہے جو اپنے دماغ ہی کو خدا کے رسول کا قائم مقام بنا کر اس کی سوچی ہوئی باتوں کو اپنے لیے خدا کا پیغام سمجھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے تصورات و مفروضات کا میدان بہت وسیع ہے، جس کے متعلق چاہیں جنتی ہونے کا فتویٰ صادر کریں اور جسے چاہیں ابد تک کے لیے جہنم کا کندہ بنائیں۔

نبوت محمدیہ کے ساتھ وابستگی کی جو وجہ اب تک بیان کی گئی وہ ایک تاریخی واقعہ اور نفس الامری حقیقت کا نتیجہ ہے یعنی اللہ ہی کو الٰہ بنانے کے لیے اللہ کی صحیح و خالص مرضی کی یافت نبوت محمدیہ کے سوا اب کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں، اس لیے نجات کی طلب اور انسانیت کی ارتقائی یافت کے حصول کے واقعے کے لحاظ سے اب صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔[2]

---

[1] قرآنی آیات کی غلط تاویلوں کی تفصیل "الدین القیم" کے ص ۱۷۱ تا ۱۷۵ میں پڑھیے

[2] گیلانی، مناظر احسن، سیدؒ، الدین القیم، ص ۱۶۶۔۱۶۹

﴿المائدہ﴾

آیت : ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْــٴَـلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَ اِنْ تَسْــٴَـلُوْا عَنْهَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ﴾ (المائدہ:۱۰۱)

نبوت کا دعویٰ جو آنحضرت ﷺ کی طرف سے پیش ہوا تھا ظاہر ہے کہ اس کا کھلا ہوا واضح مطلب یہی تھا کہ علم و عمل کا جو نظام ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس کا تعلق کسی انسان کی محدود فکری قوت اور ناقص پرواز و رسائی سے نہیں بلکہ عالم الغیب والشہادہ کے علم محیط کلی سے ہے ایسے محیط اور کلی علم سے جس سے کھلی، ڈھکی، ظاہر و باطن، ماضی و حال، مستقبل کی کسی چیز کا کوئی پہلو پوشیدہ نہیں ہے...... جوں جوں فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا اور وفود کا تانتا بندھا نت نئے انداز کے مختلف طبائع اور مزاج کے لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آنے لگے اور موقع کو غنیمت جان کر جس کو موقع ملتا تھا حضور ﷺ سے پوچھتا تھا ان سوالات میں زیادہ تر ایسے ہی سوالات ہوتے تھے جن کا دین سے تعلق ہوتا تھا بعض دفعہ تو ان سوالات کے جواب میں وحی نازل ہو جاتی قرآن مجید میں تیرہ مقامات میں یسئلونک کے لفظ سے جن امور کا ذکر ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ یہ ان ہی سوالات کے جوابات تھے جو صحابہ نے مختلف اوقات میں آپ سے دریافت کیے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ سوالات کا ایک مستقل سلسلہ وہ بھی شروع ہوا خصوصاً اجنبی نو وارد لوگوں کی طرف سے جن کا تعلق دین سے نہ ہوتا تھا......اسی طرح بعض لوگ ایسے سوالات بھی کرتے تھے جن کا تعلق گو دین ہی سے ہوتا لیکن اس کے نہ جاننے سے دین میں نہ اضافہ ہوتا تھا نہ کمی......لیکن ایک طرف بعض سادہ مزاج بزرگوں کے عجیب و غریب سوالات اور دوسری طرف مدینہ منورہ میں آستین کے جو سانپ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے طبقات سے منافقانہ طور پر مسلمانوں میں گھل مل گئے تھے ان کی قصداً شرارت بھی شریک ہو گئی کبھی تو آنحضرت ﷺ کی فطری نرم مزاجی کو دیکھ کر کوئی بوڑھی عورت بھی اپنے کسی کام کے لئے کسی گلی میں آپ کو روک لیتی ہے تو آپ رک جاتے ہیں جو کچھ کہتی رہتی ہے سنتے ہیں پانچویں کالم کے اس گروہ نے سرگوشی کے بہانہ سے آنحضرت ﷺ کو ستانا شروع کیا جس کے انسداد کے لئے بالآخر قرآن کو دخل دینا پڑا۔

دوسری طرف یہی بدبخت یہودی جن کے دین کی ہنڈیا پکنے کے بعد جل چکی تھی اور جیسا کہ ہمیشہ سوختہ اور برشتہ مذاہب کی آخری تاریخ کا خاتمہ چند لایعنی دور از کار بے ہودہ سوالات و جوابات پر آ کر منتہی ہو جاتا ہے کسی کا مذہب صرف دستر خوان اور باورچی خانہ کے مسائل میں چکر کھا کر ڈوب جاتا ہے کسی کی ایک کو تین، تین کو ایک بنانے میں ساری مذہبی قوت خرچ ہو جاتی ہے۔ سنتے ہیں کہ بعض بعض ادیان میں آخری سوال و جواب یہ رہ گیا تھا کہ اللہ کے فرشتوں کی کتنی تعداد سوئی کے ناکے سے گزر سکتی ہے ایک فرقہ کا تخمینہ دس ہزار تھا اور دوسرا بارہ ہزار کی تعداد پر مصر تھا مدتوں دونوں فرقوں میں خوب رزم آرائیاں، کشش آزمائیاں ہوئیں یہودی بھی اسی حال میں مبتلا تھے اسی قسم کے دور از کار لا حاصل سوالات سکھا سکھا کر لوگوں کو حضور ﷺ کے پاس بھیجتے اور جواب پر اصرار کرتے بخاری میں ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس کا اونٹ گم ہو جاتا وہ بھی

این ناقتی میری اونٹنی کہاں ہے

کا حضور ﷺ سے فتویٰ پوچھتا بعضوں کو اپنے باپ کے متعلق کچھ اشتباہ تھا وہ بھی اپنے نسب نامہ کی تصحیح کے لئے پیغمبر کے پاس آتے اور

من ابی میرا باپ کون ہے

''میں ایک نرمی برتنے والی ملت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں۔''

کے الفاظ میں خود نبوت ہی کی طرف سے کی گئی ہے قرآن میں بھی

﴿مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾(الحج: ۷۸)

''نہیں رکھی ہے تم پر خدا نے دین میں تنگی''۔

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾(البقرہ : ۱۸۵)

''خدا تو تمھارے ساتھ آسانی ہی چاہتا ہے اور دشواری کو نہیں چاہتا۔''

وغیرہ آیتوں کے سوا خود سرور کائنات ﷺ کا تقریباً ہر موقعہ پر آسانی و سہولت کے پہلو کو اختیار کرنا اور صحابہ کرام کو عام طور پر اس کی وصیت فرمائی جاتی تھی کہ

یسر و او لا تعسر وا،و بشروا ولا تنفر وا[۱]

''لوگوں کو خوشخبریاں سنایا کرنا انہیں بھڑ کا نامت آسانی اور سہولت عطا کرنا دشواری مت پیدا کرنا''۔

اسلام میں بظاہر بعض قوانین کی شکل وصورت کا ذرا مہیب نظر آتا لیکن معاً اسی کے ساتھ ایسے قیود کا اس میں اضافہ جن کی وجہ سے اس کی شدت اچانک خفت کی شکل اختیار کر لیتی ہے......یعنی حتی الوسع یہ چاہا جاتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دینی زندگی گزارنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو بھرم پر تختی نہ ہو جائے......قرآنی مطالبات میں اجمال وابہام کا رنگ کیوں اختیار کیا گیا؟ منجملہ دیگر وجوہ ومصالح کے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں۔

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾(البقرہ : ۱۸۵)

''چاہتا ہے اللہ تمہارے ساتھ آسانی نہیں چاہتا تمہارے لئے دشواری''۔

اور اس جیسی مختلف آیتوں میں جس تیسیر اور نرمی کے عام رحیمانہ اور رؤفانہ دستور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگر اس کو بھی اس طرز عمل کے اختیار کرنے میں دخیل سمجھا جائے تو میرے نزدیک اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی ورنہ ظاہر ہے کہ قرآن ہی میں تفصیل وتفسیر کا ارادہ اگر کر لیا جاتا تو اس سے بہتر تفسیر وتفصیل اور کس کی ہوسکتی تھی۔

بہر حال قرآن میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور قصداً اختیار کیا گیا ہے بلکہ جہاں تک آنحضرت ﷺ کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے خصوصاً علمائے احناف کا اس باب میں جو خیال ہے اس بنیاد پر تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اپنی عام تبلیغ کو پیغمبر ﷺ نے بھی قرآن کے اجمالی مطالبات کے صرف ان ہی تفصیلات وتشکیلات تک محدود رکھنے کی قصداً پوری کوشش کی ہے جن کا مسلمانوں کی زندگی سے عمومی ووجوبی تعلق تھا۔[۲]

---

[۱] البخاری، محمد بن اسماعیل، ابی عبداللہ، صحیح البخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبی یتخولھم بالموعظۃ والعلم کی لا ینفروا، [۶۸]، ص ۱۷، مکتبۃ دارالسلام الریاض، الطبعۃ الثانیۃ ذوالحج ۱۴۱۹ھ/ مارس ۱۹۹۹ء

[۲] گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مقدمہ تدوین فقہ، ماخوذ از ص ۱۰۰۔۱۱۶

آیت : ﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ﴾ (المائدہ:۱۰۵)

''اے ایمان والو تم پر اپنے ذات کی نگرانی واجب ہے جو گمراہ ہوا تمہیں ضرر نہیں پہنچا تا جب تم سیدھی راہ پر چلے۔''

جس کا حاصل یہی ہے کہ لوگوں کو اپنی ذاتی ذمہ داریوں ہی کا خیال کرنا چاہئے دوسرے اگر گمراہ ہو رہے ہوں تو ان کی گمراہی کا اثر ان لوگوں پر نہیں پڑے گا جو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی تکمیل میں اپنی استطاعت کی حد تک مشغول رہیں۔

جب حکومت جابرہ اور ملک عضوض کا دور شروع ہوا تو جن لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان ظالم سلاطین کے مقابلہ میں خاموشی اختیار کرنی چاہئے۔ان کا استدلال اسی آیت سے تھا۔تائید میں آثار کا بھی ایک ذخیرہ پیش کیا جاتا تھا جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔لیکن سوال یہی پیدا ہوتا تھا کہ اگر اسی آیت کو اصل قرار دے دیا جائے تو معنی اس کے یہی ہوں گے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو فرض مسلمانوں پر عائد کیا گیا تھا گویا وہ منسوخ ہو گیا۔حالانکہ اس کا بھی کوئی مدعی نہیں ہے۔جواب دینے والوں میں ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے، جو اسی آیت کے آخری لفظ ''اذا اهتدیتم'' پر توجہ دلاتا ہے یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ دوسروں کی گمراہی سے تمہیں ضرر نہیں پہنچے گا۔یہ ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے اور وہ شرط یہی ہے کہ ''تم اگر سیدھی راہ پر ہو'' جو اذا اهتدیتم کا ترجمہ ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اپنے متعلق فرائض صحیح طور پر اگر تم ادا کر رہے ہو جب دوسروں کی گمراہیوں سے تمہیں ضرر نہیں پہنچے گا اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے متعلقہ فرائض میں جب المعروف کا امر اور المنکر کی نہی بھی ہے تو اس فرض کا تارک ہدایت یافتہ ہی کب ہوا۔مقصد ان بزرگوں کا یہ ہے کہ اس فرض سے سبک دوشی کے بعد بھی اگر گمراہیوں سے کوئی باز نہیں آتا تو اس وقت اس کی گمراہی دوسروں کے لیے ضرر رساں نہیں ہے اسی لیے کسی حال میں بھی یہ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے سکوت اختیار کرنے کو جائز نہیں سمجھتے البتہ حدیثوں میں اس فرض کی ادائیگی کے متعلق چند مدارج جو مقرر کیے گئے ہیں، یعنی آنحضرت ﷺ کا مشہور ارشاد ہے کہ ''منکر'' اور غیر اسلامی چیز کو دیکھ کر چاہئے کہ آدمی ہاتھ سے اس کو روک دے اگر اس کی سکت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اس کی گنجائش بھی نہ ہو تو دل سے برا جانے فرمایا گیا کہ ایمان کا یہ ضعیف ترین درجہ ہے''۔نص قرآنی کی اسی نبوی تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کا فیصلہ ہے کہ ان مدارج میں سے کسی درجہ کی حد تک حکم کی تعمیل فرض سے سبک دوشی کے لیے اور ہدایت یافتہ ہونے کی شرط کی تکمیل کے لیے کافی ہے۔اگر چہ بڑا درجہ اسی کا ہے جس کی ایمانی قوت ہاتھ سے بدل دینے کی جرأت پر اس کو آمادہ کرے۔گویا ان حضرات کے نزدیک الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض میں اس فرض کی تعمیل ہی کامیابی ہے۔

حضرت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کے سلسلے میں امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ سے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا کیا مسلک ہے اس کے متعلق مولانا گیلانیؒ رقمطراز ہیں کہ دوسرے واجبات کے ساتھ مسلمانوں پر ایک فرض یہ جو عائد کیا گیا ہے کہ المعروف کا دنیا کو حکم دیں اور ''المنکر'' سے لوگوں کو روکیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی زندگی پر لوگوں کو قائم رکھنا اور اسی کی طرف دعوت دینا مسلمانوں کے ان فرائض میں ہے جن کا بار بار مطالبہ قرآن میں مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے۔لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی مشہور آیت یہ بھی ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (المائدہ:۱۰۵)

لیکن حضرت امام ابوحنیفہ کے مختلف اقوال و اعمال سے بعد کو لوگوں نے جو نتیجہ نکالا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ امام صاحب نہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہیں جنہوں نے علیکم انفسکم والی آیت کو سامنے رکھتے ہوئے سکوت مطلق یا اعراض مطلق کے مسلک کو اختیار کر لیا تھا جس کا مآل شاید یہی ہوسکتا ہے کہ معروف کے امر اور منکر کی نہی کا فرض قرآنی گویا منسوخ حکم کی حیثیت اسلام میں رکھتا ہے خصوصاً ''جبابرہ'' اور حکومت جابرہ کے مقابلہ میں ان لوگوں نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا تھا اور ان لوگوں پر معترض ہوتے تھے جو ان ظالم سلاطین کو معروف کا حکم یا منکر سے روکنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ محدثین کا ایک بڑا طبقہ اسی خیال کا قائل تھا حتی کہ الذہبی جو اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے ہشام کے مقابلہ میں حضرت زید شہید کے مقابلہ کے قصے کو بیان کرتے لکھا ہے:

خرج علی هشام فلیته لم یخرج

''ہشام کے مقابلہ میں زید نکل کھڑے ہوئے کاش نہ کھڑے ہوتے''۔

لیکن اسی کے ساتھ امام کا خیال یہ بھی تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم محض اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ حالت کا اندازہ کیے بغیر صرف اس کی تعمیل ہی کو فرض قرار دے دیا جائے بلکہ قرآن کی دوسری آیتوں آنحضرت ﷺ کی حدیثوں صحابہ کے طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر اس مجموعہ سے نتیجہ پیدا کرنا چاہئے' آخر قرآن ہی میں یہ بھی تو ہے:

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (الاعلیٰ:۹)

''لوگوں کو نصیحت کرو، اگر نصیحت فائدہ پہنچا رہی ہو''۔

پھر قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں ہاتھ سے منکر کو بدلنا فرض نہیں ہے ورنہ آخر اس قسم کی آیتوں کا کیا مطلب ہوگا جن میں ہے:

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ O لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیہ:۲۱-۲۲)

''تم لوگوں کو نصیحت کرو، تم صرف نصیحت کرنے والے ہو تم کو ان پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا ہے۔''

حضرت ابوثعلبہ الخشنی کی یہ روایت جو ہے کہ قرآن کی اسی آیت کے متعلق یعنی خود رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ معروف (یعنی اچھی باتیں) کرتے رہنا اور منکر (بری باتوں سے) بچتے رہنا۔ پھر جب دیکھو کہ لوگ اپنی حرص و ہوا کے بندے بن گئے اور اپنی خواہشوں کی پیروی میں لگ گئے، دنیا کو انہوں نے اختیار کر لیا اور ہر شخص اپنی اپنی رائے پر ناز کرنے لگے تو یہی وہ وقت ہے جس میں تمہیں صرف اپنی ذات کی خبر لینی چاہئے اور یہی کیا بکثرت ایسی روایتیں صحاح میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا وقت بھی آئے گا جس میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کے ٹاٹ بن کر رہ جائیں۔ فرمایا گیا کہ بیٹھنے والا ان دنوں میں کھڑے ہونے والوں سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والوں سے چلنے والا دوڑنے والوں سے خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات اور پیغمبر کے روایات سے بھی قطع نظر نہیں کیا جاسکتا نیز جلیل القدر صحابہ کا ایک طبقہ بنی امیہ کی حکومت جابرہ کے زمانہ میں موجود تھا۔ خود ان کا طرز عمل بھی ''الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے قانون کے سمجھنے اور اس قانون کے استعمال کرنے میں راہ نمائی کر رہا تھا۔

مشہور حنفی امام ابوجعفر طحاوی نے اسی بنیاد پر تمام روایتوں کو جمع کرنے کے بعد حنفی نقطہ نظر کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

فلما ذكرنا تو كيد الا مر بالمعروف و النهى عن المنكر يكون الزمان الذى ينقطع ذلك فيه هو الزمان الذى و صفه رسول الله ﷺ فى حديث ابى ثعلبة الخشنى الذى لا

منقطعة فيه بامر معروف و لا نهى منكر و لا قوة مع من ينكره على العام بالواجب فى ذلك فسقط الفرض عنه و رجع امره فيه الى خاصة نفسه فلا يضره ذلك من ضل.

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکیدوں کے متعلق جو باتیں میں نے بیان کیں (معلوم ہوا) کہ ایک زمانہ آئے گا جس میں اس کی تاکید کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور یہ وہی زمانہ ہوگا جس کی رسول اللہ ﷺ نے وہ خصوصیتیں بیان کی ہیں جن کا ذکر ابوثعلبہ الخشنی[1] کی روایت میں کیا گیا ہے یعنی وہی زمانہ جس میں معروف کے امر اور منکر کی نہی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور جن لوگوں کو روکنے کی ضرورت ہوگی ان سے مقابلہ کی طاقت روکنے والے میں نہ ہوگی، پس یہی وہ وقت ہوتا ہے جب فرض ساقط ہو جاتا ہے اور بات صرف اپنی اپنی ذات کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی زمانہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ گمراہوں کی گمراہی ان لوگوں کو جو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کے پوری کرنے میں کمی نہ کریں گے ضرر نہ کرے گی۔''

مطلب طحاوی کا وہی ہے کہ جیسے دوسرے فرائض صوم وصلوٰۃ حج وغیرہ کی حالت ہے کہ فرض ہونے میں ان کو کون شک کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہی روزہ جسے قرآن نے فرض کیا ہے حالت مرض وسفر میں اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ استطاعت سبیل نہ ہو تو حج جیسا فرض باقی نہیں رہتا۔ کچھ یہی حال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت کا ہے اور قرآن کی ان دونوں آیتوں یعنی جن میں اس فرض کا مطالبہ کیا گیا ہے، ان میں اور اس آیت میں جس میں ہر شخص کو اس کی شخصی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ دوسروں کی گمراہی سے تم کو ضرر نہیں پہنچے گا ان دونوں احکام میں تطبیق کی یہی شکل ہے کہ ہر حکم کو ایک خاص زمانے کے ساتھ محدود قرار دیا جائے، باقی رہی یہ بات کہ ان دونوں زمانوں کے پہچاننے کا کیا معیار ہے۔ طحاوی نے اسی کی طرف اشارہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوثعلبہ کی روایت میں اس کو خود ہی متعین فرما دیا ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ جس غرض کے لیے امر ونہی کا یہ کام مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے۔ جب دیکھا جا رہا ہو کہ وہ غرض حاصل نہیں ہو رہی ہے یعنی قبول کرنے کے لیے لوگ تیار بھی نہ ہوں اور کہنے والا بے چارا اپنے اندر ان سے مقابلہ کی قوت بھی نہ پاتا ہو تو پہچان لینا چاہئے کہ علیکم انفسکم (تم پر صرف تمہاری ذمہ داری ہے) کے قانون پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے اور معروف کے امر منکر کی نہی کی فرضیت ساقط ہو گئی۔ ابراہیم الصائغ والے قصہ کو بیان کرتے ہوئے عبداللہ بن المبارک نے امام ابوحنیفہ سے براہ راست یہ نقل کیا ہے کہ ابراہیم کی فہمائش کرتے ہوئے امام نے فرمایا کہ ایسے لوگ جن کے متعلق معلوم ہو چکا کہ ہماری نہیں سنیں گے اور مقابلہ کی طاقت چونکہ امر بالمعروف کرنے والے میں نہ تھی اس لیے وہ بے چارہ جباروں کے ہاتھ:

قتل ولم يصلح للناس امر

''مارا گیا اور عام لوگوں کے لیے کوئی اصلاحی کام بھی ان سے بن نہ پڑا''۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایسوں کی جان بھی جاتی ہے اور مسلمانوں کو ان کی اس قربانی کا کوئی نفع بھی نہیں پہنچتا بلکہ بجائے نفع کے بعض حالات میں جیسا کہ امام نے اسی کے بعد بعض دوسری باتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

---

1. کتاب میں الخشی لکھا ہے جبکہ یہ لفظ الخشنی ہے۔

واذا قتل الرجل لم یجتبری غیرہ ان یعرض نفسہ

''اور جب امر بالمعروف کرنے والا قتل ہو جاتا ہے تو دوسروں میں بھی آگے بڑھنے کی جرأت باقی نہیں رہتی۔''

یعنی اس کو قتل ہوتا ہوا دیکھ کر دوسروں کی ہمت بھی چھوٹ جاتی ہے اور لوگ اس قصے سے ہی اپنے آپ کو الگ کر لیتے ہیں۔امام نے فرمایا کہ بلاشبہ ایسی صورت میں کہ:

"ان وجد علیہ اعوانا صالحین و رجلاً براس علیھم ما مونا علی دین اللہ لا یحول"

''ہاں ایسے آدمی کو صالح رفقاء میسر آجائیں اور ایک آدمی ان کی سرداری کرے یہ ایسا آدمی ہو جو اللہ کے دین میں قابل اعتماد ہو اور اپنے مسلک سے نہ پلٹے''۔

تب اس وقت اس آدمی کے ساتھ مقابلہ کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے۔امام نے آگے وضاحت کی:

ھذہ فریضة لیست کسائر الفرائض لا ن سائر الفرائض یقوم بھا الرجل وحدہ

''امر بالمعروف نہی عن المنکر کا شماران فرائض میں نہیں ہے جن کی تعمیل میں تنہا ہر شخص کی ذات کافی ہے۔''

مطلب آپ کا یہ تھا کہ یہ اجتماعی فرائض میں ہے اور اپنے ساتھ کچھ شروط رکھتا ہے جب تک ان پر تحقق نہ ہوگا فرض بھی عائد نہ ہوگا۔

لیکن یہ گفتگو تو صرف فرضیت تک تھی، یعنی خود نص قرآنی اور پیغمبر ﷺ کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خاص حالات میں یہ فرض ساقط بھی ہو جاتا ہے مگر فرضیت کے ساقط ہونے کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس فرض کی بجا آوری پر آمادہ ہی ہو جائے تو پھر اس باب میں امام کا کیا خیال تھا، علامہ بدرالدین عینی نے اپنی شرح ہدایہ میں اس سوال کو اٹھاتے ہوئے حنفی نقطہ نظر سے اس کا جواب یہ دیا ہے:

لو علم انہ یصبر علی من ضربھم و لم یشک الی احد فلا باس بہ وھو مجاھد

''اگر سمجھتا ہے کہ مخالفین کی مار دھاڑ پر صبر کر سکے گا اور کسی کے آگے اس کا گلہ شکوہ نہ کرے گا، تو پھر امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنے میں ایسے آدمی کے لیے مضائقہ نہیں ہے بلکہ اس کو مجاہد قرار دیا جائے گا۔''

فقہاء حنفیہ اس کی تائید میں علاوہ ان مشہور حدیثوں کے مثلاً ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں ہے:

ان من اعظم الجھاد کلمة عدل عنہ سلطان جائر

''سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کا اظہار کیا جائے''۔

اس حدیث کو بھی پیش کرتے ہیں جسے امام ابوحنیفہ اپنی سند سے ایک خاص طریقے سے روایت کرتے تھے اور اسی بنیاد پر اصول حدیث اور رجال کی کتابوں میں ان کی طرف بعض خاص مسائل غالباً منسوب کیے گئے ہیں۔یعنی:

انا حدثت ابراھیم الصائغ عن عکرمة عن ابن عباس قال النبی ﷺ سید الشھداء حمزة بن عبدالمطلب و رجل قام الی امام جائر فامرہ و نھاہ فقتلہ

''میں نے ابراہیم صائغ سے عکرمہ کے حوالہ سے یہ روایت بیان کی تھی کہ ابن عباس سے عکرمہ روایت کرتے

تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شہداء کے سید (سردار) حمزہ بن عبدالمطلب ہیں اور وہ شخص ہے جو ظالم امام یعنی حاکم کے سامنے کھڑا ہو، اور معروف کا حکم دیا یا منکر سے منع کیا پھر اس امام نے اس کو قتل کر دیا''۔

جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ الامر بالمعروف نہی عن المنکر کی بنیاد صرف افادہ ہی پر نہیں ہے بلکہ ابتلا بھی ایک بڑا مقصد اس قانون کا ہے یعنی محض یہی غرض نہیں ہے کہ حکم کر کے لوگوں کو معروف اور اچھی باتوں کا پابند بنایا جائے اور منکر (بری باتوں) سے روکا جائے۔ بالفاظ دیگر غیروں کو صرف فائدہ پہنچانے ہی کے لیے حق تعالیٰ نے بندوں پر یہ فرض نہیں عائد کیا ہے بلکہ جن پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے خود ان کا بھی امتحان اور ان کے ایمان کی جانچ بھی مقصود ہے۔

لیکن فرضیت قانون کی جب ساقط ہی ہو چکی تھی۔ تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت امام کے نزدیک فوراً ابتلائی نصب العین کی تعمیل پر آمادہ ہو جانا ضروری نہیں تھا۔ ورنہ فرضیت کے سقوط کے معنی ہی کیا ہوں گے بلکہ لوگوں کے سننے اور ماننے سے مایوسی کے بعد بھی مسلمانوں کو معروف پر قائم رکھنے اور منکر سے دور رکھنے کے امکانات اگر نظر آتے ہوں تو امام کے نزدیک ابتلائی نصب العین کی تکمیل پر آمادہ ہو کر اپنے آپ کو قتل کرا دینے یا اسی قسم کے نقصان میں مبتلا کر لینے سے یہ بہتر ہے کہ ان امکانات سے نفع اٹھانے کی حتی الوسع کوشش کی جائے جن کی طرف عقل راہ نمائی کرتی ہو، یہی مطلب ہے ان کے اس فقرے کا۔

''امر بالمعروف نہی عن المنکر کا کرنے والا ایسی صورت میں اگر قتل ہو گیا تو عام لوگوں (یعنی مسلمانوں) کے لیے تو کوئی فائدہ بخش بات یہ نہ ہوگی''۔

بلکہ قتل ہونے والے کا ذاتی فائدہ ہوگا، گو بجائے خود یہ بھی ایک بڑا فائدہ ہے اور اس سے بڑا فائدہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ''شہداء'' کی جماعت کی سیادت اور سرداری اسے حاصل ہوتی ہے لیکن کچھ بھی ہو ہے یہ ذاتی ہی فائدہ۔ عام مسلمانوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے کہا ہے امام صاحب کا خیال یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع میں دوسروں کی ہمت شکنی اور حوصلہ کسلی کی وجہ یہ ابتلائی تعمیل بن جاتی ہے۔ بہر حال فرضیت کے سقوط کے بعد ابتلائی نصب العین کی تعمیل پر آمادگی امام صاحب کے نقطہ نظر سے بظاہر اقدام کی آخری شکل معلوم ہوتی ہے۔

اور اسی کو میں امام ابوحنیفہ کا سیاسی مسلک قرار دیتا ہوں۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص ۱۵۹۔۱۶۶

﴿الاعراف﴾

آیت : ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ (الاعراف:۵۹)

''اے میرے لوگو! پوجو اللہ کو، نہیں تمہارا الٰہ سوا اس کے''۔

پیغمبروں کی دعوت کا پہلا کلمہ

﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾

کی آیت کو جو قرار دیا ہے، اس کا یہی مطلب ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ جن راہوں سے عمل پیدائش کا ظہور ہو رہا ہے۔ وہ تو خیر عقل و حواس کے سپرد ہیں لیکن خود پیدا کرنے والے سے استفادہ جس فطری جذبہ کی راہنمائی میں دعا و عبادت نذر و قربانی وغیرہ مختلف اشکال و اعمال کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ اس جذبے کے تعلق کا مستحق اللہ کی ذات مبارک کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں، اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے۔ کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زندگی ہو یا مرنے کے بعد جو آنے والی زندگی ہر زندگی کی ضرورتوں سے استفادہ کی اس تدبیر کا تعلق ہے یعنی اللہ ہمارا الٰہ ان حاجتوں اور ضرورتوں میں بھی ہے۔ جن کے ہم اس ''الحیٰوۃ الدنیا'' میں محتاج ہیں، اور ان میں بھی جو ''الحیٰوۃ الاخریٰ'' میں پیش آنے والی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اللہ ہی ہمارا ''الٰہ الدنیا'' بھی ہے اور ''الٰہ الآخرۃ'' بھی۔ یقیناً پیغمبروں نے حق تعالیٰ کی الوہیت کو ''الدنیا'' یا ''الاخرۃ'' کسی ایک کی ضرورتوں کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۶۵

آیت: ﴿ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ﴾ (الاعراف:۶۵)

''لوگو! پوجے جاؤ اللہ کو، تمہارا کوئی الہ (معبود) اس کے سوا نہیں ہے۔''

مذکورہ بالا آیت قرآنی آسمانی کتابوں کے آخری قالب القرآن الحکیم میں نبوت و رسالت کی طویل تاریخ کے ناصیہ کا سب سے زیادہ نمایاں، سب سے زیادہ درخشاں ''نوشتہ'' ہے۔

از آدم تا خاتم ﷺ پیغمبروں کے پیش کیے ہوئے لاہوتی فرامین کی پیشانیوں کا یہی اختصاصی طغرا اور دوامی لازمی چھاپ ہے جس میں انسان کس لیے ہے؟ اسی سوال کے جواب میں جو واقعہ تھا اس سے پردہ ہٹا دیا گیا ہے۔ حاصل جس کا یہی ہے کہ خالق کائنات نے انسان کو صرف اپنے لیے پیدا کیا ہے، کھول دیا گیا ہے کہ یہی حقیقت آفرینش کائنات کے سلسلے میں انسانیت کا یہی تخلیقی موقف اور قدرتی مقام ہے، اور یہی وہ فراموش شدہ مقدمہ، یا گم گشتہ کڑی ہے، جس سے ہٹ کر بے چاری عقل حیران اور سراسیمگی کی وادیوں میں بھٹک رہی تھی آدمی کے وجدانی وجبلی رجحانوں اور اس کی عقلی اقتضاؤں میں کش مکش برپا تھی۔ اس درمیانی کڑی سے جوڑ دینے کے بعد تزاحم وتخالف کے سارے قصے اچانک ختم ہو جاتے ہیں۔ اب عقل بھی وہی سوچتی ہے اور اس کے سوا سوچ ہی کیا سکتی ہے، جس کے ساتھ ہمارا وجدان اور ہماری جبلت راضی ومطمئن ہے۔ اصولی غلطی یہی تھی کہ پیدا کرنے والے نے جسے مخلوقات کے لیے پیدا ہی نہیں کیا ہے، اسی انسانیت کو بغل میں دبائے مخلوقات ہی کے دروازوں پر پکارنے والے پکار رہے تھے کہ ہے کوئی اس غریب آدمی کا بھی خریدار؟ ظاہر ہے کہ قیود واستقراء کی یہ قطعاً غیر منطقی کوشش تھی۔ آنکھیں جو دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں، ان سے سننے کا کام کیسے لیا جا سکتا ہے، کانوں پر رکھ کر گلاب کے پھول کو کوئی لاکھ سونگھنے کی کوشش کرے؟ لیکن اس میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟ پیدا کرنے والے اور بنانے والے نے سونگھنے کے لیے جب ناک ہی کو بنایا ہے تو قدرت کے اس قانون سے جنگ کر کے کان کو سونگھنے کے کام کا کون بنا سکتا ہے؟

اپنے اس تخلیقی موقف اور طبعی مقام پر پہنچ جانے کے بعد آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہی انسانیت جو ساری خلقت، حتیٰ کہ بول و براز جیسی عفونتوں اور غلاظتوں تک کے مقابلے میں بھی بے قیمت ٹھہری چلی جاتی تھی، کم از کم ان گندگیوں سے بھی کھاد کا کام لیا جاتا ہے، زرعی پیداواروں کی نشوونما میں ان سے کافی مدد ملتی ہے، لیکن آدمی تو اس کام کا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں جس کا سب کچھ ہے کائنات کے اسی خالق کے لیے ہو جانے کے بعد وہ سب کچھ آدمی کے تسخیری اقتدارات کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور جن سے وہ کام لے رہا ہے، قرآن میں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثیہ: ۱۳)

''اور اس نے (اللہ نے) تمہارے لیے آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کیا ہے اپنی طرف سے۔''

گویا نسل انسانی کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے: کہ جب تم میرے لیے ہو، تو وہ سب کچھ جو میرا ہے وہ تمہارے لیے ہے، وقفہ وقفہ سے واقعہ کو اول سے آخر تک قرآن دہراتا چلا گیا ہے، کائنات کا شاید ہی کوئی اساسی وجود یا جوہری حقیقت رہ گئی ہو، جس سے استفادے کا حق نبی آدم کو اس کتاب میں نہیں دیا گیا ہے۔ اسی کے مطابق بے محابا، بے دھڑک لوگ اپنے اس حق کو استعمال کر رہے ہیں اور اپنے اس قدرتی حق سے مستفید ہو رہے ہیں۔ الغرض یہ سارے تسخیری مظاہرے اور بنی آدم کے اقتداری تصرفات کے تماشے جو ہمارے سامنے ہیں، بتائیے کہ اس کے سوا آخر ہوتا کیا؟![1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۲۱۱-۲۱۳

اول الذکر آیت کی مزید تفصیل کرتے ہوئے مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ

ہیومنٹی (عام انسانیت) کے فلاح و بہبود کے نصب العین کو پیش کر کے ''مادیت'' اپنا دم توڑ دیتی ہے۔ لیکن یہ بات کہ دنیا کی ساری پیداواروں کے مقابلے میں کرہ زمین کی پیداوار جس کا نام ''انسانیت'' ہے، خود اس کے وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ ''مادیت'' اس کے جواب میں مبہوت بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مادیت میں انسانیت اور ساری سرگرمیاں دیوانے کا بے نتیجہ خواب بن کر رہ جاتی ہے۔

اسلامی زندگی میں اسی سوال کا جواب

﴿ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ﴾ (الاعراف : ٦٥)

''اے قوم پوجو اللہ کو نہیں تمہارا معبود (الہ) اس کے سوا۔''

دیا گیا ہے۔ حاصل جس کا یہی ہے کہ پیدا کرنے والے خالق نے انسان کو خود اپنے لیے، اپنی عبادت کے لیے، اپنی مرضی پر چلنے کے لیے پیدا کیا ہے قرآن میں اسی مطلب کو کبھی:

﴿اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الا نبیاء : ٩٢)

''یہ ٹولی (انسانوں کی) ایک ٹولی ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں تو مجھ ہی کو تم پوجتے رہو۔''

کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے، اور کبھی انسانی وجود کے اسی نصب العین کو سمجھاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ:

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المومنون : ٥٢)

''یہ ٹولی (انسانوں کی) ایک ٹولی ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں، پس مجھ ہی سے ڈرتے رہنا۔''

صرف یہی نہیں کہ ''مادیت'' کے جوہری نقص کا ازالہ اس جواب سے ہو جاتا ہے بلکہ خود بخود ''روحانیت'' کا مسلک بھی اسلام کے عملی نظام کے اقوام میں کچھ اس طرح سے گھل مل جاتا ہے کہ ''مادیت'' اور ''روحانیت'' کے سارے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے یہ مختلف نظریے ایک بسیط نظریے کا قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ''روحانیت'' کے مسلک کا سلبی و منفی جز یعنی یہ جو مانا جاتا تھا کہ آدمی تو خدا کے لیے پیدا ہوا ہے، لیکن خود آدمی کے لیے دنیا کی کوئی چیز نہیں پیدا کی گئی ہے۔ اسی لیے ''دنیا گریز'' رجحانوں کی حوصلہ افزائی روحانیت کی سب سے بڑی خصوصیت، ہر زمانے میں ٹھہرائی گئی ہے، جس حد تک دنیا کی چیزوں سے بے نیاز، اور ان کی دست نگری سے اپنے آپ کو آزاد دکھانے میں جو کامیاب ہوئے ہیں، اسی حد تک روحانیت کی راہوں میں وہ قدر و عزت کے مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی اقوام و امم کی تاریخ کا یہ ایک مشترک نقطہ نظر بن گیا ہے، جس کے اثر سے ہم کسی مذہب یا دین کو مشکل ہی سے مستثنیٰ کر سکتے ہیں۔ خود مسلمانوں کے اندر بھی مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انتہائی غالیانہ شکلوں میں نہ سہی لیکن کسی نہ کسی رنگ میں لوگ اس کو مانتے چلے آئے ہیں۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۳۰۰۔۳۰۱

ساری کائنات پر تسخیری اقتدار رکھتے ہوئے گویا عالم کو اپنے قدموں پر جھکائے ہوئے، خلافتی اور خدا نمائی کے ان سارے خصوصیات کے ساتھ جن سے انسانی وجود سرفراز کیا گیا ہے ان سب کو لے کر جو اپنے آپ کو اپنے خالق اور پیدا کرنے والے خدا کے لیے بنا رہا ہے، جو کچھ بھی اسکو ملا ہے سب ہی کو لے کر خدا کے قدموں پر یہ کہتے ہوئے جو گر جاتا ہے کہ میرا کچھ نہیں ہے، سب آپ کا ہے، اپنے عجز و مسکنت، اپنی عبدیت و بندگی کو اس طریقے سے پیش کر کے جو ثابت کر رہا ہے کہ خدا ہی کے لیے وہ بنایا گیا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ عبدیت و بندگی کا یہ قالب خدا کی خدائی اور اس کے جلال و جبروت کا آئینہ بننے کا قرار واقعی طور پر مستحق ہو سکتا ہے یا بجائے اس آدمی کو فرشتہ اور ملک بنانے کے لیے چن چن کر ان خصوصیتوں سے محروم کیا جائے جو اس کے عہدہ خلافت کے لازمی اقتضا آت ہیں کائنات میں جو کچھ ہے اس کے متعلق پھیلایا جائے کہ ان کو اپنے زیر اقتدار لانے اور اپنی تسخیری قوتوں کی آماج گاہ بنانے کی جگہ چاہیے کہ جس حد تک ان چیزوں سے آدمی بھاگ سکتا ہو بھاگے اور اس بنیاد پر پانی بھی اس کے منہ سے چھینا جائے، کھانا بھی چھینا جائے، کپڑے بھی اتار لیے جائیں، حتیٰ کہ ناک بند کر کے حکم دیا جائے کہ سانس لینے میں بھی جہاں تک ممکن ہوا سے پرہیز ہی کرنے کی کوشش کرے، اور یوں فرشتہ نہ سہی، آدمی کو فرشتہ نما بنا کر ''روحانیت'' اور ''رہبانیت'' کے مسلک میں جو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ یہی فرشتہ نما آدمی خدا کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟

وہی عامیانہ مثال ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی؟ اب اس کے بعد باقی ہی کیا رہا، جسے خدا کے سامنے لے کر وہ آیا ہے، اللہ اللہ سب سے اونچا، سب سے بلند، سب کا آقا یعنی خدا کا خلیفہ بن کر خدا کے سامنے جو جھک جاتا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ تنہا وہی نہیں جھکا وہ سب جو اس کے زیر اقتدار و اختیار ہیں، وہ بھی جھک جاتے ہیں، زمین بھی جھکتی ہے، آسمان بھی جھکتا ہے، شجر بھی، حجر بھی، بحر بھی، بر بھی، جمادات بھی، نباتات بھی، عناصر بھی، مرکبات بھی، سفلیات بھی، علویات بھی، سب ہی جھک جاتے ہیں۔

اور میں تو سمجھتا ہوں کہ الانسان کے خلافتی پہلو کے راز کا افشا کرتے ہوئے قرآن میں جو اس کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ملائکہ یعنی فرشتوں کو خدا نے اس خلیفہ انسان کے آگے جھکنے کا حکم دیا اور اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے:

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾ (ص : ۷۳)

''سب کے سب جتنے فرشتے تھے آدم کے آگے سربسجود ہو گئے۔''

کی اطلاع جو دی گئی ہے، جہاں اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عالم محسوس کے مختلف طبقات و انواع کے نظم و ضبط کا تعلق غیب کی جن زندہ ہستیوں سے ہے، ان ہی ملائکہ کو جھکا کر یہ بتایا جا رہا تھا کہ سارے عالم پر اقتدار قائم کرنے کی اور ان کو مسخر کر کے اپنے قابو میں لانے کی صلاحیت انسان میں رکھی گئی ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ اسی کے ساتھ ''الانسان'' کو ملک یا فرشتہ بنا کر خدا کے سامنے پیش کرنے کا جو مغالطہ آئندہ پیدا ہونے والا تھا، اس مغالطے کا ازالہ شروع ہی میں کر دیا گیا تھا۔ اسلامی حقائق کے عصری ترجمان کا مشہور زبان زد شعر:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

میں اسی حقیقت کی طرف شاعرانہ رنگ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام سے بھی جب بنی اسرائیل نے یہ خواہش کی کہ دوسری قوموں نے مخلوقات کو جیسے اپنا معبود بنا رکھا ہے، ہمارے لیے بھی کچھ اسی قسم کے ''آلہ'' یا ''معبودوں'' کو نامزد کر دیجیے تو جھنجھلا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسوم پرست تقلیدی امت کو سمجھایا تھا، قرآن میں ان کا تاریخی فقرہ اب تک محفوظ ہے، ارشاد ہوا تھا:

﴿قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الاعراف: ۱۴۰)

''موسیٰ نے کہا: ''کیا اللہ (یعنی خالق کائنات) کے سوا تمہارے لیے میں کوئی دوسرا پرورش کرنے والا پروردگار ڈھونڈوں، حالاں کہ اس نے سارے عالمین (مخلوقات) پر تمہیں برتری عطا فرمائی ہے''۔

اور سچ تو یہ ہے کہ فرشتہ ہی بنا کر آدمی کو خدا کے سامنے جھکانا مقصود تھا تو بقول ان ہی فرشتوں کے ایک نئی مخلوق (انسان) کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ کی تسبیح و تقدیس کے لیے کیا ہم کافی نہیں ہیں؟ اور ملائکہ ہی کیا صرف ''جھکنے'' اور ''بندگی'' و عبدیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو جیسا کہ قرآن ہی میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (آل عمران: ۸۳)

''آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اس کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔''

اسی مضمون کو دوسری جگہ ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِى الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ﴾(الحج: ۱۸)

''کیا تو نہیں دیکھتا کہ خدا کے آگے سجدہ ریز ہیں وہ ساری چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہے، سورج بھی، چاند بھی، تارے بھی، پہاڑ بھی، درخت بھی، رینگنے والے سارے جانور بھی۔''

پھر سارے خلائقی کمالات و خصوصیات سے پر تینچ کر کے غریب آدمی کو لنڈ منڈ فرشتہ بنا کر خدا کے سامنے ہم لائے بھی تو کیا بڑی سوغات اور کون سا بڑا نادرالوجود تحفہ لائے؟ اس کے تماشوں سے تو سارا عالم ہی بھرا ہوا تھا۔

ہاں! ''سب کچھ'' رکھتے ہوئے ''کچھ نہیں'' بن کر خدا کے سامنے کھڑا ہو جانا، سب سے اونچے ہونے کے بعد اپنے آپ کو خدا کے آگے سب سے زیادہ نیچا بنا کر پیش کرنا، خدا کی خدائی اور اس کے جادہ جلال، اس کی لاہوتی شوکت و سطوت کی تجلی و نمائش کا یہی واحد ''آئینہ'' ہے جو صرف آدمی کو دیا گیا ہے۔ اسی ''آئینے'' کو لے کر خدا کے سامنے جب وہ حاضر ہوتا ہے، تو اس میں جیسا کہ چاہیے، خدا کی تجلیاں تڑپ اٹھتی ہیں۔ آخر جس کے جھکنے کے ساتھ ہی ساری کائنات ہی جھک جاتی ہو، اس تماشے کو آپ ہی بتائیے خدا کے اس خلیفہ انسان کے سوا اور پیش ہی کون کر سکتا ہے۔

میں جو یہ وعدہ کرتا چلا آ رہا تھا کہ آدمی کو خدا نے صرف اپنے لیے پیدا کیا ہے، اس کا مطلب آئندہ بیان کروں گا، میں خیال کرتا ہوں وہ مطلب ان شاء اللہ ادا ہو گیا اور وعدہ بھی پورا ہو گیا۔ مقصد یہی ہے کہ جھکنے کے لیے تو آدمی بھی اس طرح پیدا کیا گیا ہے، جیسے سب پیدا ہونے والی مخلوقات اپنے خالق کے آگے جھکی ہوئی ہیں۔ لیکن ایسا جھکنے والا جس کے آگے سب جھکائے گئے ہیں، یہی وہ ''الانسان'' خلیفہ ہے۔ اپنے آپ کو چھوٹا اور نیچا بنا کر آدمی بھی خالق کے آگے پیش ہوتا ہے، لیکن اس کی یہ خصوصیت ہے کہ مخلوقات میں سب سے بڑا بننے کے بعد یہ چھوٹا بنتا ہے، سب سے اونچا ہونے کے بعد اپنے آپ کو نیچا بنا کر اپنے مالک کے قدموں پر

گرتا ہے، اس کو اختیار دیا گیا ہے اور کیسا اختیار؟ کہ جس نے اس کو پیدا کیا ہے، سب کچھ بخشا ہے، چاہے تو اس کی مرضی پر چلے بھی، اور نہ چاہے تو اس کی مرضی سے وہ ٹکرا بھی سکتا ہے؟ حد ہے اس کے اقتداری دایرے کی اس وسعت اور خودمختارانہ مطلق العنانی کی؟ ان میں کتنے ہیں جن کی ساری زندگی اپنے خالق کی مرضیات سے ٹکرانے اور مالک کے احکام کے ٹھکرانے ہی میں گزرتی ہے۔

خلیفہ بن کر جینے میں اور بندہ بن کر مرنے کا ان سے جو مطالبہ ان کے خالق نے کیا ہے، اس مطالبے کو ٹھکرا دیتے ہیں یہی نمارده، فراعنہ، جبابرہ، دجاجلہ کا طبقہ اور ان کی ذریت ان کے چیلے چانٹے ہیں، ان کی ساری زندگی اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ جنگ اور تصادم میں گزرتی ہے۔ یہ بنی آدم کے وہ چوہے ہیں جو پنساری کی دوکان کے سامانوں کو دیکھ دیکھ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے رہتے ہیں۔ان ہی کے سامنے زندگی ہی ایک ایسے دور کو لے آئی ہے جس میں وہ پاتے ہیں کہ ان کے خالق کا ہر ارادہ اور اس کا قانون، ان کی ہر خواہش اور ارادے سے ٹکرا رہا ہے۔ٹکرانے والوں کی زندگی کا یہی تجربہ، مذہبی زبانوں میں جہنم، دوزخ، نرکھ وغیرہ کے ناموں سے مشہور ہے۔لیکن سب کچھ رکھتے ہوئے جو واقعۃً اس کے اعتراف کو اپنی زندگی کا اٹل اور غیر متزلزل فیصلہ بنا کر جیتے ہیں کہ ''درحقیقت ہمارا کچھ نہیں ہے'' اسی بنیاد پر اپنے اختیار و اقتدار کو ان ہی حدود تک محدود رکھنے میں پختہ عزم سے کام لیتے ہیں، جن پر اختیار و اقتدار کا بخشنے والا ان کو رکا اور ٹھہرا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔یعنی خدا سے ٹکرانے اور اس کے احکام و فرامین کے ٹھکرانے کی جگہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کی مرضی کے مطابق جئیں بھی اور اسی حال میں مریں بھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو انسانی وجود کے قدرتی نصب العین یعنی:

خدا نے آدمی کو اپنے لیے بنایا ہے

اسی نصب العین کی تکمیل کر کے مرتے ہیں، نبوات و رسالات کی بنائی ہوئی راہوں پر وہ چل رہے ہیں۔ حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کی یہ امتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ توافق کی یہ زندگی ان کے سامنے اس حال کو اگر لائی ہے کہ خدا اور اس کے سارے قوانین ان کی ہر خواہش اور ارادے کے مطابق ہے۔ جو کچھ وہ چاہتے ہیں خدا وہی ان کے لیے کرتا رہتا ہے، تو سوچنا چاہیے کہ اس کے سوا اور ہوتا کیا؟

بہر حال سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہیں بن کر کھڑا ہو جانا، جہاں رکنے کے لیے کہا جائے، رک جانا اور ٹھہرنے کا حکم دیا جائے ٹھہر جانا، اپنی بندگی و عبدیت، مسکنت و ذلت، فقر و احتیاج، عجز و نیاز کے اس آئینے کو لے کر جو اپنے خدا کے سامنے لے کر بڑھتا ہے، جو اس کا واحد ذاتی سرمایہ ہے، ایسا ذاتی سرمایہ کہ خدا کے پاس بھی جو نہیں ہے تو خدا بھی اپنے ذاتی سرمایہ یعنی قوت قدرت کے ساتھ اس کی طرف اگر متوجہ ہو، تو اس کے سوا آخر دوسرا احتمال ہی کیا ہے؟ آخر لے دے کر حاصل یہی تو ہوا کہ بندہ خدا کے آگے اپنی عاجزی میں عاجزی کا اضافہ کرتا چلا جاتا ہے اور خدا بندے میں اپنی قوت و قدرت کو بھرتا چلا جاتا ہے بقول مولانا رومؒ:

چوں از و گشتی ہمہ چیز از گشت

من لہ المولی فلہ الکل[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۳۰۷۔۳۱۱

آیت : ﴿وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الاعراف:۹۶)

''اور یقیناً بستیوں والے اگر مان لیں اور پارسائی اختیار کریں، تو ضرور ہم کھول دیں ان پر برکتوں کو آسمان سے اور زمین سے۔''

اس کا بغیر کسی تاویل وتوجیہ کے صریح مطلب یہی ہے کہ آسمان وزمین کی برکتیں جو ہمارے معاشی فوائد ہی کی دوسری تعبیر ہے۔ہم ان کو ایمان وتقویٰ کی قوت سے بھی حاصل کر سکتے ہیں، ان برکات سے انسانی زندگی کتنی شگفتہ صاف و پاک، ستھری ہو جاتی ہے۔قرآن کی اصطلاح میں جس کا نام ''حیات طیبہ'' ہے۔وعدہ کیا جاتا ہے، ہر مرد اور عورت کو مخاطب کر کے کہ

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ (النحل:۹۷)

''جو کوئی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت بحالیکہ وہ ایمان والا ہو۔تو ضرور ہم اسے جیتا رکھیں گے سنہری زندگی کے ساتھ۔''

''فَلَنُحْيِيَنَّهٗ'' کے لفظ میں لام اور مشدد ن سے وعدے میں جتنی وثوقی طاقت بھری گئی ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو عربی زبان جانتے ہیں، صاف صاف کھلے کھلے الفاظ میں اس وثیقہ کا اعلان کیا جاتا ہے کہ

﴿مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق:۲،۳)

''اللہ سے جو ڈر کر (گناہوں سے) بچے گا۔بنائیگا اللہ اس کے واسطے نکلنے کی راہ اور روزی پہنچائے گا اسے ایسی جگہ سے جہاں سے اسے امید نہ ہو۔''

کش مکش حیات کی دشواریوں کو ''تقویٰ'' سے حل کیا جا سکتا ہے۔اور ایسی روزی یا رزق جس کے ذرائع کا پہلے سے سان و گمان بھی نہ ہو، الغرض قرآن کی ایسی آیتیں مثلاً

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ (المومن:۵۱)

''ہم قطعاً مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی اس حیات دنیا میں اور اس دن بھی جب گواہیاں قائم ہوں گی۔''

یا

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ﴾ (حم سجدہ:۳۰،۳۱)

''یقیناً جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ڈٹ گئے۔اترتے ہیں ان پر فرشتے یہ لے کر کہ نہ ڈرو، اور نہ کڑھو، اور خوش ہو جنت (کے ملنے) پر جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے ہم تمہارے یار و پشت پناہ ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور الآخرۃ میں بھی۔''

یا پیغمبروں کو جب اہل کفر نے وطن سے باہر کر دینے کی دھمکی دی، تو قرآن میں ہے کہ

﴿فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ

خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِیْدِ﴾ (ابراہیم:۱۳،۱۴)

''پس پیغمبروں پر اُن کے خدا نے وحی کی کہ ہم ظلم کرنے والوں کو قطعاً برباد کردیں گے۔ اور ضرور بسائیں گے ہم تمہیں زمین میں ان کے نیست و نابود ہونے کے بعد یہ (وعدہ) ان کے لئے ہے جو میرے مقام سے ڈرا اور ڈرا میری دھمکی سے۔''

ظاہر ہے جس زمین (الارض) کے متعلق پیغمبروں پر خدا نے وحی کی۔ وہ اس دنیا ہی کی زندگی والی زمین تو ہے۔ اعلان کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ کے مقام اور خدا کی دھمکیوں سے جو بھی ڈرے گا۔ اسی کو زمین میں بسایا جائے گا۔ مشہور آیت استخلاف میں بھی جنت ہی نہیں زمین میں بھی تمکن کا وعدہ ایمان والوں سے کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ شرک نہ کریں اور اللہ ہی کو پوجتے چلے جائیں۔ قرآن ہی میں ضمانت دی جاتی ہے کہ تقویٰ سے اس معاشی سہولت کو بھی جو چاہے حاصل کرسکتا ہے بلکہ قرآن کی آیت

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ﴾ (یونس،۶۳،۶۴)

''جو ایمان لائے اور ڈر کر گناہوں سے بچا کرتے ہیں ان کے لئے بشارت ہے ''الحیوۃ الدنیا'' میں بھی اور ''الاخرۃ'' میں بھی۔ اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔''

میں تو اسی ایمان اور تقویٰ کو اخروی منافع کے ساتھ ساتھ دنیاوی کامیابیوں کی بشارت کا ذریعہ قرار دے کر حق تعالیٰ نے اس کو اپنا ایک ایسا کلمہ یا ایسی بات یا ایک ایسا قانون قرار دیا ہے جو کبھی بدل نہیں سکتا، یعنی ایسی اٹل بات ہے جو اپنے مقررہ نتیجہ سے جدا نہیں ہوسکتی مطلب یہی ہوا کہ ایمان و تقویٰ کسی میں پایا جائے اور اس کی زندگی ان نتائج سے محروم ہو، ایسا نہیں قرآن نے دوسری جگہ اسی مقصد کو اپنے اس فیصلے کی صورت میں ادا کیا ہے۔

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ﴾ (الجاثیہ:۲۱)

''کیا خیال کرلیا ہے ان لوگوں نے جو بدیوں کو بٹور رہے ہیں کہ ہم بنا دیں گے ان کو ان لوگوں کی مانند جو ایمان لائے اور نیکیاں کیں، برابر ہو جائے گی ان کی زندگی اور ان کی موت، برا فیصلہ ہے جو وہ کررہے ہیں۔''

یعنی ممات (موت) ہی کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کے نتائج کو وابستہ نہ خیال کرنا چاہیئے۔ بلکہ محیا (زندگی) بھی ان لوگوں کی جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ جیتے ہیں، ان لوگوں کی زندگی سے بالکل جدا ہو جاتی ہے۔ جو بجائے صالحات کے ''السیات'' (بدکرداریوں) میں مبتلا ہیں، پانی برسانے اور بادل بنانے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جس کے متعلق سنتے ہیں کہ آج یورپ وامریکہ میں تجربہ ہورہا ہے، اگرچہ تجربہ سے بات آگے نہیں بڑھی ہے۔

لیکن اسی توبہ واستغفار کو جس کے متعلق شاید سمجھا جاتا ہے کہ قبر اور قبر کے بعد ان کے نتائج سامنے آئیں گے۔ قرآن بارش برسانے ابرلانے کے آلہ کی حیثیت سے استعمال کرنے کا اس آیۃ میں صراحۃ حکم دیتا ہے پیغمبر نے اپنی امت سے کہا۔

﴿یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْکُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِکُمْ﴾ (ہود:۵۲)

اے میرے لوگو، آمرزش طلب کرو اپنے مالک سے، پھر پلٹو اسی کی طرف نہ بھیجے گا وہ آسمانوں کو تم پر

موسلا دھار بارش کے ساتھ اور بڑھائے گا وہ تمہاری قوت میں قوت کو"۔

آج تو کوئی شاید اس تجربے کے ماننے کے لئے بھی تیار نہ ہو، لیکن ہم کیا کریں، اللہ کے رسول ﷺ کا یہ بیان ہے۔ جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ

بینا رجل بفلاة من الارض فسمع صوتا فی سحابة: اسق حدیقة فلان فتنحی ذلک السحاب، فافرغ ماءه فی حرة، فاذا شرجة من تلک الشراج قد استوعبت ذلک الماء کله، فتتبع الماء، فاذا رجل قائم فی حدیقته یحول الماء بمسحاته، فقال له یا عبدالله! ما اسمک قال: فلان، للاسم الذی سمع فی السحابة، فقال یا عبدالله! لم سألتنی عن اسمی قال انی سمعت صوتا فی السحاب الذی ماءه یقول: اسق حدیقة فلان، لاسمک فما تصنع فیها؟ قال: اما اذا قلت هذا فانی انظر الیٰ ما یخرج منها، فاتصدق بثلثه و آکل انا و عیالی ثلثه، و اردفیه ثلثه [۱]

"اچانک اس حال میں کہ ایک آدمی جا رہا تھا کسی میدان میں کہ اس نے ابر کے ایک ٹکڑے سے آواز سنی "سیراب کرو باغ کو فلاں شخص کے" آواز کے بعد دیکھا کہ بادل کا وہ ٹکڑا ایک کنارے کی طرف ہٹ گیا اور برسا دیا اور اس نے پانی ایک چٹیل میدان میں پھر چند نالیوں میں سے ایک نالی میں سارا پانی سمٹ کر آ گیا اور ایک طرف بہنے لگا۔ آواز سننے والے کا بیان ہے کہ میں اس پانی کی روانی کے پیچھے پیچھے چلا گیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی، ایک باغ میں کھڑا اپنی کدالی سے پانی کو الٹ پلٹ رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا اے اللہ کے بندے تیرا کیا نام ہے۔ اس نے بتایا کہ فلاں نام ہے۔ یہ وہی نام تھا جسے اس نے لکہ ابر سے سنا تھا۔ تب باغ والے نے کہا اللہ کے بندے تم نے میرا نام کیوں دریافت کیا جواب میں اس نے کہا کہ جس ابر کا یہ پانی ہے اس سے میں نے یہ آواز سنی کہ "سیراب کر فلاں کے باغ کو" یہ تمہارا ہی نام تھا۔ اب یہ تو بتاؤ کہ اس باغ کے ساتھ تم کرتے کیا ہو، تب باغ والے نے کہا کہ خیر جب تم نے یہ بات سنائی تو سنو! میں اس تمام پیداوار کو جو باغ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کی نگرانی کرتا ہوں۔ پھر ایک تہائی پیداوار کا تو صدقہ کر دیتا ہوں۔ اور تہائی میں میرے اہل و عیال کھاتے ہیں۔ اور ایک تہائی کو پھر اسی باغ میں واپس کر دیتا ہوں (یعنی مصارف باغبانی میں اسے خرچ کرتا ہوں)۔

گویا آبپاشی کی بے شمار تدابیر و سائل میں قرآن کی رو سے اس کا ایک اہم ذریعہ تو بہ و استغفار بھی ہے اور حدیث کی رو سے، اس کی ایک کارگر تدبیر جس کی تصدیق تجربہ سے ہو چکی ہے صدقہ ہے۔ اور یہی میری غرض تھی کہ ایمان و تقویٰ، توبہ و استغفار، صدقہ خیرات وغیرہ جو خالص دینی اشغال و اعمال میں، اخروی منافع کے ساتھ ساتھ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے معاشی سود و بہبود۔ دنیاوی فلاح و صلاح کے بھی وہ ذرائع اور اہم و موثر ذرائع ہیں۔ اور یہ تو چند سرسری مثالیں ہیں۔ قرآن و حدیث پر جن کی تھوڑی بہت بھی نظر ہے۔ یہ چیزیں ان کے سامنے آ سکتی ہیں۔ اگر استیعاب کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے [۲]

---

۱ النیسابوری، القشیری، مسلم بن الحجاج بن مسلم، ابی الحسین، صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقاق، باب فضل الانفاق علی المساکین وابن السبیل [۷۴۷۳] ۴۵۔۲۹۸۴، ص ۱۱۹۴، دارالسلام للنشر والتوزیع الریاض، الطبعۃ الثالثۃ محرم ۱۴۲۱ھ/اپریل ۲۰۰۰ء

۲ گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۴۸۔۵۱

﴿الانفال﴾

آیت: ﴿ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَ اِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (الانفال:۶۰۔۶۵)

''اور تیار کرو جتنی تمہارے بس میں ہو قوت سے، اور حدود اسلام کی حفاظت کے لیے گھوڑوں سے ڈراؤ، اس ذریعہ سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو، اور انکے سوا بھی ہیں جنھیں تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے، اور جس چیز سے جو کچھ اللہ کی راہ میں تم خرچ کرو گے، تمہیں پورا پورا چکا دیا جائے گا، اور تمہارے ساتھ کمی نہ کی جائے گی۔ اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اسکے لیے جھک جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو، قطعاً وہ شنوا اور جاننے والا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں دھوکا دیں، تو تمھارے لیے اللہ بس ہے۔ اسی نے تو تمہاری یاوری اپنی مدد سے کی اور ایمان والوں سے، اور اس نے تمہارے دلوں کو ملا دیا، زمیں میں جو کچھ ہے، اگر تم سب خرچ کر ڈالتے تو انکے دلوں کو نہیں ملا سکتے تھے، لیکن اللہ ہی نے انھیں باہم ملا دیا۔ یقیناً وہ عزت والا اور حکمت والا ہے۔ اے نبی! اللہ تمہارے دلوں کو ملا دیا، زمیں میں جو کچھ ہے، اگر تم سب خرچ کر ڈالتے تو انکے دلوں کو نہیں ملا سکتے تھے، لیکن اللہ ہی نے انھیں باہم ملا دیا۔ یقیناً وہ عزت والا اور حکمت والا ہے۔ ہاں اے نبی! اُکساؤ ایمان والوں کو جنگ پر اگر تم میں بیس صبر والے ہونگے تو وہ سو پر غالب آئینگے، اور تم میں اگر سو ہونگے، تو جنہوں نے کفر کیا انکے ہزار پر غالب آئیں گے۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر ہلکا کر دیا، وہ جانتا تھا کہ تم میں ضعف ہے، پس اگر تمہارے سو ہوں گے صبر کرنے والے، تو دو سو پر غالب آئیں گے، اور اگر تم میں ہزار ہوں گے تو دو ہزار پر غالب رہیں گے اللہ کے حکم سے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

ایسے وقت میں جب ایمان وکفر میں مقابلہ کی ٹھن جائے اس وقت مسلمانوں کو کیا راہ عمل اختیار کرنا چاہیے قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں قبل صلح اور جنگ کی تجویزوں کے ہمیں ایک کام اور کر لینا چاہیے اور اسی کا ذکر ان آیات میں سب سے پہلے کیا گیا ہے۔

۱) غریب و امیر، چھوٹا بڑا جو بھی مسلمان ہے، اس کے بس میں جہاں تک ممکن ہے "قوت" مہیا کرے۔ قوت ایک عام لفظ ہے۔ ظاہر و باطن، اندر باہر ہر قسم کی قوتوں کو عام ہے۔ اس کی تکلیف نہیں دی گئی ہے کہ دشمن کے پاس جو قوت ہے اسکو مہیا کرو، بلکہ صرف اس کی تکلیف ہے کہ تمھارے بس میں جو ہو، اسکو مہیا کرو۔ آنحضرت ﷺ نے ممبر پر ایک دن قوت کے ایک فرد کی تعبیر لفظ "رمی" سے کی یعنی دور سے مارنے کی مشق۔ جس کا مظہر قدیم زمانہ میں تیر و کمان تھا، اور آجکل بندوق اور جدید اسلحہ ہیں۔ خواب میں آنحضرت ﷺ کو ایک بزرگ نے دیکھا تھا کہ حضور کے ہاتھ میں بندوق ہے، فرماتے ہیں نعم السلاح ہذہ (کتنا اچھا ہتھیار یہ ہے) یہ روایت حضرت شیخ الہند سے میں نے سنی ہے۔ الغرض اپنے اندر تو قوت پیدا کرنا چاہیے۔

۲) اور اسلام کے جو متعین حدود ہیں اُن پر سختی کے ساتھ پہرہ بٹھلانا چاہیے، جن کے بس میں یہ ہے کہ وہ اسلامی زمین کے حدود کی حفاظت کر سکتے ہیں وہ یہ کریں۔ اور جن کے بس میں ہے کہ وہ اسلام کے علمی و عملی نظام کے حدود کی حفاظت کریں، وہ اس پر عمل پیرا ہوں۔

۳) سب سے زیادہ قابل غور قرآن مجید کا یہ ٹکڑا ہے کہ "تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُم" اس قوت اور "رباط الخیل" کو اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے کہ جنگ کے وقت ہم اس قوت اور رباط سے کس حد تک کام لے سکتے ہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ دشمنوں کے دل میں کس قسم کی قوتوں سے دہشت اور رعب پیدا ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اس حالت میں ہمیں صرف اسی کی تکلیف دی ہے۔

۴) اور اسی کے ساتھ اس کا بھی اطمینان دلایا کہ ان راہوں پر جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے سب کوڑی کوڑی واپس مل جائے گی۔

پس قبل صلح اور جنگ کے مسلمان جس حال میں ہو، اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اپنے اندر اور اپنے باہر ایسے حالات پیدا کر لے جس سے عدو اللہ کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا ہو، ان کے دل سے یہ خیال نکل جائے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے نام لیوا ایسے لقمہ تر نہیں ہیں، جنھیں آسانی سے نگلا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، ایسی قوتوں کا پیدا کرنا کچھ زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔ آج اسی ہندوستان میں سکھوں کی قوم ہے، کہ اس کے پاس جنگ کرنے کی قوت نہ ہو، لیکن انھوں نے اپنے اندر حالات ایسے پیدا کیے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے انکا مقابل ضرور مرعوب ہو جاتا ہے۔ ان کو اتنا آسان لقمہ نہیں سمجھتا جتنا کہ اسی ملک کے دوسرے باشندوں کو خیال کیا جاتا ہے۔

پس جب مسلمان اپنے کو دوسروں کے لیے ڈراؤ را ونا بنالیں، اسکے بعد اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اب ان قوموں کی طرف بڑھو۔ اگر وہ صلح کرنا چاہیں تو تمھیں بھی صلح پر آمادہ ہونا چاہیے۔ صلح کی وجہ سے تمھارے دلوں میں جو شکوک و شبہات پیدا ہوں انکا آسان علاج بتا دیا گیا، کہ اپنی قومی زندگی کے جہاز کو اس لامحدود قوت والے لنگر کے ساتھ باندھ دو جس پر تم اللہ کے نام سے ایمان لا چکے ہو، اور یقین کرو کہ وہ سن رہا ہے، جان رہا ہے۔ تمھیں اس صلح کے سلسلے میں اگر دشمنوں کی جانب سے فریب اور دھوکہ کا خطرہ ہے

تو پروانہ کرو، تم سے چھپ کر وہ فریب کر سکتے ہیں لیکن جس پر تم نے اعتماد کیا ہے اس قوت سے تو وہ چھپ نہیں سکتے۔ تمھاری حفاظت کے لیے اس کی ذات بس کرتی ہے۔ اس انتشار پراگندگی کی حالت میں جس میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا تھے یکا یک لکھنو کے اسلامی قلم کے نیچے ان میں مختلف فرقوں کا جمع ہو جانا کیا خدا کی قدرت کی کھلی نشانی نہیں ہے۔ کون ان ٹوٹے ہوئے مسلمانوں کو جمع کر سکتا تھا جو آج طول و عرض میں ملک کے ایک نقطہ پر سمٹ رہے ہیں۔ پس جس نے ہمارے تنہا پیغمبر ﷺ کے ساتھ آج ساٹھ کروڑ انسانوں کو جمع کر دیا ہے، ہم اس پر ان کے دھوکوں کے مقابلہ میں اگر بھروسہ کرتے ہیں تو کیا ہمارا تجربہ اپنے خدا کے متعلق بھی غلط ہوا ہے۔

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، اس کے مخاطب عرب تھے اور ایمان والوں کے مقابلہ میں جو لوگ تھے وہ بھی اس ملک کے، اسی نسل کے اسی عادتوں خصلتوں کے مالک تھے۔ پھر ابتدا میں ان ہی میں جو ایمان والے تھے ان کے دس کو خدا نے سو پر کس بنیاد پر غلبہ عطا فرمایا تھا۔ ایمانی قوت کے سوا اور کیا چیز اس غلبہ کی وجہ ہو سکتی ہے۔ اور ایک دس کی نسبت تو اس وقت رہتی ہے جب ایمانی قوت شباب پر ہوتی ہے۔ لیکن قرآن نے فیصلہ کر دیا ہے کہ خواہ ایمان والوں میں جس قدر بھی ضعف پیدا ہو جائے، لیکن ہر حال میں ایک اور دو کی نسبت بہر حال باقی رہے گی۔ یعنی ایک مومن دو غیر مومن پر، اور ایک ہزار تمھارے دوسروں کے دو ہزار پر غالب رہیں گے۔ بلا شبہ اس غلبہ میں بھی "صبر" کی شرط رکھی گئی ہے، لیکن جس درجہ کا ایمان ہوگا اسی درجہ کا "صبر" ضرور ہوتا ہے۔ اگر ایمان کا وہ درجہ کسی کو میسر آ جائے کہ جس میں ایک دس پر غالب آ جاتا ہے تو اس کو "صبر" واستقامت کا بھی اتنا ہی حصہ ملتا ہے۔ اور اگر ایمانی ضعف اس درجہ پر پہنچ جائے کہ ایک اور دو کی نسبت قائم ہو جائے تو اسی درجہ کا "صبر" بھی اس ایمان کے ساتھ نصیب ہوتا ہے۔ لیکن جس میں کسی درجہ کا "صبر" نہیں ہے شاید کہ اس میں کسی درجہ کا ایمان بھی نہیں ہے۔

الغرض صلح ہو یا جنگ، اس سے پہلے انسان کو اپنی قوت پیدا کر لینی چاہیے جس سے ان کے اعداء کے دل میں ان کا رعب قائم ہو۔ اسکے بعد جو صلح ہو گی عزت کی صلح ہو گی، جو جنگ ہو گی عزت کی جنگ ہو گی۔ ورنہ اس سے پہلے صلح بھی بے عزتی کی اور جنگ بھی بے عزتی کی جنگ بن کر رہ جاتی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر حسن، سید، وقت کا تقاضا اور قرآن کی رہنمائی (صدق لکھنو) ۲۱ دسمبر ۱۹۳۷ء

﴿التوبہ﴾

یہی خیال ہوتا ہے کہ راہبانہ زندگی بسر کرنے والوں کی اکثریت جس طرح خداداد توانائیوں کے سرمائے کو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سال تک یونہی ضائع کرتی رہتی ہے اور اپنی انفرادی قوت سے جماعتی جسد کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتی، اسی طرح زائداز ضرورت آمدنی والے اپنے مالی سرمایہ سے، بجائے نفع پہنچانے کے کنز بنا بنا کر اس کے افادی پہلوؤں کو ضائع کرتے رہتے ہیں، دنوں طبقوں میں یہی اشترا کی مناسبت ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ جن اخروی سزاؤں کا ذکر فرمایا گیا ہے، اگر چہ بظاہر ان کا تعلق کنز والوں سے ہے۔ لیکن جب دونوں کے جرموں کی نوعیت میں تناسب ہے تو کیا سزا کی نوعیت میں بھی تناسب نہ ہوگا؟ بلکہ کنز والے اگر کسی کو اپنی مالی توانائی سے نفع نہیں پہنچاتے تو کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال بھی تو نہیں کھاتے، لیکن احبار و رہبان کی اکثریت جیسا کہ گذر چکا۔ علاوہ اس کے ''اکل اموال الناس بالباطل'' کے جرم میں بھی مبتلا ہے۔ اور اس لحاظ سے اس طبقہ کا معاشی جرم بہ ظاہر کنز والوں سے زیادہ سخت معلوم ہوتا ہے۔[1]

''ترک دنیا'' کو ''حصول دنیا'' کا آلہ بنا کر زندگی گذارنے والوں کا زور اگر چہ اب بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے۔ لیکن پھر بھی ہر ملت و مذہب میں ایک طبقہ بے کاری سے روزگار حاصل کرنے والوں کا تقریباً دنیا کے ہر خطوں اور ملتوں میں موجود ہے اور گو اب الذہب والفضہ کی ریل پیل کا مال ان کے یہاں اس پیانہ پر تو نہیں ہے۔ جو کبھی تھا تاہم ان کے بعض سر برآوردوں میں عہد ماضی کے کچھ نمونے اب بھی نظر آتے ہیں۔ سب کمائیں، خون کا پسینہ بنا کر کمائیں۔ اور ان کی کمائی سے محض قدیم روایات کی بنیاد پر کچھ لئے، دیئے، کرے دھرے بغیر یہ وصول کرتے رہیں اس سے صرف یہی نہیں کہ ان کی اکتسابی قوتیں اپنے افادی اور معاشی نتائج کو ظاہر کئے بغیر مسلسل نسلاً بعد نسلٍ قبروں میں دفن ہوتی چلی جارہی ہیں۔ بلکہ بے کاری کے اس عجیب وغریب سستے اور آسان روزگار کو دیکھ کر کتنے دلوں میں ان کی ریس کی ہوک اٹھتی ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ اس ریس کے سلسلے میں مکر و فریب خدع اور دجل کے جالوں میں کتنے غریب عوام کو آئے دن پھنس پھنس کر اپنی بیوی بچوں کے منہ سے نوالوں کو چھین چھین کر ان کے شکم کی دوزخ کو بھرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے جو کچھ اس طبقہ کے ذریعہ سے ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ چونکہ خدا اور اس کے دین کے نام سے ہو رہا ہے ان کو دیکھتے ہوئے سچ تو یہ ہے کہ جن سزاؤں کا ذکر قرآن میں ان کے متعلق کیا گیا ہے، اگر آخرت میں ان کے یہ مستحق ہوں تو شاید ان کے حق میں یہ زیادتی نہ ہوگی، آخر کچھ تو مصلحت ہے کہ احبار و رہبان کی اکثریت جس ''اکل بالباطل'' کی مرتکب ہے۔ اس کے ذکر کے ساتھ ان سزاؤں کا حق تعالیٰ نے یہاں کیوں تذکرہ فرمایا.....[2]

بہر حال احبار و رہبان کی اکثریت حالانکہ فسق کے مختلف گفتہ و ناگفتہ بہ حالات اور عادات میں مبتلا تھی۔ لیکن سب کی طرف (وکثیر منهم فاسقون)[3] کے اجمالی اشارے پر کفایت کرتے ہوئے صرف ان کے اس ہی معاشی جرم یعنی ''اکل اموال الناس بالباطل'' کا کھلے کھلے صاف لفظوں میں قرآن نے جو اعلان کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں معاشی مہمات اور معاشی مسائل کی کتنی اہمیت ہے۔ حالانکہ جہاں تک تاریخ کی شہادتیں ہیں۔ اس طبقہ کے دوسرے جرائم کچھ کم ہولناک اور شرمناک نہ تھے۔[4]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۹۔۱۰

۲ ایضاً، ص ۱۳

۳ مزید وضاحت کیلئے دیکھیں مقالہ ہذا میں سورہ الحدید، ۲۷

۴ گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۳

آیت : ﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ (التوبۃ:۱۲۲)

''پھر کیوں نہ چل پڑا ہر فرقے سے ایک گروہ ''الدین'' میں سمجھ پیدا کرنے کے لیے تاکہ چوکائیں اپنی قوم کو وہ لوگ جب پلٹ کر آئیں انکے پاس شاید کہ وہ (ناکردنیوں) سے بچیں۔''

وحی ونبوت کے معلومات کے استعمال صحیح اوران سے آئندہ پیش آنے والے واقعات وحوادث کے متعلق جدید نتائج واحکام کو صحیح اصول پر مستنبط کرنااوراسی کے مطابق امروحکم دینے کی واقعی صلاحیت وقابلیت ماہرانہ لیاقت واستعداد پیدا کرنے کے لیے قرآن میں حق تعالےٰ نے

﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾(التوبہ ۱۲۲)

کی آیت نازل فرماکر''تفقہ فی الدین'' پیدا کرکے امروحکم کے صحیح استحقاق حاصل کرنے والوں کے لیے اسلام میں ایک مستقل باب کاافتتاح فرمادیا۔حتیٰ کہ اسی نص محکم سے جودراصل قیامت تک پیش آنے والی دینی وقانونی ضرورتوں کے حل کی اساسی بنیاد ہے۔حافظ ابن حزم اندلسی اسی آیت کی روشنی میں اپنی کتاب الاحکام میں اسی آیت کو پیش کرکے لکھتے ہیں۔

فرض علی كل جماعة مجتمعة فی قرية او مسكوة و هی المحشرة عندنا ارۃ اعراب اوحصن ان ينتدب منهم لطلب جميع احكام الديانة اولها عن آخرها و يتعلم القرآن كله والكتاب و كل ماصح عن النبیﷺ عن احاديث الا حكام اولها ضبطها بنصوص الفاظها و ضبط كل ما اجمع عليه المسلمون و ما اختلفوافيه ... ففرض عليهم الرحيل الی حيث يجدون العلماء المحتدين علی صنوف العلم و ان بعدت ديارهم ولاتهم بالصين

مسلمانوں کی جماعتیں خواہ وہ کسی گاؤں میں یاکسی بازار یاکسی بدوی منزل یاقلعہ میں جہاں کہیں بھی اکٹھی ہو کرآباد ہوجائیں ان پر فرض ہے کہ ان میں کچھ لوگ مذہب اور دیانت کے تمام احکام کے طلب وتلاش و تحصیل کے لیے آمادہ ہوجائیں یعنی اول سے آخر تک مذہب کے تمام مسائل کوسیکھیں، ان کو چاہیے کہ پورے قرآن کی تعلیم حاصل کریں اوراحکام کی حدیثوں میں جوصحیح ثابت ہوچکی ہیں ان کی کسی کتاب کو پڑھیں، اول سے آخر تک، چاہیے کہ ان حدیثوں کے ہر ہر لفظ کوضبط کریں نیز مسلمانوں کاجن مسائل پر اجماع واتفاق ہےان کا بھی علم حاصل کریں اورجن میں لوگ مختلف ہیں ان کا بھی۔

بہر حال ان پر واجب ہے سفر کرناان علاقوں کی طرف جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہرین مل سکتے ہیں خواہ یہ علاقے ان کے ملک سے دور ہی کیوں نہ ہوں، حتیٰ کہ چین ہی میں علماء کایہ طبقہ کیوں نہ رہتا ہو۔

اسی آیت کی ذیل میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جس طرح ہراجتماعی طبقہ سے کسی نہ کسی کواس کام کے لیے مستعد ہوجانا فرض ہے۔یوں ہی

فرض علی جمیع المسلمین ان یکون فی کل قریۃ او مدینۃ او حصن من یحفظ القرآن کلہ و یعلمہ الناس و یقرئہ ایاھم

تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کے ہر گاؤں، ہر شہر یا قلعہ میں ایسے آدمی ہوں جنہیں پورا قرآن یاد ہو اور لوگوں کو وہ قرآن سکھاتا ہو اور پڑھاتا ہو یعنی مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنی اپنی آبادیوں میں ایسے پڑھانے والوں کو مہیا کریں۔

بہر حال وہی ضرورت یعنی وحی و نبوت کے ان آخری علوم کے مطابق الامر اور حکم دینے کا دروازہ رہتی دنیا تک ہر اس شخص کے لیے کھلا رہے جو اپنے لیے اسلامی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکا ہو، قرآن میں یہ واجب اور فرض قرار دیا گیا کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت سے ایک گروہ وحی و نبوت کے ان معلومات کی سمجھ اور ان میں تفقہ پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس خطاب کے پہلے مخاطب اور اس فرض کے پہلے مکلف وہی حضرات ہو سکتے تھے جنہیں ہم مسلمانوں کا پہلا قرن یا پہلا طبقہ سمجھتے ہیں، میری مراد صحابہ کرام اور عہد نبوت کے مسلمانوں سے ہے اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے اپنے خاص رجحانات اور فطری مناسبتوں کے ساتھ صحابہ میں کچھ لوگ اس فریضہ قرآنی کے انجام دہی کے لیے آمادہ ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ دین میں تفقہ پیدا کرانے یا وحی و نبوت کے معلومات کے متعلق سوجھ بوجھ پیدا کرانے کا پہلا کام جس ہستی سے متعلق ہو سکتا تھا وہ خود سرور کائنات ﷺ کی ذات اقدس تھی قرآن پاک میں

﴿یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (البقرہ: ۱۲۹)

''سکھاتے ہیں (پیغمبران مسلمانوں کو) الکتاب اور الحکمت'' ہی آپ کا فریضہ قرار دیا گیا تھا۔[۱]

''تفقہ فی الدین'' کے مطالبہ کی گزشتہ بالا قرآنی آیت کے سوا دوسری جگہ قرآن کی آیت

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۰۴)

چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہو جو خیر کی طرف بلائے، اچھی باتوں کا امر و حکم دے اور بری باتوں سے روکے۔

میں بھی اسی ''تعلیمی طبقہ'' کے پیدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے سوا بھی مختلف قرآنی آیتوں میں صراحتہ و کنایۃً اس مطالبہ کو مختلف طریقوں سے دہرایا گیا ہے جو عام طور پر مشہور ہیں۔ مثلاً علم ہی کی وجہ سے آدم کو ملائکہ پر فضیلت بخشی گئی نیز متعدد مقامات میں پوچھا گیا ہے کہ عالم اور جو عالم نہ ہو کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔[۲]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، مقدمہ تدوین فقہ، ص ۹۰۔۹۲

۲ ایضاً، ص ۹۹

یونس

آیت : ﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ (یونس:۳۱)

''پوچھو کہ کون روزی پہنچاتا ہے تمہیں، آسمان سے اور زمین سے اور کون مالک ہے شنوائی اور بینائی کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردے سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔ اور کون ٹھیک ٹھاک کرتا ہے کام کو۔''

آسمان وزمین کے نظام اور ان کے باہمی تعلقات سے رزق، یا معاشی فوائد کو کون پیدا کر رہا ہے۔ اور یہ تو باہر کا سوال ہوا۔ پھر جن اندرونی قوتوں مثلاً بینائی وشنوائی، دانائی کی اعانت سے آدمی جن چیزوں کو حاصل کر رہا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خود یہ حیات اور زندگی جو ہماری تمام اندرونی قوتوں کا سرچشمہ اور منشاء ہے۔ دونوں کو ملا کر ''من یدبر الامر'' کا سوال جس کا ترجمہ ہے کہ (ہر کام کو ٹھیک ٹھاک کر کے کون درست کرتا ہے) مطلب یہ ہے کہ اندر کی قوتوں سے ہو یا باہر کی طاقتوں سے ہر چھوٹے اور بڑے کاروبار کو سوال میں داخل کر کے قرآن دریافت کراتا ہے کہ یہ سب کس کس کے حکم اور ارادے سے ہو رہا ہے۔ یہ سب کون کر رہا ہے جواب کے متعلق ایک خبر کا اعلان کیا جاتا ہے۔

لیقولن اللہ

وہ قطعاً یہی کہیں گے کہ ''اللہ''

یہ اقرار انسانی فطرت میں کس طرح گھر کئے ہوئے ہے۔ قرآن ہم کو اس ایمان وایقان پر مجبور کرتا ہے کہ سب کچھ اللہ کر رہا ہے، صرف یہی واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر فطرت کے خمیر میں اس واقعہ کا علم اور یقین بھی پیوستہ وسرشتہ ہے۔ پھر جن راہوں اور قدرت کے جن قوانین وضوابط کے تحت یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، جب ان کے متعلق صحیح معلومات فراہم کر کے اسی کے مطابق طریقہ عمل کے اختیار کا نام حکیمانہ (سائنٹیفک) طریقہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ تو جو پیدا کر رہا ہے اسی سے ان پیداواروں کو حاصل کرنے کے لئے اس کی باتوں کا ماننا تا کہ ہماری مرضی پوری ہو، اس کی خلافت مرضی کی باتوں سے بچنا اپنی اپنی استطاعت و وسعت کی حد تک اس کی مرضی پر چلنا غلطی سے ہٹ جانے کے بعد معافی مانگتے ہوئے پھر اسی کی مرضی کی طرف پلٹنا اور ان تدبیروں کے ساتھ ساتھ جو وہ پیدا کر رہا ہے۔ گڑگڑا کر اس سے مانگنا جس کی دوسری تعبیر ایمان وعمل صالح، تقوی، توبہ، واستغفار، دعاء، الحاح وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ بتایا جائے کہ آخر کس وجہ سے حصول معاش کی یہ تدبیر صحیح حکیمانہ تدبیر نہیں ہے، اگر عمل کا پہلا طریقہ علم کی صحیح روشنی میں اختیار کیا جاتا ہے تو کیا عمل کا دوسرا طریقہ جہل کی تاریکی میں اختیار کیا گیا ہے، اگر عمل کے پہلے طریقہ پر علم اور مشاہدہ تحقیق وتجربے کی قوتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں۔ تو کیا دوسرے طریقے پر بھی وہی یقین وہی علم ہمیں نہیں مجبور کرے گا جس کے متعلق بتایا جا چکا کہ قرآن انسانی جبلت کا اسے لازوال علم قرار دیتا ہے کیسی عجیب بات ہے کہ قرآن سے ہم اس علم کو بھی حاصل کرتے ہیں کہ

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ O تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (آل عمران:۲۶،۲۷)

آیت: ﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ (یونس:۳۱)

''پوچھو کہ کون روزی پہنچاتا ہے تمہیں، آسمان سے اور زمین سے اور کون مالک ہے شنوائی اور بینائی کا اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردے سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔ اور کون ٹھیک ٹھاک کرتا ہے کام کو۔''

آسمان و زمین کے نظام اور ان کے باہمی تعلقات سے رزق، یا معاشی فوائد کو کون پیدا کر رہا ہے۔ اور یہ تو باہر کا سوال ہوا۔ پھر جن اندرونی قوتوں مثلاً بینائی و شنوائی، و دانائی کی اعانت سے آدمی جن چیزوں کو حاصل کر رہا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خود یہ حیات اور زندگی جو ہماری تمام اندرونی قوتوں کا سرچشمہ اور منشاء ہے۔ دونوں کو ملا کر ''من یدبر الامر'' کا سوال جس کا ترجمہ ہے کہ (ہر کام کو ٹھیک ٹھاک کر کے کون درست کرتا ہے) مطلب یہ ہے کہ اندر کی قوتوں سے ہو یا باہر کی طاقتوں سے ہر چھوٹے اور بڑے کاروبار کو سوال میں داخل کر کے قرآن دریافت کراتا ہے کہ یہ سب کس کے حکم اور ارادے سے ہو رہا ہے۔ یہ سب کون کر رہا ہے جواب کے متعلق ایک خبر کا اعلان کیا جاتا ہے۔

لیقولن اللہ

وہ قطعاً یہی کہیں گے کہ ''اللہ''

یہ اقرار انسانی فطرت میں کس طرح گھر کیے ہوئے ہے۔ قرآن ہم کو اس ایمان وایقان پر مجبور کرتا ہے کہ سب کچھ اللہ کر رہا ہے، صرف یہی واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر فطرت کے خمیر میں اس واقعہ کا علم اور یقین بھی پیوستہ و سرشتہ ہے۔ پھر جن راہوں اور قدرت کے جن قوانین وضوابط کے تحت یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، جب ان کے متعلق صحیح معلومات فراہم کر کے اسی کے مطابق طریقہ عمل کے اختیار کا نام حکیمانہ (سائنٹیفک) طریقہ عمل قرار دیا گیا ہے۔ تو جو پیدا کر رہا ہے اسی سے ان پیداواروں کو حاصل کرنے کے لئے اس کی باتوں کا ماننا تا کہ ہماری مرضی پوری ہو، اس کی خلافت مرضی کی باتوں سے بچنا اپنی اپنی استطاعت و وسعت کی حد تک اس کی مرضی پر چلنا غلطی سے ہٹ جانے کے بعد معافی مانگتے ہوئے پھر اسی کی مرضی کی طرف پلٹنا اور ان تدبیروں کے ساتھ ساتھ جو وہ پیدا کر رہا ہے۔ گڑ گڑا کر اس سے مانگنا جس کی دوسری تعبیر ایمان و عمل صالح، تقوی، توبہ، و استغفار، دعاء، الحاح وغیرہ کے الفاظ سے کی جاتی ہے۔ بتایا جائے کہ آخر کس وجہ سے حصول معاش کی یہ تدبیر صحیح حکیمانہ تدبیر نہیں ہے، اگر عمل کا پہلا طریقہ علم کی صحیح روشنی میں اختیار کیا جاتا ہے تو کیا عمل کا دوسرا طریقہ جہل کی تاریکی میں اختیار کیا گیا ہے، اگر عمل کے پہلے طریقہ پر علم اور مشاہدہ تحقیق و تجربے کی قوتیں ہمیں مجبور کرتی ہیں۔ تو کیا دوسرے طریقے پر بھی وہی یقین وہی علم ہمیں نہیں مجبور کرے گا جس کے متعلق بتایا جا چکا کہ قرآن انسانی جبلت کا اسے لازوال علم قرار دیتا ہے کیسی عجیب بات ہے کہ قرآن سے ہم اس علم کو بھی حاصل کرتے ہیں کہ

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (آل عمران:۲۶،۲۷)

''کہو اے اللہ آپ ہی مالک ہیں ملک کے دیتے ہیں جسے آپ چاہتے ہیں، اور چھین لیتے ہیں جس سے چاہتے ہیں، آبرو بخشتے ہیں جسے چاہتے ہیں اور رسوا کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں۔ ''الخیر'' (ساری بھلائیاں) آپ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں، آپ ہی رات کو دن میں گم کرتے ہیں اور دن کو رات میں گم کرتے ہیں۔ نکالتے ہیں آپ ہی زندہ کو مردے سے، اور نکالتے ہیں مردے کو زندہ سے اور روزی پہنچاتے ہیں جسے چاہتے ہیں حساب کے بغیر''۔

جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا کام مثلاً حصول سلطنت وحکومت اور چھوٹے سے چھوٹا کام مثلاً روزی کی روزی جس میں چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے بھی ہمارے شریک ہیں، کام کے یہ دونوں سلسلے براہ راست حق تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کے ساتھ بندے ہوئے ہیں اور کس طرح بندھے ہوئے ہیں۔

﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَ مَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ﴾ (فاطر:۲)

''جو کچھ کھولتا ہے خدا لوگوں کے لئے رحمت کے (سرچشمہ سے) تو نہیں ہے کوئی روکنے والا اس کا اور جسے روک دے خدا تو نہیں ہے، بھیجنے والا اس رحمت کا اس کے بعد کوئی۔''

یعنی اپنی رحمت کے جس دروازے کو کسی پر وا کردے، آسمان وزمین کی کوئی دوسری قوت پھر اسے بند نہیں کرسکتی اور جسے بند کردے کوئی دوسرا پھر اسے کسی طرح کسی حال میں کھول نہیں سکتا۔ جب ''الخیر'' (ہر وہ چیز جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہو اور جس سے ہم نفع اٹھا سکتے ہوں) سب کی سب اس کی مٹھی میں اور ید میں بند ہے، تو بتایا جائے کہ اسی ''الخیر'' کا طالب اس کی طلب میں قرآن کے حکم

﴿فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ﴾ (عنکبوت:۱۷)

''پس ڈھونڈھو اللہ کے پاس روزی کو''

اور

﴿وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (النساء:۳۲)

''اور مانگو اللہ سے اس کے فضل کو''

کی تعمیل کرتے ہوئے، جس کے پاس ''الخیر'' ہے۔ اسی سے اگر اس ''الخیر'' کو مانگتا ہے تو بتایا جائے کہ عقل ودانش، حکمت ودانائی کا بھی اس کے سوا اور کیا اقتضا ہوسکتا ہے، میرے نزدیک تو معاشی جدوجہد کے سلسلے میں عمل کا پہلا طریقہ اگر کوئی عقلی تدبیر ہے تو دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ عقلی تدبیر کہلانے کا مستحق ہے۔

ناکامیوں کے ہزارہا تجربات کے بعد بھی جب آدمی کے لئے تدبیر کے پہلے شعبہ کا ترک کرنا بدعقلی کی دلیل ہے تو محض اس لئے کہ دعائیں بھی کبھی قبول نہیں ہوتیں۔ تدبیر کے اس طریقہ سے محض اسی لئے بے تعلق ہوجانا آخر نادانی وحماقت کیوں نہ ہو، اپنے اختیار پر بھی جنھیں اختیار نہیں ہے۔ اور اپنا اقتدار بھی جن کے اقتدار میں نہیں ہے جب ان ہی میں کسی کے اندر لوگوں کو اختیار اور اقتدار کا کچھ سراغ ملتا ہے، مثلاً کسی حکومت کا ہم میں کوئی عہدہ دار یا حاکم ہوجاتا ہے بلکہ خود بیچارے سلاطین کو بھی کب اپنے

نمائشی اختیار پر کامل اختیار ہوتا ہے۔ بہر حال اسی نمائشی اختیار و اقتدار کے مظاہر کو دیکھ کر جب دیکھا جاتا ہے کہ مسلسل نامنظوریوں کے باجود ان کی بارگاہوں سے درخواستوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا، ہزار دفعہ جس کا معروضہ مسترد ہو چکتا ہے وہ ایک ہزار ایک کے بعد منظوری کی توقع کرتے ہوئے درخواست دینے سے نہیں گھبراتا پھر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جو محکوم نہیں حاکم ہے، تابع نہیں متبوع ہے، جاہل نہیں عالم ہے، صاف صاف لفظوں میں کہئے کہ جو بندہ نہیں خدا ہے۔ اگر کسی بندے کی کسی درخواست کو کسی وقت نہیں قبول فرماتا یا جاہل کے جہل کا اپنے علم کو تابع نہیں بناتا تو یہ کیسے باور کرلیا جاتا ہے کہ جس کے اختیار میں سارے جہان کے اختیارات اور جس کے اقتدار کے ساتھ سارے جہان کے اقتدارات اٹکے ہوئے ہیں۔ بندے کے کسی مطالبہ کا پورا کرنا اس کے اختیار سے العیاذ باللہ خارج ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۵۲-۵۴

﴿ہود﴾

آیت : ﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا﴾ (ہود:٦)

"اور نہیں ہے کوئی چلنے والا (زمین پر) مگر اس کی روزی کی ذمہ داری خدا پر ہے۔ جانتا ہے اس کی قیام گاہ کو بھی اور جہاں سونپا جائے گا اس کو بھی۔"

جن معاشی پیداواروں پر آدمی اپنی موجودہ زمینی زندگی گذار رہا ہے قرآن سے ان کی سلبی صفت تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ مجموعی حیثیت سے بسط کی کیفیت ان سے پیدا نہیں ہو سکتی، پیدا کرنے والے کی یہی مشیت اور یہی اس کا طے شدہ ارادہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی یہ بھی یقین دلاتا ہے کہ باوجود اس طے شدہ ارادے کے یہ بھی قطعی ہے کہ اتنا بہر حال پیدا ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ جس سے آدمی اور آدمی کے سوا دوسرے زندگی گذارنے والوں کو "معائش" فراہم ہوتے رہیں گے اس وقت تک فراہم ہوتے رہیں گے۔ جب تک قدرت انھیں زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ یہی مطلب ہے ضمانتِ رزق کی ان مشہور آیتوں کا، یعنی

﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا﴾

یا دوسری جگہ ارشاد ہے

﴿وَ كَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَ اِیَّاكُمْ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ (العنکبوت:٦٠)

"اور کتنے چلنے والے ہیں کہ نہیں لادے پھرتے ہیں اپنی روزی کو، اللہ ہی روزی پہنچاتا ہے ان کو بھی اور تم کو بھی وہی شنوا ہے وہی دانا ہے۔"

[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۱۷

آیت : ﴿ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (هود : ۴۸)

''ہماری طرف کی سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اتر جو تجھ پر ہیں اور تیرے ساتھ کی بہت سی جماعتوں پر، اور بہت سی وہ امتیں ہوں گی جنھیں ہم فائدہ تو ضرور پہنچائیں گے لیکن پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔''

بہ ظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''امم'' کا ایک طبقہ تو وہ ہے جو نوح کے ساتھ تھا ان کو سلام و برکات کی بشارت سنائی گئی۔ لیکن یہ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ مقابلہ کی رو سے چاہیے کہ حضرت نوح کی کشتی والوں کے سوا ہوں، اگرچہ حسب دستور ارباب تفسیر دبے پاؤں گذر گئے ہیں، لیکن سوچنے کی بات ہے۔ میرے دل میں تو کچھ اس قسم کی بات آتی ہے کہ حضرت نوح کی کشتی میں جو لوگ تھے زمین پر اترنے کے بعد ممکن ہے کہ علاوہ حضرت نوح کے ان کی بھی اولاد چلی ہو لیکن وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ (الصفت: ۷۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں صرف نوح کی اولاد ہی کشتی سے اترنے والوں کی دنیا میں باقی رہ گئی یعنی اس بقاء کا تعلق صرف کشتی والوں کی حد تک محدود رکھا جائے۔ مگر وہ طبقہ امم کا جو کشتی والوں کے سوا تھا کیا یہ قائن کی اولاد تھی جس کی نسل میں حسب تصریح تورات توبلقائن تھا۔ اور اسی کی نسل سے باڑھ دار ہتھیار بنانے والے اور آلات سرود و نغمہ کے موجدین پیدا ہوئے۔ ان کی خصوصیت قرآن پھر بتاتا ہے کہ ابھی تو نہیں مگر آئندہ زمانے میں تمتع کا موقعہ ان کو بھی دیا جائے گا۔ پھر عذاب الیم ان کو پکڑ لے گا۔ کیا یورپ کی قابیلی یا بالفاظ دیگر یاجوجی ماجوجی نسلوں کی طرف اشارہ ہے؟ یہ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ '' تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا '' (ھود:۴۹) بہ ظاہر خیال گذرتا ہے کہ حضرت نوح کا قصہ بائبل میں جس طرح مذکور ہے اس سے عرب یہود و نصاریٰ کی صحبت کی وجہ سے کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف تھے بلکہ طوفان نوح کا چرچا تو دنیا کی اکثر قوموں میں پایا جاتا ہے حتیٰ کہ ہندو چین اور گمنام جزائر والوں کے یاں بھی کسی نہ کسی شکل میں اس طوفان کی یاد باقی ہے عرب کا ناواقف رہنا محل عجیب سے تھا اسی بنیاد پر میں نے تورات کے قصے کو اٹھا کر پڑھا۔ اس میں نہ تو نوح علیہ السلام کے اس بیٹے کا قصہ ہے جو اس زمانے کی اکتشاف شناوری میں پناہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور نہ طبقاتی تقسیم یا کاسٹ سسٹم کا ذکر ہے جو قوم نوح کے تمدن کی اصل خصوصیت تھی ہندوستان وغیرہ میں اب تک اس کی یادگار باقی ہے، خیال یہی گذرتا ہے کہ تلک کا مشار الیہ قصے کے ان اجزا کو کیوں نہ قرار دیا جائے یعنی قصے کو جس شکل میں اوپر بیان کیا گیا ہے مجموعی حیثیت سے نہ تم ہی اس سے واقف تھے نہ تمھاری قوم ہے[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، معارف قرآنی (صدق جدید لکھنو) ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء

آیت : ﴿اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا﴾ (ھود:۶۱)

''اٹھا کر کھڑا کیا تمہیں زمین سے، اور آبادی کرائی تم سے اس زمین میں۔''

جصاص رحمۃ اللہ اس آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

وفيه الدلالة على وجوب العمارة للزراعة والغراس والابنية

''یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کا آباد کرنا، کھیتی، باغبانی اور تعمیر کے ذریعہ سے واجب ہے۔''

جس کا یہی مطلب ہے کہ زمین کی عمارت (آبادی) خواہ بہ شکل الزراعۃ (کھیتی) یا بشکل الغراس (باغبانی) یا بصورت الابنیۃ (تعمیرات) ہو، قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی بنیاد پر علامہ جصاص حنفی کے نزدیک جائز یا سنت ہی نہیں، واجب اور فرض ہے، گویا اس شغل کی حیثیت وہی ہے جو نماز روزہ وحج وزکوۃ کی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ عربی زبان کے طرز خطاب سے جو واقف ہے۔ وہ الجصاص کے اس استدلال میں کوئی کمزوری نکال سکتا ہے۔ خصوصاً جب ہم تک ایک دو نہیں، بلکہ تقریباً مشہور و مستفیض روایتوں کی شکل میں آنحضرت ﷺ کی وہ حدیثیں پہنچی ہیں، جن میں آپ نے صرف اسی کاشتکاری اور باغبانی کو نہیں جس سے کاشت کرنے والے یا باغ لگانے والے کو نفع ہی پہنچے، بلکہ اس میں بھی جس سے وہ نفع گیر نہ ہوا ہو، اس کے متعلق بھی مختلف پیرایوں میں حضور ﷺ اخروی ثواب کی بشارت سناتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال النبي ما من مسلم يزرع زرعاً أو يغرس غرسا، فيأكل منه طير أو انسان أو بهيمة، الا كان له به صدقة[1]

''فرمایا رسول ﷺ نے نہیں ہے کوئی ایسا مسلمان جس نے کھیتی کی ہو یا درخت لگایا ہو، پھر اس کھیتی یا درخت سے پرند کھائے یا آدمی یا جانور، مگر یہ کہ ہوگا وہ اس کی طرف سے صدقہ۔''

وجہ ظاہر ہے کہ اس کھیت یا باغ لگانے والوں کو اگر نفع نہ پہنچا، تو کیا ہوا، اس نے تو اپنا فرض ادا کیا، اور جس نے خدا کے عائد کئے ہوئے فرض کو ادا کیا، ثواب کا مستحق وہ نہ ہوگا، تو اور کون ہوگا، ماسوا اس کے حضور ﷺ نے ادھر بھی اشارہ فرمایا کہ کاشتکار اور باغبان نے خدا کی دی ہوئی قوتوں سے کام لے کر اس چیز کو جو معدوم تھی، وجود کے لباس میں جلوہ گر ہونے کا موقع دیا۔ اس سے اگر فرد کو نفع اٹھانے کا موقع نہ ملا، تو جماعت کی خدمت کا فرض تو وہ بجالایا، اور جماعت ہی نہیں، خدا کی دوسری زندہ مخلوق، مثلاً پرندیا بہیمہ (چوپائے) اگر اس سے مستفید ہوئے تو قصداً نہ سہی۔ ضمناً اپنے وجود اور اپنی توانائیوں کو اس نے مفید ثابت کیا، اور اسلام یہی چاہتا ہے کہ خدا کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بے کار اور ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

معاشی کاروبار میں مشغولیت پر اسلام کا کتنا زور ہے۔ وہ اسکی اہمیت پر کس حد تک اصرار کرنا چاہتا ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس مشہور حدیث سے بھی ہوسکتا ہے۔ جو آنحضرت ﷺ سے وہ روایت فرمائی ہیں۔

قال النبي ان قامت الساعة و بيدا حد كم فسيلة، فان استطاع أن لا يقوم حتى يغرسها فليفعل[2]

[1] احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، مسند انس بن مالکؓ، [۱۲۵۲۳]، (۳/۱۴۷)، ص ۴/۳۸۰، عالم الکتب للطباعۃ للنشر والتوزیع، بیروت لبنان، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء

[2] (یہ حدیث انس بن ملکؓ سے بھی مروی ہے) احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، مسند انس بن مالک (۱۳۰۱۲) [۳/۱۹۱] ص ۴/۴۹۳، عالم الکتب للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء

''رسول ﷺ نے فرمایا: قیامت قائم ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو۔ اگر اس کے بس میں ہو کہ کھڑا نہ ہو۔ جب تک کہ اس کو بوئے تو چاہیئے کہ اس پودے کو بو دے۔''

مذہب اور دین کے متعلق آج جو غلط خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو سامنے رکھتے ہوئے کون یقین کر سکتا ہے کہ اسلام بھی باوجودیکہ ایک دین اور مذہب ہے لیکن جن مشاغل اور پیشوں کو عام طور پر دنیاوی مشغلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسلام نے ان سب پر اخروی اجر و ثواب کر مرتب کر کے ان کو وہی مقام عطا کر دیا ہے جو عام دینی فرائض و عبادات کا سمجھا جاتا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۷، ۱۸

آیت: ﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ O اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ وَ لِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ﴾ (ہود:۱۱۸،۱۱۹)

''اگر تیرا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر ایک گروہ کر دیتا وہ تو برابر اختلاف کرنے والے ہی رہیں گے سوائے ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے انھیں تو اسی لئے پیدا کیا ہے۔''

سورہ ہود کی مذکورہ بالا آیت کے آخری الفاظ ''اسی لیے پیدا کیا ہے ان کو'' کی تفسیر میں مفسرین کا ایک گروہ تو یہی کہتا ہے کہ مراد اس سے انسانوں کا باہم مختلف ہونا ہے، بیضاوی نے اسی رائے کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔

الضمير للناس فالا شارة الى الاختلاف

(خلقهم) میں ہم کی ضمیر کا مرجع الناس ہے اور (ولذلک) کا اشارہ ایسی صورت میں اختلاف کی طرف ہوگا۔

بہر حال جس طریقہ سے بھی دیکھا جائے مشاہدہ اور تجربہ کی راہ سے ہو یا قرآن وحدیث کی روشنی میں ہو، ہر حال میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کا اختلاف مصنوعی نہیں بلکہ قدرتی ہے، بنانے والے نے آدمی کی ساخت ہی ایسی رکھی ہے کہ باہم ان کا مختلف ہو جانا ناگزیر تھا۔ اس کے ازالہ کا خیال قدرت سے مقابلہ کا خیال ہے۔ البتہ اس قسم کے جبلی صفات مفاسد کے روکنے کی کارگر تدبیر ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ازالہ نہیں بلکہ امالہ کر کے بجائے نقصان کے ان سے نفع اٹھالیا جائے اور اسلام نے یہی کیا بھی ہے، اس نے دین کے ایک حصہ کو تو شیوع عام اور استفاضہ کی راہ سے لوگوں میں اس طرح پھیلا دیا کہ خود شریعت کے العیاذ باللہ غلط یا صحیح ہونے کا احتمال تو ان قلوب میں پیدا ہو سکتا ہے جو اب تک آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے ہیں۔

لیکن یہ بات کہ جس حصہ کو یہ کیفیت عطا کی گئی ہے وہ اسی دین کے اجزاء ہیں جس کی تبلیغ محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے اس کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہے، مثلاً خود قرآن کا، جو چیزیں اسلام کی اسی راہ سے پہنچتی ہیں جس راہ سے قرآن پہنچا ہے ان کا جو حال ہے۔ قرآن میں اسی کا نام ''البینات'' رکھا گیا ہے یعنی ان کا دین کے عناصر و اجزاء میں ہونا ایک ایسی کھلی بین حقیقت ہے جس کا انکار عقل و فطرت کے حدود سے خارج ہے ان ہی ''البینات'' پر متفق و متحد کر کے مسلمانوں کے اختلافی پہلو کا امالہ ان امور کی طرف کر دیا گیا جن کی حیثیت دین میں ''البینات'' کی نہیں ہے یعنی ''البینات'' میں متفق و متحد ہو کر اگر غیر بینائی مسائل میں اختلاف بھی پیدا ہو جائے تو اس اختلاف کو ایسا اختلاف نہیں قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک ٹولی کا دین دوسری ٹولی کے دین سے یا ایک فرقہ کا مذہب دوسرے فرقہ کے مذہب سے جدا ہو جاتا ہے، اور یہی وہ بات تھی کہ ابتداء ہی سے یعنی عہد صحابہ ہی سے مسلمان ان امور میں مختلف ہوتے رہے، لیکن نہ اس اختلاف کو انہوں نے چنداں اہمیت دی اور نہ یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ محض اس اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں کے کسی گروہ کو دوسرے طبقہ سے جدا کیا گیا ہو، بلکہ اس اختلاف میں افادے کے نت نئے پہلو مختلف زمانوں میں مسلمان جو پیدا کرتے رہے ہیں۔

اور سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں مختلف اقالیم و امصار میں جن بزرگوں کے جن خداداد کمالات کا ظہور اسلام کے مختلف شعبوں میں ہوتا رہا اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو بروئے کار لانے میں ان اختلافات کا بھی حصہ ہے، ان ہی کی تحقیق و تفتیش، تنقید و تنقیح اور ان میں تطبیق و توفیق و ترجیح کی کوششوں ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی امامت و پیشوائی کے جلیل

منصبوں پر وہ سرفراز ہوئے اور اپنی محنتوں کا جو صلہ اس دن ان کے سامنے جب آئے گا جس دن ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا ہو گا، آج اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، سورہ ہود کی مذکورہ بالا آیت کے متعلق بعض ارباب نظر کی نظر جو یہاں پہنچی ہے جسے قاضی بیضاوی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

او الیہ والی الرحمۃ

یعنی ذالک کے اسم اشارہ کا اشارہ اختلاف کی طرف بھی ہو اور رحمت کی طرف بھی ہو۔

تو جہاں تک واقعہ ہے اس سے تو اسی کی تائید ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ میلانات ور جحانات کے فطری اختلاف کے رخ کو ''المبینات'' سے ہٹا کر جن لوگوں نے دین کے ''غیر بیناتی'' حصہ کی تحقیق و ریسرچ کی طرف پھیر دیا، ظاہر ہے کہ اپنے اجتہاد و کوشش کے صلہ سے وہ محروم نہیں ہو سکتے اور محروم کیا معنی خدا کی رحمتوں اور کرامتوں کے وہ مستحق نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا، پس کھلی ہوئی بات ہے کہ یہی اختلاف ان کے حق میں ذریعہ رحمت بن گیا، اور یوں ذلک کے اسم اشارہ کا اشارہ ''اختلاف اور رحمت'' دونوں طرف صحیح ہو جاتا ہے۔

بلکہ کل ان کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے اس کا ثبوت آج ہی اس سے مل رہا ہے کہ کروڑہا کروڑ مسلمانوں کے قلوب نسلاً بعد نسل ان بزرگوں کے تشکر و امتنان کے جذبات سے لبریز ہیں اتنے لبریز کہ ''رحمۃ اللہ علیہم'' رضی اللہ تعالےٰ عنہم کی دعاؤں کے بغیر ان کا تذکرہ نہیں کر سکتے۔ آخر کوئی بات ہی تو ہے کہ مکتب خانوں کے میاں جی بیچارے بھی تو بچوں کو قرآن ہی پڑھاتے ہیں خدا کی باتیں ہی سکھاتے ہیں مگر اعزاز و احترام کا وہ حصہ ان کو کیوں نہیں دیا جاتا جو صرف ان بزرگوں کے ساتھ مخصوص ہے جنھوں نے خلافیاتی مسائل کے سلجھانے کی کوششوں میں اپنی جانیں لڑا دی ہیں۔

یہی وہ وجوہ واسباب ہیں جن کی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ انسانی افراد کے باہمی اختلافات کے ازالہ کی کوشش دنیا کے جن مکاتب خیال میں چاہا جاتا ہے، خواہ اس کا تعلق دین سے یا دنیا سے ہو یا زندگی کے کسی شعبہ سے ہو یہ ایک لا حاصل کوشش اور بے معنی سعی ہے بلکہ یہ نصب العین خود اس نصب العین کی غلط اور باطل ہونے کی دلیل ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مقدمہ تدوین فقہ، ص ۱۸۴۔۱۸۷

آیت : ﴿لِلّٰہِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّہٗ فَاعۡبُدۡہُ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡہِ﴾ (ہود:۱۲۳)

''اللہ ہی کی ہیں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں پلٹتی ہے بات سب کی سب اسی کی طرف تو اسی کو پوجے چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگالو۔''

قرآن مجید میں

﴿لِلّٰہِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّہٗ فَاعۡبُدۡہُ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡہِ﴾

کی جو تعلیم دی گئی ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ عقل سے تم زیادہ سے زیادہ پیدائش کے ان ہی آئین وقوانین کو دریافت کر سکتے ہو جو حواس وعقل کی رسائی کے حدود میں ہوں۔ لیکن ''السموت والارض'' کے قوانین کا وہ حصہ جو حواس وعقل سے غائب ہے۔ یعنی ''غیب السموات والارض'' ان کے متعلق تمہارے لئے چارہ کار ہی کیا ہے۔ بجز اس کے کہ وہی ذات جس کے ساتھ تمام چیزوں کی پیدائش وابستہ ہے، سارے کاروبار کی جس پر انتہا ہے۔ اسی کو اپنا وکیل بنا کر اسی کو پوجتے اسی سے مانگتے چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ، گویا عقل وحواس کی راہوں سے جو معلومات حاصل ہو سکیں ان کا جو اقتضاء ہو اس کو پورا کرنے کے بعد واقعہ یہی ہے کہ آخری پناہ آدمی کے لئے پیدا کرنے والے کی پناہ اور اس پر توکل اعتماد کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ جب ساری باتیں اسی کی طرف لوٹ کر جاتی ہیں اور وہی مختار کل ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنے اوپر ٹیک لگانے والوں کو وہ بے ٹیک اور بے سہارا کر دے گا۔

﴿مَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَہُوَ حَسۡبُہٗ﴾ (الطلاق:۳)

''جس نے ٹیک لگایا اللہ پر پس وہ بس ہے اس کو''۔

کا یہی مطلب ہے کہ بہر حال ایسا آدمی بے سہارا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی مقصد ہے اس کا کہ

﴿فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی لَا انۡفِصَامَ لَہَا﴾ (البقرہ:۲۵۶)

''اور الطاغوت (یعنی ہر وہ چیز جو خدا سے طغیان وسرکشی پیدا کرے) اس کا جس نے انکار کر دیا۔ اور اللہ کو مان لیا تو اس نے پکڑ لیا مضبوط ترین کڑے کو جو کبھی نہ ٹوٹے گا''۔[۱]

[۱] گیلانی، مناظر احسن سید، اسلامی معاشیات، ص۵۹

﴿یوسف﴾

آیت: ﴿ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴾ (یوسف:۳۳)

''اے میرے پروردگارا قید خانہ مجھے گوارا ہے اس سے جدھر یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں اور اگر آپ نے ان کی چال کو دور نہیں فرمایا، تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں ہو جاؤں گا۔''

زلیخا یہ کہہ کر کہ ''یہ نہیں مانتا'' یوسف علیہ السلام کو دھمکی دیتی ہے۔

﴿ وَ لَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ﴾ (یوسف:۳۲)

اگر اس نے وہ نہیں کیا جس کا میں حکم دیتی ہوں، تو یہ قید کیا جائے گا اور ذلیل لوگوں میں ہو جائے گا۔

یوسفؑ اس دھمکی کو سن کر یکا یک چیخ اُٹھے ہیں اور یعقوبؑ کے خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔

﴿ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴾

ذرا دیکھنا! یوسف پر ایک عورت نہیں چند عورتیں اور پھر وہ بھی مصر کی مشاق شاطرہ عورتیں، ہر چہار طرف سے یوسف کو گھیرتی ہیں، خدا جانے کن کن طریقوں سے ان کو اپنی طرف ریجھاتی ہیں اور اخیر میں یہ کہ چھری لے لے کر اپنے ہاتھوں کو لہولہان کر لیتی ہیں اور پھر اس واقعی جرم کو بنا کر اب کہتی ہیں کہ ''دیکھ مان جا ورنہ ہم ان زخموں کو دکھا کر تجھے مجرم بنائیں گے، سزا دلائیں گے۔''

اللہ اللہ اس وقت تو یوسفؑ بالکل خاموش ساکت وصامت بنے کھڑے رہتے ہیں، نہ چیختے ہیں، نہ چلاتے ہیں، نہ اپنے خدا کو پکارتے ہیں۔ کچھ نہیں، لیکن جب وہ عورتیں تھک کر بیٹھ جاتی ہیں اور زلیخا ان سے اپنا دکھڑا رونے بیٹھتی ہے اور اسی سلسلہ میں ضمنی طور پر ان کو بغیر کسی سازشی ثبوت کے یوں ہی دھمکی دیتی ہے کہ میں تجھے قید کردوں گی یا رسوا کردوں گی، تو یکا یک آپ چیخ اٹھتے ہیں اور اپنے کو اس درجہ بے قابو پاتے ہیں کہ خدا کو اپنا یہ آخری پیغام پہنچا دیتے ہیں کہ اگر آپ نے مجھے نہیں بچایا تو میں ان کی طرف مائل ہو کر جہالت کی باتیں کر گزروں گا۔

ان کی یہ دعا، کس قدر بے محل اور بے موقعہ معلوم ہوتی ہے؟ اور یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ تفسیر جدید میں خواہ مخواہ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ یوسفؑ کو ان عورتوں نے بھی دھمکیاں دی تھیں، بہر حال یوسفؑ کا زلیخا کی دھمکی کے بعد دعا کرنا اس بات کو چاہتا ہے کہ اس سے پہلے آپ کو اس مجلس میں کسی قسم کی دھمکی وغیرہ نہیں دی گئی اور یہی ائمہ دین رحمہم اللہ اجمعین کا خیال عالی ہے، ورنہ اس دعا کو بجائے زلیخا کی دھمکی کے زنانِ مصر کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد ہونا چاہیے تھا۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی دعا میں جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کید میں تمام عورتیں شریک تھیں۔

بلاشبہ ایسا معلوم ہوتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کید قطع ید وغیرہ تھا، اس کا بھی کوئی ثبوت ہے؟ ہم کہہ سکتے ہیں جیسا کہ امام رازی کا بھی خیال ہے، اور خود دعا کا زلیخا کی دھمکی کے بعد واقع ہونا اس کو چاہتا ہے کہ جب زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو قید اور ذلت کی دھمکی دی، تو زنانِ مصر جن کو زلیخا کی مجبوریوں پر رحم آچکا تھا اور جن کی ملامت اب عنایت سے بدل گئی تھی، اسی طرح یوسفؑ کے

معصومانہ حسن دلکش، نبوی کشش و جذب نے بھی ان پر اثر کیا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ یوسف علیہ السلام کو سمجھائیں اور قرینہ چاہتا ہے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کو کہا ہوگا کہ میاں لڑکے ادیکھو اپنی ضد سے باز آؤ، اپنے اوپر رحم کرو، ورنہ یہ دیوانی عورت خدا جانے تمہارے ساتھ کیا کچھ کرگذرے، تم اب مجبوریوں کے حکم میں ہو اور حالت مجبوری میں تو ناجائز سے ناجائز چیز بھی انسان کے لیے جائز ہو جاتی ہے۔ جب اس قسم کے خطرہ میں آدمی مبتلا ہو جاتا ہے، تو اس وقت اس کے فعل پر مواخذہ نہیں ہوتا الی غیر ذلک

واقعہ یہ ہے کہ یوسفؑ کی وہ دعا اور خداوند تعالیٰ کو اس یاس انگیز انداز سے پکارنا کہ اگر آپ نے نہیں بچایا تو میں گیا، نا ممکن ہے کہ بغیر اس قسم کی کیادیوں کے وقوع پذیر ہو، تقویٰ وورع کی قوت جذبات کے ہیجان کو تھام سکتی تھی، اور تھامتی ہے لیکن عقل پر جب حملہ ہو جاتا ہے اور وہ مغلوب ہونے لگتی ہے تو اس وقت انسان کی کوئی قوت اسے نہیں بچا سکتی۔ اس وقت وہ صرف بشریت سے بالاتر قوت کا محتاج ہو جاتا ہے۔

اس سے پہلے یوسف علیہ السلام کے محض جذبات کو مغلوب کرنے کی کوشش زلیخا کی طرف سے عمل میں آرہی تھی، جیسا کہ قصہ کے اجزاء سابقہ سے معلوم ہوتا ہے، لیکن اب جبکہ زلیخا ان کی قید کا فیصلہ کر چکتی ہے اور ہر طرح کی رسوائی پر آمادہ ہے، پھر یہ عورتیں حضرت یوسفؑ کی بہی خواہ بن کر ان کی عقل سے یہ اپیل کرتی ہیں جس کا حاصل یہ تھا کہ ان کا تدین واتقاء بھی مغالطہ میں آجائے اور ان کی عقل بھی درست نہ رہے، یہ وقت تھا کہ اب یوسفؑ اپنے کو بالکل خدا کے سپرد کر دیں اور انہوں نے یہی کیا، ان کا اخیر دعامن الجاھلین کہنا بھی یہی چاہتا ہے کہ اب اپنی علم وعقل کو مغلوب ہوتی ہوئی پا رہے ہیں۔

اس تشریح کے بعد دعا بھی ٹھیک موقع پر آجاتی ہے۔ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے، یعنی میں ان کی باتوں کی طرف مائل ہو جاؤں گا، کیدھن وغیرہ کی جمعیت کا راز بھی واشگاف ہو جاتا ہے اور نہ صرف یہی بلکہ آئندہ کلام میں حضرت یوسفؑ نے جو کیدھن علیم فرمایا اس کی تفسیر بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ پھر بادشاہ کے آدمی کا ان عورتوں سے اذراودتن بصیغۂ جمع کہنے کا بھی مطلب معلوم ہو جاتا ہے کہ جب تم لوگوں نے یوسف علیہ اسلام کو پھسلانا چاہا، یہ اس لیے کہ گویا زلیخا کے لیے اب سب پھسلا رہی تھیں، اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اگر یہ عورتیں اپنے لئے پھسلاتیں، ان کا پھسلانا زلیخا کے لیے نہ ہوتا تو خواہ مخواہ زلیخا کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ انا راودته عن نفسه گویا وہ بھی یہی بیان کرتی ہے کہ دراصل میں اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی تھی، باقی ان عورتوں نے بھی جو مراودت کی وہ بھی ہمارے لئے تھی۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، عالم بے بدل، ص ۴۵۸۔۴۶۰

آیت: ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ﴾ (یوسف:۳۴)

''پھر یوسفؑ کے پروردگار نے اس کی دعا قبول کی اور ان کے کید کو دور فرمایا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی وہ دعا مستجاب ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ان عورتوں کی کید یعنی خود ساختہ زخموں کی بدولت حضرت یوسفؑ کو زندان مصر کا منہ دیکھنا پڑا، تو پھر صرف کید کیا معنی؟ اور دعا مستجاب ہوئی تو کیا ہوئی؟

اس سے قطعاً معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کا قید خانہ جانا کسی اور وجہ سے واقع ہوا، جس کا پتہ اگرچہ ہم کو نہ ہو، تاہم اس قدر ضرور ہے کہ مفسر جدید کے اختراعی زخم جن کو انہوں نے عورتوں کا کید قرار دیا، یہ وجہ تو قطعاً نہ تھی ورنہ قرآن مجید کی خبر میں صریح کذب کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے اگر حضرت یوسف پر بھی مقدمہ دائر ہو گیا تھا اور حکام کے سامنے یہ ثابت کر دیا گیا کہ اس کنعانی غلام نے شرفا و اعیان مصر کی خاتونوں پر ناجائز حملہ اس طرح کیا کہ آخیر میں چھری سے ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے، تو میں نہیں سمجھتا کہ حکومت فرعونیہ جو بنی اسرائیل کے معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنے میں کبھی نہیں شرمائی، وہ اتنے قوی جرم کی سزا صرف لیسجننه حتی حين دیتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ معیاد مقررہ تک وہ قید کی سزا بھگتیں، حالانکہ قرائن کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ایسے غلاموں (جو اپنی جان کے مالک نہیں ہوتے تھے) کو قتل سے فروتر سزا دینی، خلاف عقل ہے اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ زخم بنا بنایا تیار تھا، اور مقدمہ بھی عصمت دری کا، اور ایک عورت کا نہیں چند کا، مدعی علیہ بچارا غلام اس کی مالکہ زلیخا (جس سے پالائش کی امید ہوتی) وہ اس پر دعوے دائر کرتی ہے، لیکن خدا جانے حکام کیا سوچتے ہیں کہ اولاً فیصلہ بھی اپنا ہلکا دیتے ہیں اور ایک زمانے کے بعد دیتے ہیں جیسا کہ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ میں لفظ ثم کا مقتضی ہے، بحالیکہ تراضی کی ظاہرا کوئی وجہ نظر نہیں آتی[1]

رہا آیات سے عورتوں کے زخم مراد لینے میں اس کا جواب دوں یا ہنس کر چپ ہو رہوں۔

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، عالم بے بدل، محمد اکرام چغتائی (مرتب)، ص ۶۱۷

آیت : ﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾ (یوسف:۳۸)

''میرے لیے کسی طرح یہ روا نہیں رکھا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی ہم شریک اور ساجھی مانیں، یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر بھی اور ساری انسانیت پر، مگر بہت سے لوگ اس فضل اور مہربانی کا گن نہیں گاتے''۔

زندان مصر میں قیدیوں کو تلقین کرتے ہوئے سیدنا یوسف علیہ وعلی نبینا الصلوۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ:

﴿مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ پیدا کر کے ہمارے پیدا کرنے والے خالق قدیر نے دوسروں کے بھروسہ پر سر مارنے کے لیے ہمیں نہیں چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت کی کفالت ہر بندہ کی اس نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ضرورتوں کا محتاج بنا کر اس نے ہمیں ضرور پیدا کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس کا یہ کرم اور کیسی عظیم مہربانی ہے کہ ہماری اس محتاجی کا تعلق بجز اپنی ذات کے اور کسی کے ساتھ قطعاً نہیں رکھا ہے۔ ہم محتاج ضرور ہیں لیکن اسی ایک پیدا کرنے والے خالق کے جو ہمارا ذوالقوۃ المتین رزاق ہے۔ اس ایک کے محتاج بن کر ہر ایک کی محتاجی کی ذلت ورسوائی اور دربدر مارے پھرنے کی دردسری سے آزاد ہیں۔ یہی اللہ کا وہ فضل ہے، جس کا گن ناشکرا انسان بہت کم گاتا ہے، اسی ناشکری کا نتیجہ ہے کہ اس ایک کی محتاجی سے لاپروائی اختیار کرنے والے ہر ایک کی محتاجی کا طوق گلے میں ڈالے مارے مارے پھرتے ہیں۔ فضل وکرم کی مذکورہ بالا عجیب وغریب حقیقت کو واشگاف کرنے کے بعد قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (یوسف:۳۸)

''کیا بہت سے متفرق طرح طرح کے پروردگاروں کا ہونا بہتر ہے، یا جو ایک سب پر غالب وقاہر اللہ ہے اس کی پروردگاری بہتر ہے''۔

جس یقین اور یقین کی روشنی کو ایمانی وجدان ان قرآنی آیتوں میں پا رہا ہے، اس کے بعد خود ہی سوچیے کہ کہنے والے نے اگر یہ کہا کہ:

از خدا خواہم دوز غیر نہ خواہم
کہ نیم بندہ غیر نہ خدائے دگرست

تو اس کے سوا اپنا احساس آخر اور کیا بتائے [1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات گیلانی، شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب، لاہور، ص ۳۶۳۔۳۶۵

آیت: ﴿ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (یوسف:۳۹)

''کیا متفرق ومتعدد خدا کا ہونا بہتر ہے، یا ایک خدا کا جو (عالم کی ہر چیز پر) قہار (وغالب) ہے؟''۔

غور کرنے والے کے لیے تشفی وتسکین کے جتنے پیغام نشاط اس سوال کے جواب میں مستور ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کسی دلیل میں تم نہیں پاسکتے ہو اور پاؤ گے بھی، تو وہ بھی قرآن ہی کا کوئی برہان ہوگا۔

سمجھانے کے لیے چند ضروری امور کو بطور تمہید کے میں مقدم کرتا ہوں:

۱) فطری طور پر انسان میں کچھ قوتیں ہیں، جن کے آثار واعمال پر وہ ہر طرح اطمینان وبھروسہ کرتا ہے، مثلاً: اس میں بینائی کی قوت ہے، جس چیز کا علم اس کے ذریعہ سے اس میں آتا ہے، اس پر وہ یقین کرتا ہے، جب تک اس کے خلاف میں کوئی قوی اور نہایت زبردست دلیل نہیں قائم ہو جاتی ہے، اس کی کبھی تغلیط نہیں کرتا۔

۲) انسان کی فطری قوتوں میں سے ایک قوت یہ بھی ہے کہ جب اس کے سامنے دو ایسی چیزیں پیش ہوں جن میں ایک اچھی اور ایک بری ہو، تو وہ اچھی چیز کے اختیار کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے، مثلاً: فرض کرو! کہ تمہارے سامنے دو گلاس رکھے جاتے ہیں، جن میں سے ایک تو قند وگلاب سے لبریز ہے اور دوسرا یا تو زہر ہلاہل سے مملو ہے، یا نہیں تو کم از کم اس میں زہر کے ملنے کا تم کو شبہ ہے، اس کے بعد تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ ان میں سے جس گلاس کو چاہو، چڑھا جاؤ، ظاہر ہے کہ تمہارا ہاتھ قند وگلاب والے غیر مشکوک گلاس کی طرف اضطراراً بڑھ جائے گا۔ بتاؤ کہ کس نے تم کو اس پر مجبور کیا؟ آخر وہ کون سی قوت تھی جس نے زہر کے گلاس سے تمہارا ہاتھ روک دیا اور دوسرے گلاس کی طرف بڑھا دیا؟ دراصل یہ ایک فطری قوت ہے، جو ہر ایک انسان میں (اگر وہ ماؤف الدماغ نہیں ہے) موجود ہے کہ جب خیر وشر کا مقابلہ ہوگا، تو وہ اسے خیر کی طرف متوجہ کردے گی۔

قرآن مجید کی اس دلیل کا مدار اسی قوت فطریہ پر ہے، اب تم اس قوت کو زندہ کرلو اور اس تلاش میں نکلو کہ عالم کا رب، کردگار، خالق، پروردگار ایک ہے، یا چند، ظاہر ہے کہ اس علمی سفر میں تمہارے سامنے کل دو صورتیں پیش آسکتی ہیں:

۱) ایک تو یہ کہ ہر موجود، ہر ہستی کا خالق و پروردگار الگ الگ ہے، مثلاً: زید کا پیدا کرنے والا اور ہے عمرو کا خالق اور ہے، پانی کا برسانے والا اور ہے، غلہ کا پیدا کرنے والا اور ہے، ہوا ایک خدا کے ہاتھ میں ہے، تو آگ دوسرے کے، آفتاب تیسرے کے، الی غیر ذلک۔

۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے از ماہ، تا ماہی صرف ایک اور ایک ہی قوۃ قہار کے زیر فرمان ہیں۔

شرک وتوحید کے یہ دو مرقع ہیں، جس کو قرآن تمہارے سامنے پیش کرکے صرف اس قدر پوچھتا ہے کہ بتاؤ کہ ان دونوں میں کون خیر و بہتر ہے اور کون سراسر خبط وبدعقلی کا مظہر ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر پہلی صورت تسلیم کی جاتی ہے، تو جس مہربان وکریم پالنہار

کی تلاش میں تم نکلے تھے، وہ ملتا نہیں، بلکہ کھویا جاتا ہے۔ آخر جب زید کا رب اور ہوا اور تمہارا رب اور ہوا، تو تم اپنے خدا کو اب کہاں پا سکتے ہو اور کس طرح پا سکتے ہو؟ خدا حواس سے تو محسوس نہیں ہوتا، البتہ عقل اس کی ضرورت ثابت کرتی ہے کہ ہمارے لئے ایک پیدا کرنے والا ہونا چاہئے، لیکن وہ یہ کس طرح بتا سکتی ہے کہ ان ستر ہزار معبودوں میں تمہارا خدا کون ہے کہ اس کی تعیین اس کے اختیار میں نہیں، پھر اندازہ کرو کہ اس صورت میں تم نے اپنے مالک کو (جس کی جستجو تمہیں صرف اس لئے تھی کہ اس کے آگے اپنی حاجتیں پیش کروں گا، روؤں گا، اس سے اپنی دنیا وآخرت کی بھلائی طلب کروں گا) اسے تم نے اس جھمیلے میں پایا، یا گم کیا اور صرف یہی نہیں، بلکہ اگر تنگ آ کر تم نے خواہ مخواہ بلا کسی دلیل کے (جیسا کہ مشرکین کرتے ہیں) کسی ایک معبود سے لو لگائی اور فرض کرو کہ وہ تمہارا مالک نہ ہوا، تو اس وقت تمہارے اصلی معبود و پروردگار کے دریائے غیظ وغضب کبھی تھم سکتے ہیں؟ پھر کیا اس وقت ''ضلانہ شد، بلا شد'' کے مصداق بننے کے لیے تمہیں تیار نہیں ہونا چاہئے۔

بخلاف اس کے کہ اگر تم تمام عالم کو ایک ہی قوت قاہرہ یزدانیہ کے ماتحت کر لو اور سمجھو کہ تمام عالم کا رب، پروردگار ایک ہی ہے، تو اس وقت ان تمام دقتوں کی کیا کبھی نوبت آ سکتی ہے، کسی خطرہ کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ اور جبکہ نہیں رہتی، تو اب دوسری صورت کے خیر و بہتر ہونے میں کیا شر ہے؟ صرف اس پر غور کرو، یا اس طرح مثلاً تمہارے سامنے دو قوتیں پیش کی جاتی ہیں:

۱) ایک تو ایسی جس سے تم اپنے تمام مقاصد کو حاصل کر سکتے ہو، اگر اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے، تو نہ صرف دنیا، بلکہ عقبیٰ کا بھی ہر معاملہ بآسانی سلجھ سکتا ہے۔ الغرض ذرہ سے لے کر آفتاب تک پر اس کے ذریعے سے حکومت کر سکتے ہو اور اگر زیادہ سنجیدگی سے تم نے کام لیا، تو تمام کائنات پر متصرف ہو سکتے ہو۔

۲) دوسری قوت ایسی ہے جس سے بجز معدودے چند چیزوں کے اور کوئی کام نہیں نکل سکتا۔ کیا اس میں سے پہلی صورت خیر نہیں؟ اور جبکہ ہے، تو کیا یہ نسبت متفرق معبودوں اور خدائے واحد قہار کے درمیان نہیں؟ آخر متفرق معبود جبکہ بجز اپنی زیر اثر مخلوقات اور کسی دوسرے پر تصرف نہیں کر سکتے، تو پھر ان کے پوجنے والوں کو ان موجودات کے علاوہ اور کس پر قدرت ہو سکتی ہے، بخلاف خدائے واحد قہار کے۔ جب تمام نظام عالم اسی کے زیر نگین ہیں، تو اس کو راضی کر لینے کے بعد ہو سکتا ہے اور ہوا کہ تم چاند کے ٹکڑے اڑا سکتے ہو، آفتاب کو تھام سکتے ہو، ہوا کو روک سکتے ہو، وغیرہ ذالک۔

پس یہی قرآن کا بھی مطلب ہے کہ شرک و توحید کے دعوؤں کو سامنے رکھنے کے بعد توحید کے علاوہ اور کوئی چیز خیر نہیں ہو سکتی اور اس کے خیر ثابت ہو جانے کے بعد اس کا یقینی ہونا قطعی ہو جاتا ہے، علی الخصوص جبکہ خلاف میں کوئی دلیل نہیں اور اگر اس کے بعد بھی شبہ رہتا ہے، حالانکہ وہ ایک فطری قوت کے آثار طبعی میں سے ہے، تو پھر یہی شبہ بینائی اور شنوائی کے معلومات پر کیوں نہیں ہوگا؟ حالانکہ (جب تک ان کے خلاف پر دلیل نہیں قائم ہو جاتی) ان کے آثار پر تمام دنیا نے یقین و جزم کا اطلاق کیا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ توحید کے عقیدہ پر جو اسی طرح ایک جبلی قوت کے ثمرات میں سے ہے، یقین و اذعان کا اطلاق نہ کیا جائے۔

یہ تو اس آیت کی ایک معمولی توضیح تھی، اب اس کی تعمیم کو بھی دیکھ لو:

توحید کا عقیدہ جب خیر و بہتر ٹھہرا اور شرک ایک خراب اور بری چیز قرار پائی، تو پھر کون ہے جو اس پر ایمان لانے سے جھجک سکتا ہے کہ دلیل تو جس احساس جبلی پر مبنی ہے، اس سے دنیا کا کوئی سلیم الفطرت انسان خالی نہیں۔

ایک دیہاتی تیل خریدنے کے لیے بازار آتا ہے، اس کے سامنے دو بیل آتے ہیں، ایک مضبوط وخوبصورت ہے اور دوسرا لاغر و بدہیئت ہے، ایک چست و چالاک ہے دوسرا سست و مریل ہے اور فرض کرو اگر قیمت میں پہلا اگر کم نہیں، تو مساوی ہے، ایسی صورت میں وہی جذبہ کیا دہقان میں تموج پرواز نہ ہوگا اور بعجلت تمام روپیہ نکالنے پر اسے مجبور نہ کرے گا؟ اور جب کہ دنیا کے ایسے معمولی واقعہ میں اس قوت کی بھی کارفرمائی ہے، تو ایسے مقام میں جہاں پر دین و دنیا کی صلاح وفلاح کی تلاش ہے، اس کی وہی قوت خیر کے اختیار کرنے پر کیوں نہیں مجبور کرے گی؟ اور وہ توحید کے علاوہ اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

اسی طرح ایک تاجر کسی شہر میں دوکان کرایہ پر لینے کے لیے آتا ہے، اس کے سامنے بھی دو دوکانیں پیش ہوتی ہیں، ایک عام شاہراہ پر واقع ہے اور دوسری کسی کوچہ کے تاریک گوشہ میں ہے، ایک خوبصورت فراخ ہے، دوسری سیاہ اور تنگ ہے اور فرض کرلو کہ کرایہ میں دونوں مساوی ہیں، تو ایسی صورت میں تاجر کیا کریگا؟ کیا شر کو خیر پر بلا کسی وجہ کے ترجیح دے سکتا ہے[۱] اور جبکہ یہاں نہیں دے سکتا، تو شرک وتوحید کے موقعہ میں اس کا یہ احساس کیوں باطل ہو جائے گا؟

ازیں قبل دنیا کے ہر طبقہ میں اسی اصول پر عمل درآمد جاری ہے، انسان جو کچھ کرتا ہے، اسی احساس کی رہنمائی میں کرتا ہے۔ جو کچھ غلطی ہوتی ہے، وہ خیر و شر کے سمجھنے میں ہوتی ہے اور جبکہ واضح طور پر توحید کی بہتری شرک کے مقابلے میں ثابت ہو چکی، تو اب دنیا کا کوئی فیلسوف بھی اس کا منکر نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی صرف اسی لئے حقائق پر نئے سرے سے غور کرتا ہے کہ غلط مسائل میں سے صحیح کو چھانٹ لے، اس کے سامنے بھی جب دو باتیں جن میں ایک غلط اور لغو ہوتی ہے اور دوسری صحیح اور باوقعت ہوتی ہے، پیش کی جاتی ہے، تو وہ صحیح کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور غلط کو رد کر دیتا ہے، پھر جبکہ شرک وتوحید میں بھی نسبت ہے، تو ''توحید'' کے تسلیم پر اس کی طبیعت کیوں مجبور نہیں ہوگی۔[۲]

---

۱ کتاب میں غلطی سے یہ لائن یوں لکھی گئی ہے ''کیا خیر کو شر پر بلا کسی وجہ کے ترجیح دے سکتا ہے'' ملاحظہ فرمائیے مقالات گیلانی، حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری (مرتب)، ص ۸۱

۲ گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات گیلانی، حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری (مرتب) ص ۷۸-۷۷

آیت : ﴿مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ﴾ (یوسف:۵۰)

''ان عورتوں کا کیا بیان ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔''

اگر یوسف علیہ السلام کے اس جملہ

﴿مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ﴾

کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جن عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کے جرم میں مجھے قید خانہ بھیجا گیا ہے، ان کا کیا حال ہے؟ تو بادشاہ کے قاصد کو ان عورتوں سے جا کر یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ کیا واقعی یوسف علیہ السلام نے تمہاری عصمت پر حملہ کیا تھا اور اسی بنا پر انہوں نے تمہارے ہاتھ کاٹے تھے؟ اس کے جواب میں اگر وہ عورتیں اپنے کئے پر پشیمان ہو چکی تھیں تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ نہیں یوسف کا کوئی قصور نہیں، ہم نے سازش کر کے خود اپنے زخم بنائے تھے مگر قرآن مجید بجائے اس سلسلہ کے جوبات نقل کرتا ہے وہ یہی کہ قاصد ان سے پوچھتا ہے کہ تم یوسف کو جب پھسلا رہی تھیں، تو اس وقت اس کا کیا حال تھا؟ عورتیں جواب میں کہتی ہیں کہ ہم نے اس میں کوئی برائی نہیں پائی۔

حالانکہ تفسیر جدید میں یوسف علیہ السلام کے سوال میں جو مطلب پہنایا گیا ہے اس سے ان جوابوں کو کیا تعلق؟

بلکہ ظاہراً اس کا مطلب وہی ہے جو عامہ مفسرین لکھتے ہیں کہ چونکہ یوسف علیہ السلام کے حسن کا چرچا پھیلا تو حکام وقت کو خطرہ ہوا کہ کہیں یوسف کی بدولت کوئی فتنہ نہ پھیلے، شریف خاتونیں اسی کنعانی غلام کے ہاتھوں کہیں برباد نہ ہوں اور اسی لیے ان کو جیل سپرد کر دیا حالانکہ یوسفؑ کا کیا قصور تھا؟ مستحق جیل اگر ہو سکتی تھیں تو مصر کی عورتیں مگر بہرحال بدگمان ہو کر لوگوں نے ان کو قید خانہ بھیج دیا تھا، اب جبکہ بادشاہ کی طرف سے آپ کی رہائی کا پیغام آیا تو آپ نے مناسب خیال کیا کہ اس بدگمانی کا ازالہ کر کے جیل سے باہر نکلوں، آپ نے خیال فرمایا کہ پاکبازی کی شہادت ان عورتوں سے بڑھ کر اور کون دے سکتی ہیں جن کے سامنے عزیز مصر کی بیوی نے اقرار کیا ہے کہ

﴿لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ﴾ (یوسف:۳۲)

میں اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہوں لیکن یہ بچتا رہا۔

ان عورتوں کو خوب معلوم ہے کہ زلیخا نے مجھے کن کن طریقوں سے گھیرنا چاہا مگر میں راضی نہیں ہوا تھا، نہ صرف زلیخا بلکہ ان عورتوں نے بھی مجھے اس وقت سمجھایا تھا، مگر اس وقت میرے طرز عمل کو ان عورتوں نے خوب دیکھا تھا، بہرحال اس لیے آپ نے ان عورتوں کا پتہ دیا اور اسی لئے قاصد نے بھی ان عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کی تحقیق نہیں کی، بلکہ یہ پوچھا کہ جب یوسف کو پھسلایا جا رہا تھا تو تم نے ان کو کیسا پایا انہوں نے سچا اظہار دیا اور اس کے بعد زلیخا نے بھی کہہ دیا کہ یوسف کا کوئی قصور نہیں، بلکہ

﴿اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (یوسف:۵۱)

میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا، اور یوسف سچوں میں ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، عالم بے بدل، محمد اکرم چغتائی (مرتب)، ص ۴۶۱۔۴۶۲

آیت: ﴿مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ﴾ (یوسف:۵۰)

''ان عورتوں کا کیا بیان ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔''

اگر یوسف علیہ السلام کے اس جملہ

﴿مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ﴾

کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جن عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کے جرم میں مجھے قید خانہ بھیجا گیا ہے، ان کا کیا حال ہے؟ تو بادشاہ کے قاصد کو ان عورتوں سے جا کر یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ کیا واقعی یوسف علیہ السلام نے تمہاری عصمت پر حملہ کیا تھا اور اسی بنا پر انہوں نے تمہارے ہاتھ کاٹے تھے؟ اس کے جواب میں اگر وہ عورتیں اپنے کئے پر پشیمان ہو چکی تھیں تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ نہیں یوسف کا کوئی قصور نہیں، ہم نے سازش کر کے خود اپنے زخم بنائے تھے مگر قرآن مجید بجائے اس سلسلہ کے جو بات نقل کرتا ہے وہ یہی کہ قاصد ان سے پوچھتا ہے کہ تم یوسف کو جب پھسلا رہی تھیں، تو اس وقت اس کا کیا حال تھا؟ عورتیں جواب میں کہتی ہیں کہ ہم نے اس میں کوئی برائی نہیں پائی۔

حالانکہ تفسیر جدید میں یوسف علیہ السلام کے سوال میں جو مطلب پہنایا گیا ہے اس سے ان جوابوں کو کیا تعلق؟

بلکہ ظاہراً اس کا مطلب وہی ہے جو عامہ مفسرین لکھتے ہیں کہ چونکہ یوسف علیہ السلام کے حسن کا چرچا پھیلا تو حکام وقت کو خطرہ ہوا کہ کہیں یوسف کی بدولت کوئی فتنہ نہ پھیلے، شریف خاتونیں اسی کنعانی غلام کے ہاتھوں کہیں برباد نہ ہوں اور اسی لیے ان کو جیل سپرد کر دیا حالانکہ یوسفؑ کا کیا قصور تھا؟ مستحق جیل اگر ہو سکتی تھیں تو مصر کی عورتیں مگر بہر حال بدگمان ہو کر لوگوں نے ان کو قید خانہ بھیج دیا تھا، اب جبکہ بادشاہ کی طرف سے آپ کی رہائی کا پیغام آیا تو آپ نے مناسب خیال کیا کہ اس بدگمانی کا ازالہ کر کے جیل سے باہر نکلوں، آپ نے خیال فرمایا کہ پاکبازی کی شہادت ان عورتوں سے بڑھ کر اور کون دے سکتی ہیں جن کے سامنے عزیز مصر کی بیوی نے اقرار کیا ہے کہ

﴿لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ﴾ (یوسف:۳۲)

میں اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہوں لیکن یہ بچتا رہا۔

ان عورتوں کو خوب معلوم ہے کہ زلیخا نے مجھے کن کن طریقوں سے گھیرنا چاہا مگر میں راضی نہیں ہوا تھا، نہ صرف زلیخا بلکہ ان عورتوں نے بھی مجھے اس وقت سمجھایا تھا، مگر اس وقت میرے طرز عمل کو ان عورتوں نے خوب دیکھا تھا، بہر حال اس لیے آپ نے ان عورتوں کا پتہ دیا اور اسی لئے قاصد نے بھی ان عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کی تحقیق نہیں کی، بلکہ یہ پوچھا کہ جب یوسف کو پھسلایا جا رہا تھا تو تم نے ان کو کیسا پایا انہوں نے سچا اظہار دیا اور اس کے بعد زلیخا نے بھی کہہ دیا کہ یوسف کا کوئی قصور نہیں، بلکہ

﴿اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (یوسف:۵۱)

میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا، اور یوسف سچوں میں ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، عالم بے بدل، محمد اکرم چغتائی (مرتب)، ص ۴۶۱-۴۶۲

آیت : ﴿ اجْعَلْنِىْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ (یوسف:۵۵)

''مقرر کرو مجھے زمین کی پیداواروں پر، میں نگرانی کرنے والا اور علم والا ہوں''۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں بادشاہ مصر سے ان کی گفتگو، اس گفتگو میں حضرت یوسف علیہ السلام کا تنظیمی کاروبار کے سلسلے میں یہ فرمانا کہ

﴿ اجْعَلْنِىْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾

یعنی زمین کی پیداوار اور (خزائن الارض) کے نظم وترتیب اور بندوبست کے لئے جب حضرت نے اپنے آپ کو پیش کیا، تو اس وقت تنظیمی کاروبار کے لئے جن صفات کی ضرورت ہے، ان کو بھی دو لفظوں (حفیظ علیم) کی شکل میں ظاہر فرمایا۔ مطلب یہ تھا کہ اس قسم کے کام میں ایک تو حفظ (یعنی حفاظت ونگرانی دیکھ بھال کا سلیقہ ناگزیر ہے) دوسرے علیم (یعنی نظم کرنے والے کی معلومات کو وسیع ہونا چاہیے) گویا جسمانی طاقت سے زیادہ اس سلسلے میں دماغی اور ذہنی سرمایہ کی ضرورت ہے، بظاہر قرآن کے یہ چند اشارے ہیں، مگر میرے خیال میں یہ ایسے اشارے ہیں کہ غالباً غور کرنے والے ان میں وہ سب کچھ پا سکتے ہیں جو معاشیات کی کتابوں میں آج ہزار ہا ہزار اوراق کے اندر بھی عاملیں پیدائش (Factors of Production) یعنی زمین، سرمایہ، محنت، تنظیم کے متعلق بہ مشکل مل سکتے ہیں، یا یوں کہئے کہ علماء معاشیات جن نتائج تک سالہا سال کی فکر ونظر، تحقیق وتجسس کے بعد پہنچے ہیں۔ قرآن نے چند الفاظ میں ان آخری نتائج کو اشاروں اشاروں میں بیان کر دیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۲-۳

آیت : ﴿اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ (یوسف:۸۶)

''اپنی بے کلی اور اپنے حزن وغم کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں''۔

احسن القصص کے اشارے نے سورہ یوسف کی طرف کچھ دنوں سے زیادہ متوجہ کر رکھا ہے۔ جب پڑھتا ہوں تو عملی زندگی کے متعلق نتائج اور مشوروں کا سیلاب امڈنے لگتا ہے اسی مقام پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے الفاظ

﴿اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ﴾

ان پر پہونچنے کے ساتھ بے قرار ہو جاتا ہوں، ہر ایک سے مایوس ہر ایک سے جدا ہو کر اپنی بے کلی اور بے چینی اپنے غم والم کو مالک ہی کے قدموں پر ڈال دینا، دنیا کے مصائب وحوادث کا یہ کتنا قیمتی اور انمول (استعمال ہے) بے کلی مٹے نہ مٹے غم جائے نہ جائے۔ لیکن کتنی مبارک ہے وہ بے چینی، وہ اضطراب وہ اندوہ غم والم جس سے تلملا تلملا کر بندہ اپنے مالک کے قدموں پر گر گر کر لوٹنے لگے۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ صبر کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے سامنے مصائب کا شکوہ نہ کیا جائے لیکن خالق کے آگے اپنی مصیبتوں کا اظہار یہی تو مصیبتوں کی قیمت ہے مصائب آتے ہی اس لئے ہیں کہ بھاگے ہوؤں کو مالک کے آستانے کی طرف لوگوں کو ہنکایا جائے۔

آج مصائب وآلام کے طوفانوں میں محمد رسول اللہ ﷺ کی امت مرحومہ گھری ہوئی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے یہ کیوں ہو رہا ہے۔ حالانکہ یعقوب علیہ السلام کا یہی تاریخی فقرہ جسے قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے چاہتے تو اسی میں صرف سوال کا جواب ہی نہیں مل جاتا بلکہ باہر ہیں جو کچھ ہم نے کھویا یا کھوتے چلے جا رہے ہیں سچ کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ اور کہیں زیادہ اندر میں ہم پا لیتے مگر مصائب آئے اور آتے چلے جا رہے ہیں اور ان کی قیمت مسلسل ہم کھوتے چلے جا رہے ہیں جن کے بس میں کچھ نہیں ہے ان ہی بندوں کے سامنے ہم چلا رہے ہیں۔ نظم میں ماتم کرتے ہیں تو ان ہی کے آگے، اور نثر میں نوحہ خوانی کا نشانہ ان ہی مجبور و معذور بندوں کو بنائے ہوئے ہیں۔ ہم نے اخباروں کے صفحات سیاہ کئے۔ منبروں اور محرابوں کو ان ہی آلام ومصائب کی داستانوں سے ہلا رکھا ہے۔ لیکن کم ہی ہم میں ایسے تھے یا ہیں جنہیں مصائب وآلام کی ان عصری ٹھوکروں نے اس چوکھٹ پر لا کر کھڑا کر دیا ہو جس کے متعلق

﴿اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ (یوسف:۹۶)

فرمانے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے ''علم'' اور یقین کا اظہار لڑکوں کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے کیا تھا کہ۔

﴿یٰبَنِیَّ اذۡهَبُوۡا فَتَحَسَّسُوۡا مِنۡ یُّوۡسُفَ وَ اَخِیۡهِ وَ لَا تَایۡـَٔسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡكٰفِرُوۡنَ﴾ (یوسف:۸۷)

''مرے بچو! جاؤ، ڈھونڈھو یوسف کو اور اس کے بھائی (بنیامین) کو اور کشود کار سے اللہ کے (اپنے آپ کو) ناامید نہ بنانا، کیونکہ اللہ کے کشود کار سے نہیں ناامید ہوتے مگر وہی جو ناشکرے ہیں''۔

اللہ اللہ! یعقوب علیہ السلام کے قلبی اعتماد کا جو اللہ کے دیے ہوئے علم پر ان کو تھا۔ اس کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ قرنوں پر قرن گذرتے چلے جا رہے تھے اور روح اللہ جس کا ترجمہ میں نے ''اللہ کے کشود کار'' کیا ہے اس سے ایک لمحہ کے لئے اپنے رب کو مایوس کر دینے پر وہ راضی نہیں ہے۔ خلقت کے آگے شکوہ چونکہ صبر کے منافی تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عالم اسباب کے تحت دل میں نا

امیدی کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہو۔لیکن یہ استیاس یعنی ناامید ہو جانا ہے جو یاس یعنی اپنے آپ کو ناامید کر دینے سے مختلف کیفیت ہے۔سابق الذکر استیاس (ناامید ہو جانے) کی کیفیت ایک ضطراری حال ہے ناموافق اسباب کی شدت سے فطرت انسانی قدرتاً اس حال کو اپنے اندر پاتی ہے لیکن یاس (اپنے رب کو ناامید کر دینا) یہ اختیاری فعل ہے اسی احسن القصص والی سورہ یوسف کے آخر میں استیاس (ناامید ہو جانے) کی اضطراری کیفیت کو قرآن نے رسولوں کی طرف بھی منسوب کیا ہے لیکن یاس عن روح اللہ کے اختیاری فعل کو صرف کافروں کی حد تک اسی قرآن نے محدود کر دیا ہے۔میرا تو خیال ہے کہ یعقوبی سورہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کیلئے عبرت وبصیرت کے اسباق سے لبریز ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، سورہ یوسف سے سبق (صدق جدید لکھنو)، ۲۵، مئی ۱۹۵۱

آیت : ﴿لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (یوسف:۸۷)

''نہیں ناامید ہوتا کوئی اللہ کی رحمت سے مگر جو کفر والے ہیں۔''

کسی قدر عجیب ہے کہ اپنی رحمت سے مایوس ہونے والوں کو جو کافر قرار دیتا ہے۔ اللہ کے ان بندوں سے جو خدا سے نہیں۔ بلکہ خدا کے بندوں سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ ان سے کون پوچھے کہ آخر کس بنیاد پر تم نے اپنے خالق سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے مایوس بنالیا، خدا نے تو کہا ہے کہ

﴿لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾

جس کا یہی مطلب ہے کہ کافر ہوئے بغیر کوئی حق تعالیٰ کی رحمتوں سے مایوس نہیں ہوسکتا۔ لیکن لوگ ہیں جو ایمان و اسلام کے دعوئی کے بعد بھی اس کی رحمتوں سے ناامید ہوکر دعاء و استغفار کو مشکلات حیات کے حل کی راہ میں العیاذ باللہ جھوٹی طفل تسلی تک قرار دینے کی جسارت کر جاتے ہیں۔ علانیہ کہتے ہیں کہ دعاؤں سے کیا ہوتا ہے جو ہونا ہے وہ ہوکر رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا اگر کچھ فائدہ ہوسکتا ہے تو یہی کہ اضطراب و بے چینی کی حالت میں آدمی کو اس سے گونہ قوت اور اطمینان کی خنکی مل جاتی ہے۔ اور یہ خیال کس بنیاد پر قائم کرلیا گیا، محض اس لئے کہ دعا کی گئی تھی، چونکہ قبول نہیں ہوئی، اس لئے حصول مقاصد کی اس تدبیر کی تاثیر ہی کا انھوں نے انکار کردیا جو بات جس وقت کہی جائے۔ اسی وقت اس شکل میں پوری ہو جائے۔ دعا کا مطلب جنھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ انھوں نے خدا کو خدا بھی باقی رکھا، یا اس کو کاربرآری کی کوئی ایسی مشین یا آلہ فرض کرلیا جس کا کھٹکا ان کے دل ودماغ اور زبانوں میں لگا ہوا ہے، گویا وہ چاہتے ہیں کہ ادھر اس کھٹکے کو دبا دیا جائے۔ اور چاہیے کہ ان کا آلہ ان کے مطلوب کو ان کے سامنے لاکر حاضر کردے، بعضوں کو قرآن کی آیتوں

﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرہ:۱۸۶)

''جواب دیتا ہوں میں پکار کا، پکارنے والا جب پکارتا ہے وہ مجھے۔''

یا

﴿ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المومن:۶۰)

''پکارو مجھے میں جواب دوں گا تمہیں''

وغیرہ سے بھی شاید مغالطہ ہوا ''استجابت'' و ''اجابت'' کا ترجمہ بجائے جواب دینے کے انھوں نے جو مانگا جائے اس کا قبول کرنا خدا جانے کس لغت کی بنیاد پر فرض کرلیا۔ حالانکہ پتھروں اور بتوں کے پوجنے والوں کے مقابلے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان کے بہرے گونگے، مردہ بے جان معبود جب اپنے پوجنے والوں کی پکار اور دہائی کو سنتے ہی نہیں تو جواب کیا دیں گے لیکن جس کی ذات بینا وشنوا، حی و قیوم، سب کو محیط، سب کے قریب ہے، وہ ہر ایک پکارنے والے کو قطعاً جواب دیتا ہے، لیکن پکارنے والے جو کچھ مانگتے ہیں اسے دے بھی دیتا ہے یہ مطلب ان آیتوں کا کہاں سے لیا گیا۔ کم از کم میں تو اس سے ناواقف ہوں۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۵۵

﴿ابراھیم﴾

آیت : ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (ابراہیم:۱۰)

''کیا حق تعالیٰ کے بارے میں تمہیں شک ہے جو آسمان وزمین کا بنانے والا ہے''۔

اس عالم میں ہم دیکھتے ہیں کہ آنکھیں بن رہی ہیں، چند خاص پردوں کے ساتھ بن رہی ہیں، ہر پردہ خاص قوانین کے تحت بن رہا ہے، یہی آنکھیں حیوانات میں بھی بن رہی ہیں، انسانوں میں بھی بن رہی ہیں، امریکہ میں بھی بن رہی ہیں، ایشیا میں بھی بن رہی ہیں، ہر جگہ ہر پردہ اپنے قوانین کے تحت بن رہا ہے الغرض جس چیز کو دیکھو گے اس میں ایک خاص قسم کی ترتیب، یکسانیت اور ہمواری نظر آئے گی، اور کیسی ترتیب، کیسی ہمواری؟ بقول بعض ''فطرت کے قوانین کیا ہیں ایک بلیغ نظم، ایک ایسا موزوں شعر کہ اگر اس کا ایک لفظ بھی اپنی جگہ سے نکال دیا جائے تو سارا نظم شعری ہی بگڑ جاتا ہے۔'' یہی حال اس عالم کا ہے کسی ایک چیز کو نکال کر دیکھو اور اندازہ کرو، بہرحال پوچھا جاتا ہے کہ یہ کس کی قدرت کے کرشمے ہیں؟ اب عقل کے ساتھ کیا یہ تمسخر نہیں ہے کہ اس کے جواب میں اس کا نام لیا جائے جس کو ہر قسم کی قدرت سے مفلس فرض کیا جاتا ہے۔

آفتاب نکلتا ہے یا زمین گھومتی ہے، جو طریقہ تعبیر بھی اختیار کیا جائے بہرحال ٹھیک چوبیس گھنٹوں میں یہ یومیہ دورہ ختم ہو جاتا ہے اور تین سو پینسٹھ دن اور کچھ منٹ وغیرہ میں یہ سالانہ گردش پوری ہوتی ہے، اور جس وقت تک کی تاریخ ہمارے پاس موجود ہے، معلوم ہے کہ اس وقت سے یہی ہوتا رہا ہے اور اب بھی یہی ہو رہا ہے اور ایک آفتاب اور زمین ہی کیا، عالم کی ہر چیز چند ایسے اٹل قوانین کی گرفت میں جکڑی ہوئی ہے کہ آج انہی کے اس استحکام پر ہمارے تمام علوم وفنون کی بنیاد ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ ان دقیق، نازک مضبوط اور مستحکم ہمہ گیر قوانین کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے؟ قرآن پاک اس کے جواب میں ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (الانعام:۹۶)۔ (یہ سب اس کے ناپنے اور جانچنے کا نتیجہ ہے جو ہر چیز پر غالب اور علم والا ہے) کہتا ہے، بتاؤ انسانی عقل کی تشنگی اس سے بجھتی ہے، یا اس جواب سے کہ کہا جائے: **ذالک اتفاق المجبور الجاهل** ''یہ ایک لاچار اور علم وقدرت سے یکسر عاری مادہ کے اتفاقی اثرات کا نتیجہ ہے''۔

اور سچ یہ ہے کہ اس قسم کی مضحکہ انگیز حماقتوں کا صدور ان ہی لوگوں سے ہو سکتا ہے جنہوں نے فطرت اور اس کے نازک استوار قوانین پر کبھی غور نہیں کیا یا جن کی زندگی صرف فسق فجور، مسخرگی اور اوباشی میں گزری ہو، ورنہ سچے سوچنے والوں نے ہمیشہ وہی کہا جسے پیغمبروں نے دیکھا، عہد جدید کا سب بڑا مفکر نیوٹن جس نے اپنے ایک معلوم کردہ قانون کے ذریعہ انسانی سمجھ کا رخ پھیر دیا، قانون طب وکشش کی تشریح کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''کائنات کے اجزا میں باوجود ہزاروں انقلابات زمان ومکان کے جو ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایسی ذات کے پایا جا سکے جو سب سے اول صاحب علم وارادہ وبااختیار ہو۔''

﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانعام: ۴۵)

''پس ظالم لوگوں کی جڑیں کاٹ دی گئیں سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

الحاصل نظام ہستی کا ایک خود بخود ہستی پر ختم ہونا، اس کا ہمیشہ ہمیشہ سے ہونا، ایک ہونا، اس کا ہر قسم کے اعلیٰ کمالات اور برتر وگرامی صفات سے موصوف ہونا ثابت ہو چکا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے متعلق پیغمبروں کے یہ ایسے ذاتی تجربے اور مشاہدے ہیں کہ عقل انسانی اس کے سوا کسی اور چیز کو مان بھی نہیں سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ چند ماؤف العقل پیشہ ور فلسفیوں کے سوا فطرت بشری قریب

قریب ہر زمانے میں اور ہر ملک میں ایمان کے اس جز کے ساتھ متفق رہی ہے۔ پروفیسر میکس مولر نے دنیا کے قدیم آثار وشواہد کے مطالعہ اور جستجو کے بعد اسی بنیاد پر اپنے اس تاریخی فیصلہ کا اعلان کیا ہے کہ۔

''ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے خدا کو اس وقت جانا جس وقت وہ اس کا شاید نام بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔''[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۸۹۔۹۱

آیت : ﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (ابراہیم:۳۴)

''اور اگر اللہ کی نعمت کو تم گنو، تو نہ گن پاؤ گے اس کو۔''

مذکورہ بالا آیت میں نعمتوں کے عد (شمار) کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اسی لئے جو قانون اس سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام مد کی مناسبت سے عد رکھ دیا گیا ہے۔ مد کا قانون تو سلبی حکم پر مشتمل ہے یعنی مد عینین سے روکا گیا ہے، اور عد والا قانون ایجابی و اثباتی ہے۔ یعنی جن نعمتوں میں آدمی زندگی کے ہر لمحہ میں ڈوبا ہوا ہے، ان ہی کے گننے کا مطالبہ کیا گیا ہے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانون مد کی تعمیل کرتے ہوئے نایافتہ نعمتوں سے نگاہوں کو ہٹا کر یافتہ نعمتوں کو اگر آدمی شمار کرنے لگے، تو بسطیوں کی طرف آنکھ اٹھانے، ان کے معاشی حال سے اپنے معاشی حال کو ناپنے کی وجہ سے قلوب میں شکوے شکایات کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، صرف ان کا ہی ازالہ نہیں ہو جائے گا بلکہ یافتہ نعمتوں کے شمار کرنے یعنی قانون عد پر عمل کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ جذبات شکر کی مسرتوں سے دل بھر جائیں گے، بخاری و مسلم وغیرہ میں جو یہ حدیث پائی جاتی ہے، یعنی

قال النبی ﷺ اذا نظر احد کم الیٰ من فضل علیه فی المال و الخلق فلینظر الیٰ ماهو اسفل منه [1]

''تم میں سے جس کی نظر ایسے آدمی پر پڑے جسے مال و دولت میں اس پر برتری عطا کی گئی ہو، تو چاہئے کہ دیکھے اس وقت ان لوگوں کو جو (مال و دولت کے حساب سے) اس سے نیچے ہیں''۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ قانون عد ہی کی تعمیل کی یہ ایک عملی شکل ہے، مطلب وہی ہے کہ بسطیوں کی دولت وثروت ابہت و شوکت کو دیکھ دیکھ کر اپنی قدری معیشت سے جو لوگ غیر مطمئن ہو جاتے ہیں، اور نایافتہ کی حسرتیں ان کو بے چین کرتی رہتی ہیں، ان کو چاہئے کہ ان نعمتوں کو شمار کریں جو انھیں حاصل ہیں اور ان حاصل شدہ نعمتوں کے شمار کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایسے آدمی کو چاہئے ان لوگوں کو دیکھے جو نعمتوں کے حساب سے اس سے بھی فروتر درجہ میں ہیں، سعدی نے جس کی مثال دی ہے کہ بغیر جوتے کے ایک دن راہ چلنے کا مجھے اتفاق ہوا، اپنے افلاس کا دل میں شکوہ پیدا ہوا تھا کہ سامنے ایک آدمی پر نظر پڑی جس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے، اس حال کو دیکھ کر

سپاس نعمت حق بجا آوردم وبه بے کفشی صبر کردم۔

اللہ کی نعمت کا شکر بجالایا، اور جوتے کے نہ ہونے پر دل کو صبر ہو گیا۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ قدری معیشت کی طرف جن جن تکلیفوں کو منسوب کیا جاتا ہے، ان کا ایک بڑا حصہ اس ترکیب پر عمل پیرا ہونے کے بعد صرف زائل ہی نہیں بلکہ زحمتیں راحتوں سے بدل جاتی ہیں۔ [2]

---

[1] النیساپوری، القشیری، مسلم بن الحجاج بن مسلم، ابی الحسین، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق [۷۴۲۸] ۸۔ (۲۹۶۳)، ص ۱۱۹۱، دار السلام للنشر والتوزیع الریاض، الطبعة الثالثة محرم ۱۴۲۱ھ / اپریل ۲۰۰۰ء

[2] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص: ۱۹۳

﴿النحل﴾

آیت: ﴿وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ﴾ (النحل:۶۸،۶۹)

''اور میرے رب نے وحی کی شہد کی مکھی پر کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درخت میں اور ان چیزوں میں جن سے لوگ اپنے گھر چھاتے ہیں، پھر کھا ہر قسم کے ''الثمرات'' سے اور چل اپنے رب کی راہ پر فرماں بردار بن کر نکلتا ہے اسکے پیٹ سے ایک ''مشروبہ'' جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اس میں ''الناس'' کے لیے شفاء ہے''۔

غور کی نظر اگر آیت پر ڈالی جائے تو حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ النحل (شہد کی مکھی) کی صفت ''ذُلُلًا'' بیان کی گئی ہے۔ یعنی وہ پالتو ہو سکتی ہے، سدھائی جا سکتی ہے۔ ارسطو کا بیان کہ جس پھول پر مکھی کو لگا دیا جائے۔ اگر چہ وہاں سینکڑوں پھول ہوں لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ اُس پھول کے سوا اور کسی سے رس حاصل نہیں کرتی۔

۲) مکھی کو ''مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ'' سے کھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ ثمر کے معنی پھل کے بھی آئے ہیں، لیکن مکھی پھل نہیں کھاتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ''الثمرات'' سے کوئی دوسرا معنی مراد لیا جائے۔ لغت کی کتابوں کو دیکھیے۔ تثمیر اللبن (یعنی دودھ سے مسکہ باہر نکالنا) آپ کو اس قسم کے محاورے ملیں گے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی چیز کا جوہر نکالنا بھی تثمیر کے معنی میں ہے۔ پس ''مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ'' یعنی پھل پھول والے درختوں کے جوہر کے چوسنے کا حکم دیا گیا۔

۳) اس جوہر کو مکھی ''شہد'' کی شکل دیتی ہے، قرآن کہتا ہے کہ ''مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ'' اسکے رنگ مختلف ہیں۔ اور جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف رنگوں کا انسان کے امراض سے گہرا تعلق ہے۔ حتی کہ ایک جدید نظام ہی علاج کا یہ ہے کہ صرف رنگ کے ذریعہ علاج کیا جاتا ہے، کبھی رنگین بوتلوں میں پانی بھر بھر کر دھوپ میں رکھ دیتے ہیں اور ان ہی بوتلوں کے پانی سے ہر قسم کے امراض میں فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ان بوتلوں کے پانی کے متعلق عجیب ہے۔ ان تین باتوں کو پیش نظر رکھ کر اگر قرآن کی اس آیت سے علاج کے ایک جدید نظام کی طرف توجہ کی جائے تو قرآن کی روشنی میں یہ چیز بالکل واضح طور پر نظر آ رہی ہے۔

میرا طلب یہ ہے کہ جن نباتاتی چیزوں سے آپ کی طب میں علاج کیا جاتا ہے اور ایلوپیتھک کے مقابلہ میں آپ کا بڑا امتیاز یہی ہے کہ آپ ''الثمرات'' سے یعنی نباتاتی اشیاء کے جواہر سے علاج کرتے ہیں، لیکن آپ کو یہ مجبوری پیش آئی ہے کہ ان نباتاتی چیزوں کے جواہر کو نکالنے کے لیے ان کو کوٹنا چھاننا پڑتا ہے، پھر قرع انبیق وغیرہ آلات سے ان کی تقطیر کرتے ہیں، اس پر بھی صحیح جوہر جس کی آپ کو تلاش ہے وہ میسر نہیں آتا ہے۔ جب قرآن کہتا ہے کہ مکھی قدرتاً ایک ذلول (سدھنے والا مطیع، فرمانبردار حیوان ہے) اور اس بنا پر آپ جس قسم کے نباتات سے چاہیں مکھیوں کے ذریعہ سے ''الثمرات'' یعنی انکے جوہروں کو کھنچوا سکتے ہیں تو پھر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ سارے جوشاندہ، مالیدہ، کوفتہ، بیختہ کے جھگڑوں سے آزاد ہو کر مختلف اقسام کی مکھیوں کو مختلف دواؤں کے جوہر نکالنے پر مامور کیا جائے، اور ان ہی کو جمع کر کے مختلف بوتلوں میں رکھ دیا جائے۔ جو دوائیں جن امراض میں کام آتی ہیں بجائے انکے ان ہی نباتاتی دواؤں کے کھنچے ہوئے شہد کو مفرد طریقہ سے یا دوسرے شہدوں کے ساتھ مرکب کر کے استعمال کرائیں۔ یہ نباتاتی ثمرات جنھیں آپ نے قدرت کی عجیب و غریب مشین (النحل) سے حاصل کیا ہے، چونکہ قدرتی جوہر ہونگے اس لیے ان کا

﴿بنی اسرائیل﴾

آیت : ﴿انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (بنی اسرائیل:۲۱)

''دیکھو! کس طرح ان میں بعض کو بعض پر ہم نے برتری عطا کی ہے۔''

مذکورہ بالا آیت یا اسی حقیقت کی دوسری قرآنی تعبیریں

﴿وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ﴾ (الانعام:۱۶۵)

''اور برتری بخشی خدا نے تم میں بعض کو بعض پر''

یا

﴿رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ﴾ (زخرف:۳۲)

''اور ہم نے ہی اونچا کر دیا ہے تم میں بعض کو بعض پر مدارج کے لحاظ سے''

کے الفاظ میں آپ کو ملیں گی۔

مطلب یہ ہے کہ یوں تو تماشہ گاہ عالم کی بنیاد ہی صفات و کمالات کے تفاوت پر مبنی ہے۔ جمادات میں وہ صفات نہیں پائے جاتے جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے۔ نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے بہرہ نہیں ملا ہے۔ جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد قائم ہے اور صفات و کمالات کے تفاوت کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ گلاب کی دو پنکھڑیاں بھی باہم ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہو سکتیں۔ تجربے اور مشاہدے نے ثابت کیا ہے کہ باایں ہمہ یک رنگی ایک پنکھڑی کچھ نہ کچھ خصوصیت اپنے اندر ایسی ضرور رکھتی ہے۔ جو دوسری پنکھڑی میں نہیں پائی جاتی۔ ''تجلیات میں تکرار نہیں ہے۔'' تفاوت وصفات ہی کے مسئلہ کی یہ صوفیانہ تعبیر ہے۔ غالب مرحوم نے ''ع لوح جہاں پر حرف مکرر نہیں ہوں میں'' کے مصرعہ میں اسی واقعہ کو دہرایا ہے۔ بلکہ اس واقعہ کی واقعیت پر اتنا بھروسہ کیا گیا ہے کہ اسی پر اعتماد کر کے حکومت والوں نے ہر شخص کے ابہام (ہاتھ کے انگوٹھے) کے نشان کو دستخط کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شخص کے انگوٹھے کی لکیریں دوسرے کے شخص کے انگوٹھے کی لکیروں سے کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رکھتی ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صفات کے تفاوت کا اگر یہ تماشا دنیا میں نہ پیش ہوتا تو ان گنت بے شمار طرح طرح کی بوقلموں ہستیوں سے آج عالم جو بھرا ہوا نظر آ رہا ہے۔ کثرتوں کا یہ مجموعہ ظاہر ہے کہ صرف ایک واحد شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا۔ ایک چیز کا دوسری چیز سے امتیاز کی صورت ہی اس کے سوا کیا تھی کہ صفات و کمالات میں باہم ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ لیکن باایں ہمہ اختلافات و امتیازات یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ موجودات کی مختلف قسموں میں جو صف بندی کی گئی ہے۔ کسی سلسلہ کو نباتات، کسی کو جمادات، کسی کو حیوانات، کسی کو انسان جو ہم کہتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس اختلاف کے باوجود کچھ چیزوں کے اندر اختلاف و مجانست و مشابہت بھی یقیناً پائی جاتی ہے، اور اتنی زیادہ مجانست و مشابہت کہ اس بنیاد پر ان کو کسی نہ کسی نوع یا صنف کے نیچے ہم داخل کرتے ہیں۔ ایک ایک جنس یا ایک ایک نوع کے افراد میں باوجود صفاتی امتیازات کے وحدت کے مشترک جہات بلاشبہ اتنی کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ بجائے دو کے ان کو ایک جنس یا ایک نوع کے نیچے اگر مندرج کیا گیا ہے تو قطعاً یہ غلط اندراج یا غلط صف بندی نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر ہم گھوڑوں گدھوں، بیلوں کے افراد کو اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی سمجھتے ہیں اور اسی نقطہ نظر سے ان تمام انواع میں ایک نوع کے نیچے افراد انسانی بھی مندرج ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ انسان کے سوا حیوانات کی جتنی دوسری نوعیں ہیں۔ مثلاً گھوڑا، ہاتھی، بیل

متعلق کی جاسکتی ہے۔ جنھیں مادر شکم سے بچہ اپنے ساتھ لایا ہو، اور یوں بھی تو سوچئے ایک ہی استاد سے ایک ہی کمرے میں ایک ہی نصاب کی تعلیم ہر جماعت کے طلبہ کو دی جاتی ہے۔ لیکن سب پر اس تعلیم کا نتیجہ ایک ہی کیوں مرتب نہیں ہوتا۔ بہر حال صفات و کمالات کے اسی تفاوت اور اس تفاوت سے مدارج و مراتب کا اختلاف، نسل انسانی کے افراد میں جو پیدا ہو گیا ہے۔ قرآن نے مذکورہ بالا آیتوں میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۰۷۔۱۰۹

آیت : ﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل:۲۷)

''تبذیر کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے رب کا ناشکرا ہے۔''

''تبذیر'' کا مادہ ''بذر'' ہے، بذر کے معنی تخم کے ہیں، تبذیر تخم چھڑکنے کو کہتے ہیں پھر جیسے کسان اپنے کھیت میں دانے ڈالتا ہے اور بغیر اس خیال کے چھڑکتا چلا جاتا ہے کہ دانے کہاں گریں گے کہاں نہ گریں گے، یہی حال اس شخص کا ہے جو اپنی دولت خرچ کرتا چلا جاتا ہے لیکن اس صرف میں اس کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ جائز خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے یا ان خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے جن کی تکمیل قانونا جرم ہے یہاں تک تو مبذر کسان کے مشابہ ہے لیکن آگے کسان کے دانے تو ایک سے سو پیدا کرتے ہیں اس معاملہ میں مبذر اس سے جدا ہو جاتا ہے بلکہ ٹھیک جو حال شیطان کا ہے وہی حالت اس کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان جیسا کہ اس قوت کا نام ہے جو بجائے خیر کے ہمیشہ شر اور برائی پر صرف ہوتی ہے۔ یہی حال مبذر کا ہے کہ خدا کی دی ہوئی مالی طاقت کو وہ بھی برائی اور شر کے حصول میں صرف کرتا ہے اسی لئے اس کا بھائی ہے اور جس طرح شیطان اپنی قوت کے غلط استعمال سے خدا کا ناشکرا قرار پایا یہی حال اس کی ناشکری کا ہے۔ الحاصل ''تبذیر'' کے صحیح معنی جو خود قرآن سے پیدا ہوتے ہیں وہ یہی ہیں کہ مال جو جائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے انسان کو دیا گیا ہے اسے ناجائز خواہشوں اور غیر قانونی اعمال وافعال پر خرچ کرنا، مثلاً شاہد بازی، حرام کاری، شراب خواری وغیرہ قانونی جرائم پر جو دولت کو صرف کرتا ہے وہ مبذر ہے پس ''تبذیر'' کے حقیقی معنی یہی ہیں۔ رہا اسراف وہ اس سے بالکل جداگانہ چیز ہے، تعجب ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں جہاں تبذیر کی یہ آیت ہے اسی کے بعد اسراف کے قانون کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، اگر دونوں ایک ہی چیزیں ہوتیں تو پھر اس کو دہرانے کی کیا ضرورت ہوتی جب ''تبذیر'' کی حقیقت واضح ہوگئی تو اب اس کا پتہ چلانا کہ مصارف کا کون سا سلسلہ تبذیر کے تحت میں داخل ہے اس کے لئے اسلامی جرائم کی فہرست اپنے سامنے رکھ لینا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ ان جرائم میں سے ہر چیز پر دولت کا صرف کرنا تبذیر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے تبذیر کی یہی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

ولو د القا

اگر چہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ جرائم پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک روپیہ خرچ کرے اور اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تبذیر کے معنی فضول خرچی کے نہیں ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ ضرورت سے زیادہ ایک حبہ بھی خرچ کرنا شیطان کا بھائی بننا اور خدا کے کفور بندوں میں شریک ہونا ہے۔ حالانکہ ایسا دنیا میں کون ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۴۴۴۔۴۴۶

﴿ طہ ﴾

آیت : ﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ (طٰہٰ:۱۲۴)

''اور جو کترایا میری یاد سے تو یقیناً اس کے لئے ہے ایسی معیشت جو ضیق اور تنگی سے بھری ہے۔''

قرآن میں ''معیشت'' کا ذکر کر کے ایک خاص قانون کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے، یعنی

﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾

ضیق اور تنگی، یہی ''ضنک'' کے لغوی معنیٰ ہیں، حاصل اس کا یہی ہوا کہ حق تعالیٰ اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو جو یاد نہیں کرنا چاہتا، قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس کی معیشت میں قدرت تنگی اور ضیق پیدا کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ قانون زندگی کے ہر حال اور ہر پہلو کو حاوی ہے، اسی لئے سمجھنا چاہیئے کہ رزق کے حساب سے خواہ آدمی بسط کی حالت میں ہو، یا قدر کے جو اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے اعراض وگریز کرے گا، اس کی معیشت تنگی اور ضیق کی شکار ہو جائے گی، اگرچہ یہ بالکل ایک تجربی چیز ہے، اسی لئے علماء نے اس کی تفصیل کی طرف کم توجہ کی، یعنی یہ بات کہ ایسی حالت میں ضیق اور تنگی کی کیفیت معیشت میں کیوں پیدا ہو جاتی ہے اسے چھوڑ دیا گیا ہے کہ تجربہ ہی اس کا بہترین جواب ہو سکتا ہے۔

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، قرآن ہی کی متفرق آیتوں کے مضمون پر اگر غور کیا جائے تو علاوہ تجربہ کے یوں بھی اس کے اسباب اور ان اسباب سے پیدا ہونے والے آثار کو بیان کیا جا سکتا ہے، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس باب میں اپنے خیالات عرض کرتا ہوں۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ معیشت میں بسط کی خواہش اسی لئے کی جاتی ہے کہ بسطی معیشت سے زندگی میں سہولت اور آسانی پیدا ہوتی ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ مال ودولت کی غرض یہی سمجھی جاتی ہے کہ خواہشوں کی تکمیل اور ضرورتوں کی فراہمی میں ان سے امداد ملتی ہے، لیکن بسطی معیشت کا یہ مقصد کیا ہر حال میں پورا ہوتا ہے قرآن ہی کی آیت ہے۔

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى Oوَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى Oفَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴾ (الیل:۵،۶،۷)

''تو جس نے دیا، اور ڈرا، اور تصدیق کی اس نے الحسنیٰ کی یعنی اچھی باتوں کی تو قریب ہے کہ ہم آسان کریں اس پر سہولت کی زندگی کو۔''

جس کا مطلب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''الیسریٰ'' یعنی آسانیوں اور سہولتوں والی زندگی کی راہ ان ہی لوگوں کے لئے آسان کی جاتی ہے، جو دیتے ہیں، دینے کا مقصد یہی ہے کہ جو ذمہ داریاں ان کے مال پر عائد کی گئی ہیں، ان ذمہ داریوں کو پوری کرتے ہیں، آگے وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (یعنی ڈرا اور اچھی باتوں کی تصدیق کر) یہ ان اسباب کی تشریح ہے جو ذمہ داریوں کے ادا کرنے پر آدمی کو آمادہ کرتے ہیں، یعنی خدا سے جو ڈرتا ہے وہ اچھی باتیں جنھیں خدا پسند کرتا ہے، انھیں وہ مانتا ہے، ظاہر ہے خدا کی ذمہ داریوں کا خیال ایسے آدمی کو نہ ہوگا تو کسے ہوگا''۔

بہرحال قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ الیسریٰ (آسان زندگی) کے حاصل کرنے کی راہ یہ ہے کہ خُدا کے خوف سے خُدا کی مرضی کے مطابق حق داروں تک ان کے حقوق پہنچائے جائیں۔ رہی یہ بات کہ ایسا ہوتا ہے بھی یا نہیں، یعنی ایسوں پر ان کی

زندگی آسان ہوتی ہے یا نہیں، سوجیسا کہ میں نے عرض کیا یہ بالکل ایک تجربہ کی بات ہے اور جہاں تک میرے غور وفکر کا تعلق ہے، اس باب میں اس سے زیادہ شاید اور کچھ کہا بھی نہیں سکتا۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اس راہ سے ہٹ کر زندگی گذارتے ہیں یعنی وہی بات کہ اس معاملہ میں خدا اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو یاد کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے ذکر سے اعراض کرتے ہوئے، مثلاً اس اصول کو اختیار کرتے ہیں، جس کا ذکر اسی الیسری والی آیت کے بعد ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

﴿وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی O وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی﴾ (الیل:۸،۹)

''اور جو بخیل بنا اور بے نیاز بنا اور اچھی باتوں کو جس نے جھٹلایا''۔

یعنی جو لوگ بجائے اعطاء (دادودہش) کے بخل کا رویہ اختیار کرتے ہیں، کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اسی کی طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں آگے کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے، یعنی مال و دولت روپیہ پیسے میں ان کو یہ خاصیت محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں سے آدمی کو یہ بے نیاز کر دیتے ہیں، اور بہ ظاہر روپے میں کچھ یہ خصوصیت نظر بھی آتی ہے، ایک غریب آدمی آج کی ضرورتوں کی پوری ہو جانے کے بعد پریشان رہتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ اپنی ضرورتوں کے لئے کس کس کے پاس جانا پڑے گا۔ کس کس سے کہنا ہوگا، لیکن اسی کے مقابلہ میں جس کا سرمایہ فرض کیجئے کہ کسی بنک میں جمع ہے۔ وہ ہر حال میں چہ غم رہتا ہے۔ ہر ضرورت جو پیش آسکتی ہے، اس کے متعلق مطمئن رہتا ہے کہ قاضی الحاجات ہمارے پاس موجود ہے، جس کھانے کی خواہش دل میں پیدا ہوگی اسے کھا سکتا ہوں، جس لباس کے پہننے کو جی چاہے گا، بنوا سکتا ہوں، جہاں جانے کی ضرورت ہوگی جا سکتا ہوں، حتیٰ کہ جس ڈاکٹر کو چاہوں گا بیمار پڑنے کی صورت میں بلوا سکتا ہوں، جس دوا کی طبیب ضرورت ظاہر کرے گا منگوا سکتا ہون، روپے کے متعلق "استغنا''یا''غنا بخشی '' کا یہی نظریہ ہے جوار باب بخل پر مسلط ہوتا ہے اور جیسا کہ میں نے کہا بہ ظاہر یہ ایک عقل کی بات بھی معلوم ہوتی ہے، روپے کے متعلق یہی احساس ایسوں کو اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیاز بناتا چلا جاتا ہے، نہ صرف انسانوں سے ہی، بلکہ بہ تدریج ایک کیفیت قلب میں ان کے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی کیفیت جس کا انھیں ممکن ہے شعور بھی نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ روپے کی استغنائیت ان کو خدا سے بھی بالآخر بے تعلق بنا کر رہتی ہے اور یہ بھی یہی بات کہ خدا کی ضرورت تو اسی بیچارے کو ہوتی ہے جو اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہو اور سرمایہ دار خواہ واقعہ میں کتنا ہی بے سہارا ہو، لیکن روپے کا ایک نشہ ہوتا ہے، جو بے سہارا ہونے کے احساس کو اس کے اندر پیدا ہونے نہیں دیتا، اور یہ تو خیر اس کے نفس کی ایک باطنی کیفیت ہوتی ہے، لیکن دوسرا جملہ وکذب بالحسنٰی (جھٹلاتا ہے وہ اچھی باتوں کو) یہی چیز اس باطنی کیفیت کے راز کو فاش کرتی رہتی ہے، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ الحسنٰی (یعنی ہر ایسی بات جو اچھی سمجھی جاتی ہے) قدرتاً بخل زدہ انسان انھیں جھٹلاتا ہے، اس کے دل سے انسانیت کی ہمدردی نکل جاتی ہے، صلہ رحمی، غربا پروری، حسن سلوک الغرض تمام اخلاقی خوبیاں، کردار کی بلندیاں، اس کی نگاہوں میں حماقت اور نادانی بن جاتی ہیں، آخر ان باتوں کی پرواہ کیوں کرے؟ آدمی ان چیزوں کی پابندی یا خدا کے ڈر سے کرتا ہے یا مخلوق خدا کے خیال سے، لیکن جس پر اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیازی واستغناء کا احساس مسلط ہو، وہ کسی کا خیال ہی کیوں کرنے لگا، اپنی تمام بے مروتیوں، بداخلاقیوں کے متعلق دل میں وہ ایک ہی جواب رکھتا ہے کہ کوئی میرا کیا کرے لے گا؟ اس ''تکذیب بالحسنٰی'' کے ردعمل میں اگر چہ اسے ہر قسم کی

رسوائیوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے، عمومیت اس سے بے نیاز رہتی ہے، محفلوں میں مجلسوں میں لوگ اس کی دنائتوں، خباثتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بنی آدم کے عام قلوب میں اس قسم کے لوگوں کے متعلق جو ایک قسم کی عداوت پائی جاتی ہے اور خلق اللہ کی ساری لعنتوں اور ملامتوں کی تہہ میں عداوت کا یہی مخفی جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اسی عداوت کا یہ پرتو نہیں ہوتا۔ جس کے متعلق بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ ''بخیل خدا کا دشمن ہے'' مگر باوجود ان تمام باتوں کے اس کے قلب کا استغناء اس کے آگے کوئی میرا کیا کر لے گا، اسی جواب کو دہراتا رہتا ہے، اور یہ بھی یہی بات کہ بیچارے عوام اس کا کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن کیسی عجیب بات ہے جو اس کے بعد اسی آیت کے آخر میں، یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى﴾ (الیل:۱۰)

''پس قریب ہے کہ ہم آسان بنادیں گے اس کے لئے ''العسریٰ'' کو یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو''۔

معلوم نہیں قرآن کے ان الفاظ کا مطلب دوسرے کیا سمجھتے ہیں، لیکن مجھ پر تو یہی کھولا گیا ہے، یعنی عوام ظاہر ہے کہ ایسوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن جس نے اسے یہ دولت دی ہے، کیا اس کے پنجہ اقتدار سے بھی وہ نکل جاتا ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا چاہے تو اس دولت کو اس سے چھین لے یا دولت ہی کیا، وہ تو قادر ہے کہ زندگی اور زندگی کے جن احساسات پر یہ بولیاں وہ بولتا رہتا ہے اسی زندگی سے جب چاہے اسے محروم کر دے، یہ تو خیر عام بات ہے، اور رات دن یہ ہوتا ہی رہتا ہے مذکورہ بالا قرآنی الفاظ میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ اس سے الگ بات ہے، یعنی سب کچھ کو اس کے قبضہ اقتدار میں دیتے ہوئے، قدرت کی یہ عجیب مخفی تدبیر ہے کہ جس دولت و ثروت روپے پیسے کو آدمی زندگی کی سہولتوں کے لئے حاصل کرتا ہے اور غالباً بخل زدہ آدمی بھی مال اندوزی کی راہ میں ابتداً جب قدم رکھتا ہے تو اسی عام خیال کے زیر اثر ہی رکھتا ہے۔ لیکن قدرت کی قہاریت کا یہ کیسا عجیب نظارہ ہے کہ جب روپے پیسے پر اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، تو بجائے ''الیسریٰ'' (آسان زندگی) کے العسریٰ (سخت دشواریوں سے بھری زندگی) اس پر آسان کر دی جاتی ہے، وہ سب کچھ کھا سکتا ہے۔ لیکن کچھ کھا نہیں سکتا۔ سب کچھ پہن سکتا ہے، لیکن کچھ پہن نہیں سکتا، الغرض اپنے اپنے دائرے کے اعتبار سے آرام و عیش کی جن جن صورتوں کو وہ مہیا کر سکتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک سے وہ محروم کر دیا گیا ہے، اتنا محروم کہ غربت، انتہائی غربت کی زندگی رکھنے والوں کو بھی جو سہولتیں میسر آتی ہیں عموماً بخل کے ان روگیوں کو وہ بھی نصیب نہیں ہوتیں، سچ پوچھئے تو ایسوں کو دیکھ کر بے ساختہ

ایں طرفہ تماشا ہیں لب تشنہ بآب اندر

کا مصرعہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے، گویا بہتی ہوئی خنک ریز موجوں کے نیچے حالانکہ اسے بٹھایا جاتا ہے۔ موجوں پر موجیں گذرتی رہتی ہیں، اسی پر سے گذرتی رہتی ہیں، لیکن اس کور بخت کور نصیب کی تشنہ لبی اور محرومی اپنے حال پر باقی رہتی ہے، بہر حال حق تعالیٰ کی ذمہ داریوں سے انحراف و اعراض کر کے بخل کی راہ جو اختیار کرتے ہیں، ان کے متعلق قرآنی آیت

﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى﴾ (الیل:۱۰)

پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے اس کے لئے العسریٰ کو (یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو)

کا مشاہدہ ایک ایسا تفسیری مشاہدہ ہے جس کی زندہ مثالیں دُنیا کی آبادیوں میں جہاں ڈھونڈیئے آپ کو مل سکتی ہیں، ہر قسم کی سہولتوں پر قابو یافتہ ہونے کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ زندگی کی دشوار ترین شکلوں کو اپنے آپ پر اس قسم کا آدمی کتنا آسان بنائے ہوئے ہے، اور جیسے ان مثالوں کی کمی نہیں ہے، قرآنی الفاظ

﴿كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾ (الیل:۹)

جھٹلاتا ہے وہ ''الحسنیٰ'' کو (یعنی جو باتیں اچھی سمجھی جاتی ہیں)۔

کے لئے بھی بجائے کتابوں کے کسی بخل زدہ فطرت کی زندگی کا مطالعہ ہی کافی ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جن واقعات کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ میرے نزدیک تو قرآن فہمی کے لئے وہی بس کرتے ہیں، کسی کو زیادہ شوق ہو تو جاحظ کی مشہور ''کتاب البخلاء'' کے مطالعہ سے اپنے شوق کو وہ پورا کرسکتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ''الحسنیٰ'' کی تکذیب کے متعلق تو کوئی میرا کیا کرلے گا؟ یہ جواب بھی وہ رکھتا ہے۔ اس تکذیب کے ردعمل کا ظہور جن شکلوں میں ہوتا ہے، ان کے متعلق بھی یہ سمجھ کر کہ حاسدوں کو بکنے دو، وہ میرا بگاڑ ہی کیا سکتے ہیں، شائد اپنے دل کو مطمئن کرلیتا ہو، اگرچہ سچ تو یہ ہے کہ معیشت کی تنگی وضیق کے لئے اس کی یہی رسوائیاں کافی ہوسکتی ہیں، اور میں نہیں جانتا کہ انسانی احساسات رکھتے ہوئے یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ خلق اللہ کی لعنتوں اور ملامتوں کی چوٹ اس کے دل پر نہیں پڑتی مال کا ایک بڑا مصرف جیسا کہ حضرت حسین علیہ السلام سے مروی ہے، عزت اور آبرو ہی کا بچانا ہے۔ لیکن قدرت کا یہ بھی انتقام ہی ہے کہ اسی مال سے رسوائیوں اور بے عزتیوں کے خریدنے پر وہ مجبور کیا جاتا ہے، تاہم جو اذیت اپنی بے عزتی بے آبروئی سے آدمی کی ہوتی ہے۔ چوں کہ قلب کی یہ ایک مخفی کیفیت ہے، جس پر گذرتی ہے وہی اس کا صحیح اندازہ کرسکتا ہے، دوسروں کے مشاہدہ کی یہ چیز نہیں؛

مگر دوسری سزا یعنی ''العسریٰ کی تیسیر'' یعنی دشوار اور کٹھن زندگی جو اس پر آسان کردی جاتی ہے اور سزا کے اس سلسلہ میں بآب اندر رہ کر جس ''تشنہ لبی'' کا تماشا یہ طبقہ دکھاتا چلا آرہا ہے، یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، سہولتوں اور آسانیوں کے لئے جو چیز حاصل کی جاتی ہے، مغالطوں میں مبتلا ہو کر اسی کو اپنی دشواریوں اور سختیوں کا وہ ذریعہ بنالیتا ہے اور یہ ہے،

﴿مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾

''جو کترایا میری یاد سے تو قطعاً ہے اس کے لئے زندگی ضیق اور تنگی سے بھری ہوئی۔''

کی مشاہداتی بیّن اور کھلی ہوئی تفسیر، مرنے سے پہلے جسے ان لوگوں کو دیکھنی پڑتی ہے جو خُدا اور اس کی ذمہ داریوں کے یاد کرنے سے گریز کرتے ہیں۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص:۲۰۳۔۲۰۸

آیت : ﴿وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْھُمْ زَھْرَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا لِنَفْتِنَھُمْ فِیْہِ﴾ (طٰہٰ:۱۳۱)

''اور نہ اٹھائیو! اپنی دو آنکھوں کو ان کی طرف جنھیں جوڑے جوڑے کی شکل میں ہم نے نعمتیں بخشی ہیں۔ یہ پست زندگی کی تازگی ہے (اس لئے ان کو دی گئی ہیں) تا کہ ہم امتحان لیں ان کا اس میں۔''

قانون مد و عد یہ میری ایک اصطلاح ہے، اور قرآن سے ماخوذ ہے۔ مد کے قانون سے میرا اشارہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے۔

﴿وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْھُمْ زَھْرَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا لِنَفْتِنَھُمْ فِیْہِ﴾

''اور نہ اٹھائیو! اپنی دو آنکھوں کو ان کی طرف جنھیں جوڑے جوڑے کی شکل میں ہم نے نعمتیں بخشی ہیں۔ یہ پست زندگی کی تازگی ہے (اس لئے ان کو دی گئی ہیں) تا کہ ہم امتحان لیں ان کا اس میں۔''

بعض الفاظ کی کمی وبیشی سے اس حکم کا اعادہ دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْھُمْ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ﴾ (الحجر:۸۸)

''اور نہ اٹھانا اپنی دونوں آنکھوں کو ان چیزوں کی طرف جن سے جوڑے جوڑے کی شکل میں ہم نے لوگوں کو سرفراز کیا ہے اور نہ اس پر غم کھانا!''

ان دونوں آیات میں مد عین سے منع کیا گیا ہے، مد کے معنی کھینچنے اور بلند کرنے کے ہیں اور عین کے معنی آنکھ۔ مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو ان کی طرف اٹھانے سے منع کیا گیا ہے، جنھیں گویا بسطی پیمانے پر روزی عطا کی گئی ہے۔ اردو میں مدنظر کا لفظ بھی قریب قریب اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے جو مد عین کا مفہوم ہے، خیر یہ تو الفاظ کا سرسری حاصل ہوا، بسطی طبقات کی تعبیر جن الفاظ سے یہاں کی گئی ہے، غور کرنے کی یہی چیز ہے، پہلے اسے سمجھ لینا چاہئے۔

(۱) پہلی بات اس سلسلے کی ''ازواجا'' کا لفظ ہے، بسطی طبقات کی ایک خاص خصوصیت کی طرف اس میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اشارہ کیا گیا ہے، مشاہدہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے، یعنی دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ آمدنیوں پر جن لوگوں کو یہاں اقتدار بخشا جاتا ہے عموماً ان کے قلوب میں ایک عجیب جذبہ اس بات کا پیدا ہو جاتا ہے کہ ضرورت کی ایک ہی چیز مثلاً سواری، لباس، پوشاک، مکان وغیرہ وغیرہ ہر ایک میں ان کی تشفی کسی ایک شکل سے نہیں ہوتی، باوجودیکہ ان کے پاس مثلاً موٹر موجود ہوتی ہے۔ لیکن ایک موٹر سے ان کا جی نہیں بھرتا، دل دوسری موٹر کے لئے بے چین رہتا ہے۔ پھر شکل وصورت، رنگ روپ کا معمولی فرق بھی کسی دوسری موٹر کی ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے یہی حال زندگی کی دوسری ضرورتوں میں ان کا ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان امیروں کے کمروں میں جب آپ داخل ہوں گے تو عموماً ایک طرف قطار در قطار مختلف شکلوں، صورتوں کے جوتے نظر آئیں گے دوسری طرف کسی کونے میں دیکھئے تو صرف چھڑیوں کا ایک بوجھا ٹھیک اس شکل میں جیسے ترکش میں تیر ہوتے ہیں۔ ان کی چھڑی دانیوں میں رکھا نظر آئے گا، اور یہ تو ان کا حال ہے جن کا شمار نسبتہً متوسط طبقات بلکہ کہئے تو عوام کی زبان میں کہہ سکتے

ہیں کہ چھوٹ بھیوں میں جو گنے جاتے ہیں، ازواجی مذاق میں ان کی یہ کیفیت ہے، باقی ان میں جو بڑے ہیں، ان کو تو دیکھا جاتا ہے کہ ایک بلڈنگ کے بعد دوسری بلڈنگ اور ایک محل کے بعد دوسرے محل کا شوق کسی طرح ختم ہونے ہی کو نہیں آتا، ہر چیز میں زوج اور جوڑے کے ذوق نے اس حد تک ان لوگوں کو پہنچا دیا ہے کہ کسی عمارت کے ایک پہلو میں اتفاق سے اگر کوئی مسجد آ گئی ہے تو صرف ''ازواجیت'' اور جوڑا بنانے کے ذوق کی تکمیل کے لئے سنا ہی نہیں گیا ہے بلکہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد کے مد مقابل دوسری سمت میں ٹھیک مسجد ہی کی شکل وصورت رکھنے والی عمارت بنوائی گئی، چونکہ قبلہ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس دوسری مجازی مسجد کا کعبہ کی سمت واقع نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے واقع میں تو وہ مسجد نہ ہوسکی، لیکن دیکھنے والوں کو اگر مغالطہ ہو جائے اور شکل وشباہت سے دھوکہ کھا کر اس میں نماز پڑھنے لگیں تو کچھ تعجب نہیں۔

(۲) دوسری چیز ''زہرۃ الحیواۃ الدنیا'' کے الفاظ ہیں ''الحیوۃ الدنیا'' تو ظاہر ہے کہ انسان کی موجودہ پست زندگی کی تعبیر ہے، رہا زہرہ سو لغت میں اس کے معنی تازگی اور شادابی کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ ایک تو انسان کی موجودہ زندگی کے واقعی ضروریات ہیں، یعنی ایسی ضرورتیں جن کے بغیر اپنی زندگی کو آدمی گذار نہیں سکتا، معاشی اصلاح میں جنہیں NECESSARY کہتے ہیں، اور دوسری چیزیں وہ ہیں جن کا اصطلاحی نام Luxury ہے، سچ پوچھیے تو ''زہرۃ الحیوۃ الدنیا'' زندگی کے ثانی الذکر لوازم کی قرآنی تعبیر ہے، دوسرے مقام پر اسی کو کبھی ''زینۃ الحیوۃ الدنیا'' بھی کہا گیا ہے، یعنی زندگی کے آرائش وزیبائش سے ان کا تعلق ہے۔

ان امور کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب مذکورہ بالا آیات کے مفہوم کو سمجھنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ بسطی طبقات کی طرف نگاہ اٹھانے سے جب ان آیتوں میں منع کیا گیا ہے تو یہی قرینہ ہے اس بات کا کہ براہ راست ان آیتوں کے خطاب کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہوسکتا ہے جو معاشی لحاظ سے بسطی نہیں بلکہ قدری زندگی رکھتے ہوں، لیکن جیسا کہ بسط وقدر انسان کے معاشی مدارج کی اضافی شکلیں ہیں، اس لئے ان کے استعمال میں بھی چاہیے کہ کسی خاص طبقہ کو متعین کر کے محدود نہ کر دیا جائے۔ بلکہ وہی بات کہ اپنے آپ سے بالاتر طبقات کے حساب سے جو لوگ یہ پاتے ہوں کہ معاشی لحاظ سے وہ قدر اور تنگی کی حالت میں گرفتار ہیں، وہی ان آیتوں کا اپنے آپ کو مخاطب قرار دے کر ان ہدایتوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں جن کی طرف حق تعالیٰ نے راہنمائی فرمائی ہے۔

مقصود تو ان آیتوں سے یہی ہے کہ ہر شخص کو معاشی جدوجہد میں اپنی حقیقی ضرورتوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ دوسروں کے ساتھ ناپ ناپ کر اپنے اندر کمتری اور کم مائیگی کا خواہ مخواہ احساس پیدا کر کے اپنے ہاتھوں خود اپنے آپ کو ذہنی کلفتوں میں لوگ مبتلا نہ کریں، گویا دوسرے الفاظ میں وہی بات جس کی طرف قرآن ہی کی آیت

﴿ وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ (النساء:۳۲)

''اور نہ آرزو کیا کرو اس چیز کی جس کی وجہ سے خدا نے بعض کو بعض پر برتری عطا کی ہے۔''

میں توجہ دلائی گئی ہے میں نے بھی کہیں لکھا ہے کہ زندگی کی حقیقی ضرورتوں کی پوری ہونے کے باوجود جو دوسروں کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو ناپ ناپ کر کڑھتے اور جلتے رہتے ہیں، وہ دنیا میں اگر تنہا پیدا ہوتے، اور ان کے ساتھ ان کا ہم جنس کوئی دوسرا نہ ہوتا، تو کھلی ہوئی بات ہے کہ دوسروں سے ناپنے کا موقعہ ہی ان کو نہ ملتا پھر اس وقت جیسے اپنی زندگی سے آدمی مسرور ہوتا، کیوں نہیں آج بھی دوسروں سے قطع نظر کر کے اپنی زندگی ہم گذاریں، تجربہ بتادے گا کہ جن کلفتوں اور الجھنوں کو آدمی قدری معیشت کی طرف منسوب کرتا ہے، ان کا اکثر و بیشتر حصہ اس عمل کے بعد ثابت ہوگا کہ قطعاً وہمی اور خود تراشیدہ تھا۔ لیکن قرآن نے اسی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ مذکورہ بالا آیات کے جن الفاظ کی طرف میں نے توجہ دلائی ہے ان پر غور کیجئے نظر آئے گا کہ ان الفاظ کا اضافہ بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے۔ آخر سوچئے کہ بسطیوں کے جن حالات کو دیکھ دیکھ کر قدریوں کا گروہ محزون و مغموم رہتا ہے۔ تجزیہ کے بعد ان کی حقیقت کیا وہی نہیں ہے کہ زیادہ تر ان میں وہی ازواجی مذاق یعنی ہر چیز کو جوڑے کی شکل میں رکھنے، اور ہر شئی کے مدمقابل کے مہیا کرنے کے شوق سے ان کا تعلق ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک قسم کی ابلہی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے، تاجروں اور کاریگروں، کارخانوں والوں سے پوچھئے، وہی امیرانہ چونچلوں کے اس راز سے خوب واقف ہیں، اسی لئے ایک ہی چیز کو مختلف شکلوں اور قالبوں میں ڈھال ڈھال کر وہ ان کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں، اور ان بیچاروں کی ماؤف ذہنیت سے جواز واجیت کے ذوق کی عموماً مریض ہوتی ہے فائدہ اٹھاتے ہیں، بسطیوں کو جو کچھ دیا گیا ہے جو اس کی اس واقعی حقیقت پر متنبہ ہو جائے گا جس کی طرف قرآن نے ''ازواجا'' کے لفظ سے اشارہ کیا ہے، ظاہر ہے کہ حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اس ابلہی کی ہوس اپنے اندر کیوں پیدا کرے گا، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مشہور حدیث

من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه[1]

آدمی کے اسلام کی خوبی کی یہ دلیل ہے کہ لاحاصل اور بے نتیجہ باتوں کو ترک کر دے۔

کا ایک مصداق آدمی کا یہ طرز عمل بھی ہے، بلکہ حدیثوں میں جو آیا ہے۔

یکفیک من الدنیا ماسد جوعتک دواری عورتک و ان کان شیئی یظلک فذاک و ان کان لک دابه فبخ

''دنیا سے تیرے لئے یہ کافی ہے جس سے تیری بھوک کا ازالہ ہو جائے اور جس سے تیری سرپوشی ہو جائے۔ اور ان ہی کے ساتھ اگر کوئی ایسی چیز بھی تجھے مل گئی جس کے سائے میں تو رہے (یعنی کسی قسم کا گھر) تو پھر یہ تو ہے ہی اسی کے ساتھ اگر کوئی سواری بھی تجھے مل جائے تو پھر کیا کہنے۔''

اس میں بھی اسی حقیقت کی یافت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

---

[1] احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، حدیث الحسین بن علیؓ (۱/۲۰۱) [۱۷۳۷]، ص ۱/۵۳۷، عالم الکتب بیروت لبنان، الطبعة الاولی، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء

اب اس کے بعد ''زہرۃ الحیواۃ الدنیا'' کے الفاظ پر غور کیجئے، اسی کی دوسری تعبیر قرآن ہی میں ''زینۃ الحیواۃ الدنیا'' سے بھی کی گئی ہے، یعنی جن سرمایوں کو بسطیوں کا سرمایہ سمجھا جاتا ہے قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ اس کا تعلق بھی زندگی کی ضرورت سے نہیں، بلکہ زینت سے ہے، جن لوگوں کو حیات دنیا کی زینت دی گئی ہے، اس زینت کے استعمال سے تو ان کو منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ منع کرنے والوں کو ڈانٹا گیا ہے، لیکن سوال ان لوگوں کے متعلق ہے جو حیات دنیا کی اس زینت یا زہرہ سے محروم ہیں، کیا ان کی محرومی اس قابل ہے کہ اس پر حزن کیا جائے، اور اس حزن وملال کو مٹانے کے لئے زینت ہی کو اپنی زندگیوں کا مقصود بنالیا جائے؟ قرآن میں سخت تہدیدی لہجہ میں یہ فرماتے ہوئے۔

﴿تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ (الکھف:۲۸)

کیا اس پست زندگی کی زینت کو تم اپنا مقصود بناتے ہو۔

حیات دنیا کی زینت کو مقصود بنانے سے روکا گیا ہے۔ کیوں روکا گیا ہے؟ کیا خدا کا اس میں فائدہ ہے، آخر حیاتِ دُنیا کی زینت سے جو سرفراز کئے گئے ہیں، انھیں اس کے استعمال سے جب منع نہیں کیا گیا ہے تو زینت کا استعمال ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ناراضی کا سبب کیسے ہوسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں خطاب ان لوگوں سے ہے جن کی معاشی زندگی زینت کے اسباب سے خالی ہے، ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ مخواہ بلا وجہ زینت کو اپنا مطلوب بنا کر وقت کو رائگاں نہ کریں۔ جب ضرورت پوری ہورہی ہے تو غیر ضروری چیزوں کی طلب میں اپنے آپ کو دکھ میں آدمی کیوں مبتلا کرے۔ بلکہ مدعین والی آیتوں میں سے ایک آیت جو سورہ طٰہٰ میں پائی جاتی ہے اس کے آخر میں جو یہ الفاظ ہیں۔

﴿وَ رِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی﴾ (طٰہٰ:۱۳۱)

''تیرے مالک کی روزی تیرے لئے خیر بھی اور زیادہ باقی رہنے والی بھی''۔

اگر غور کیا جائے تو حیاتِ دنیا کی زینت کو مطلوب بنانے سے روکنے کے دوسرے وجوہ بھی اسی سے سمجھ میں آسکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ زینت سے ہٹ کر اگر آدمی ان ہی ضروریات پر قناعت کرے جن کی بدولت اس کی زندگی گذرتی رہتی ہے، قرآن نے جس کا نام ''رزق رب'' رکھا ہے تو زینت کی لوکو دل سے نکالنے کے ساتھ ہی رب کی یہی روزی آدمی کے لئے خیر کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، خیر کے معنی وہی ہیں کہ وہی اس کی فطرت کے لئے بہتر اور خوشگوار بن جاتی ہے اور یہ حاصل تو خیر کے لفظ کا ہوا، رہا دوسرا لفظ ابقٰی کا جو اس کے بعد ہے۔ اس کو یوں سمجھیے کہ آدمی جب تک جیتا ہے، اس وقت تک ضروریاتِ حیات بہر حال اس کے لئے مہیا ہوتے ہی رہتے ہیں، بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے جب تک قدرت ان ضرورتوں کو اس کے لئے مہیا کرتی رہتی ہے جن پر اس کی زندگی مبنی ہے، اس لئے جب تک زندگی ہے اس وقت تک ان ضرورتوں کی فراہمی بھی ضروری ہے۔ اور جب تک یہ ضرورتیں فراہم ہوتی رہتی ہیں، اسی وقت تک زندگی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زندگی اور زندگی کی ان ضرورتون کو ایک دوسرے سے کوئی علیحدہ نہیں کرسکتا

بخلاف ان چیزوں کے جن کا تعلق حیات دنیا کی زینتوں سے ہے کہ زندگی کے ساتھ ان کی ذمہ داری کوئی نہیں لے سکتا آئے دن لوگوں کو یہ ملتی بھی رہتی ہے اور چھنتی بھی رہتی ہے کتنے زینت والے ہیں جو جیتے رہتے ہیں اور حیات دنیا کی ان زینتوں کے بغیر جیتے ہیں جن سے کسی زمانے میں وہ مالا مال تھے ''زینۃ الحیوۃ الدنیا'' کو مطلب ومقصود بنانے سے منع کرنے کا یہ دوسرا فائدہ ہے جس کی طرف ابقی کے لفظ سے میرے خیال میں قرآن میں ایما کیا گیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص:۱۸۸۔۱۹۲

﴿الانبیاء﴾

آیت: ﴿وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ﴾ (الانبیاء:۸۰)

''اور سکھایا ہم نے (داؤد) کو تمہارے لئے (انسانوں کے بچاؤ کے لئے) زرہ بنانا، تا کہ حفاظت کرے تمہاری لڑائیوں میں''۔

ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ انبیاء بنی اسرائیل کے دوسرے اولوالعزم نبی حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے،

﴿وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ﴾

آج توپ اور بندوق، بلکہ بم یا اس کی مختلف جہاں گداز عالم سوز قسموں کے مقابلے میں یقیناً اب اس غریب ''زرہ'' کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔لیکن سوچنا چاہیے اس زمانے کو سوچنا چاہیے جب اون اور بال سے ننگے جسم رکھنے والے اس نازک اندام انسان پر باڑھ اور دھار والے نوکیلے ہتھیاروں سے حملہ کر دیا گیا تھا۔یقیناً اس وقت خدا کی رحمتوں میں سے ایک بڑی رحمت یہ بھی تھی کہ لوہے جیسی کرخت وسخت دھات کا اتنا نرم پڑ جانا کہ تاروں کی شکل میں اس کا کھنچنا آسان ہو گیا۔پھر ان تاروں سے چھوٹی چھوٹی کڑیوں کے بنانے پر قادر ہو جانا۔تا ایں کہ انہی کے جوڑنے سے لوہے کے ایسے لباس کے تیار ہو جانے کا امکان پیدا ہونا کہ جس طرح جسد انسانی پر سوتی اور اونی کپڑے چست ہر کر لپٹ جاتے ہیں۔یہی کیفیت اس لباس میں بھی پیدا ہو گئی۔قرآن میں جن امور کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی۔

﴿وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ﴾ (سباء:۱۰،۱۱)

اور نرم کر دیا ہم نے (داؤد) کے لئے لوہا (تاکہ) بنائیں وہ (بدن پر خوب چست ہو کر اتر جانیوالی زرہیں)
(اور سکھایا ان کو) کہ ٹھیک اندازے کے ساتھ جوڑیں کڑیوں کو۔

میں بار بار اس پر متنبہ کرتا چلا آ رہا ہوں کہ قرآن نہ براہ راست کوئی معاشی کتاب ہے اور نہ صنعت وحرفت وایجاد واکتشافات پر بحث اس کے حقیقی مقاصد میں داخل ہیں۔لیکن ضمناً بھی قرآن میں جس چیز کا ذکر آ گیا ہے۔یقیناً وہ قرآن ہی کی چیز ہے،ہم مسلمانوں میں اپنی آسمانی کتاب کے متعلق نفاق کا وہ رویہ بحمداللہ اب تک نہیں پیدا ہوا ہے،جس کا اظہار بعض دفعہ اس زمانے کے دوسرے ارباب مذاہب اپنی ان کتابوں کے متعلق کرتے ہیں۔جنھیں کہنے کی حد تک تو وہ بھی آسمانی اور وہ خدا کی نازل کی ہوئی کتابیں کہتے ہیں،لیکن باوجود اس کے بسا اوقات ان چیزوں کے متعلق جن کا ان کی ان ہی مذہبی کتابوں میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ان ہی کے متعلق یہ کہہ دیتے ہیں کہ عوام کا جو خیال اور جو عقیدہ کسی چیز کے متعلق اس زمانے میں تھا،اسی کی رعایت کرتے ہوئے ہماری ان کتابوں میں غلط بیانی سے بھی کام لیا گیا ہے۔لیکن ایک مسلمان ایک لحہ کے لئے اس عقیدہ کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔خدا کی طرف غلط بیانی کے انتساب کی بھلا کسے جرات ہو سکتی ہے؟ پس خواہ ایسی باتیں ہوں جن کا ذکر قرآن کا اصل مقصود ہے۔یا جن چیزوں کا ذکر قرآن میں ذیلاً یا ضمناً آ گیا ہے۔چونکہ بہر حال وہ خدا ہی کا کلام ہم مسلمانوں کے نزدیک ہے اس کی وقعت اور قیمت کے لحاظ سے ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے [1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۳۱-۳۳

﴿الحج﴾

آیت : ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ (الحج:۱۱)

''اُن میں بعض ایسے ہیں جو پوجتے ہیں خدا کو کنارے پر بیٹھ کر، پھر اگر پہنچی اسے کوئی بھلائی، تو مطمئن ہو گیا اس کے ساتھ، اور اگر پہنچی کوئی آزمائش تو پلٹ پڑا اپنے رخ پر برباد کر بیٹھا الدنیا بھی اور الآخرۃ بھی یہی ہے کھلا ہوا خسارہ''۔

اُن لوگوں کے لئے جو حق تعالیٰ کی الہ المعادی شان سے بے پرواہو کر محض الہ المعاش ہی بنانے کا رشتہ ان کے ساتھ رکھتے ہیں، ان دو تعلقوں سے صرف ایک یعنی معاشی تعلق کو تھام کر دوسرے سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔ اور یوں ایک ہی کنارہ پر بیٹھ کر صرف اسی الحیٰوۃ الدنیا کی کامیابیوں کے لئے اس کو پوجتے ہیں، نمازیں بھی اسی لئے پڑھتے ہیں، تلاوت بھی اسی لئے کرتے ہیں۔ خیر وخیرات کے مدوں میں بھی اسی لئے دیتے ہیں، تا کہ مثلاً ان کی نوکری برقرار رہے، ترقیوں کی راہیں ان پر کھلیں، تجارت میں فروغ ہو، فصل پوری ہاتھ لگے، بال بچوں سے گود بھری رہے، گھر کا اقبال اونچا ہو، اعزاز بڑھے ''علی حرف'' یعنی کنارے بیٹھ کر اس طریقہ سے اللہ کے پوجنے والوں کو قرآن میں اس سے بھی ڈرا گیا ہے کہ کہیں ''الدین'' کے ساتھ وہ اپنی ''الدنیا'' بھی نہ ڈھا بیٹھیں، ارشاد ہے،

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ (الحج:۱۱)

مطلب یہ ہی ہے کہ معادی معاملات میں تو خدا سے اپنے آپ کو بے نیاز بنائے ہوئے تھا ہی، لے دیکر ایک معاشی رخ حق تعالیٰ کی طرف اس کا باقی تھا، اس رخ سے جب تک پاتا رہے گا، اس وقت تک تو خیر لیکن عالم کا علم، اگر اس کے جہل کا ساتھ خود اسی کے فائدہ کے لئے کسی وقت نہ دے اور اس کی حکمت ورحمت کا تقاضا ہے کہ نہ دے، تو ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ الہ المعاش ہونے کی حیثیت سے اس وقت خدا کو الہ بنانا اس کے لئے برابر ہو جائے گا، کتنا نازک وقت اور کٹھن گھڑی اس کے لئے یہ صورت ہو گی، خدا کا یہ ایک رخا پجاری جب معاشی فلاح و بہبود ہی کے لئے خدا کو پوج رہا تھا، اتفاقاً اس راہ کی کامیابیوں کے دروازے جب اپنے اوپر بند پائے گا تو کب تک وہ اس حرفی عبادت ودعا پر صبر کئے بیٹھا رہے گا۔ معادی منافع تو اس کے سامنے ہیں نہیں، رہ گئے تھے معاشی فوائد، جب ان میں بھی ناکامیوں کے سوا اپنے سامنے کچھ نہیں دیکھتا تو خطرہ اور بہت زیادہ خطرہ ہے کہ اکتا کر وہ خدا کے سامنے سے ہٹ جائے، معادی رشتہ تو پہلے ہی سے ٹوٹا تھا، رہ گیا تھا معاشی ربط سو وہ بھی (العیاذ باللہ) جب اس کا ختم ہو گیا۔ تو اب بارگاہ حق میں حضوری کی کیا صورت اس کے لئے باقی رہ جاتی ہے؟ محرومی اور کیسی سخت محرومی ہو گی، جس کا ایسی حالت میں وہ محض اسی لئے شکار ہوا کہ جو ہم انسانوں کا الہ المعاش ہونے کے ساتھ الہٰ المعاد بھی تھا، اسی ذات پاک کو یہ نادان صرف الہ المعاش بنا کر پوجتا رہا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یاس کی تلخ کامیاں، اس قسم کے یک رخی عبادت والوں کی زبانوں سے ان حالتوں میں اول فول کی جو گندگیاں، اگلواتی ہیں، وہ تو شاید ان مسکینوں کے لئے بھی قابل برداشت نہ ہوں، جو اپنے مالک سے نہ معاشی ہی تعلق رکھنے کی ضرورت سمجھتے ہیں اور نہ معادی کی بلکہ صرف عقلی سہاروں کے بل بوتے پر زندگی گزارتے ہیں[۱]۔

---

[۱] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۷۸۔۷۹

آیت : ﴿مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ﴾ (الحج:۳۱)

''اللہ کے ساتھ جو بھی کسی کو شریک بناتا ہے، ایسا سمجھو کہ گویا وہ آسمان سے چکرا کر گر پڑا، پھر (بیچ ہی میں) کسی پرندے (باز، بحری وغیرہ) نے اس کو اچک لیا یا گراتے ہوئے آندھی اسے دور دراز جگہ میں (اڑائے) لیے چلی جاتی ہو۔''

مادیت کے جدید مشرکانہ رجحان میں آدمی کا وجود کیا عدم کے برابر نہیں ہو جاتا؟ یقیناً ایسی ہستی کی شکل وہ اختیار کر لیتا ہے جس کے ساتھ کسی قسم کا مفاد کسی کا وابستہ نہیں ہے۔ اپنے پیدا کرنے والے خالق کے لیے ہے؟ نہیں! اور مخلوقات میں بھی کسی کو انسانی وجود کی ضرورت نہیں۔ ایسی صورت میں نظام کائنات کے اندر ایک ایسی حیثیت اس کی ہو جاتی ہے کہ رہے تو کیا اور نہ رہے تو کیا۔ ہمارے زمانے کی جدید نئی مشرکانہ ذہنیت کا یہ قدرتی منطقی نتیجہ ہے۔ مطلب جس کا یہی ہوا کہ وہ کچھ باقی نہ تھا اس کا بود نابود کے ہم معنی ہو کر رہ گیا۔ دوسرے تو دوسرے، آدمی کے حافظہ سے خود اپنی یاد کا چراغ اس ذہنیت کے شکار ہونے کے ساتھ ہی بجھ جاتا ہے۔ گویا اپنے آپ ہی کو آدمی کا حافظہ اس طور پر نگل جاتا ہے کہ اگلوانے کی لاکھ کوشش کی جائے تو وہ اس کو اگل ہی نہیں سکتا، جب تک کہ وہی یاد نہ آ جائے، جس کی یاد کے لیے آدمی پیدا کیا گیا ہے۔ الغرض بے مقصد ہو کر ''انسان'' اس زمانے میں جو کھویا گیا ہے، سمجھا جائے تو ''فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ'' (اچک لیا اس کو پرندے نے) کے الفاظ میں ''شرک جدید'' کے اس منطقی نتیجے کا اشارہ شاید ہم پا سکتے ہیں۔ شکاری پرندے باز، بحری، جرے یہی تو کرتے ہیں۔ اڑتی ہوئی چڑیوں کو ہوا سے اچک لیتے ہیں۔ ان کے پوٹوں میں پہنچ کر چڑیوں کا وجود عدم کی شکل اختیار کر کے گم ہی تو ہو جاتا ہے اسو چیے شرک کے جدید مادی رجحان میں اس کے سوا ''انسانیت'' کا انجام اور کیا ہوتا ہے؟ باقی ''مشرکانہ ذہنیت'' کا دوسرا نتیجہ کہ آندھی گراتے ہوئے۔ دور دراز مقام کی طرف لیے، اڑائے لیے چلی جاتی ہے۔ یعنی ''أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ'' مخلوق پرستی میں مبتلا ہونے کے بعد جو بپتا آدم کی اولاد پر پڑی اس کی یہ کتنی سچی تصویر ہے ''خالق کی بندگی اور عبادت سے اکتانے کے بعد اسی مخلوق کو جاہلیت والے قدیم شرک میں معبود اور الٰہ جب بنا لیا گیا تو آدمی کی پیشانی کے لیے پھر کوئی ''قرارگاہ'' میسر آئی؟ خالق سے آدمی کٹا اور پھٹا، پھر دیکھیے کٹنے سے اکھڑ جانے والی پتنگ کی طرح ''انسانیت'' کے لیے غوطوں کے بعد غوطوں کے سوا اور بھی کچھ دیکھا گیا؟

ایک زینے سے لڑھک کر دوسرے پر، دوسرے سے تیسرے پر یوں ہی نہ ختم ہونے والے سیڑھیوں کے ڈنڈوں پر قلابازیاں کھاتے ہوئے وہ لڑھکتی ہی چلی گئی!

سچ ہے کہ مشرک آسمان سے چکرا کر گرتا ہے پھر بیچ ہی میں بے چارہ کھو کر گم ہو جاتا ہے یا مخلوق پرستی کے عارضہ میں مبتلا ہو کر پٹخنیاں کھاتے ہوئے گرتا ہے، گرتا چلا جاتا ہے اور گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اسی کے اندر سے ''شرک'' کی آندھی اٹھتی ہے، وہ اسے اڑائے لیے چلی جاتی ہے۔ بس ''شرک'' کا خواہ پرانا رنگ ہو یا نیا، ہر حال میں تباہی و بربادی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہ پہلے سامنے آیا اور نہ آج آیا نہ آیندہ آئے گا۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید الدین القیم، ص ۲۶۴۔۲۶۵

﴿المومنون﴾

آیت : ﴿فَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ (المومنون:۲۷)

''اور ہم نے وحی کی نوح کی طرف اس بات کی کہ بنا کشتی میری نگاہوں کے سامنے۔''

قرآن پڑھنے والوں میں کون نہیں جانتا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی، جس کی خواہ اس زمانے میں کوئی اہمیت نہ رہی ہو۔ لیکن جس عہد میں اس جدید اکتشاف وایجاد کو حضرت نوح علیہ السلام نے دنیا میں پیش کیا تھا، یقیناً اس وقت وہ اسی قسم کی عجیب و غریب چیز تھی، جیسے ہم اس زمانے کی جدید ایجادوں کو حیرت وتعجب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا اس کشتی کی ایجاد کے متعلق قرآن نے دہرا دہرا کر یہ نہیں بیان کیا ہے کہ

﴿فَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ (المومنون:۲۷)

* خاکسار نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جن ایجادی اکتشافات کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں کسی انقلابی عہد کا ان سے آغاز ہوا، اگر سوچا جائے تو ان انقلابی ایجادوں کی فہرست میں شاید نوح پیغمبر علیہ السلام کی اس ایجاد کو بھی امتیازی مقام عطا کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو حضرت نوح علیہ السلام کی اس کشتی کے متعلق یہی خیال کرنے کی ہے کہ کشتی کے لفظ سے اردو میں جو مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً حضرت نوح کی اس صنعتی ایجاد کی حیثیت اس سے مختلف تھی۔ اتنا تو قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوہ آسا موجوں کو چیرتی پھاڑتی یہ کشتی آگے بڑھتی چلی جاتی تھی قرآنی الفاظ ہیں وھی تجری بھم فی موج کالجبال (کشتی بہہ رہی تھی، کشتی والوں کو لئے ہوئے ایسے تھپیڑوں میں جو پہاڑ جیسے تھے) اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کشتی جس کا اردو ترجمہ ناؤ کیا جاتا ہے۔ کیا اس قسم کے تھپیڑوں کو وہ برداشت کرسکتی ہے؟ پھر قرآن سے بھی جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے چرند، دوند، پرند وغیرہ کے ایک ایک جوڑے اس میں رکھے گئے تھے۔ اس سے اس کی وسعت وگنجائش کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، اور بائبل میں جو تفصیلات اس کشتی کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ ان کے بعد تو اس کو ناؤ یا کشتی کہنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہوسکتی تورات کتاب پیدائش میں ہے۔ ''تو اپنے واسطے گوپھر (ساگوان) کی لکڑی کی ایک کشتی بنا، اس کشتی میں کوٹھریاں تیار کر اور اس کے بعد اندر پر ال لگا، اور اس کو ایسی بنا کہ اس کی لمبائی تین سو ہاتھ اور اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی اونچائی تیس ہاتھ کی ہو، اور اس کشتی میں ایک روشن دان بنا۔ اسے اوپر سے ہاتھ چھوڑ کر تمام کر، اور کشتی کے ایک طرف دروازہ بنا اور نیچے کا طبقہ، اور دوسرا، تیسرا بھی بنا، پیدائش باب ۱۰۰۷''۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی شک کرسکتا ہے کہ جہاز سازی کی صنعت حضرت نوح کے ہزاروں سال بعد ایک بال بھی ترقی نہ کرسکی؟ البتہ اسٹیم اور برق کے عہد میں بلاشبہ ترقی کی دوسری منزلیں اس صنعت نے طے کی ہیں۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ حضرت نوح کی یہ صنعتی ایجاد ایک ایسی ایجاد تھی جن کے بعد نسل انسانی انقلاب کے ایک جدید دور میں داخل ہوئی، یعنی آج جو دنیا کے مختلف اقالیم اور خطوں میں انسان آباد ہیں۔ اور ہر جگہ تمدن وعمران کا تلاطم برپا ہوا: یقیناً اس کا امکان اس ایجاد کے بعد پیدا ہوا ورنہ خونخوار مفسدوں اور، ذخار دریاؤں کو پھاند پھاند کر بنی آدم کے حکمرانوں کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم کی طرف منتقل ہونے کی اس سے پہلے صورت ہی کیا تھی۔ شناوری کے زور سے کوئی ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف جانا بھی چاہتا تو ہفتوں بلکہ مہینوں پانی میں تیرتے رہنا کیا آسان تھا۔ اور کسی زمانے میں مان لیا جائے کہ لوگوں میں اس کی قوت بھی ہوگی۔ جب بھی اس ذریعہ سے افراد ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوسکتے تھے۔ لیکن اہل وعیال ساز وسامان کے ساتھ خاندانوں کے منتقل ہونے کو سچ پوچھئے تو اسی نوحی ایجاد نے ممکن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں بھی بنی آدم آباد ہیں۔ کسی نہ کسی شکل میں نوح کی اس ایجاد کا تذکرہ ان میں پایا جاتا ہے *۔[۱]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۳۰۔۳۱

آیت : ﴿اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (المومنون:۶۸)

''کیا بات کو وہ سوچتے نہیں یا ان کے پاس کوئی ایسی بات آئی ہے جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہ آئی تھی۔''

''اسلام'' کو پیش کرتے ہوئے قرآن میں اس مذکورہ بالا سوال کو اٹھا کر اس کے جواب کو اجمالی رنگ میں کبھی با یں الفاظ:

﴿اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى﴾ (الاعلیٰ:۱۸)

''قطعاً یہ (جو قرآن میں بیان کیا گیا) پہلے صحیفوں میں بھی بلاشبہ یہی تھا۔''

ہم قرآن میں پاتے ہیں، اس مقصد کو کہیں:

﴿اِنَّهٗ لَفِىْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (الشعراء:۱۹۶)

''اور (یہی باتیں) اگلوں کی کتابوں میں تھیں۔''

اسی اجمال کی گونہ تفصیل کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى﴾ (الشوریٰ:۱۳)

''تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جاتا ہے جس کی وصیت خدا نے نوح کو کی تھی اور اسی کی وحی ہم نے تم پر بھی اور اسی کی وصیت ہم نے ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ کو بھی کی تھی۔''

گویا رسالت ونبوات کی پہلی مشہور تاریخی شخصیت حضرت نوح علیہ السلام اور نزول قرآن سے پہلے اسی سلسلے کی آخری ہستی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جو کچھ اگلوں کو دیا گیا تھا وہی پچھلوں تک پہنچایا جاتا رہا۔ اسی طرح سورۃ الاعراف میں اسی راہ کے چند ممتاز مشہور بزرگوں کے اسمائے گرامی یعنی:

۱۔ نوح، ۲۔ ابراہیم، ۳۔ اسحاق، ۴۔ یعقوب، ۵۔ داؤد، ۶۔ سلیمان، ۷۔ ایوب، ۸۔ یوسف، ۹۔ موسیٰ، ۱۰۔ ہارون، ۱۱۔ زکریا، ۱۲۔ یحییٰ، ۱۳۔ عیسیٰ، ۱۴۔ الیاس، ۱۵۔ الیسع، ۱۶۔ یونس، ۱۷۔ لوط علیہم السلام کے ذکر کے بعد،

﴿وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ﴾ (الانعام:۸۷)

''اور ان ہی کے باپ دادوں میں جو تھے اور ان کی اولاد میں جو تھے اور ان کے بھائی۔''

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں بظاہر ان سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس راہ کی ساری برگزیدہ ہستیاں جن میں نسلی تعلق ہو یا نسلی نہیں، بلکہ صرف نبوت کی اخوت کا رشتہ قایم ہو، اِخْوَانِهِمْ (ان کے بھائیوں) کے الفاظ سے جن کی تعبیر کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سارے نمایندے اور اس کے پیغام کو بندوں تک پہنچانے والے خواہ ایک نسل اور قوم سے ہوں یا مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہوں سب ہی کے متعلق:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾ (الانعام:۹۰)

''یہی وہ لوگ ہیں جن کی رہنمائی اللہ نے کی۔''

کی خبر دینے کے بعد قرآن پر ایمان لانے والوں سے:

﴿ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ (الانعام:۹۰)

''پس چاہیے کہ جن باتوں کی ہدایت ان کو کی گئی تھی ان ہی کی پیروی تم بھی کرو۔''

کا مطالبہ کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ ''الاسلام'' کو قبول کرتے ہوئے ہر مسلمان کو یہ بھی ماننا پڑے گا، اور اس پر ہی بیعت کرنی ہوگی کہ:

﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَاۤ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴾ (البقرہ : ۱۳۶)

''مانا ہم نے اللہ کو اور ان چیزوں کو جو ہم پر اتاری گئیں اور اترا ابراہیم پر، اسماعیل، پر اسحاق پر، یعقوب پر اور اسباط (اسرائیلی پیغمبر) پر، جو کچھ کہ دیا گیا موسیٰ کو اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے (سب پر ہم ایمان لائے) اور ان میں سے کسی کو کسی سے ہم جدا نہیں کرتے اور ہم سب (خالق کائنات) ہی کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔''

بیعت کے اس کلمے میں آپ دیکھ رہے ہیں، نام بہ نام چند خاص بزرگوں کے ذکر کے بعد اقرار لیا جاتا تھا کہ ''النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ'' یعنی جہاں کہیں جس زمانے میں بھی اپنے رب کی طرف سے نبی اور پیغمبر بنا کر بھیجے گئے، خواہ ان کے نام معلوم ہوں یا نہ ہوں، لیکن اجمالاً سب ہی پر ایمان لاتا ہوں، ان پر بھی ایمان لاتا ہوں اور جو کچھ اللہ کے پاس سے وہ لائے، اس کو بھی مانتا ہوں اس لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہ سمجھوں گا۔

اور یہ چند آیتیں تو گویا بطور مثال کے یہاں پیش کر دی گئی ہیں، ورنہ چاہا جائے تو ایسی قرآنی آیتوں کا کافی ذخیرہ آپ کے سامنے لا کر رکھ دیا جا سکتا ہے، جس کا قدر مشترک یہی ہے کہ انسانی زندگی کا یہ قدرتی دستور، جس کا نام ''الاسلام'' یا ''اسلامیت'' ہے۔ سارے بنی آدم کا دوامی دستور ہے۔ خالق کائنات کے پاس سے ہر زمانے میں اسی کی پابندی کا مطالبہ ہر اس شخص سے کیا گیا ہے جو آدمی بن کر زمین کے اس کرّے پر پیدا ہوا۔ خواہ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو، کسی نسل اور قوم سے اس کا تعلق ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ خود آیت قرآنی:

﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ (آل عمران:۱۹)

''قطعاً دین اللہ کے پاس وہ الاسلام ہی ہے۔''

میں بھی کوئی ایسا لفظ یا اشارہ نہیں پایا جاتا جس کی بنیاد پر خواہ مخواہ بلا وجہ یہ باور کر لیا جائے کہ قرآن کا یہ ''اطلاقی اعلان'' کسی خاص زمانے تک محدود ہے اور اس سے پہلے خدا کے پاس سے زندگی کے کسی ایسے دستور کی پابندی کا مطالبہ بھی پیش ہوتا رہا ہو جو ''الاسلام'' سے مختلف تھا۔ آپ کے سامنے رہبانیت اور نظریہ اشتراک والی مادیت کے مصنوعی طریقوں کے مقابلے میں انسانی زندگی کے اسی قدرتی دستور کو پیش کرتا ہوں جس کا قرآنی نام ''الاسلام'' ہے اور قرآن ہی کی رو سے اسی کی پابندی کا مطالبہ ہر زمانے میں آدم کی اولاد سے خدا کے پاس سے پیش ہوتا رہا۔

قرآن ہی کی بنیاد پر ہر پڑھنے والے کو یہ سمجھنا چاہیے اور اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے میں اسلام کو پیش کروں گا کہ

اسی قدرتی دستور کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مطالبہ خدا کے پاس سے چین والوں سے بھی کیا گیا تھا اور ان سے بھی جو جاپان کے جزیروں میں رہتے تھے، اسی کے مکلف اپنے پیدا کرنے والے کی طرف سے وہ بھی ٹھہرائے گئے تھے، جو ایران میں یا ہندوستان میں، عرب میں یا مصر میں پیدا ہوئے تھے۔ الغرض ایشیا ہو یا افریقہ، یورپ ہو یا امریکہ، کسی ملک کے رہنے والے ہوں۔ سامی نسل سے تعلق رکھتے ہوں یا آریائی گوت سے، تورانی ہوں یا سلاف اور ٹیوٹانی، خواہ جزائر کے باشندے ہوں یا براعظم میں ان کا وطن ہو، کوئی بھی ہوں کہیں کے بھی ہوں، کسی زمانے میں پیدا ہوئے ہوں، قرآن کے واضح بیانات اور محکم آیات ہی کا اقتضاء ہے کہ اصولاً سب ہی کے آگے ''الاسلام'' ہی کی پابندی کا مطالبہ ان کے خالق کے پاس سے پیش کرنے والے پیش کرتے رہے۔ ممکن ہے کہ نام زندگی کے اس ''نظام'' کا ''الاسلام'' نہ ہو۔ اور ممکن کیا بظاہر عام حالات کے لحاظ سے شاید ممکن نہ تھا۔ لیکن ''نام'' نہ سہی ''کام'' جو ان سے چاہا گیا، وہ تو یقیناً ''الاسلام'' ہی تھا اور اسی کو ہونا بھی چاہیے تھا۔ آخر نزول قرآن سے پہلے بھی تو زمین کے اس کرّے پر آدم ہی کی اولاد آباد تھی وہ بھیڑ بکری تو نہ تھے۔ [1]

بہر حال ارباب مذاہب و ادیان سے اس کے سوا مجھے اور کچھ کہنا نہیں ہے کہ جو قرآن ہی نے سکھایا ہے یعنی قرآن جس دینی زندگی کے نظام کو تم پر پیش کر رہا ہے، یہ وہی طریقہ ہے جس کی وصیت خدا نے نوحؑ کو کی تھی، ابراہیم و موسیٰ کو بھی اسی کی وصیت کی گئی تھی، یعنی وہی سورۃ الشوریٰ والی آیت ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ .... ﴾ اسی سلسلے میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ الہامی کتابیں وراثۃً جن لوگوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہیں، وہ اپنی کتابوں کے متعلق شک میں مبتلا ہو کر دبدھے میں پڑ گئے ہیں۔ آخر میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ:

> ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (الشوریٰ:۱۵)
>
> ''پس ان ہی وجوہ سے (یعنی اول سے آخر تک دین ایک ہی تھا مگر لوگ شک میں مبتلا ہوئے اس لیے اسی پرانے دین کی طرف تم پھر لوگوں کو) پکارو اور خود بھی اس پر ڈٹ جاؤ جیسے تمہیں حکم دیا گیا اور مت پیروی کرو لوگوں کی اپنی من مانی خواہشوں کی اور مصنوعی خود ساختہ طریقوں کی اور کہو کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہم نے تو صرف اسی کو مانا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگوں (یعنی دینی قوموں) کے درمیان میں فیصلہ کروں (یعنی حق کو ناحق سے جدا کر کے بتا دوں''۔

دنیا کے عام مروجہ مذاہب و ادیان کے درمیان قرآن کا یہی ''طبعی موقف'' اور ''قدرتی مقام'' ہے۔ آیت کو ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ مروجہ مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کو خطاب کرتے ہوئے یہی کہا کرو کہ:

> ﴿اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ:۱۵)

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۲۸۷-۲۹۰

"اللہ ہی ہمارا پروردگار ہے اور تمہارا پروردگار بھی وہی ہے۔ ہمارے لیے ہمارے کام اور تمہارے لیے تمہارے کام، کوئی جھگڑا ہمارے تمہارے درمیان نہیں ہے۔ اللہ ہم سب کو (قدرتی دستور حیات) پر اکٹھا کر دے اور واپسی اسی اللہ کی طرف ہے۔"

یہی ہمیں سکھایا گیا ہے۔ چاہیے کہ عام مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کے مقابلے میں اسی قرآنی نقطہ ہائے نظر کو زندہ رکھا جائے اور میں تو ناامید نہیں ہوں کہ قرآن کی بتائی ہوئی دعا ہے:

﴿اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا﴾ (الشوریٰ:۱۵)

"ہم سب کو (جو دین کے ماننے والے ہیں، زندگی کے قدرتی دستور) پر اللہ جمع کر دے۔"

قبول نہ ہوگی، قرآن کے متعلق لوگ غلط فہمیوں کے شکار ہیں۔ ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو کر رہے گا۔ وہ کتاب پہچانی جائے گی، جو ہر قوم کو اس کے سچے آبائی دین اور دھرم تک پہنچانے کے لیے سب سے آخر میں قدرت کی طرف سے نسل انسانی کو سپرد کی گئی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ بجائے اپنے ذاتی خیالات و اظہار کے قرآن کو اسی رنگ میں قوموں کے آگے رکھا جائے جس رنگ میں اس نے خود اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۲۹۲۔۲۹۴

آیت : ﴿وَّمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (المومنون:۹۱)

''اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی مخلوق کو (یا ہر الٰہ اپنے مظاہر و آثار کو) لے بھاگتا اور بجائے آویزش و ترکیب کے ایک دوسرے پر چڑھ جاتے''۔

جب خیر کا وجود شر سے علاحدہ ہو کر نہیں پایا جاتا بلکہ استعمالی غلطی سے خیر ہی شر بن جاتا ہے تو ایک کے لیے دو خالق کی تلاش نہ صرف فضول بلکہ قطعاً غلط ہے۔ لہٰذا پارسیوں کے دو خداؤں میں سے بھی ایک اسی طرح فالتو ہو جاتا ہے جس طرح آریوں کا مادہ اور روح! ہاں اگر بجائے خیر و شر کے یہ کہا جائے۔ (اور غالباً ایرانی فلاسفہ کی یہی مراد بھی ہوگی) کہ نظام عالم کی بنیاد متضاد قوتوں پر بنی نظر آتی ہے۔ نیستی کے ساتھ ہستی اور حیات کے ساتھ موت لگی ہوئی ہے، حرارت کے ساتھ برودت اور رطوبت کے ساتھ یبوست علیٰ ہذا سکون کے ساتھ حرکت، اور ضعف کے ساتھ قوت کے مظاہرے یہاں ہر آن اور ہر لمحہ دیکھے جاتے ہیں، تو ان تماشوں کا کون انکار کر سکتا ہے؟ بلکہ سچ یہ ہے کہ مظاہر فطرت میں شاید ہی کوئی ایسی صفت ہوگی جس کی ضد یہاں موجود نہ ہو، لیکن کیا اس سے بجائے ایک کے دو کی ضرورت ثابت ہوتی ہے؟ تم اضداد کو دیکھتے ہو لیکن ان اضداد کی باہمی آویزشوں اور پیچیدہ پیوستگیوں سے آنکھیں کیوں بند کر لیتے ہو، غور تو کرو! بیچاری عقل جو دو ضدوں کے باہمی اجتماع کو سوچ بھی نہیں سکتی، اسی کی پیٹھ پر کائنات کی ان غیر محدود لا متناہی اضداد کی کثرتوں کے اجتماع کے بوجھ کو کیسے لادا جا سکتا ہے، جب تک کہ کسی شیراز وحدت کے ساتھ انہیں جکڑا نہ جائے؟ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔

﴿وَّمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (المومنون: ۹۱)

اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو ہستی کے جس نظام کی بنیاد انہیں اضداد پر قائم ہے کیا وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی قائم رہ سکتا تھا؟ رطوبت کے مظہر پانی کو حرارت کے مظہر آگ کو الغرض اس قسم کے اضداد کے مظاہر میں سے کسی ایک چیز کو نکال لو! تو کیا پھر یہ دنیا یہی دنیا رہ سکتی ہے؟ قرآن میں وحی کا اگر یہ تجربہ پیش کیا گیا ہے کہ

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (الانبیاء:۲۲)

''یعنی اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا کوئی معبود ہوتا تو یہ دونوں برباد ہو جاتے۔''

خود غور کرنا چاہیے کہ پیغمبروں کے اس مشاہدے[۱] کے سوا کیا عقل کچھ اور بھی سوچ سکتی یا مان سکتی ہے؟ بلا شبہ ہم سے وہی منوایا گیا جس کے سوا ہم کچھ مان ہی نہیں سکتے اور وہی سمجھایا گیا جس کے سوا ہم کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے، حقیقت یہ ہے کہ اضداد کے جس ایرانی فلسفہ کو پیغمبروں کے تجربہ توحید میں شک اندازی کے لیے پیش کیا گیا تھا کیسی عجیب بات ہے کہ یہی فلسفہ الٹ کر شرک کے گلے کا پھندا بن گیا اور لے دے کر توحید کے دشمنوں کے ہاتھ میں ایک حربہ تھا۔ آخر اضداد کا یہ مجموعہ جو باہم اتنی سختیوں کے ساتھ جکڑا ہوا ہے، موحد اگر اسے جکڑا ہوا مانتا ہے تو کیا بکھرا ہوا مانے؟ سچ کو جھوٹ نہیں بنایا جا سکتا اور بلا شبہ، وحی اور نبوت کے تجربات اور مشاہدات کا انکار بغیر اس کے ہو نہیں سکتا۔ قرآن نے سچ فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ﴾ (البقرہ:۱۳۰)

---

[۱] کتاب میں ''مشاہدے'' کی بجائے ''مشاہد'' لکھا ہے۔

''یعنی ابراہیم کی ملت'' دین اسلام'' اور دین فطرت سے وہی کترا سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو احمق وسفیہ بنا لیا ہو۔''

پارسیوں کو اپنی کتاب کا صحیح علم نہیں ہے ورنہ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ ان کو اپنی کتابوں میں بھی ملتا، زنداوستا میں زرتشترا کی طرف یہ عبارت منسوب کی گئی ہے۔

''نیک اندیشوں اور سچے خیال والوں کے نزدیک اہرمزدما، رب دو جہاں ہے، جو لوگ بتوں کے خیال میں منہمک رہتے ہیں اور مشرک ہیں یا جو وہ شرارت یا بدنفسی میں مبتلا رہتے ہیں، رذیل ہیں۔''

الحاصل حق سبحانہ تعالیٰ کا خود بخود موجود ہونا، ہمیشہ ہمیشہ سے ہونا، ایک ہونا نبوت کے یہ ایسے روشن تجربات ہیں جن کے اقرار پر یہ بھی مجبور ہیں جو بے دیکھے بے جانے خدا کا بلاوجہ انکار کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ان حدود تک مذہب اور لامذہبیت میں کوئی اختلاف نہیں، پیغمبروں سے جو باغی ہیں ان کو بھی یہی ماننا پڑتا ہے اور ایمان لانے والوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ [1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۸۱۔۸۳

آیت : ﴿وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ﴾ (المومنون:۱۱۷)

''اور خدا کے سوا جو دوسرے معبود کو پکارتا ہے اس کے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ہے۔''

آریوں نے مسلمانوں پر یہ الزام لگا کر کہ ''وہ نیستی سے ہستی کے پیدا ہونے کے قائل ہیں'' اپنا ایک خود تراشیدہ وہم یہ پیش کیا کہ ''عالم صرف خدا سے نہیں بلکہ مادہ سے بھی ظاہر ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس فطری یقین کو محفوظ رکھنے کے لیے کہ ''ہستی ہستی ہی سے پیدا ہوتی ہے'' خدا کی ہستی کیوں کافی نہ تھی جو مادہ کے وجود کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہستی کو ہستی ہی سے پیدا ہونا چاہیے، یہی پیغمبروں کا مشاہدہ بھی ہے کہ موجودہ نظام ہستی اس ہستی سے ظاہر ہوا ہے جس کا نام خدا ہے، پھر خدا کے پہلو میں کسی فالتو ہستی (مادہ یا روح) کے اضافہ کی کیا ضرورت ہے؟[1] قرآن پاک میں توحید کے جہاں اور دلائل بیان کیے گئے ہیں ان میں زیادہ زور اسی دلیل پر ہے کہ ہستی کی پیدائش کے لیے خدا یعنی ایک خود بخود ہستی کے ماننے کے لیے تو آدمی یقیناً مجبور ہے، لیکن اس ہستی کے سوا کسی اور خود بخود ہستی کی ضرورت کیوں بتائی جاتی ہے؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ کسی کے پاس کوئی دلیل، کوئی شہادت ہو تو پیش کرے:

﴿اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾ (الانعام:۱۹)

''یعنی پوچھیے! کیا تم مشرکین، اس کی شہادت دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ اے پیغمبر کہیے کہ میرے پاس اس کی شہادت نہیں ہے اور کہیے کہ وہ تو یکتا واحد معبود ہے اور بلاشبہ ہم ان سے قطعاً جدا ہیں، جنہیں تم اللہ کا ساتھی ٹھہراتے ہو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ (النجم:۲۳)

چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے تراش لیے ہیں۔ اللہ نے اس کے متعلق کوئی دلیل نہیں اتاری، یہ مشرکین صرف الکل پچو باتوں اور اپنی خواہش کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، حالاں کہ ان کے پروردگار کی رہنمائی ان کے سامنے آچکی ہے۔''

ایک اور جگہ مسلمانوں سے چیلنج دلایا گیا ہے کہ ان کے فالتو معبودوں کے متعلق ان مشرکین کے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کریں!

﴿هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ﴾ (الکھف:۱۵)

''یعنی ہماری قوم کے لوگوں نے اللہ کے سوا جو معبود بنا لیے ہیں کیوں نہیں وہ کھلی دلیل اس پر لاتے ہیں''۔

بہرحال اسی مسلک کی طرف قرآن نے اعلان کیا ہے:

﴿وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ﴾ (المومنون:۱۱۷)

---

[1] کتاب میں لفظ ''ضرورت'' کی بجائے ''ضروریات'' لکھا ہے۔

توحید کے متعلق قرآن اس ٹھوس مطالبہ سے بھرا ہوا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس مطالبہ کا نہ کوئی جواب کسی نے اب تک دیا ہے اور نہ کوئی دے سکتا ہے، صرف خیر و شر کی تقسیم سے مغالطہ کھا کر قدیم ایرانی فلاسفروں کے ایک گروہ نے یزدان کے ساتھ اہرمن کے وجود کے اضافہ کو عقل کا تقاضا ٹھہرانا چاہا ہے۔

لیکن پارسیوں سے اتنا اس وقت پوچھتے چلنا چاہیے کہ تمہاری مراد خیر و شر سے کیا ہے؟ اگر خیر سے نفع بخش اور شر سے ضرر رساں چیزیں مراد ہیں تو کیا اس قسم کے خیر کا وجود شر سے علاحدہ ہو کر پایا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو شاید شر کے لیے علاحدہ خالق کی تلاش ممکن بھی تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس آگ سے ہمارے گھر جلتے ہیں اسی سے کھانا بھی پکتا ہے، اور جس پانی سے اناج پیدا ہوتا ہے اسی سے طوفانی مصائب بھی آتے ہیں اور علیٰ ہذا جس آفتاب کے نور و حرارت سے روشنی ملتی، توانائی پیدا ہوتی اور کھیتی پکتی ہے اسی کی حرارت سے کھیتیاں جھلس بھی جاتی ہیں۔

الحاصل ایک ہی چیز کے صحیح استعمال سے نفع بھی ہوتا ہے اور استعمالی غلطی سے وہی چیز شر بھی بن جاتی ہے۔

جب خیر کا وجود شر سے علاحدہ ہو کر نہیں پایا جاتا ہے بلکہ استعمال غلطی سے خیر ہی شر بن جاتا ہے تو ایک کے لئے دو خالق کی تلاش نہ صرف فضول بلکہ قطعاً غلط ہے۔[1]

---

[1] سید مناظر احسن گیلانی، الدین القیم، ص۷۹۔۸۱

﴿النور﴾

آیت : اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور:۳۵)

''اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا''۔

جس شخص کی پہلی یافت ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' کی ہو اور جو اس حقیقت کو سمجھ چکا ہو کہ اس عالم میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اصلانہ تھی، بلکہ یہاں ساری ''نمود'' ''بود'' ہی کی ہے اور اس عالم میں جہاں کہیں جو کمال جو صفت جس شان جس شکل میں بھی نظر آتی ہے وہ اس کا ذاتی کمال یا صفت نہیں بلکہ سب رب العالمین کے شؤن وصفات، کمالات وحسنات کی مختلف شانیں ہیں، جو مختلف مدارج کے لحاظ سے مختلف پیمانوں پر نمایاں ہو رہی ہیں، پس جس نے اس حقیقت کو پالیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ عالم کی پیدائش کے لیے عالم کے جاننے کی ضرورت نہیں بلکہ حق تعالیٰ کو اپنی ذات وصفات کا جاننا اور ان کا علم بس کافی ووافی ہے کہ یہی کمالات وشؤن وصفات دراصل عالم کی حقیقتیں ہیں۔ الغرض ظاہر ہے کہ ازل میں خدا تھا اور خدا کے ساتھ اس کے لامحدود کمالات و صفات تھے، وہ ان تمام چیزوں (ذات وصفات) کا عالم تھا پس اس نے اپنی جن صفات کو جس پیمانے پر جن دوسرے صفات کے ساتھ جس ترتیب کے ساتھ تصور کیا اور جب اور جس وقت چاہا اس تصور کو کن فیکونی قوت سے خلق اور آفرینش کا رنگ دے کر ظاہر فرمایا، تو اس کے لیے خدا کا خود اپنی ذات وصفات کا علم یقیناً کافی ہے گویا بقول عراقی باہر سے نہیں بلکہ پیدائش عالم کے لیے:

نخستیں باده اندر جام کردند
زچشم مست ساقی دام کردند

یعنی خود ساقی کی چشم مست سے دام وقرض لیا گیا۔ قرآن نے اسی مسئلہ کی طرف سورۃ النور کی مذکورہ بالا مشہور آیت میں اشارہ کیا ہے۔

نیز مشہور حدیث ہے:

کنت کنزاً مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق

''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ جانا جاؤں، تو پیدا کیا میں نے مخلوقات کو''۔

مطلب یہ ہے کہ اسماء حسنیٰ جس قدوس اور سبوح کے ساتھ مخصوص ہیں اور جس کے کمالات یا کلمات کے لکھنے کے لیے نہ سمندر کا پانی اور نہ دنیا کے درخت کافی ہو سکتے ہیں، اور جس کے متعلق خود سرور کائنات ﷺ کا ارشاد ہوا۔

لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک[۱]

''تیری خوبیوں کو میں تو گن نہیں سکتا، بس تو ایسا ہے جیسا کہ تو نے خود اپنے متعلق فرمایا''۔

پس اسی حی وقیوم نے اپنے غیر محدود اسماء اور بے شمار صفات کو جب اپنا غیر فرض کیا تو اسی کا نام عالم ہو گیا، اگرچہ حق تعالیٰ مثل سے پاک ہے لیکن صرف سمجھنے کے لیے یہ مثال دی جاسکتی ہے کہ جس طرح کبھی کبھی شاعر اپنے بینائی کو نرگس میں، گویائی کو سوسن میں، شنوائی کو غنچہ میں، حسرت ودرد کو لالہ میں، اپنے استقلال کو ساحل میں اور بے چینی کو دریا میں فرض کرتا ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تنہائی میں خود اپنی ذات کو اپنا غیر اعتبار کر کے گھنٹوں اس سے سوال وجواب بھی کیا کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اپنی ذات و

[۱] السجستانی، ابی داؤد سلیمان بن الاشعث، سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الدعاء فی الرکوع والسجود [۸۷۹] ص ۱۳۶، دار السلام للنشر والتوزیع الریاض، الطبعۃ الاولیٰ، محرم ۱۴۲۰ھ/اپریل ۱۹۹۹ء

صفات کے متعلق اس عمل کے کرنے سے ہماری ذات یا صفت میں کوئی عیب یا نقص نہیں پیدا ہو جاتا، مثلاً اگر ہم کسی میں اپنے صفت بینائی فرض کریں تو اس فرض کی وجہ سے میری بینائی میں تو کوئی کمی پیدا نہیں ہو جاتی، پھر اگر غیر محدود اسماؤ شیون، صفات و کمالات والے نے مختلف مدارج کے لحاظ سے ان کو اپنا غیر فرض کیا تو اس سے ذات حق کی طرف کیا نقص عائد ہوتا ہے یا اس میں کیا کمی پیدا ہوتی ہے، البتہ فرق ضرور ہے کہ ہماری ارادی قوت اور کن فیکونی طاقت چوں کہ کمزور ہوتی ہے، اس لیے ہمارے مفروضات صرف مفروضات بن کر رہ جاتے ہیں اور ان سے واقعی آثار کا ظہور نہیں ہوتا، مثلاً آگ کو اپنے ذہن میں پیدا کر لیتے ہیں لیکن اس سے سوزش اور روشنی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے بخلاف حق تعالیٰ کے کہ اپنی جس صفت جس کمال کے جس درجہ کو جس جگہ جس مقدار میں فرض فرماتے ہیں اسی حد تک ان کا یہ فرض خلق اور آفرینش بن جاتا ہے، مثلاً جس میں اپنی صفت حیات جس مقدار میں فرض کرتے ہیں وہ اسی حد تک زندہ ہو جاتی ہے، اور جس میں علم فرض کرتے ہیں اس میں علم پیدا ہو جاتا ہے الیٰ غیر ذالک بہر حال ان کے مفروضات، مخلوقات بن جاتے ہیں اور ان سے واقعی آثار کا ظہور ہونے لگتا ہے۔[1]

---

[1] سید مناظر احسن گیلانیؒ، الدین القیم، ص ۱۱۳۔۱۱۴

﴿النمل﴾

آیت: ﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ﴾ (النمل:۱۴)

''انہوں نے اس کا انکار کیا حالاں کہ ان کا جی مان چکا تھا۔ انکار صرف ظلم اور سرکشی کی وجہ سے کر رہے ہیں''۔

اس آیت کریمہ میں انسانی نفس کی اسی باغیانہ کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جن خصوصیات، شکل وصورت، اندرونی وبیرونی صفات وحالات کی بنا پر مثلاً ہم اپنے کو یا اپنے ملنے والوں کو آدمی سمجھتے ہیں، پھر ان ہی خصوصیات کے ساتھ جب کوئی اجنبی آدمی ہمارے سامنے آئے تو کیا صرف اس لیے کہ اب تک ہم نے اس کو نہیں دیکھا تھا یا ہم نے ہمارے باپ دادوں نے اس اجنبی کو چوں کہ آدمی نہیں مانا تھا، اس لیے اس کے آدمی ہونے میں شک کر سکتے ہیں؟ جو اس میں بھی شک اندازی کرے گا، ظاہر ہے کہ قصداً شرارت یا کسی اور غرض سے ایسا کر سکتا ہے۔ یعنی آدمی یقین کرتے ہوئے محض کسی وقتی مصلحت یا طبعی شرارت کی وجہ سے زبان سے اس کے آدمی ہونے کا انکار کرے گا۔

قوموں نے جن خصوصیات وعلامات کی بنا پر اپنے جن پیشواؤں کو خدا کی مرضی کا نمائندہ مان رکھا ہے، ظاہر ہے کہ جب انہی بلکہ ان سے بہتر کمالات وخصوصیات کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے انہی نمائندوں میں سے ایک نمائندہ اور ان ہی رسولوں میں سے ایک رسول قرار دیا، تو جنہیں آپ کی رسالت میں اب تک شک ہے کیا ان کا حال اس شخص کا سا نہیں ہے، جو ایک شخص میں تمام انسانی خصوصیات کو دیکھ رہا ہے، لیکن باوجود اس کے اس کے آدمی ہونے میں شک کر رہا ہے۔ صرف اسی لیے شک کر رہا ہے کہ شک ہی کا قطعی ارادہ پہلے سے وہ طے کیے ہوئے ہے۔

اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر دنیا کے تمام مذہبی اور دینی وثیقوں پر وہ حادثہ نہ بھی پیش آتا، جس کی وجہ سے کسی پیغمبر کا پیغام یا کسی قوم کا آسمانی دستور اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہا ہے، جس کا دوسروں ہی کو نہیں خود ان پیغمبروں کے ماننے والوں اور ان مذاہب کی پیروی کرنے والے کو بھی اعتراف ہے۔ بہر حال اگر یہ صورت نہ بھی پیش آتی جب بھی قوموں نے جن بنیادوں پر اپنے رسولوں اور پیغمبروں کو خدا کا نمائندہ اور خدا کی مرضی کا ظاہر کرنے والا مانا ہے، جب وہ ساری باتیں بالوجہ الاتم محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات والا صفات میں پائی جا رہی ہیں تو پھر آپ کی اور آپ کے دعوے کی تکذیب کی عقلاً وفطرۃً کسی کے پاس کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ قرآن میں آں حضرت ﷺ کی نبوت کی دلیلوں میں اس دلیل کا ذکر بھی۔

﴿مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ (سورۃ الحقاف:۹)

''نہیں ہوں میں رسولوں میں کوئی انوکھا۔''

وغیرہ جیسی آیتوں میں کیا گیا ہے۔

کچھ نہیں تو کم از کم آج مسلمانوں کو جو یہ مجبوری پیش آ رہی ہے کہ آں حضرت ﷺ کی نبوت کے بعد کسی قسم کی نبوت کے دعوے کو تسلیم کرنے میں علاوہ اس واقعی وجہ کے کہ کیوں ایک فالتو نبی کی بغیر کسی ضرورت کے خواہ مخواہ ضرورت محسوس کی جائے، بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس نبوت کی تصدیق ایک دوسری نبوت صادقہ مبینہ مسلمہ یعنی آں حضرت ﷺ کی نبوت کی تکذیب بن جاتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ من جملہ اور خصوصیتوں کے آں حضرت ﷺ نے اپنی نبوت کی ایک بڑی خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ آخری نبوت ہے اور آپ کے بعد پھر کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ بھی کیا جائے گا، اس کی تصدیق آں حضرت ﷺ کے دعویٰ ختم نبوت کی تکذیب ہوگی۔

لیکن حضورﷺ کی نبوت کے ماننے میں دنیا کی قوموں کے لیے اس قسم کی بھی تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اس لیے کہ آں حضرتﷺ کے سوا ان تمام ادیان و مذاہب کے پیش کرنے والوں نے جن کی طرف آج دنیا کے مذاہب منسوب ہیں، ان میں سے کسی نے بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ میری نبوت آخری نبوت ہے، بلکہ اس باب میں تو معاملہ بالعکس ہے، یعنی جن بچی کچھی صورتوں میں آج دنیا کی مذہبی یادداشتیں پائی جاتی ہیں تقریباً سب ہی میں کسی نہ کسی طرح اس کا سراغ ملتا ہے کہ ''آنے والے نبی'' کی اپنی اپنی امتوں کو انہوں نے بشارت سنائی تھی، اور خود قرآن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف تورات و انجیل والے بلکہ ان کے سوا بھی خدا نے اپنے تمام پیغمبروں سے آں حضرتﷺ کا نام ہی ''میثاق کا نبی'' بتایا ہے۔ خیر یہ ایک مستقل جداگانہ بحث ہے۔ مجھے تو یہاں کہنا یہ تھا کہ مذہب کے اس حادثے کی وجہ سے کہ ان کے اساسی وثائق کے مشتبہ اور مشکوک ہونے کی وجہ سے آں حضرتﷺ کی رسالت پر ایمان جہاں دنیا کی موجودہ نسلوں کے لیے ایک واقعاتی ناگزیر ضرورت ہوگئی ہے کہ پیغام محمدی کے سوا قطعی اور یقینی شکل میں مرضی حق کی یافت کی کوئی شکل کسی کے پاس اب باقی نہیں رہی ہے۔ یوں بھی آں حضرتﷺ کی نبوت کا دعویٰ بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہے جو اپنا ثبوت خود اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۱۶۹۔۱۷۱

﴿الروم﴾

آیت : ﴿فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الروم:۳۰)

''یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر آدمی کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ دینی دعوت سے فطرت کا بدلنا مقصود نہیں ہے یا اللہ کی پیدا کی ہوئی خلقت کو تبدیل کرنا نہیں ہے۔ یہی سیدھی، لازوال، محکم اور استوار راہ ہے لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔''

دنیا کا جو فطری مذہب ہے اس نے اپنا نام ہی ''دین فطرت'' رکھا ہے اور وہ ہمیشہ اپنی تعلیمات کو پیش کرنے کے بعد عقل انسانی کو جگاتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ تمہاری عقل جس حد تک گہری اور بیدار ہوتی جائے گی، مذہبی امور کے ماننے کی بھی صلاحیت تم میں بڑھتی جائے گی۔ جیسا کہ میں نے کہا اس نے اپنا نام ہی دین الفطرت قرار دیا ہے اور اپنا فرض ہی یہ ٹھہرایا ہے کہ جو لوگ اپنی فطرت کے نقطے سے ہٹ کر غیر فطری زندگی بسر کر رہے ہیں، یا غیر فطری احساسات اور معلومات میں الجھ کر پریشان ہو رہے ہیں۔ ان کو فطری نقطہ تک لایا جائے یہی اس کا حقیقی کام ہے۔

مذہب حق کی صداقت کا ایک بڑا نشان یہی ہے کہ اس کی تعلیمات کے ماننے کی انسانی فطرت میں گنجائش تلاش کرنی چاہیے، نہ کہ جاننے کی، اسی لیے پیغمبروں نے ہمیشہ ایمان ''یعنی ماننے'' کا مطالبہ لوگوں سے کیا، مغالطہ یہ ہوا کہ پیغمبروں نے ہم سے جن چیزوں کے ماننے کا مطالبہ کیا تھا، نادانوں نے سمجھا کہ وہ ہم سے براہ راست ان کے جاننے اور محسوس کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں پیغمبر کہتے ہیں کہ ان چیزوں کو مانو لیکن احمقوں نے کیا کہا کہ ہم ان چیز کو نہیں جانتے ہیں۔ ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم کسی سے پھول سونگھنے کا مطالبہ کریں تو اس کے جواب میں کہے کہ ہم پھول کی خوشبو کو کان سے سن نہیں سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں مذہب کے غیبی حقائق الملائکہ، الجنت، النار، القبر، البرزخ وغیرہ وغیرہ کے متعلق جو مباحث چھڑے ہوئے ہیں، بادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ جاننے اور ماننے کے عدم امتیاز ہی پر اس کی بنیاد زیادہ قائم ہے۔ پیغمبر کہتے ہیں کہ ان امور کو مانو اور انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کو جان نہیں رہے ہیں۔

مجھے دنیا کے دوسرے مذاہب سے اس وقت بحث نہیں ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے وحی کے ذریعہ سے جو معلومات انسانی بستیوں میں تقسیم فرمائی ہیں اور جو چیزیں ہم تک پہنچائی ہیں اس کا ایک ایک جز ایک ایک مسئلہ صداقت کے اس معیار پر کھرا ہو کر اترتا ہے، اتر سکتا ہے، اتر چکا ہے۔ علمائے اسلام نے اس کے لیے ایک خاص علم بنایا ہے، جس کا نام ''علم الکلام'' ہے اس فن میں یہی کیا جاتا ہے کہ اسلام کے اصولی مسائل میں سے ایک ایک مسئلہ کو لے کر دکھایا جاتا ہے کہ اس کے ماننے کے لیے انسانی عقل، ہمارے فطری فرائض، اندرونی احساسات اور اصول فطرت کس حد تک ہم آہنگ ہیں۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۶۲۔۶۳

﴿الفاطر﴾

آیت : ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ (فاطر:۶)

''قطعاً شیطان تمہارا دشمن ہے۔ تو تم بھی اس کو دشمن بناؤ''۔

اللہ اکبر ایک مذہبی اور اعلیٰ اخلاقی کتاب میں 'عداوت' جیسے رذیلہ کے اقتضاء کی تکمیل کا مطالبہ امر کے الفاظ میں کیا جارہا ہے، ''دشمنی کرو'' نیکی کے مبلغ مذہب کے منہ پر یہ بات کیسی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس کی طرف عداوت اور دشمنی کے رُخ کو پھیر کر یہ حکم دیا گیا ہے۔ جب آدمی اس پر غور کرتا ہے تو نظر آتا ہے کہ بلاشبہ اس مصیبت سے جس کا نام ''الشیطان'' ہے۔ انسانیت نجات پا نہیں سکتی تھی۔ اگر عداوت کے اس جذبہ کا تخم آدمی کی فطرت میں نہ بودیا جاتا، بلکہ ایک طرف اگر عداوت کے اس جذبہ کی قیمت اس کے صحیح استعمال سے واضح ہوتی ہے تو دوسری طرف تمام برائیوں کے آخری سرچشمہ یعنی وہی ''الشیطان'' کے وجود کی قیمت بھی اسی سے خود بخود ہمارے سامنے آجاتی ہے، معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لئے قدرت نے آدم کی اولاد کو درحقیقت ''الشیطان'' کی شکل میں ارتقاء کا ایک زینہ عطا فرمایا ہے کہ اسی کی ٹکر آدمی کو ہر تحتانی درجہ سے اٹھا کر فوقانی مراتب پر پہنچاتی چلی جارہی ہے۔ آپ دیوار سے ٹکراتے ہیں۔ تو زمین پر گرتے ہیں۔ لیکن ''الشیطان'' سے جو ٹکراتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ براہ راست وہ رحمت حق کی آغوش میں گرتا ہے، اور یہی ''الشیطان'' کا اسلام میں صحیح استعمال ہے، اب بجائے ٹکرانے کے جو ''الشیطان'' سے بغل گیری میں مشغول ہو جائے اور اس کی یہی مشغولیت اس کے لئے وبال جان بنتی چلی جائے تو آپ ہی بتایئے کہ ''الشیطان'' کو غلط طور پر استعمال کرنے والوں کا یہ قصور ہے یا الشیطان کے پیدا کرنے والے پر اس کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اسلام کے مشہور شیرازی حکیم نے امالہ کی اسی عجیب وغریب اسلامی قانون کی تلخیص اپنے ان دو مصرعوں میں کتنی بلاغت سے کی ہے۔ فرماتے ہیں

ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن　　نہ گفتم کہ دیوار مسجد بہ کن (سعدیؒ)

دینے والے بے بیشک آپ کو تیشہ دیا تھا، اور اس لئے دیا تھا کہ اپنی ضرورت کے لئے اس سے لکڑی پھاڑنا، لیکن بجائے لکڑی کے مسجد کی دیوار جو اس تیشہ سے آپ کھودنے لگے۔ تو اس الزام کا ملزم کیا تیشہ دینے والے کو ٹھہرایا جاسکتا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۲۷۔۱۲۸

آیت : ﴿بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (الفاطر:۴۰)

''بلکہ (نظریہ شرک کے متعلق واتفاقی) حدود سے چلنے والے باہم ایک دوسرے کو نہیں امید وار ٹھیرا رہے ہیں مگر صرف فریب کا۔''

رہبانیت کے بالکل برعکس جینے کا وہ طریقہ جس میں ان مخلوقات کو جو خود اپنے اندر اپنا کچھ نہیں رکھتے، ان کو تو سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے اور خالق جس کا سب کچھ ہے اسی سے کتراتے ہوئے اور زندگی کے سارے کاروبار میں عملاً اسی کو کچھ ایسے طریقے سے نظر انداز کرتے چلے جانا کہ گویا ''وہ کچھ نہیں'' بن کر رہ گیا ہے۔ جو قدیم ہو یا جدید مشرکانہ ذہنیت کی مشترکہ خصوصیت ہے۔ اسی کے متعلق قرآن میں پوچھا گیا ہے:

﴿ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ یَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ یُشْرِكُوْنَ ﴾ (الروم : ۳۵)

''کیا ان پر ہم نے کوئی سلطان (دلیل) نازل کیا ہے، وہی دلیل بولتی ہے ان چیزوں کو جنہیں وہ اس (خالق) کا شریک ٹھہراتے ہیں۔''

یا اس کے قریب قریب

﴿ اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْهُ﴾ (فاطر : ۴۰)

''کیا ہم نے ان کو کوئی نوشتہ دیا ہے؟ اسی لیے اپنے آپ کو کھلی دلیل کی روشنی میں پاتے ہیں۔''

وغیرہ سوالات کے ساتھ ان ہی ''مخلوقات'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جنہیں مشرکانہ زندگی میں سب کچھ ٹھہرایا جاتا ہے، اس قسم کے مطالبات مختلف پیرایوں میں بکثرت کیے گئے ہیں۔ مثلاً

﴿اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴾(الاحقاف : ۴)

''دکھاؤ مجھے! ان چیزوں نے (جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو، انہوں نے) زمین کی کسی چیز کو پیدا کیا یا ان کا ساجھا آسمانوں میں ہے؟ لاؤ کوئی نوشتہ جو پہلے نازل ہوا ہو یا علم جو چلا آتا ہو ان کے ہاں اگر تم سچے ہو۔''

یا ان ہی سے دریافت کرتے ہوئے پوچھا گیا ہے کہ:

﴿ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا﴾ (الانعام : ۱۴۸)

''کہو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے؟ تو نکالو اس علم کو ہماری آگاہی کے لیے۔''

اس نوعیت کی تحدیوں یا چیلنج پر چیلنج کے بعد خود ان کو بھی جنہیں اس مشرکانہ نقطہ نظر کے مطابق زندگی بسر کرنے پر اصرار ہے، قرآن اس قسم کے الفاظ سے چونکاتا چلا گیا ہے کہ:

﴿ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ﴾(الانعام : ۱۴۸)

''نہیں پیچھے چل رہے ہو تم لوگ مگر صرف خیالی گمان کے اور نہیں تم لوگ مگر یہ کہ صرف الکل سے کام لے رہے ہو۔''

حاصل سب کا یہی ہے کہ رہبانیت اور روحانیت جیسے زندگی کا کوئی قدرتی دستور و آئین نہیں ہے، بلکہ اپنے ذاتی

رجحانات، ذہنی الناد یا اتفاقاً پیش آنے والے حوادث وحالات کے زیر اثر تراشنے والوں نے جینے کا ایک مصنوعی، غیر فطری طریقہ خود ہی تراش لیا ہے۔ یہی حال اس مشرکانہ مادی زندگی کا بھی ہے، جس میں نظریہ شرک آدمی کو مبتلا کر دیتا ہے۔ قرآن نے چیلنج کیا ہے کہ نہ تو علم کے حکیمانہ اور سائنٹیفک معیار پر جانچی اور پرکھی ہوئی کوئی حقیقت مشرکانہ نظام زندگی میں ڈھونڈھنے والوں کو کبھی مل سکتی ہے اور استناد واعتماد کی قدرتی ضمانت وحی والہام کی لاہوتی راہ کے مکشوفات معلومات میں جو پائی جاتی ہے، اسی کی ضمانت اس خوامخواہ کے بے بنیاد وسوسے کو میسر آسکتی ہے جس میں مبتلا ہو کر ہا اور کرنے والے ہا اور کر لیتے ہیں کہ جس کا سب کچھ ہے، وہی عملاً کچھ نہیں ہے اور جن میں خود اپنا کچھ نہیں ہوتا وہی سب کچھ بن بیٹھے ہیں اور ہے بھی بجائے خود یہ اتنی بودی پھسپھسی مضحکہ خیز، مجسم انگریز بات کہ وحی الہام کی طرف انتساب کا دعویٰ ہی اس کی تردید اور یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اتنا بے بنیاد وسوسہ یا وہم خدائے علیم و خبیر کا بخشا ہوا علم نہیں ہو سکتا۔ عقل بے چاری ہر بھلی بری بات کی تائید اور جذبات واحساسات کی وکالت میں لاکھ بدنام سہی، لیکن ایسے بے معنی دعوے کی برداشت کی گنجائش بتائیے کہ اس غریب میں بھی کیسے پیدا کی جائے؟ کسنا اور کس کر دکھانا تو خیر دور کی بات ہے، سچ تو یہ ہے کہ ایسے دانش سوز، عقل گداز وسوسے کو تجربے اور مشاہدے کی حکیمانہ وعلمی کسوٹی پر کسنے کا بھلا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے ؟ خدا کا انکار کر کے تو خیر بنانے والے کچھ الٹی سیدھی باتیں بنا بھی سکتے ہیں، لیکن مشرکانہ طریقہ فکر جس میں خدا کا انکار بھی تو نہیں کیا جاتا، یہی مانا جاتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسی صورت میں بتایا جائے کہ فرض وتخمین کی ایک ''الکل پچو'' بات ظن اور گمان کے سوا اوہام ووساوس کے ان تھپیڑوں کی توجیہ اور کیا کی جائے، جن سے ''مشرکانہ ذہنیت'' ٹکرا کر جو کچھ نہیں ہے اسی کو سب کچھ اور جو سب کچھ ہے اسی کو ''کچھ نہیں'' ٹھہرانے کی ابلہ فریبیوں میں خود مبتلا ہے اور دوسروں کو بھی مبتلا کرتی چلی آرہی ہے۔

﴿بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا﴾(فاطر : ۴۰)

''بلکہ (واقعات کے حدود سے ہٹ کر زندگی بسر کرنے والے) ظالمین باہم ایک دوسرے کو نہیں امیدوار ٹھیرا رہے ہیں مگر صرف فریب کار۔''

کے سوا اور کن لفظوں میں آخر کاروبار کے اس سارے نظام کی روداد قرآن پیش کرتا، جو شرک کی راہوں میں انجام دیے جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں مشرکوں ہی کو خطاب کر کے قرآن میں مطالبہ کیا گیا ہے:

﴿فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾(ابراھیم : ۱۰)

''لاؤ اپنے فکر وعمل کی صداقت پر کوئی سلطان مبین یعنی کھلی دلیل۔''

اور اس کے ساتھ اس واقعہ کا بھی اظہار واعلان کر دیا گیا ہے کہ:

﴿مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ (یوسف : ۴۰)

''نہیں اتارا ہے اللہ نے اس کے متعلق کوئی سلطان یعنی دلیل۔''

جہاں تک میرا خیال ہے ایسی بات جو انسانی عقل واحساس پر مسلط ہو کر اس طریقے سے چھا جائے کہ اس کے ماننے پر آدمی بے بس ہو جائے قرآنی اصطلاح کی رو سے اسی نوعیت کے دلائل کی تعبیر ''سلطان'' کے لفظ سے کی گئی ہے۔ بظاہر اس پیرایہ

بیان سے ادھر توجہ دلانا مقصود ہے کہ زندگی بہر حال زندگی ہے، وہ کوئی ہنسی مذاق، کھیل کود، لہو ولعب نہیں ہے کہ من مانے، خود تراشیدہ خیالات واوہام کے نیچے بہنے اور بہانے کے لیے حیاتی توانائیوں کے اس انمول قیمتی سرمائے کو چھوڑ دیا جائے۔ ''سلطان'' کے لفظ سے قرآن چونکانا چاہتا ہے اور اس احساس کو دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جو قدم بھی اس زندگی میں اٹھایا ہے، چاہیے کہ ''سلطانی دلائل'' ہی کی روشنی میں اٹھایا جائے۔

اور شکر ہے کہ نزول قرآن کے بعد نظر وفکر کے اسے سلطانی کہیے یا قرآنی طریقے پر اصرار کا مذاق روز بروز شدت پذیر اور اپنے دائرے کو وسیع کرتا چلا جا رہا ہے۔ تعلیم کا نیا مغربی نظام اپنے جوہری کوتاہیوں بلکہ بعض انسانیت گداز خصوصیتوں کے ساتھ سلطانیت کے مذاق کو آگے بڑھانے میں جو کام کر رہا ہے اس کا انکار میرے نزدیک تو ایک حقیقت اور واقعے کا انکار ہوگا۔ مگر کیا کیجیے مغربی تمدن وتہذیب کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ جب بقول شخصے:

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کے پہلوؤں پر نظر پڑتی ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے، سب کچھ سوچا جا رہا ہے، ہر مسئلے پر بحث کا دروازہ کھول دیا گیا ہے، لیکن زندگی کے بنیادی سوالوں کی طرف سے دوسرے تو دوسرے خود یورپ وامریکہ والے بھی غفلت یا تغافل ہی سے کام لے رہے ہیں۔ تاہم پہلے حال کی تاریکی کے پیچھے میری ایمانی بصیرت وفراست کسی روشن مستقبل کو دیکھ رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہ زور ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائے یعنی وہی باتیں جن کے چرچا کرنے والے تو ہر جگہ مل جاتے ہیں لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ کسی نے ان کو دیکھا بھی ہے تو ہر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتا ہے یا زیادہ سے زیادہ کسی انفرادی شخصیت کا ''سپنا'' یا خواب یا افراد ہی کے مراقباتی ونفسیاتی کرشموں کے ان آثار کو پیش کر دیا جاتا ہے، جن میں یقین سے زیادہ شکوک وشبہات ہی کے جراثیم بھنبھناتے رہتے ہیں۔ توقع تو یہی ہے کہ ایسی پارینہ کتابیں جن کی قدیم تعبیروں میں اللہ اور زمانہ سے ہر مفہوم اور ہر مطلب کے نکال لینے کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے، ان ہی غیر سلطانی مبہم فقروں سے نکالے ہوئے مشکوک ومشتبہ نتائج پر بھروسہ کر کے آدم کی اولاد زیادہ دن تک اپنی زندگی سے کھیلتی نہ رہے گی اور قرآنی مطالبہ:

﴿فَأْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ (ابراهیم: ۱۰)

''لاؤ (مشرکانہ کاروبار کی صداقت پر) کوئی سلطان مبین یعنی کھلی دلیل۔''

پر دھیان دینے کے لئے آج نہیں تو کل ان شاء اللہ دنیا آمادہ ہو جائے گی۔[1]

---

[1] گیلانیؒ، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۲۸۱۔۲۸۵

﴿یٰسٓ﴾

آیت : ﴿اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ﴾ (یٰس:۸۲)

"اس کا کام یہ ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق ارادہ کیا تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔"

شیخ اکبر اپنی کتاب فصوص الحکم میں فرماتے ہیں۔ بالوهم يخلق كل انسان في قوة خياله مالا وجود له الا فيها و هذا هو الا مر العام.

فلاسفہ اسلام اور صوفیہ کا نظریہ ہے کہ انسان کو جب کسی چیز کا علم حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے تو اس علمی اثر کے بعد انسان میں اس کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی معلوم کی ہوئی شے کو اپنی خیالی قوت سے پیدا کرے اور یہی انسان کا "تخلیقی عمل" ہے تفہیم کے لیے ہم اپنی اصطلاح میں اس تخلیقی قوت کا ایک نام "کن فیکونی قوت" رکھتے ہیں ولا مشاحته في الاصطلاح۔

قرآن کا بیان ہے کہ اس کن فیکونی قوت سے خدا بھی اپنی مخلوقات کو پیدا کرتا ہے۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے خیالی اور علمی یا "کن فیکونی مخلوقات" سے جس قسم کے تعلقات انسان کے ہوتے ہیں قرآن پاک نے ان سارے روابط کو خدا اور عالم کے درمیان ثابت کیا ہے، میں ان تعلقات اور نسبتوں میں سے بعضوں کو یہاں درج کرتا ہوں۔

(۱) پہلا تعلق قرآن کا دعویٰ ہے کہ حق تعالیٰ نے عالم کو بغیر مادہ کے پیدا کیا ہے جیسا کہ "بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ" (البقرہ:۱۱۷، الانعام:۱۰۱) کے قرآنی الفاظ کا اقتضاء یہ ہے اسی کی تفسیر حدیث میں ہے کہ "كان الله و لن يكن معه شي" جس کے معنی یہی ہیں کہ آسمان و زمین کچھ نہ تھے اور پھر پیدا ہو گئے۔

حاصل یہ ہے کہ ابتدا میں خدا کے سوا کچھ نہ تھا یعنی مادہ وغیرہ کچھ نہ تھا اور پھر خدا نے قوۃ کن سے اس عالم کو پیدا کیا، ٹھیک جس طرح ہمارے خیال یا (علم) میں کچھ نہیں ہوتا ہے پھر محض اپنے ارادہ کن سے اپنے معلومات کو ہم وجود عطا کرتے ہیں، پس اگر خدا نے بھی ایسا ہی کیا تو اس کے سواء اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

(۲) اسی طرح قرآن کا بیان ہے کہ:

﴿وَ مَاۤ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ﴾(النحل : ۷۷)

"موجودہ نظام عالم کی بربادی کے لیے (یا قیام قیامت کے لیے) پلک جھپکانے بلکہ اس سے بھی کم زمانہ کی ضرورت ہے۔"

ہم بھی جب اپنے خیال اور علمی مخلوق مثلاً چار مینار کو جسے خیال میں پیدا کرتے ہیں اگر برباد کرنا چاہیں تو اس کے لیے لمح بصر (پلک جھپکانے) سے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں صرف توجہ کا ہٹا لینا کافی ہے، توجہ ہٹا لینے کے ساتھ ہی ہمارے مخلوقات معدوم ہو جاتے ہیں اور بغیر کسی مادہ چھوڑنے کے معدوم ہو جاتے ہیں۔

(۳) ہماری خیالی اور علمی مخلوق مثلاً چار مینار جس طرح پیدا ہونے میں ہمارے ارادہ اور توجہ کی محتاج ہے ٹھیک اسی طرح ہر لحظہ اور ہر لمحہ اپنے قیام و بقا میں بھی ہماری توجہ اور التفات کی وہ دست نگر ہے، یہی قرآن کا بھی بیان ہے کہ خدائے تعالیٰ عالم کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ قیوم بھی ہے، یعنی وہی اسے تھامے ہوئے ہے۔(یعنی عالم اسی سے قایم ہے)

اگر ادنیٰ التفات اس کی طرف سے ہٹالے تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا جیسا کہ ارشاد ہے۔

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ﴾ (البقرہ:۲۵۵)

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے (یعنی مردہ مادہ نہیں ہے) قیوم ہے، (یعنی عالم کو تھامے ہوئے ہیں ایسا خالق نہیں ہے جیسا کہ معمار مکان کا یا صانع مصنوع کا بلکہ وہ خالق قیوم ہے) اسے نہ غنودگی پکڑتی ہے اور نہ نیند چھوتی ہے (کیوں کہ اگر ایسا ہو تو نظام عالم قایم نہیں رہ سکتا)''

خیال میں کسی مخلوق کو پیدا کر کے اگر کوئی اونگھ جائے یا سو جائے تو اس کی یہ پیدا کی ہوئی مخلوق کیا باقی رہ سکتی ہے؟

(۴) اب اس پر غور کیجیے کہ مثلاً زید اپنی ''کن فیکونی قوت'' سے عالم خیال میں جس وقت چار مینار کو پیدا کرتا ہے، کیا زید چار مینار ہو جاتا ہے یا چار مینار زید بن جاتا ہے؟ ہم بالبداہتہ جانتے ہیں کہ ایسا نہیں۔ آخر خود غور کرنا چاہیے کہ اپنے ذہن میں جو کوئی مثلاً گدھے کا تصور کرتا ہے، کیا اس وقت وہ گدھا بن جاتا ہے یا گدھا وہ ہو جاتا ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ پس خالق قیوم کے متعلق بھی یہ باور کرنا کہ قیومی نسبت کی وجہ سے وہی عالم ہے اور عالم وہی ہے، اپنی ہی حماقت ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علوا کبیرا۔

لیکن اسی کے ساتھ اس کو سوچیے کہ اس خیالی اور علمی چار مینار کا وجود زید کے وجود اور ارادہ سے کیا جدا ہے؟ اس کے ہونے کے معنی بجز اس کے اور کیا ہیں کہ اس کا ارادہ اس کی توجہ اس کی طرف ہے، یہ نہ ہو تو چار مینار کی نہ دیواریں ہوں نہ محراب اور نہ مینار تو اسی طرح سمجھیے کہ نہ عالم خدا بن گیا ہے نہ خدا عالم بن گیا ہے، لیکن عالم کا وجود، بجز اللہ کے وجود اور ارادہ کے کچھ نہیں ہے۔

(۵) اس پر بھی غور کیجیے کہ آپ جس وقت اپنی خیالی مخلوق کو ذہن میں پیدا کرتے ہیں کیا اپنے آپ کو اس خیالی مخلوق کے کسی فوقانی، تحتانی، ظاہری و باطنی حصہ سے غائب پاتے ہیں؟ غور کیجیے کہ آپ جس طرح اپنے کو اس کی دیواروں کی جڑ کے پاس پاتے ہیں اسی طرح اس کے میناروں پر بھی یقیناً پائیں گے، آپ کو جو نسبت اس کے ظاہر سے ہے، اس کے باطن سے بھی وہی نسبت آپ کو ہوگی، قرآن یہی کہتا ہے کہ خالق قیوم، عالم کے اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے، باطن میں بھی۔ ارشاد ہے۔

﴿ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴾ (الحدید:۳)

''وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے اور وہی ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

کہیں فرمایا جاتا ہے کہ خدا عرش پر ہے، کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ انسان کی رگ گردن کے پاس بھی ہے، خود ہی غور کیجیے ایک خالق اور اس کی مخلوق میں اس کے سوا اور نسبت ہی کیا ہوتی ہے؟ آخر آپ بھی تو اپنے آپ کو اپنے خیالی چار مینار کے کنگروں پر بھی پاتے ہیں اور اس کی دیوار کی جڑوں کے پاس بھی، پھر اگر اس عالم کا خالق اگر عرش پر بھی ہو اور آپ کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہو تو، اس کے سوا اور عقل سوچ ہی کیا سکتی ہے۔

(۶) اب دیکھیے چار مینار ایک طویل و عریض عمارت ہے آپ اپنے ذہن میں جس وقت اسے پیدا کرتے ہیں اس کے طول و عرض کے ساتھ پیدا کرتے ہیں، اس لمبائی اور چوڑائی کے باوجود آپ اپنے کو کیا اس کے ذرہ ذرہ پر محیط نہیں پاتے؟ لیکن کیا اگر اس ذہنی چار مینار کو آپ دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے تو اس کی تقسیم کی وجہ سے آپ کے بھی دو حصے ہو جاتے ہیں؟ قطعاً نہیں، قرآن بھی یہی کہتا ہے۔

﴿اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ﴾ (حٰم سجدہ:۵۴) [1]

''اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہیں۔''

لیکن اس احاطہ کی وجہ سے خدا کی ذات میں کوئی تقسیم اور تجزی نہیں ہوتی۔

(۷) اسی طرح آپ اپنے ذہنی و علمی چار مینار کے کسی مینار کو توڑ دیجیے یا اس کے کسی حصہ میں کوئی گندگی، نجاست وغیرہ مثلاً فرض کیجیے پھر کیا اس شکست و ریخت اور اس گندگی و نجاست کا اثر آپ پر بھی مترتب ہوتا ہے؟ یقیناً نہیں، پھر اگر قرآن خدا کو عالم کی ہر چیز کے ساتھ، ہر جگہ مانتا ہے لیکن باوجود اس کے عالم کے کسی تغیر، کسی عیب و نقص کا اثر خدا کی ذات پر نہیں پڑتا تو کیا ''کن فیکونی مخلوقات'' کے ساتھ خالق کے تعلقات کی یہی نوعیت نہیں ہوتی؟

(۸) آپ جس وقت اپنے ذہن میں کسی پہاڑ یا کسی شہر کو پیدا کرتے ہیں، کیا اس ذہنی، خیالی یا علمی مخلوق میں کسی دوسرے کے ارادہ سے کوئی چیز اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے، غور کیجیے اس کا ہر ذرہ آپ ہی کی مرضی اور آپ ہی کے ارادہ کا پابند ہے دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

پس مذہب بھی اگر یہی کہتا ہے کہ

﴿اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ﴾

''اگر چھوئے اللہ تجھے کسی ضرر کے ساتھ پر اسے کوئی کھولنے والے نہیں لیکن وہی، اور اگر ارادہ کرے تیرے ساتھ بھلائی کا کوئی اس کی مہربانی کا پلٹانے والا نہیں۔'' (یونس:۱۰۷)

یعنی اس عالم کے کسی حصہ میں کوئی واقعہ بھی ہو بغیر ارادہ و اذن حق کے نہیں ہو سکتا اور کسی دوسرے کا تصور یا ارادہ یا فعل اس میں قطعاً موثر نہیں ہو سکتا تو کیا عقل اس کے سوا کچھ اور بھی سوچ سکتی ہے؟

(۹) آپ جب خیالی چار مینار کو پیدا کرتے ہیں تو جہاں آپ ہوتے ہیں کیا چار مینار بھی وہیں نہیں ہوتا؟ جب ایسا ہے تو خدا نے جب عالم کو پیدا کیا اور خدا اس کا خالق اور وہ اس کا مخلوق ہے تو اس کے بعد یہ سوال کتنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ عالم کہاں ہے اور خدا کہاں ہے؟

یہ سچ ہے کہ ایک ہی نوعیت یا ایک ہی ظرف کے دو وجود یعنی دو مخلوق یا اگر دو خالق فرض کیے جا سکتے ہوں تو ایسے دو ہم ظرف۔ وہم مثل وجودوں کی ایک ہی فضا یا ایک ہی مکان میں گنجائش نا قابل تصور ہے۔ لیکن دو ہستیوں میں ایک خالق اور دوسری مخلوق ہو تو ایسی حالت میں مخلوق کے پائے جانے کے لیے خالق کا علم و ارادہ اور اس کی توجہ ہی کافی ہوتی ہے۔ جب قرآن میں فرمایا گیا کہ:

---

[1] کتاب میں (واللہ بکل شئی محیط) درج ہے جو درست نہیں۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (الحدید:۴)

تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ جہاں ہم ہوتے ہیں وہیں خدا کس طرح ہوسکتا ہے لیکن لوگ اپنے مخلوقات کے متعلق نہیں سوچتے کہ جہاں وہ ہوتے ہیں کیا وہاں ان کے مخلوقات ان سے باہر ہوتے ہیں؟ اسی کے ساتھ اگر آدمی اپنے ذہنی مخلوقات کے متعلق غور کرے تو کیا اپنے آپ کو ان کے نیچے یا اوپر یا کسی اور سمت میں پاتا ہے؟ یقیناً خالق ومخلوق میں کوئی ایسی سمتی نسبت نہیں پیدا ہوتی پھر کیا ہوا اگر قرآن میں اعلان کیا گیا کہ

﴿اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (البقرہ:۱۱۵)

''یعنی جدھر تم رخ کروگے وہیں خدا ہے۔''

سوچنا چاہیے کہ آخر اس کے سوا اور کیا کہا جاتا؟

الحاصل خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟ وہ عالم کو کس طرح محیط ہے؟ وہ ہر چیز کے ساتھ کس طرح ہے؟ عالم کے ہر ذرہ کی حرکت وسکون حق کے ارادہ کے ساتھ کس طرح وابستہ ہے؟ وہ اپنی مخلوقات کے ظاہر و باطن میں کس طرح پایا جاتا ہے؟ ان سارے سوالات کا حل بجائے باہر کے اگر آدمی سوچے تو خود اپنے اندر پاسکتا ہے، اور یہی مطلب ہے اس فقرہ کا کہ ''عالم کا وجود بجز وجود حق کے اور کچھ نہیں۔'' صحیح حدیث میں:

الا كل شي ماخلا الله باطل

''ہاں! ہر چیز اللہ کے سوا ہیچ ہے۔''

کے مصرع کی توثیق فرمائی گئی ہے بایں ہمہ نہ خدا عالم بنا ہے نہ عالم خدا بن گیا ہے، اور آپ نے دیکھا کہ خالق ومخلوق کی باہمی نسبتوں پر غور کرنے کے بعد فطرت انسانی اس اسلامی اور قرآنی بیان کے سوا کسی اور راہ سے کیا تسلی پاسکتی ہے؟ اسی مسئلہ کو مسئلہ قیومیت کہتے ہیں۔ عارف جب اثر موثر، خالق ومخلوق میں ان نسبتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو چیخ اٹھتا ہے:

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست
خیال آب و گل در رہ بہانہ

(العارف الشیرازی)

یعنی آب وگل، خدا کا خیالی یا تخلیقی عمل ہے۔ مغربی نے اور واضح لفظوں میں تشریح کی ہے، ان کی اسی غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

خیال بازی اوبیں کہ پردۂ او خیال
فگندہ بررخ خود تا خیال اوبینی!

ل گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۱۰۱ تا ۱۰۶

﴿ص﴾

آیت : ﴿تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ﴾ (ص:۳۶)

''چلتی تھی ہوا دھیرے دھیرے حضرت سلیمان کے حکم سے جدھر وہ چاہتے تھے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق متعدد مقامات پر قرآن کا یہ بیان کہ ''ہم نے ہوا کو سلیمانؑ کے لئے مسخر کر دیا تھا'' اور اس طور پر ہوا اُن کے قابو میں آ گئی تھی کہ

﴿تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ﴾

پھر دوسری جگہ سورۃ الانبیاء میں ہے۔

﴿وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ﴾ (الانبیاء:۸۱)

اور قابو میں کر دی گئی ہوا سلیمانؑ کے جو تیز و تند ہو کر چلتی تھی سلیمانؑ کے حکم سے۔

بہ ظاہر جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زیر اقتدار ہو کچھ اس قدر آ گئی تھی کہ جس رفتار پر چاہتے اسے چلا سکتے تھے، تیز کرنے کی ضرورت ہوتی تو تیز بھی کر سکتے تھے۔ عاصفۃ کے لفظ کا یہی اقتضاء ہے، اسی طرح موقع ہوتا تو اس کی رفتار کو دھیمی بھی کر دیتے تھے۔ ''رخاء'' کے لفظ سے یہی سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہوا پر حضرت سلیمان کو یہ اقتدار کسی معجزاتی رنگ میں بخشا گیا ہو، عام یہی ہے۔ لیکن معجزاتی رنگ ہو یا یہ سمجھا جائے کہ ہوا کا کوئی قانون حضرتؑ کی گرفت میں آ گیا تھا۔ بہر حال جب ہوا ان کے قابو میں آ گئی تھی، تو اس واقعہ کا وقوع بہر حال کسی شکل میں ہوا ہوگا، آپ ذریعہ علم میں اختلاف کر سکتے ہیں۔ یعنی الہام سے یہ علم ان کو حاصل ہوا تھا۔ یا عقل و فکر کا یہ نتیجہ تھا۔ لیکن ہوا کے کسی خاص قانون کا علم جس کے بعد اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا آسان ہو جائے اس کے انکار کی تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ عام طور پر علم کے جس سلسلے کو لوگ عقل و فکر کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ علم بھی وہیں سے آتا ہے جو الہامی علوم کا سر چشمہ ہے۔ قرآن تقویٰ کے ساتھ فجور کے متعلق بھی جب خبر دیتا ہے کہ

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ (الشمس:۸)

پھر الہام کیا اللہ تعالیٰ نے (نفس انسانی) میں اس کے فجور کو اور اس کے تقویٰ کو۔

تو جو چیزیں فجور نہیں ہیں، الہام کی طرف منسوب کرنے میں اس کے متعلق آخر کیا مضائقہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال بات خواہ مخواہ طویل ہو گئی۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ خواہ کوئی صورت بھی پیش آئی ہو لیکن قرآن کے اس اشارے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج دنیا پر اسٹیم اور گیس یا برق وغیرہ کی قوتوں کا راز واضح ہوا ہے، اگر توجہ کی جائے تو طاقت کا ایک بڑا ذخیرہ ہوا میں بھی ایسا مل سکتا ہے کہ اس کو قابو میں لانے کے بعد آدمی اپنی مرضی کے مطابق اس سے کام لے سکتا ہے۔ آج نہیں تو ہو سکتا ہے کہ دنیا پر کل ہوا کے اس قانون کا راز واضح ہو، کیا تعجب ہے کہ اس راز کے طشت از بام ہونے کے بعد وہ ساری قوتیں جن پر آج دنیا کو ناز ہے، وہ ہوا ہو جائیں، کیونکہ جتنی آسانی کے ساتھ ہر جگہ ہوا آدمی کو میسر آتی ہے اتنی سہولت کے ساتھ نہ پٹرول ہی ہر جگہ مل سکتا ہے نہ اسٹیم اور نہ برقی قوتوں کو اس آسانی کے ساتھ ہم فراہم کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک تو قرآن کے اس اشارے میں ارباب فکر کے لئے ایک ''پیغام'' ہے۔ چاہیں تو قوت کے ایک نامعلوم ذخیرے کی سراغ رسانی کا اسے ذریعہ بنا سکتے ہیں۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۴۴۔۴۵

آیت : ﴿نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ﴾ (ص:۷۲)

''اپنی روح اس میں پھونک دوں''۔

مسلمانوں میں ایک گروہ ہے، جس کا دعویٰ ہے کہ صرف ماننے پر جو قناعت نہیں کرنا چاہتے ان کو نبوت و وحی کے معلومات کا مشاہدہ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عام حواس اور عقل کے سوا ہر انسان میں کچھ اور علمی قوتیں بھی پوشیدہ ہیں جن کی طرف مرزا بیدل نے اپنی مشہور غزل کے مطلع میں بایں الفاظ اشارہ کیا ہے:

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم ندمیدہ دردل کشا بچمن در آ

قرآن نے اسی سر انسانی کی تعبیر مذکورہ بالا آیت کے الفاظ میں کی ہے۔

بہر حال یہ اندرونی قوتیں انبیاء علیہم السلام کے کامل اتباع اور پیروی کے بعد رفتہ رفتہ بیدار ہوتی ہیں۔ اور جس کی یہ مخفی قوتیں کھل جاتی ہیں وہ ان چیزوں کو دیکھ کر پہچانتا ہے جن کو وہ اب تک صرف مان رہا تھا، بالفاظ دیگر جس شخص کی یہ باطنی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں تو اس کی مذہبی حقائق کی معرفت و شناخت شروع ہو جاتی ہے۔ ان کے اسی علم کا نام ''معرفت'' یعنی ''شناختن'' ہے کیوں کہ پیغمبروں نے جن چیزوں کو جانا تھا انہی کو وہ پہچانتا ہے، اور شناخت ہو یا پہچان، اس کا تعلق ان ہی امور سے ہو سکتا ہے جن کے ساتھ گونہ علم بالواسطہ یا بلا واسطہ پہلے متعلق ہو چکا ہو۔ معرفت و شناخت کے اس مقام پر جب عارف پہنچتا ہے تو چلا اٹھتا ہے:

صد کتاب و صد ورق در نار کن
جان خود را جانب دلدار کن
صیقلے کن یک دو روزے سینہ را
دفتر خود ساز آں آئینہ را
آئینہ دل چوں کنی صافی و پاک
نقشہا بینی بروں از آب و خاک
ہم بہ بینی نقش و ہم نقاش را
فرش دولت را وہم فراش را
اندر آں اشکال غیبی رود ہد
عکس حوری و ملک در وے جہد

(رومی)

خلاصہ یہ ہے کہ:

پنبہ وسواس بیروں کن زگوش
تاب گوشت آید آواز سروش
بینی اندر دل علوم انبیاء

بے کتاب و بے معید واوستا

(رومی)

قرآن کریم اور آں حضرت ﷺ نے علم کے اس مخفی قوت کے ظہور کا وعدہ فرمایا ہے اور کوشش کرنے والے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اور ہور ہے ہیں۔

﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰه﴾ (البقرہ : ۲۸۲)

''خدا سے ڈر کر بچو اللہ تمہیں سکھائے اور بتائے گا''۔

﴿وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت : ۶۹)

''اور جو ہماری راہ میں جدو جہد کرتے ہیں انہیں ہم اپنی راہیں دکھاتے''۔

لیکن اس ''معرفت'' اور ''شناختن'' کے لیے طالب کو بجائے مدرسہ اور کسی کالج کے کسی خانقاہ میں، اور بجائے ''گفت و قال'' کے ''رفت وحال'' والوں کے پاس جانا چاہیے۔ ہمارے سامنے تو اس وقت صرف متکلمین اسلام کی روش ہے اور اصول اسلام کے اثبات کا یہی وہ طریقہ ہے جسے ''علم الکلام'' کہتے ہیں۔[۱]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۶۴، ۶۵

﴿الزمر﴾

آیت : ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر:۲۹)

''اللہ تعالیٰ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک آدمی (غلام) ہے، جو مختلف شرکاء میں مشترک ہے اور دوسرا غلام ایسا ہے کہ صرف ایک آدمی کے سپرد ہے، کیا دونوں (بہتری وخیریت) میں برابر ہو سکتے ہیں؟ سب تعریفیں خدا کے لیے ہیں، لیکن (توحید وشرک کے حسن وقبح) کو بہت کم لوگ جانتے ہیں (ورنہ اگر جانتے، تو توحید کے ماننے پر اپنے کو مجبور پاتے''۔

اگر چند ارباب کے ماننے والے یہ کہیں کہ ہم ہر ایک معبود کو پوجیں گے، کیونکہ انسان اپنے کھانے پینے، رہنے سہنے، دواء وغیرہ میں ہر ایک موجود کا محتاج ہے اور جب ان کا محتاج ہوا، تو پھر ان کے خالقوں کا تو بدرجہ اولیٰ ہوا، اس لیے سب کو ماننا چاہئے۔ اس شبہ کو ذہن میں گذرنا تھا کہ میں نے پھر آیاتِ قرآنیہ پر نظر کی، فوراً معلوم ہوا کہ خداوند قدیر جل مجدہ نے اس کا بھی ازالہ فرما دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ تمام ''ارباب متفرقوں'' کی عبادت کی جائے، اس کے بعد بھی مقابلہ کر کے دیکھ لو اور اندازہ کرو کہ شرک بہتر رہتا ہے، یا توحید؟ کیونکہ اس وقت بھی وہی دو صورتیں پیش ہوتی ہیں۔

۱) ایک شخص ہے جو صرف ایک ہی شخص کا غلام ہے اور اسے صرف اسی کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔

۲) دوسرا شخص ہے جو بہت سے آقاؤں میں مشترک ہے، ان میں ہر آقا اس سے خدمت کا طلبگار ہے۔

بتاؤ کہ اس میں خیر وبہتر کون ہے، امن واطمینان کس کے لیے ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک کا کام تو انجام دے کر بخوشی زندگی بسر کر سکتا ہے، بخلاف اس کے جس کے سینکڑوں آقا ہیں، کیونکہ کل دو صورتیں ہیں، یا تو وہ سب کا کام کرے، تو اس کا انجام بجز ہلاکت وبربادی کے اور کیا ہے؟ پھر احتمال باقی ہے کہ پورا ہو، یا نہ ہو اور اگر ایک کا کرتا ہے، تو اور سب آقا اس سے خفا ہو کر اس کے درپے آزار ہو جائیں گے، پس ہر حال میں پہلا دوسرے سے خیر وبہتر ہے۔ علاوہ اس کے فرض کرو کہ ایسے غلام مشترک کو اگر کبھی کوئی ضرورت پیش آئی، تو بوجہ شرکت کے ہر ایک دوسرے پر ٹالے گا اور دو ماموں کے بھانجے بھوکے رہ جاتے ہیں، وہ مثل پوری صادق آئے گی۔

پس یہی نسبت ان دونوں میں بھی ہوگی، جن میں سے ایک صرف ایک خدا کو مانتا ہے اور اسی کی عبادت کرتا ہے اور دوسرا متفرق معبودوں کو بلا کسی دلیل کے مانتا ہے اور سب کو پوجنا چاہتا ہے، اس لیے کہ کم از کم اگر کچھ بھی نہیں، تو اس مشرک ان گنت معبود

والے انسانوں کی ذمہ داریاں موحد کی ذمہ داریوں سے بہت زیادہ مشکل ہوں گی اور ظاہر ہے سہل و مشکل کاموں میں جب مقابلہ ہو جاتا ہے اور مشکل کے اختیار کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہوتی، تو اس وقت سہل کام سے بہترین چیز اور کچھ نہیں ہوتی۔

پس جب شرک کے اختیار کرنے میں انسان بہت سی صعوبتوں کا نشانہ بن جاتا ہے اور اس کے اختیار کرنے کی کوئی دلیل بھی نہیں، تو اس صورت میں توحید سے بہترین چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔!

اور یہی مقصد تھا کہ توحید ہر حال میں شرک سے بہتر ہے اور جو چیز بہتر ہے اس کے ماننے پر انسان کی فطرت مجبور ہے، پس توحید کے ماننے پر انسان کی فطرت مجبور ہے۔ هذا والسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ [1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مقالات گیلانی، حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری (مرتب)، ص ۸۲۔۸۴

آیت : ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (الزمر:۴۲)

''اللہ ہی اٹھاتا ہے نفوس (یعنی جانوں) کو ان کی موت کے وقت اور جو جان نہیں ہوتی اسے نیند میں اٹھالیتا ہے، روک لیتا ہے اس نفس (جان) کو جس پر موت کا حکم صادر ہو جاتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے دوسرے کو (یعنی نیند والوں کی جان کو) مقررہ وقت کے لئے، اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں۔''

سوچنے، سوچنے کا خاص طور پر حکم بھی دیا گیا ہے۔ کیا اس محکم نص قرآنی سے ذیل کے نتیجے نہیں پیدا ہوتے۔

۱) موت کے وقت اور سونے کے وقت دونوں حالتوں میں انفس یعنی جانوں کے اٹھالینے کا قصہ پیش آتا ہے۔

۲) نفس یا جانوں کے اٹھالئے جانے کے بعد دو ہی صورت پیش آتی ہے جن کا وقت پورا ہو جاتا ہے۔ ان کی اٹھائی ہوئی یہی جان روک لی جاتی ہے۔ اور جن کا وقت پورا نہیں ہوا ہے۔ ان کے لئے اٹھائی ہوئی یہ جان چھوڑ دی جاتی ہے۔

۳) توفی انفس یعنی جانوں کے اٹھائے جانے کی صورت میں ہو، یا نیند میں ہر حال میں توفی کا عمل بھی واحد ہی ہوتا ہے اور نوعیت بھی ایک سی ہوتی ہے۔

اب تینوں نتیجوں کو پیش نظر رکھ لینے کے بعد دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ نیند کے وقت انفس کی توفی یعنی جانوں کے اٹھالئے جانے کا تجربہ تو ہر چوبیس گھنٹوں میں ہم میں ہر سونے والے کو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ سر رکھ کر آدمی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ یا آنکھیں بند نہ بھی ہوں پڑا رہتا ہے۔ کروٹیں بدلتا ہے ان ہی حالات میں یکا یک دیکھا جاتا ہے کہ نیند آگئی۔ ہم کہتے ہیں کہ نیند آگئی اور قرآن اطلاع دیتا ہے کہ تیرے نفس یا جان کے ساتھ توفی یعنی اٹھالئے جانے کا قصہ قدرت کی طرف سے پیش آیا۔ ہم کچھ نہیں جانتے ہیں کہ اس قدرتی عمل میں جس کی تعبیر قرآن میں توفی انفس سے کی گئی ہے۔ اس میں ہمارے ساتھ کیا کیا گیا الا یہ کہ بجائے کسی تکلیف یا دکھ کے اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ سکون اور راحت کی ایک کیفیت پیدا ہوئی۔ حواس نے اپنا عمل چھوڑ دیا آواز ہمارے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی ہے۔ لیکن ہم اسے نہیں سنتے خوشبو سے بسی ہوئی ہوا ہماری ناکوں کے نتھنوں میں بھرتی ہے لیکن ہم اسے نہیں سونگھتے۔ نیند یا منام کی بھی توفی (انفس کے اٹھالئے جانے) کے بعد ارسال کی صورت وقدرت اگر اختیار کرتی ہے تو کہتے ہیں کہ جاگ اٹھے حواس پھر اپنے مقررہ وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں دیکھنے لگتی ہیں کان سننے لگتے ہیں۔ لیکن بجائے ارسال کے ہی توفی میں امساک اور دوام کا رنگ جب پیدا ہو جاتا ہے تو قرآن خبر دیتا ہے کہ اسی کا نام موت ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ واقعہ کی نوعیت اگر یہی ہے اور قرآن کی آگاہی کے بعد اس کے سوا واقعہ کم از کم مومن کے نزدیک کیا ہو سکتا ہے۔ تو منامی توفی کے سوا مرنے من توفی یعنی جان کے اٹھالئے جانے کے لئے ایک جدید عمل کے اضافہ کا ادعا اور کچھ ہو، یا لیکن قرآن کے بخشے ہوئے علم سے انحراف وگریز کے سوا ہتایا جائے کہ وہ اور کیا ہے پس منامی توفی کے سوا، موت کے لئے کسی جدید اور نئی توفی کی قرآنا جب ضرورت نہیں ہے، تو منامی توفی کے آثار اور تجربات کے سوا خواہ مخواہ موت والی اختراعی خود ساختہ توفی کے مہیب اور ہولناک آثار سے مرنے والوں کو محض اس لئے کہ وہ مرنے والے ہیں کیوں ڈرایا جائے، طرفہ تماشا یہ ہے کہ ڈرانے والے موت کے اس خود آفریدہ آثار سے ڈراتے بھی ہیں اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس قدرکی مصیبت سے بچ نکلنے کی کوئی صورت بھی نہیں ہے۔ نہ نیک ہی بن کر کوئی اس سے بچ سکتا ہے۔ اور نہ بد بن کر اس سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ جسم سے جان نکلنے

میں جو قدرتی کش مکش پیش آتی ہے۔ کہتے ہیں یہ اسی کش مکش کا لازمی وطبعی نتیجہ ہے۔ مگر یہ اطلاع تو ان لوگوں کی ہے جنھوں نے نہ موت کا مزا چکھا ہے اور نہ موت کے مزہ چکھنے والوں سے پوچھ کر یہ رائے قائم کی ہے اور موت حیات کو جو پیدا کرتا ہے۔ نہ اس کے بخشے ہوئے علم سے اپنی رائے میں انھوں نے مدد لی ہے بہ خلاف اس کے احیاء واماتت زندہ کرنے اور مارنے کی اقتداری قوت سے براہ راست ہمیں جب یہ آگاہی حاصل ہو رہی ہے کہ سونے والے جیسے سو رہتے ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ نیند ان کو کیسے آ گئی کچھ یہی صورت موت میں بھی پیش آتی ہے۔

گویا میر مرحوم کا مشہور شعر

عہد جوانی رو رو کاٹا　　　　پیری میں لی آنکھیں موند

یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا۔ جسے اب تک ایک شاعرانہ طفل تسلی سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب سے حقیقت کی ترجمانی کا کام لیا گیا تھا۔ سورہ زمر کی مذکورہ نص محکم کا یہ کھلا ہوا واضح اقتضاء ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سکرۃ الموت س سکرہ یعنی نشہ کے لفظ سے جو اشارہ ملتا ہے یا سورہ یسین میں من بعثنا من مرقدنا (کس نے اٹھایا ہمیں ہماری خواب گاہ سے) میں مرقد (خواب گاہ) کے لفظ سے یا صحیح حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ نیکی کی زندگی بسر کر کے مرنے والوں کو برزخی عالم میں نم کنومة العروس (دلہن جیسے سوتی ہے اسی طرح سو جا) سے خطاب کیا جائے گا۔ اگر غور کیا جائے۔ تو ان سارے اجمالی اشاروں میں وہی بتایا گیا ہے جس کی تفصیل سورہ زمر میں کی گئی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، سکرۃ الموت (صدق جدید لکھنو)، ۱۹ ستمبر ۱۹۵۲ء

﴿حم سجدہ﴾

آیت: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ﴾ (حم سجدہ: ۵۳،۵۴)

''میں اپنے پتے لوگوں کو آفاق اور انفس میں دکھاؤں گا۔ یہاں تک کہ کھل جائے گا ان پر کہ وہی خدا حق اور ثابت ہے۔ کیا تیرے رب کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے، خبردار! یہ لوگ اپنے مالک کی ملاقات میں شک کے اندر ہیں۔ خبردار وہ ہر چیز کو محیط ہے۔''

صفات الٰہیہ کے ظہور کی دوکلی شکلوں کی طرف قرآن میں بھی اشارہ کیا گیا ہے صوفیہ اسلام کی اصطلاح میں اسی کی تعبیر آفاق وانفس سے کی جاتی ہے درحقیقت ان دونوں اصطلاحوں کا ماخذ بھی قرآن کی مذکورہ بالا مشہور آیت ہے۔ جس میں حق تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کو بیان فرمایا ہے۔

ارباب معرفت نے گذشتہ بالا آیات میں ''آفاق'' سے مراد کائنات کا وہ عریض وطویل سلسلہ لیا ہے، جو انسان کے باہر ثوابت وسیارات، نباتات وجمادات حیوانات وملائکہ اور جن وشیطان وغیرہ کی شکل میں پھیلا ہوا ہے

اور ''نفس'' سے مراد خود انسان کی حقیقت اور اس کی ذات ہے قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات اللہ کی تجلی ان دونوں چیزوں میں دو جداگانہ حیثیتوں سے ظاہر ہوئی ہے۔

* ''یہاں تصوف کی ایک اصطلاح لفظ تجلی کو سمجھ لینا چاہیے۔ عالم کا اپنی معلومات کی شکل میں ظاہر ہونا، مثلاً جبرئیل علیہ السلام کبھی دحیہ کلبیؓ یا مسافر، یا رجل سوی کی شکل میں جو ظاہر ہوتے تھے تو اس کی حقیقت یہی تھی کہ اپنے معلومات کی شکل میں وہ ظاہر ہوتے تھے۔ آدمی بھی جب اپنے ذہن میں اپنے کسی معلوم کو عالم خیال میں پیدا کرتا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ معلوم کی شکل میں وہ متجلی ہوا۔ ظاہر ہے کہ عالم خیال میں جو گدھے کا تصور مثلاً قائم کرتا ہے اس وقت وہ گدھا نہیں ہو جاتا بلکہ صرف اسی کا ظہور اپنے ایک معلوم کی شکل میں ہوتا ہے عالم کی مختلف چیزوں کی شکل میں حق کے ظہور اور تجلی کو بھی کچھ اسی پر قیاس کیا جاتا ہے''۔ *

صوفیہ کرام فرماتے ہیں کہ اسمائے حسنیٰ کی ایک تفصیلی جلوہ گاہ وہ ہستی اعظم ہے جسے اصطلاح میں شخص کبیر کہتے ہیں جس میں حق تعالیٰ اپنے تمام اسماء وصفات کے مختلف مدارج کے لحاظ سے جلوہ فرما ہوئے ہیں، اسی کا نام عالم اور آفاق ہے اور اسی شخص کبیر کو چھوٹے پیمانے پر بطور خلاصہ کے دوبارہ جب اعتبار فرمایا گیا اور اس کو مجمل اور مختصر کر کے ایک اور ہستی نکالی گئی تو اسی کا نام انسان اور نفس ہو گیا ہے۔ اس چھوٹی شخصیت میں وہ سب کچھ ہے جو اس سے باہر ایک ایک چیز میں جدا جدا پایا جاتا ہے اسی بنیاد پر جدید زمانہ ہو یا قدیم، ہمیشہ انسان ''خلاصہ کائنات'' یا باصطلاح حال ''ارتقا کی آخری منزل'' قرار دیا گیا ہے۔

تصوف کی کتابوں میں اس کی تفصیل مل سکتی ہے کہ کس طرح اس چھوٹے پیمانے میں وہ سب چیزیں اتر آتی ہیں جو وسیع سے وسیع تر پیمانوں پر عالم کبیر میں پائی جاتی ہیں۔ کم از کم اتنا تو ہر عامی بھی جانتا ہے کہ انسانی وجود ان تمام خواص وآثار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، جن کے مظاہر عام طور پر جمادات ونباتات اور حیوانات وغیرہ مرکبات ہیں اسی طرح کون نہیں جانتا کہ انسان سے باہر اگر مٹی ہے، پانی ہے، ہوا ہے، حرارت ہے تو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری جسدی ترکیب میں بھی یہ ساری چیزیں شریک ہیں۔ اور جب یہ ہیں تو جن کیمیائی بسائط سے ان عناصر کی ترکیب ہوئی ہے، کیا کوئی اس کا انکار کر سکتا ہے کہ وہ بھی انسانی بدن کے اجزا نہیں ہیں۔ بلکہ عہد جدید کے کیمیائیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جتنے کیمیائی بسائط انسان سے باہر پائے جاتے

ہیں۔ان کا ایک بڑا حصہ ہماری حسی تعمیر میں خرچ ہوا ہے البتہ بعض بسائط کا اب تک ان کو پتہ نہیں چلا ہے۔لیکن جو معلوم نہیں ہیں کیا ضروری ہے کہ وہ موجود بھی نہ ہوں بہر حال کم از کم ہر شخص اتنا تو ضرور جانتا ہے کہ انسانی وجود ان تمام خواص و آثار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جو عام طور پر حیوانات، جمادات، نباتات وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

الحاصل جمادات ہوں یا معدنیات، نباتات ہوں یا حیوانات، بلکہ وہ ساری چیزیں جو اس کی گرفت میں آسکتی ہوں کون نہیں جانتا کہ انسانی ہستی (وجود) ان تمام طبقات محسوسہ کے آثار وخواص کی ''کتاب مجمل'' اور ''نسخہ جامع'' ہے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ علاج و معالجہ وطبی دواؤں کی بنیاد عالم صغیر و کبیر کی اس باہمی مناسبت پر قائم ہے حتیٰ کہ وہ نورانی اجرام جو ایتھر کے لامحدود سمندر میں تیر رہے ہیں یا جو ان کے پیچھے ہیں، گو عام الناس کو اس کا علم نہ ہو لیکن جن لوگوں نے انسان کے باطنی قویٰ کو کریدا ہے، انہیں اس چھوٹے قالب میں عالم انوار کے وہ سارے نظامات منکشف ہوئے ہیں جو اس سے باہر پائے جاتے ہیں۔

نہ صرف صوفیانہ مجاہدات والے، بلکہ جوگیت و رہبانیت کی راہوں سے بھی جو انسان کے ان اندرونی حدود میں اترے ہیں، ان کو قالب انسانی کے مختلف مقامات میں مختلف الوان انوار کے مراکز کا مشاہدہ ہوتا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ مستقل مقامات پر پر سرخ، سفید، سبز یا نیلگوں انوار کے نقطے قائم ہیں۔ان کے کھل جانے کے بعد آدمی پر ان نت نئے حالات کا انکشاف ہوتا ہے، جن کا صحیح اندازہ صرف عقل وحواس رکھنے والوں کو نہیں ہوسکتا۔

انوار باطنی کے ہی انشراح کا نام نبوت کی وہبی مقام میں ''شق صدر'' یا شرح صدر'' ہے اور جب کسب و کوشش ریاضیات و مجاہدات سے اس کے دروازے کھولے جاتے ہیں تو ان کو صوفیانہ اصطلاح میں ''لطائف واسرار'' کہتے ہیں۔کیا اس کے بعد اس میں شک رہ جاتا ہے کہ انسانیت کے عالم صغیر میں وہ چیز بھی موجود ہے جس کا پتہ آفاقی کائنات میں جن، بھوت، چڑیل وغیرہ الفاظ کی ذریعہ سے دنیا کی ہر قوم نے ہر زمانہ میں دیا ہے۔

الحاصل صفاتی لحاظ سے جن جن چیزوں کا مظاہرہ آفاق میں ہوا ہے نفس میں کسی نہ کسی طرح وہ سب چیزیں کسی نہ کسی پیمانے میں ضرور پائی جاتی ہیں صوفیہ کے نزدیک بھی یہی مطلب ہے، قرآن کی اس آیت کا جس میں آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ:

﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَیَّ﴾ (ص : ۷۵)

'میں نے آدم علیہ السلام کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے''۔

بالفاظ دیگر اپنی تمام صفات جلالی و جمالی، سلبی و ایجابی کا اسے مظہر بنایا ہے۔لیکن یہ صرف صفات کی حد تک بات تھی، الحاصل آفاق میں بھی انہی صفات کو فرض کر کے،'' کن فیکونی'' عمل کے زیر اثر ایجاد کا رنگ بخشا گیا اور پھر چھوٹی تقطیع پر اسی عمل کا ظہور النفس میں بھی ہوا۔

اب صرف ایک بات رہ گئی کہ اب تک خدا نے اپنے اسماء و صفات کو اپنے سے باہر فرض کیا یا پیدا کیا، لیکن خود اپنی ذات کو اپنا غیر فرض کر کے کوئی مخلوق نہیں بنائی، یہی وہ ارادہ تھا جس کا اعلان ملائکہ کے سامنے ازل میں:

﴿إِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْأَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (البقرہ : ۳۰)

سے کیا گیا، اور یہی کہ صفات کے اس نسخہ جامعہ میں یا عالم صغیر میں خود اپنے آپ کو اپنا غیر فرض کر کے۔

﴿نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (الحجر:۲۹)

کا اعلان کیا گیا، جمادات سے لے کر ملائکہ تک کو اس کے آگے جھکنے کا حکم ہوا، اور اب جا کر پیکر آدم احسن تقویم کے سانچے میں ڈھل کر خدا کا خلیفہ بن کر آیا، یہی مطلب ہے اس حدیث کا یعنی

خلق الله ادم علی صورته[1]

پس شخص کبیر یا آفاق کے لیے جس طرح ایک روح یا نقطہ مرکزی یا انا (خدا) تھا، اور ہے اسی طرح اس شخص صغیر میں بھی یک ایسا شعوری نقطہ پیدا ہو گیا۔ جس کو ہر شخص ہم میں سے "انا" یا "میں" وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے جس میں وہ سارے شیون و اوصاف ہیں جن پر شعوری یا غیر شعوری طور پر الوہیت کا دھوکا ہوتا ہے اور خدا جانے کتنوں کو ہوا ہے۔[2]

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، ابی عبداللہ، صحیح البخاری، کتاب الاستئذان باب بدء السلام، [۶۲۲۷] ص ۱۰۸۳، مکتبہ دار السلام، الطبعۃ الثانیہ، ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ

[2] گیلانی، مناظر احسنؒ، سید، الدین القیم، ص ۱۱۵ تا ۱۲۰

﴿الشوریٰ﴾

آیت: ﴿شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾ (الشوریٰ:۱۳)

''الدین (یعنی ایسا آئینی دستور جس پر زندگی کے دوسرے دور میں بدلہ دیا جائے اسی کو قانون بنا کر) جو تمہیں دیا گیا یہ وہی دین ہے، جس کی وصیت خدا نے نوح علیہ السلام کو کی اور جس کی وحی ہم نے تم پر کی اور اس کی وصیت ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کی اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی (اسی کی وصیت کی گئی مقصد یہ تھا اور ہے) کہ اس الدین (اسی دستور کو) قائم کرو اور اس میں بکھرو مت۔''

نسل انسانی کو خدا کی طرف سے پہلی آسمانی کتاب کون سی، کہاں اور کب ملی اس بارے میں قرآن کا بیان اجمال کا حامل ہے اس سلسلے میں قرآن میں چند پیغمبروں کے نام لینے کے بعد فرمایا:

﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾ (الشوری: ۱۶۴)

جس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کے نیک اور بدانجام کو علم وعمل کے نظام پر مرتب کرنے کے لیے اور اسکی تشریح وتعلیم کے لیے پیغمبروں کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی تصریح ہے کہ:۔

﴿شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾ (الشوری:۱۳)

ایک اور مقام پر یہ فرما کر کہ:

﴿أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ﴾ (المومنون:۶۸)

''کیا بات کو وہ سوچ نہیں رہے ہیں۔ یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے آباء اولین (اگلے باپ دادوں کو) نہیں دی گئی تھی۔''

اس امر کو واضح الفاظ میں صاف کر دیا گیا کہ انسانی زندگی کا قدرتی دستور العمل جس کی دین ومذہب کیش اور دھرم وغیرہ الفاظ سے لوگ تعبیر کرتے ہیں یہ انسانیت کا ایک مشترکہ موروثی[1] ترکہ ہے اور اصولاً ایک ہی دستور العمل ہے جس کی پابندی کا مطالبہ اس زمینی زندگی میں اول سے لے کر آخر تک بنی نوع انسان کی تاریخ کے ہر دور میں کیا گیا اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا، آخر قانون کا بنانے والا جب ایک ہو اور جس کے لیے قانون بنایا گیا ہو وہ بھی ایک ہو تو شکل وصورت، چہرہ وبشرہ، رنگ وروغن کے اختلاف سے یا زمین کے کسی خاص خطہ میں سکونت کی وجہ سے جو کسی دریا پہاڑ وغیرہ سے گھرا ہو یا کسی خاص خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا زبان کے اختلاف کی وجہ سے یا انسان جن چیزوں کو استعمال کرتا ہے ان کے بدل جانے کی وجہ سے کیا آدمی کی فطرت بدل جاتی ہے۔

بہر حال جیسا کہ مولانا گیلانی کا خیال ہے کہ زندگی کا وہی دستور کہن جو ہمارے آباؤ اولین کو ملا تھا۔ اصولاً اسی کا اعادہ، اسی کی تجدید کا عمل پچھلی نسلوں میں بھی ہوتا رہا اسی لیے دین یا زندگی کا یہ دستور العمل ہمارا ایک مشترک موروثی ترکہ ہے، البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عطا کیے ہوئے اس آئین کی حفاظت ونگرانی میں بوجوہ مختلف قومیں غفلتوں اور لاپرواہیوں کی شکار ہوتی رہیں۔

---

[1] یہ کتاب میں یہ لفظ ''مورثی'' لکھا ہے جبکہ یہ لفظ ''موروثی'' ہے دیکھئے گیلانی، مناظر احسن، سید، تدوین قرآن، مکتبۃ البخاری، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۳۸

خدا کی خالص تعلیم سے ہٹ ہٹ کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خود تراشیدہ رسوم اور دستوروں میں لوگ الجھے رہے۔ مختلف زمانوں اور ملکوں میں زیادہ تر پیغمبروں کی ضرورت اسی عام تاریخی حادثہ نے پیدا کی یعنی جب خدا کی خاص تعلیم اور ہدایت نامہ سے لوگ ہٹ گئے تو پھر اسی موروثی آئینِ کہن کی طرف واپس کرنے کے لیے حق تعالیٰ قوموں اور امتوں میں رسولوں اور پیغمبروں کو پیدا کرتا اور اٹھاتا رہا۔

چاہیے تو یہی تھا کہ مقنن کی شخصی وحدت اور جن کے لیے قانون بنایا ان کی نوعی وحدت کی بنیاد پر لوگ اپنے اس موروثی قانون کو ایک ہی قانون کی حیثیت سے دیکھتے مگر تصدیق وتوثیق، تصحیح اور تکمیل وغیرہ اغراض کے لیے متعدد پیغمبروں کا ظہور مختلف زمانوں میں جو ہوتا رہا یہ عجیب بات ہے کہ اسی ایک دستور العمل کے پیش کرنے والوں کے اس تعدد و کثرت کو دیکھ کر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مذہب دنیا میں ایک نہیں بلکہ متعدد اور بہت ہیں۔

بقول حضرت الاستاذ ایک ہی کتاب کو چند آدمی اگر کتب خانہ سے نکالیں تو چند لانے والوں کی وجہ سے کیا وہی ایک کتاب بھی چند ہو جائے گی۔ یقیناً کسی مصنف کی کتاب کے چند ایڈیشن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کتنا غلط فیصلہ ہوگا کہ مصنف کی یہ ایک کتاب نہیں بلکہ چند کتابیں بن گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ اپنی اس نسبت کا مدعی ہے یعنی پچھلی ساری آسمانی کتابوں کا اپنے آپ کو وہ آخری اور مکمل ترین ایڈیشن قرار دیتا ہے اور قوموں کے پاس اس کتاب کے جو پرانے مشتبہ اور مشکوک یا ناقص وغیرہ لے مکمل نسخے رہ گئے ہیں ان کے متعلق اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اس جدید ترین اور کامل ایڈیشن سے مقابلہ کر کے قومیں اپنی موروثی کتابوں کی تصحیح کر لیں، یہی اور صرف یہی ایک مطالبہ قرآن نے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا ہے، ظاہر ہے اس مطالبہ کا مطلب کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں کے پاس آسمانی دین اور مذہب اپنے آباؤ اجداد سے جو پہنچا ہے اس دین سے اور اس دین کا انتساب جن بزرگوں کی طرف ہے ان بزرگوں سے بے تعلق ہو کر قرآن کو بالکلیہ ایک جدید دین اور دھرم کی کتاب کی حیثیت سے مانا جائے یقیناً نہ قرآن ہی کا یہ مطالبہ ہے اور نہ قرآن کے ماننے والوں کی طرف سے یہ دعوت دنیا کے سامنے کبھی پیش ہوئی۔

حاشیے میں مولانا گیلانیؒ اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ:

*اسی سے اندازہ کیجئے کہ عبداللہ بن سلام صحابی رضی اللہ عنہ جو علماء بنی اسرائیل میں سے تھے، جب رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو انہوں نے عرض کیا کہ قرآن کے ساتھ تورات کی تلاوت بھی جاری رکھوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اقرأ هذا الليلة وهذا الليلة'' یعنی ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات۔ طبقات ابن سعد میں بھی ابوالجلاء الجونی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات ختم کرنے کا عام دستور اپنے لیے انہوں نے مقرر کیا تھا اور ختم کے دن لوگوں کو جمع کرتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن کی صحیح راہ نمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے، انجیل وتورات خیر ان کا تو پوچھنا ہی کیا میں سنسکرت سے واقف نہیں ہوں لیکن اردو میں اس کے بعض حصوں کا ترجمہ ہو گیا ہے اس کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا جو یجر وید کا ایک ٹکڑا تھا ایک جگہ مجھے یہ فقرہ اس کتاب میں ملا۔ ''یعنی اے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے، پودوں میں سے نکالا ہوا،

لے کتاب میں لفظ ''وغیر'' لکھا ہے جبکہ لفظ ''وغیرہ'' ہے دیکھئے تدوین قرآن، ص ۳۹

تاریکی کو دور کرتا ہوا، ماؤں سے شور کرتا ہوا پیدا ہوا ہے۔" (ادھیا۱۱/۴۳) کو کہتے ہوئے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے لیکن جو واقعہ پیش آیا اس کا اظہار کرتا ہوں، اس اشلوک نے معاً میرے دماغ کو قرآن کی ان آیتوں کی طرف منتقل کر دیا جن میں ارشاد ہوا ہے کہ "تم دیکھتے ہو اس آگ کو جسے تم پیدا کرتے یا نکالتے ہو، کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا، یا ہم ہیں اس کے اگانے والے"۔ (الواقعہ) قریب قریب یہی مضمون سورہ یسین میں بھی ہے۔ عام مفسرین عرب کے بعض خاص درختوں کا ذکر کر کے لکھ دیتے ہیں کہ ان کی شاخوں کو باہم رگڑ کر عرب آگ پیدا کرتے تھے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یجر وید کا یہ طرز تعبیر قرآن کے طرز تعبیر سے اس درجہ ملتا جلتا تھا کہ خیال گذرا کہ کیوں نہیں قرآن میں بھی 'درخت' کو عام درخت سمجھا جائے اور جیسے وید میں ہے کہ آگ خوبصورت بچہ ہے پودوں سے نکلا ہوا یعنی آگ کا ظہور لکڑی ہی کے جلنے سے ہوتا ہے اور اسی سے شور کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے، قرآن میں بھی کیا اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے *۔[1]

آج کروڑ ہا کروڑ کی تعداد میں مسلمان دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں یقیناً ان میں عیسائی، یہودی اور اسی قسم کے دوسری مذہبی امتوں کے لوگ بھی شریک ہیں۔ پھر کیا قرآن کو مان کر جو عیسائی تھے مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی کتاب انجیل کی تکذیب کی، یا جو یہودی تھے مسلمان ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام یا انبیاء بنی اسرائیل کی توہین کر رہے ہیں یا تورات اور تورات کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی جو کتابیں ہیں انہیں جھٹلا رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے جو دور ہو گئے تھے قرآن شریف کو مان کر وہی عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان کی صحیح تعلیم سے پھر قریب ہو گئے اور یہی حال ان ساری قوموں کے ساتھ پیش آیا ہے جو گذشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں قرآن کو مان مان کر اسلامی حلقے میں داخل ہوتی رہی ہیں یعنی اپنے آبائی اور موروثی دین کے جن اجزاء وعناصر کو لوگ کھو بیٹھے تھے یا تاریخی حوادث وواقعات نے ان کے دین کے جن حقائق ومسائل کو مشتبہ ومشکوک بنا کر رکھ دیا تھا۔ قرآن شریف کی راہ سے ان کھوئی ہوئی چیزوں کو انہوں نے پالیا اور شک وریب کی تاریکیوں میں جو باتیں رل مل گئی تھیں، قرآن کی روشنی میں اب یقین کی آنکھوں سے دیکھنے اور پالینے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ پس حقیقت یہی ہے کہ اپنے آباء اولین اور گذشتہ باپ دادوں کے دین سے قرآن پاک کو مان کر قطعاً کوئی الگ نہیں ہوا ہے بلکہ جو الگ ہوئے تھے بلاخوف تردید دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے آبائی دین ہی کی طرف خدا کی اس آخری کتاب نے ان سب کو واپس کر دیا ہے۔ اس نے توڑا نہیں ہے بلکہ جو ٹوٹے ہوئے تھے ان کو اپنے بزرگان سلف اور ان کی سچی تعلیم، صحیح زندگی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، واقعہ یہی ہے خواہ دنیا اس کو مانے یا نہ مانے قرآن کی دعوت وتبلیغ کا یہی محوری نصب العین ہے۔ بکھری ہوئی منتشر اور پراگندہ انسانیت کو اسی راہ سے وحدت ووفاق کے مرکزی نقطہ پر وہ "سمیٹ کر" لے آنا چاہتا ہے۔[2]

---

[1] اس بحث سے متعلق ضروری نوٹ "تدوین قرآن کے مقدمہ میں ملاحظہ فرمائیں"۔

[2] گیلانی، مناظر احسن، سید، تدوین قرآن، ص ۳۷-۴۲

آیت : ﴿لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (الشوریٰ:۲۷)

''اگر کھول دے اللہ روزی کو اپنے بندوں کے لئے تو بغاوت اختیار کرلیں گے زمین پر۔''

قدرتی پیداواروں پر قبضہ کر کے بعض لوگ تو ہم میں رزقی حیثیت سے بسطی حالت میں ہیں۔ اور بعض قدری زندگی میں مبتلا ہیں۔ لیکن بسط وقدر کی یہ حالت تو افراد کے حساب سے ہے۔ مگر اسی سوال کو اگر اس طریقہ سے اٹھایا جائے یعنی پوچھا جائے کہ ان قدرتی پیداواروں کی نوعیت افرادانسانی کی مجموعی حیثیت کی نسبت سے کیا ہے؟ تو قرآن کی مشہور آیت

﴿لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ﴾ (الشوریٰ:۲۷)

کا جو فتوی ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان پیداواروں کو جس پیانہ پر قدرت پیدا کر رہی ہے، قرآن کا بیان ہے کہ یہ ایسا پیانہ ہے، جس سے بہ حیثیت مجموعی العباد (یعنی خدا کے بندے) بسط کی حالت میں نہیں آسکتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں ہر ایک شخص اگر یہ چاہے کہ موجود زندگی میں ایسی آمدنی پر اسے اقتدار حاصل ہو کہ خرچ کے بعد ہم میں سے ہر ایک کے پاس کچھ پس ماندہ بھی رہ جائے تو مذکورہ بالا آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم حیات کے جس دور سے آدمی اس وقت گذر رہا ہے اس میں تو اس کا امکان نہیں ہے، معاشی پیداواروں کو جو پیدا کر رہا ہے۔ قصداً وارادۃً اس نے یہی چاہا کہ اس قسم کا بسط نہ پیدا ہو، ایسا کیوں چاہا گیا، گو اس کا جواب اسی آیت میں مذکور ہے، لیکن اس وقت میری بحث کے دائرے سے یہ مسئلہ خارج ہے کہ اس وقت تو صرف مجموعی حیثیت سے معاشی پیداواروں کے متعلق اس ''پیانہ'' کو صرف دریافت کرنا ہے، جس پیانے پر یہ چیزیں اس دنیا میں پیدا ہو رہی ہیں۔ مذکورہ بالا آیت سے اس پیانے کی یہ تو سلبی صفت معلوم ہوئی۔ یعنی مجموعی طور پر بسط کی حالت ان سے کبھی پیدا نہیں ہوسکتی اسی کے بعد یہ الفاظ ہیں۔

﴿وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ﴾ (الشوریٰ:۲۷)

''لیکن نازل کرتے ہیں ہم اس رزق کو اس پیانے پر جس پر چاہتے ہیں۔''

گویا سلبی صفت کے بعد پیدائش کے اسی پیانہ کی یہ ایک ایجابی واثباتی صفت کی طرف اشارہ ہے، یعنی قدرت کے نزدیک کوئی خاص پیانہ مقرر ہے، اسی مقررہ پیانہ کے مطابق پیدائش کا یہ سلسلہ جاری ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ الرزق یعنی معاشی پیداواروں کے متعلق بہ ظاہر کبھی جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوب پیدا ہوئیں، اور کسی سال محسوس ہتا ہے کہ پیدائش میں کمی ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی پیدائش کا کوئی قانون نہیں ہے گویا الل ٹپ جزافی طور پر کام چل رہا ہے۔ یہ نتیجہ قطعاً غلط ہے۔ بلکہ پیدا کرنے والے کے سامنے کوئی خاص پیانہ ہے، اور تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے وہ اسی مقررہ پیانے پر ان کو پیدا کرتے ہوئے چلا آرہا ہے۔ باقی یہ سوال کہ قدرت کے اس مقررہ چاہے ہوئے پیانے کی نوعیت کیا ہے؟ اس منفی صفت کے سوا یعنی مجموعی حیثیت سے بسط کی حالت کی توقع اس سے نہیں کی جاسکتی سورہ الحجر میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد یعنی

﴿وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ (الحجر:۲۱)

''نہیں ہے کوئی چیز مگر اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور انہیں نازل کرتے رہتے ہیں ہم ان کو لیکن ایک مقررہ معلوم پیانے پر''

جس میں گویا اسی مضمون کا اعادہ فرمایا گیا ہے، جو

﴿لٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ﴾ (الشوری:۲۷)

''مگر ہم نازل کرتے رہتے ہیں اس کو اس پیمانے پر جس پر ہم چاہتے ہیں۔''

کا مفاد ہے۔ یعنی وہی بات کہ پیدائش کا پیمانہ جانا بوجھا، مقرر کیا ہوا ہے، بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ جو الفاظ ہیں۔

﴿وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ﴾ (الحجر:۲۰)

''اور زمین میں ہم نے تمہارے جینے کا سامان کر دیا ہے۔ اور ان چیزوں کے جینے کا بھی جس کے روزی پہنچانے والے تم نہیں ہو۔''

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس میں اسی ''مقررہ'' اور ''معلومہ پیمانے'' کی ایک مزید ایجابی صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ''معائش'' کا جو لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ان ہی ذرائع اور وسائل کی تعبیر ہے، جن کے بل بوتے پر موجودہ زندگی گذر رہی ہے۔ گویا ''معائش'' ''الرزق'' ہی کی دوسری قرآنی تعبیر ہے، حاصل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نہ صرف ہمارے ہی لئے یعنی بنی نوع انسانی ہی کے لئے بلکہ ان کے لئے بھی جن کی روزی کا متکفل انسان نہیں ہے، سب ہی کے لئے ایسے پیمانہ پر یہاں چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، جن سے آدمی کی بھی زندگی گذر رہی ہے، اور جو آدمی کے زیر پرورش نہیں ہیں، ان کی بھی۔ اور یہی معاشی پیداواروں کے معلومہ و مقررہ پیمانے کی میرے نزدیک دوسری ایجابی صفت ہے جس کا سراغ قرآن سے ملتا ہے۔

اب خلاصہ یہ ٹھہرا کہ جن معاشی پیداواروں سے آدمی استفادہ کر رہا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ان میں بسط کی کیفیت کو قصداً و عمداً قدرت چاہتی ہے کہ نہ پیدا ہو، لیکن باایں ہمہ ایک ایسے مقررہ و معلومہ پیمانہ پر ان کی پیدائش کا سلسلہ جاری ہے کہ آدمی اور جو آدمی کے زیر پرورش نہیں ہیں ہر ایک کے لئے معائش (یعنی وہ وسائل جن پر زندگی موقوف ہے) مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ یہی اس پیمانے کی ایجابی صفت ہے، ایسی صفت کہ خشکی و تری، بحر و بر، جہاں کہیں بھی جو جی رہا ہے۔ اس کے لئے اسی کے مطابق روزی یا معائش مہیا ہو رہے ہیں، بلکہ وہ جیتا ہی اس وقت تک ہے، جب تک ''معائش'' اور ''رزق'' کے یہ ذرائع اس کے لئے فراہم ہوتے رہتے ہیں۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۱۴۔۱۱۵

﴿الزخرف﴾

آیت: ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ (الزخرف:۳۲)

''ہم ہی نے بانٹ دی ہے الحیٰوۃ الدنیا (پست زندگی) میں ان کی معیشت کو ان کے درمیان، اور اونچا کر دیا ہے ہم نے بعض کو بعض سے مدارج و مراتب کے لحاظ سے (یہ اس لئے کیا گیا ہے) تاکہ انسانوں میں بعض بعض سے کام لیں۔''

رزقی و معاشی حیثیت سے مراتب و مدارج کا جو اختلاف نسل انسانی کے افراد میں پایا جاتا ہے قرآن میں اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے۔

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾

اس کا مطلب آج ہی نہیں، صدیوں پہلے مشہور مفسر قرآن القاضی البیضاوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ای یستعمل بعضهم بعضافی حوائجهم فیحصل بینهم تالف وتضام ینتظم بذالک نظام العالم

یعنی انسانوں میں بعض بعض سے اپنی حاجتوں میں کام لیں اور اسی ذریعہ سے باہم انسانوں میں باہمی الفت پیدا ہوتی ہے۔ اور بعض بعض کے ساتھ مل گئے ہیں۔ عالم کے نظام کا انتظام اسی پر قائم ہے۔

حاصل اس کا کیا ہوا؟ یہی کہ نوع انسانی جن کے افراد فطرۃً وطبعاً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں، ان ہی کو بجائے توڑنے اور ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کے قصداً و ارادۃً خود پیدا کرنیوالے نے مدارج و مراتب کا یہ اختلاف پیدا کر کے یعنی معاشی لحاظ سے بعضوں کو بعض پر برتری عطا کر کے وحدت و وفاق کا ایسا نظام قائم فرما دیا ہے کہ ساری انسانی برادری گویا زنجیر کی کڑیوں کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے، مراتب و مدارج کا وہی معاشی نشیب و فراز ان کی وہی رزقی بلندی و پستی جسے کُرید کُرید کر آج ابھارا جا رہا ہے اور اسی اختلاف کو دکھا دکھا کر فساد و جدال، فتنہ و فساد کی جہنم انسانی بستیوں میں بھڑکانے والے بھڑکا رہے ہیں۔

امالہ کی ایک ہلکی سی تدبیر سے اسی اختلاف کو قرآن نے اتحاد و اتفاق کا کتنا مستحکم واستوار ذریعہ اچانک بنا دیا۔ دوسرے جس سے جُدائی کی فصل کاٹنا چاہتے ہیں، بلکہ کاٹ رہے ہیں، اسلام نے اسی کو میل ملاپ اور وصل کے سدا بہار پھول پیدا کرنے کی تدبیر سے بدل دیا۔ ایسی تدبیر کہ صرف ذہنی تصورات کے رخ کی ہلکی سی تصحیح اس کے لئے کافی ووافی ہے۔ غلط نقطہ نظر قائم کر کے جس واقعہ کو لوگوں نے اپنے اور اپنے بعد ساری انسانیت کے دُکھ کا ذریعہ بنا لیا تھا اب اسی میں راحت و آسائش کی ضمانت بلاشبہ نظر آ رہی ہے۔

اب کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اور بات ہے، ورنہ حق یہ ہے کہ احتیاجی تعلقات (جو قانون تفضیل بعض علیٰ بعض) کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ان ہی تعلقات کی بنیاد پر کسی آبادی کے افراد میں اس قسم کی وابستگیوں اور پیوستگیوں کا جو تماشا نظر آتا ہے کہ دھوبی کمھار کا برتنوں میں محتاج ہے، اور کمھار اپنے کپڑوں کے دُھلانے میں دھوبی کا، حجام زرگر کا، زرگر حجام کا، عالم طبیب کا، طبیب عالم کا، کیمیا

والے طبیعات والوں کے، طبیعات والے کیمیا والوں کے، اور اس طویل زنجیر کی تفصیل کا بجائے کتابوں کے ہر ملک اور ہر ملک کی ہر آبادی کے اوراق پر چلتی پھرتی تصویروں کی شکل میں ہر جگہ آپ بآسانی مطالعہ اور مشاہدہ کر سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سارا تماشا اسی تقسیم معیشت اور رفعنا بعضھم علیٰ بعض کے اسی شجرہ طیبہ یا مقدس درخت ہی کا تو ثمرہ ہے، جس کی مختلف شاخوں پر ہر آبادی کے مختلف افراد بیٹھے ہوتے ہیں، یا انسانیت کی زنجیر کے حلقوں کی شکل ہر ایک اختیار کئے ہوئے ہے۔

الی صل سب کو سب کچھ دے دیا جاتا، بجائے اس کے قدرت نے یہ طریقہ بنی نوع انسانی کے ساتھ اختیار کیا ہے کہ کچھ نہ کچھ سب کو دے کر ہر ایک کو دوسرے کا دست نگر بنا دیا ہے، اگرچہ قدر و قیمت کے اعتبار سے باہمی احتیاج کی یہ کیفیتیں بیسیوں شکلوں میں منقسم ہیں، لیکن افراد کی باہمی پیوستگی کا یہ نظام ہے تو اسی تفضیل بعض علیٰ بعض کے قانون کا نتیجہ، یعنی بعض کو بعض پر صفات و کمالات، عواطف و رجحانات کے حساب سے برتری عطا کی گئی ہے۔ اسی نے ہماری آبادی کو گویا اینٹوں کی اس دیوار کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ پر قائم اور اسی سے سہارا لئے ہوئے ہے انسانیت کا یہ مایہ ناز افتخار کہ ؎

جو عضوے بدرد آورد روزگار   دگر عضو ہا را نماند قرار

اگر سوچا جائے تو اس میں فطری انجذاب کے ساتھ ساتھ احتیاجی تعلقات کے ان مادی اسباب کا ہاتھ بھی یقیناً نظر آئے گا۔ اور اسی کا اثر ہے کہ باہم اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ کبھی الجھ بھی جاتے ہیں۔ تو بالآخر عموماً طبیعت غالب آ کر اس غیر طبعی کیفیت کا ازالہ کر کے تعلقات کو پھر سلجھا دیتی ہے، بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ دُنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں مختلف پیداواروں کی پیدا کرنے کی صلاحیت جو قدرت نے پیدا کی ہے، نظری وسعت و کشادگی سے اگر کچھ کام لیا جائے تو شاید اس قرآنی آیت

﴿وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ﴾ (الرعد:۴)

''اور زمین میں باہم ملے جلے قطعات ہیں، اور باغ ہیں انگوروں کے اور کھیت ہیں اور درخت ہیں کھجوروں کے چند تنے والے اور ایک تنے والے سینچے جاتے ہیں ایک ہی پانی سے اور برتری بخشتے ہیں بعض کو بعض پھلوں میں۔''

سے بھی ذہنوں کو چاہا جائے تو اسی واقعہ کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے، یعنی سب کچھ ہر ملک اور ہر ملک کے ہر علاقہ اور قطعہ میں جو نہیں پیدا ہوتا، بلکہ ضرورت کی مختلف چیزوں کو قدرت نے مختلف ممالک اور ان ممالک کے مختلف قطعات کے ساتھ جو مختص کر دیا ہے، کسی کو معدنیات، کسی کو زرعیات، کسی کو مصنوعات، اسی طرح مختلف حاجتوں کا مختلف، اقالیم اور کشوروں کے ساتھ خصوصی تعلق جو نظر آتا ہے میرے خیال میں تو یہ بھی وہی ''تفضیل بعض علیٰ بعض'' ہی کی یہ ایک وسیع شکل ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس ذریعہ سے کسی آبادی ہی کے افراد کو نہیں، بلکہ مختلف بلاد و امصار میں بکھری ہوئی انسانی برادری کو بھی باہم مربوط رکھنے کا کام قدرت لینا چاہتی ہے۔ اور لینا چاہتی ہے کیا معنی؟ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے دور دراز ممالک کے رہنے والوں میں مختلف قسم کے تعلقات جو نظر آتے ہیں۔ مواصلات کی جو آسانیاں آج مہیا ہیں جس زمانے میں ان کا پتہ بھی نہ تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ملک کے تاجر دوسرے ملکوں میں ہند والے سندھ میں، سندھ والے ایران میں، ایران والے عرب کے سواحل پر، عرب کے باشندے، بحر روم کے

کناروں پر فلیقیہ والے وینس اور یورپ کے دوسرے شہروں میں جو گھومتے پھرتے تھے۔ بتایا جائے کہ بجز اسی احتیاجی رشتہ کے اور کونسی چیز تھی جس نے کرہ زمین کے بعد المشرقین پر رہنے والوں کو یوں جوڑے رکھا ہے۔

یقیناً یہی قدرتی رشتہ تھا، جس میں مشرق بعید کے بعید تر نقاط مثلاً جاپان وچین کے باشندے اور مغربی آبادیوں کی آخری حدود تک کے رہنے والے اور جوان کے درمیانی علاقوں میں آباد تھے، سب کے سب تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے اور پھولوں کے ہار کے مانند ایک دوسرے کے ساتھ گتھے ہوئے تھے۔ ہر علاقہ کا آدمی دوسرے علاقہ میں گھومتا رہتا تھا، قافلوں کا ایک سلسلہ تھا، جورواں تھا، دواں تھا، ہر ملک کے باشندے دوسرے ملک کی پیداوروں کے لئے چشم براہ رہتے تھے، ہندوستان کے رہنے والے استنبول کے قالین، کاشان کے مخمل، چین کے ظروف کو فخریہ استعمال کرتے تھے۔ عرب کے رہنے والے سیف ہند یا تیغ ہندی کے بھروسہ پر اپنی زندگی کے دن کاٹتے تھے، اور میں کہاں تک تفصیل کروں کہ کہاں کہاں کے باشندوں کو کن کن ممالک کے جہازوں کا تری کی راہوں سے، اور کن کن علاقوں کے قافلوں کا خشکی کی راہوں سے انتظار رہتا تھا۔ جزیروں والوں کو دیکھا جاتا تھا کہ اپنے اپنے جزیروں کی پیداواروں کو لئے سمندر کی طرف جھانک رہے ہیں کہ ان کی ضرورت کی چیزوں کو بدلنے والے کب آتے ہیں۔

حتیٰ کہ ہمارے ملک ہندوستان میں مصری اور چینی کے الفاظ اسی زمانے کی تاریخی یادگاریں ہیں شکر کی خاص قسم کا نام مصری اس لئے رکھ دیا گیا تھا کہ مصر سے وہ ہندوستان آتی تھی۔ اور چینی کو بھی چینی اسی لئے کہتے تھے کہ چین سے وہ درآمد ہوتی تھی، انتہا یہ ہے کہ علاج ومعالجہ جیسی اہم ضرورت میں بھی ایک ملک بغیر کسی وغدغہ کے دوسرے ملکوں پر بھروسہ کرتا تھا۔ قدیم یونانی طب کے نسخوں میں روم کی مصطگی آرمینیہ کی گل (مٹی) کشمیر کا بنفشہ خطا (چینی ترکستان) کی بادیان اور کیا کیا بتاؤں کن کن ملکوں کی پیدا شدہ دوائیں کہاں کہاں استعمال ہوتی تھیں۔ بلکہ آثار قدیمہ والے دور دراز ممالک کے سکوں کو مختلف علاقوں میں پا پا کر آج جو متحیر ہو رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بغداد کا سکہ سائبیریا میں بلکہ ہندوستان کے ڈھلے ہوئے پیسے اور روپے میکسیکو (امریکہ) تک میں جو نکل رہے ہیں اگر ان قصوں کو بھی

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾

''ہم ہی نے بانٹ دی ہے الحیوۃ الدنیا (پست زندگی) میں ان کی معیشت کو ان کے درمیان اور اونچا کر دیا ہے ہم نے بعض کو بعض سے مدارج ومراتب کے لحاظ سے، (یہ اس لئے کیا گیا ہے) تا کہ انسانوں میں بعض بعض سے کام لیں۔''

کے قرآنی اشارے کی وسیع پیمانے پر تفسیر ہی سمجھا جائے تو اس کے انکار کی کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۵۲۔۱۵۵

آیت: ﴿ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴾ (الزخرف:۳۶)

''اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمٰن کی یاد سے تو پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے ایک شیطان کو، پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔''

قرآن میں ذکر اللہ سے انحراف کی پاداش میں اس مخفی سزا کا جو ذکر کیا گیا ہے، یعنی ارشاد ہے،

﴿ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴾

اور یہ ہے۔ درحقیقت ''ضنکی معیشت'' اور تلخ زندگی کے پھل کا وہ مخفی غیر مرئی درخت جس کے پھل کا مزہ تو ان میں سے ہر ایک کو چکھنا ہی پڑتا ہے۔ جن کی زندگی، ذکر اللہ سے کٹ کر گذرتی ہے، اب آپ ہی بتائیے کہ درخت ہی جب تک اکھاڑا نہ جائے گا، پھل کے پھلنے کو کون روک سکتا ہے، کیسے روک سکتا ہے، اور انسانی فطرت کے جگر میں جڑ قائم کرنے والا یہی وہ درخت ہے جس کے اکھاڑنے اور نکالنے کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ جس چیز کی حرارت سے وہ مرجھاتا ہے، مرجھا کر گرتا ہے، گرنے کے بعد خود بخود اس کی جڑ نکل جاتی ہے، اسی حرارت کے مہیا کرنے کا سامان کیا جائے۔

جو نہیں جانتے کہ خود میں کیا ہوں، وہی پوچھتے ہیں کہ یہ ''الشیطان'' آخر کیا بلا ہے، خدا جانے دینے والے اس کا کیا جواب دیتے ہیں، لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ بیچارا کچھ نہیں ہے، صرف قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے، پیدا کرنے والے نے انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لئے زمین کے اس کرہ پر بسایا ہے۔ جو جس حد تک اس قدرتی نصب العین سے ہٹتا ہے۔ نہ رکنے والے کوڑے کی شکل میں وہی ان پر برستا ہے، برستا چلا جاتا ہے، ٹھیک جیسے بل سے نکلنے والے چوہے کو بلی دبوچ لیتی ہے، اپنے نصب العین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے، اس کو اسی لئے بنایا گیا ہے، یہی اس کا کام ہے، ایک جگہ نہیں قرآن میں مختلف مقامات میں

﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (الحجر:۴۲)

''میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں''۔

کے اعلان کے ساتھ اس کو حکم دیا گیا ہے۔

﴿وَ اَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِکَ وَ رَجِلِکَ وَ شَارِکْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَ عِدْهُمْ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل:۶۴)

''اور چڑھ جا ان پر (آدم کی اولاد پر) اپنے سوار اور پیادوں کے ساتھ اور ساجھی بن جا ان کے اموال اور اولاد میں، اور وعدوں (کے سبز باغ دکھا) ان کو، اور نہیں وعدے کرتا ہے ان سے شیطان مگر صرف فریب۔''

''الاولاد'' کے ساتھ ''الاموال'' میں جن لوگوں کے وہ ساجھی اور شریک بن جاتا ہے، یقین مانئے کہ ان ہی مسکینوں کو ''دخل'' کی شکل میں ہو، یا ''خرچ'' کی راہوں میں، ہر حال میں مغالطی احساسات میں مبتلا کرتے ہوئے وہ گھسیٹے لئے چلا جاتا

ہے۔ الحرانی زندگی گذارنے والوں کو اس حال میں جو دیکھا جاتا ہے کہ چیختے بھی جاتے ہیں، چلاتے بھی جاتے ہیں، جلتے بھی جاتے ہیں اور گھٹتے بھی جاتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ بڑھتے بھی جاتے ہیں چڑھتے بھی جاتے ہیں، تو درحقیقت وہ خود نہیں بڑھتے، خود نہیں چڑھتے، قرآن کی روشنی میں دیکھئے اس شیطان کو جو انھیں دبوچے ہوئے بڑھاتا اور چڑھاتا جاتا ہے۔ اسی موقعہ پر شیطان کی زبانی قرآن میں یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ اس نے آدمؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا لاحتنکن ذریتہ (میں ڈھاٹی لگاؤں گا اس کی اولاد کو) گدھوں اور گھوڑوں کے منہ پر بجائے لگام کے لوگ رسی باندھ کر بھی کھینچتے ہیں، اسی کو اردو میں کوٹھری لگانا اور عربی میں احتناک کہتے ہیں، بہار میں ٹھری لگانا کہتے ہیں۔ یعنی جیسے گدھوں اور گھوڑوں کو ٹھڑی لگا کر لوگ لے چلتے ہیں جو گدھوں اور گھوڑوں کی تذلیل کی شکل ہے۔ شیطان نے بھی دعویٰ کیا کہ انھیں گھسیٹوں گا اور ذلت کے ساتھ گھسیٹوں گا گھسٹنے والوں کا یہ تماشا کتنا دردناک ہے، گویا وہی مثل ان پر صادق آتی ہے کہ کمل کو یہ نہیں چھوڑتے،۔۔۔ بلکہ کمل ہی انھیں نہیں چھوڑنا چاہتا۔ جب تک کہ وہی پڑھ کر اس پر نہ پھولکا جائے جس کے سوا دنیا کے کسی جھاڑ اور پھونک کو وہ نہیں سنتا، صحیح حدیثوں میں آیا ہے،

اذا ذکر الله خنس

جب آدمی، اللہ کو یاد کرتا ہے تب ہی وہ پیچھے سرک جاتا ہے۔

ورنہ جب تک یہ نہیں ہے، اس کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں درحقیقت غنا بخشی کی قوت نہیں ہے باور کرائے کہ وہی آدمی کو غنی بناتی ہے، خلود بخشی کی خاصیت سے جو واقع میں محروم ہے، دھوکہ دیتا رہے کہ وہی خلود بخش ہے۔ جن اعمال وافعال کا بالآخر کوئی نتیجہ نہیں، باور کراتا رہتا ہے کہ وہی نتیجہ خیز ہیں، جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا، سکھاتا رہتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا ہے، الغرض جو ہے، شیطانی تسلیط کے بعد نظر آتا ہے کہ وہی نہیں ہے، اور جو نہیں ہے، عجیب بات ہے کہ آدمی دیکھتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ وہی ہے یہی ترجمہ ہے، آیت کریمہ قرآنیہ کا

﴿وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (النساء:۱۲۰، بنی اسرائیل:۶۴)

''اور نہیں وعدہ کرتا ہے ان سے شیطان لیکن صرف فریب اور دھوکہ''۔

[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۲۳۵۔۲۳۷

﴿الفتح﴾

آیت : ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح:۲۹)

''کافروں پر وہ سخت ہیں۔اور باہم ایک دوسرے پر مہربان''۔

چند لفظوں کا ایک مختصر سا جملہ قرآن میں ہے۔مگر فطرت انسانی کے وہ سارے صفات جن کی شدت وصلابت سے دنیا چیخ اٹھی ہے۔غصہ،بغض وعداوت،حسد،الغرض وہ سب کچھ جن سے دوسروں کو دکھ پہنچتا ہے،بجائے اس بات کے کہ مسلمانوں کو یہ حکم دیا جاتا کہ اپنے نفس سے ان رذائل کو مٹانے کی کوشش کریں،یعنی ان کے ازالہ کا حکم دیا جاتا۔آپ دیکھ رہے ہیں کفر کی طرف ان کے رخ کو پھیر کر شدت کے ان ہی صفات کو اسلام نے کتنا کارآمد اور قیمتی بنا دیا۔کفر کس چیز کا نام ہے ان ہی چیزوں کا تو جنھیں اختیار کر کے اپنے ہاتھوں آدمی خود اپنے آپ کو اپنی توانائیوں کو خطرناک انجام تک پہنچا دیتا ہے۔کیسی عجیب بات !جن صفات کی سختیوں سے انسانیت جاں بہ لب تھی۔صرف ایک اشارے میں قرآن نے ان ہی کو ذریعہ بنا دیا خس وخاشاک کے اس انبار کی صفائی کا جس کا قرآن کی اصطلاح میں کفر نام ہے،جن سے زحمت ہو رہی تھی وہی بنی آدم کی خدمت کے وسائل بن گئے۔[1]

---

[1] گیلانی،مناظر احسن،سید،اسلامی معاشیات،ص ۱۲۶۔۱۲۷

﴿الذاریات﴾

آیت: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات:۵۶)

''نہیں پیدا کیا میں نے الجن اور الانس کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کیے چلے جائیں۔''

فطرت انسانی کا جبر نما اختیار جو بالآخر آدمی کو اس مقصد تک خود پہنچا دیتا ہے، جس کے لیے وہ پیدا ہوا، مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں اختیار اور اس کی وسعت کے امکانات کا احساس ہم میں آرزوؤں اور تمناؤں کے طوفان برپا کرتا رہتا ہے، اور دوسری طرف ہمارے محدود اختیارات، ہماری نارسائیاں اور تمناؤں کی شکست اور ناکامیاں مجبور کرتی ہیں کہ غریب انسان اپنی ذلت کی پیشانی کسی کے آگے جھکا دے اور سوال یا بھیک کا ہاتھ کسی کی طرف اٹھائے۔ اسی کو عبادت اور دعا کہتے ہیں، اسی کی مختلف شکلوں اور بھیسوں کا نام نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ ہے۔ کس کے آگے جھکے؟ کس سے مانگے؟ بلاشبہ اس میں بنی آدم کے مختلف طبقات مختلف رہے ہیں، لیکن نفس کے جھکنے اور مانگنے سے تو عموماً کسی نے انکار نہیں کیا۔ اور یوں یہ اہم سوال کہ ''عالم کو خدا نے کس لیے پیدا کیا؟'' اس سوال کا زندہ جواب بن کر وہی ہستی سامنے آجاتی ہے، جو خلافت کے قالب میں خدائی کمالات لے کر پیدا ہوئی تھی اور اب بندہ بن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ خلافت اور عبدیت کی یہی کش مکش ہے جس نے انسان کی اس ارضی زندگی کو آزمایش اور ابتلا کی زندگی بنادی ہے۔ الغرض اب جا کر فطرت انسانی کے پیچ در پیچ قوانین نے مذکورہ بالا آیت قرآنی کی تفسیر کردی، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس کن فیکونی کائنات کا ہر ذرہ رب قیوم کے جب مسلسل عمل تخلیق اور التفات و توجہ کا محتاج اور دست نگر ہے، تو اس میں یہ مختار نما مجبور انسان اگر کچھ کر سکتا ہے تو صرف یہی کہ اپنے اختیار کو بجائے ناقص علوم اور ناقص تجربوں کے علم محیط کلی کے ماتحت کردے یعنی خدا کے بتائے ہوئے قانون کو اپنے اوپر عائد کرلے اور خود ﴿ایاک نعبد و ایاک نستعین﴾ (تجھی کو ہم پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔) کہتے ہوئے اس کے آگے جھک جائے، جس کے سامنے جھکنے کے لئے وہ پیدا ہوا ہے، اسی سے ہر معاملے میں صراط مستقیم کا طلب گار ہو جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، وہ اسی لیے پیدا ہوا ہے اور وہ سوچے تو اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا، بلکہ جیسا کہ بتایا گیا تھا کہ انسان اپنے وجود کا مقصد اس (عبدیت) کے سوا کچھ نہیں بتا سکتا، عبدیت کے مقام سے ہٹ جانے کے بعد معلوم ہو چکا ہے کہ انسان پھر کسی مقام پر ٹھہر کر اپنی ہستی کو کارآمد اور نظام کائنات کا مفید جز ثابت نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد وہ قطعاً سدی (یعنی معطل) اور عبث بن کر رہ جاتا ہے، جس کی طرف قرآنی آیات۔

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا﴾ (المومنون: ۱۱۵)

کیا آدمی یہ سوچتا ہے کہ اسے لا حاصل بنا کر ہم نے پیدا کیا ہے؟

﴿أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى﴾ (القیمة: ۳۶)

کیا آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ بے نتیجہ بنا کر چھوڑ دیا جائے گا؟

میں اشارہ کیا گیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۱۴۹-۱۵۰

﴿الطّور﴾

آیت: ﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ﴾ (الطور:۳۵)

''کیا انسان نیست محض (غیر شی) سے پیدا ہوا ہے؟ یا اس نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا ہے''۔

آریوں نے غل مچا رکھا ہے کہ مسلمانوں کا ایک عام عقیدہ یہ بھی ہے کہ عالم نیست محض سے ہست ہوا ہے۔ حالاں کہ پیغمبروں کا تجربہ یہ ہے کہ موجودہ نظام ہستی ایک خود بخود ہستی کی جلوہ گاہ ہے اور اس کا مطلب بغیر اس کے اور کیا ہے کہ ہستی ہستی ہی سے پیدا ہوئی ہے، اور مسلمان جب اس خود بخود ہستی کو جس پر کائنات کی بنیاد قائم ہے، ازلی مانتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ وہ نیست سے ہست نہیں ہوا ہے یا یہ کہ ''وہ نہ تھا اور پھر ہو گیا'' ایسا نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ سے ہے، تو پھر ان پر آریوں کی یہ تہمت نہیں تو اور کیا ہے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمان جب عالم کو خدا سے پیدا شدہ مانتے ہیں تو ہستی سے ہستی کو نکلی ہوئی تسلیم کرتے ہیں یا نیستی سے عالم کو نکالتے ہیں؟ بلاشبہ جس کا عقیدہ یہ ہو کہ ''خدا نہ تھا اور پھر کچھ مدت کے بعد ہست ہوا'' ان پر ضرور یہ سوال وارد ہو سکتا ہے کی نیستی سے ہستی کس طرح پیدا ہوئی؟ لیکن جو خدا کی ہستی کو ہمیشہ ہمیشہ سے ازلی مانتے ہیں ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ نیستی سے ہستی کے پیدا کرنے کے قائل ہیں بالکل عجیب بات ہے۔ قرآن پاک میں اس نظریہ کی طرف مذکورہ بالا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ نیستی سے ہستی کی پیدائش کو ہم سوچ ہی نہیں سکتے اور اس سے بھی زیادہ جھوٹ یہ ہوگا کہ ہم اپنے آپ کو اپنا خالق مانیں۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص۷۶، ۷۷

﴿النجم﴾

آیت: ﴿إِنْ هِيَ إِلَّآ أَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَآبَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ﴾ (النجم:۲۳)

''نہیں ہے وہ (یعنی جن چیزوں کو کفار پیدائش وتخلیق کا وسیلہ وذریعہ خیال کرتے تھے) لیکن چند نام (یا الفاظ) جسے رکھ لیا ہے تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں اتارا اللہ نے ان کیلئے سلطان نہیں پیروی کرتے ہیں وہ لیکن صرف اٹکل کی اور ان باتوں کی جنھیں انکا جی چاہتا ہے۔''

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر انسانوں ہی کے مسلمات ان ہی کے نظریات کے متعلق

مَّآ أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ (النجم:۲۳)

''نہیں اتارا خدا نے اس کے لئے سلطان''

یا

﴿فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ﴾ (ابراہیم:۱۰)

''لاؤ کوئی کھلا ہوا ''سلطان''

وغیرہ کے مطالبات جو پائے جاتے ہیں۔ان سے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مختلف چیزوں کی پیدائش کی جو مختلف راہیں اس عالم میں پائی جاتی ہیں، اور ہم اپنے معلومات وتجربات کی بنیاد پر ان کے متعلق جو نظریات وقوانین بناتے رہتے ہیں۔قرآنی تعلیم کے لحاظ سے ان قوانین کے ایک سلسلہ کو تو ہم سلطانی قوانین کہہ سکتے ہیں اور اسی کے مقابلے میں دوسرے سلسلہ کا ''غیر سلطانی قوانین'' نام رکھا جاسکتا ہے۔

''سلطانی قوانین'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بادشاہی قوانین ہیں، یعنی حق تعالیٰ کو بادشاہ اور سلطان قرار دے کر ان کے بنائے ہوئے قوانین کو سلطانی قوانین کے نام سے میں موسوم کررہا ہوں، اردو میں سلطان کے معنی چونکہ بادشاہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے قدرتاً لوگوں کا ذہن شاید اسی طرف منتقل ہو جائے۔ضرورت ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں کی جن سے قوانین کی یہ تقسیم پیدا ہوتی ہے۔شرح کرلی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان میں سلطان کے لفظی معنی ''غلبہ'' اور ''تسلط'' کے ہیں۔ چونکہ سلاطین کو بھی ملک پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔اس لئے سلطان کے لفظ کا ان پر بھی اطلاق ہونے لگا۔مگر ان آیتوں میں ''سلطان'' کا لفظ دراصل غلبہ اور استیلاء تسلط ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تو سلطان کے لفظ کی تحقیق ہوئی، دوسرا لفظ جو یہاں قابل غور ہے وہ ''ماانزل اللہ'' میں ''انزل'' کا لفظ ہے۔انزل کا مادہ نزول ہے۔نزول کے معنی اترنا اور انزال کے معنی اتارنا ہے، عام طور پر قرآن کی طرف بھی تنزیل وانزال کے الفاظ قرآن میں چونکہ منسوب کئے گئے ہیں۔اس لئے دوسری چیزوں کی طرف بھی جب اس لفظ کو حق تعالیٰ کی نسبت سے منسوب کیا جاتا ہے، تو پہلا خیال اسی تنزیل اور انزال کے معنی کی طرف چلا جاتا ہے۔جو قرآن کے متعلق سمجھے جاتے ہیں۔مثلاً

﴿مَّآ أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ﴾ (النجم:۲۳)

''نہ اتارا خدا نے اس کے لئے سلطان''۔

کے متعلق عموماً ذہن ادھر منتقل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے متعلق کوئی وحی نہیں ہوئی۔ یا پیغمبروں کو کوئی علم

اس کے متعلق عطا نہیں ہوا۔ اگر اس آیت میں بھی ''انزل'' کے یہی معنی لئے جائیں گے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سلطانی قوانین سے مراد وہ قوانین ہوں گے۔ جن کے قانون الٰہی ہونے کی تصریح قرآن میں یا رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں کی گئی ہو، اور غیر سلطانی قوانین سے مراد وہ باتیں ہوں گی، جن کی تصریح شریعت میں نہ پائی جاتی ہو لیکن سچ یہ ہے کہ محض ''انزل'' کے لفظ کی بنیاد پر اگر ایسا سمجھا جاتا ہے۔ تو خود قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کون نہیں جانتا کہ قرآن میں ''الحدید'' لوہے کے متعلق بھی یہ آیت پائی جاتی ہے۔

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ (الحدید:۲۵)

اتارا ہم نے لوہے کو جس میں بہت زیادہ زور بھرا ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ ''الحدید'' یعنی لوہے کے متعلق یہ باور کرنا کہ حق تعالیٰ نے کسی پیغمبر پر اس کی بھی وحی کی از عقلاً صحیح ہے نہ نقلاً بلکہ اس کا صاف کھلا ہوا سلفاً عن خلف یہی مطلب سمجھا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے لوہے کو پیدا فرمایا'' جس سے معلوم ہوا کہ ''انزل'' کے لفظ کو صرف الہام و وحی کے ساتھ مختص کرنے پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

اب ان لغوی تشریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہ ظاہر خیال میں یہی بات آتی ہے کہ اس دنیا کے کچھ قوانین تو ایسے ہیں جن میں خدا نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے۔ یعنی اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ ان کی واقعیت کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً آگ جلاتی ہے، مرچ تلخ ہے، سنکھیا قاتل ہے۔ آفتاب روشن ہے، گرم ہے، قدرت کے ان ہی قوانین کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی اصطلاح کی بنیاد پر میں ''سلطانی قوانین'' قرار دیتا ہوں، اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں جن کے ساتھ انسان کی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے۔ وہی غیر سلطانی باتیں سمجھی جائیں گی۔ اس تقسیم کے بعد اب بآسانی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائش و تخلیق کی وہ واضح اور کھلی ہوئی راہیں جن کے آثار و نتائج کا کسی حال میں کسی طرح انکار ممکن نہ ہو، انسانی فطرت پر جن قوانین کی سلطانیت اور تسلط کی یہ کیفیت ہوگی۔ خدا کے ان سلطانی قوانین کا سنۃ اللہ ہونا یقینی ہے۔ اسی لئے اس کو چھوڑ کر کسی اور راہ سے ان چیزوں کی پیدائش اور حصول کی کوشش کرنے والے۔ مثلاً بغیر بیوی کے اولاد کو ڈھونڈھنے والے، جوتے بوئے بغیر لہلہاتی فصلوں کی آس لگانے والے، سنکھیا کھا کر زندگی کی امید رکھنے والے، خدا کے مقرر کردہ قوانین کے متعلق باغیانہ اعتدائی طرز عمل اختیار کر کے گویا اس سے لڑنے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہیں۔

لیکن معاشیات ہو، یا سیاسیات، طبیعیات ہو یا عمرانیات، یا اسی قسم کے عام عقلی و ذہنی علوم، ان کے تمام نظریات و مسلمات کے متعلق یہ فیصلہ کہ ان میں سے کسی نظریہ یا کسی مسلمہ کی خلاف ورزی، خدا کی سنت یا سلطانی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتنی بڑی زبردستی ہے۔ جزئیات تو خیر جزئیات ہیں ان عقلی علوم و فنون کے کلیات بلکہ اساسی مقدمات تک بھی ابھی مشتبہ اور محل نظر و بحث ہیں، طبیعیات ہی کو لیجیے جن پر ہزار ہا ہزار سال سے انسانی عقل مسلسل کام کرتی چلی آرہی ہے۔ لیکن تفصیلات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اس علم کے مختلف دبستانوں مثلاً ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک کے بنیادی مقدمات ہی میں آسمان و زمین کا فرق ہے، ایک میں ضد کو ضد سے دفع کرنے کا تجربہ پیش کیا جاتا ہے اور اس کا سارا معالجاتی نظام اسی اساس پر مبنی ہے۔ دوسرے میں بالکل اس کے خلاف، علاج بالمثل کے نظریہ پر اصرار کیا جاتا ہے علاج کے ان دونوں متصادم و متخالف نظاموں سے لوگوں کو شفا بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی ہے اب فرض کیجیے کہ ایلو پیتھک طریقہ علاج کو ترک کر کے کوئی ہومیو پیتھک والوں کی طرف رجوع کرتا ہے، تو کیا اس پر الزام لگانا درست ہوگا کہ وہ قدرت کے قانون سے جنگ کرتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے طبی تجربات اور علاجی نظریات اس وقت تک اپنے تاثیری نتائج کے لحاظ سے عموماً ایسے حال میں ہیں کہ ان کی غیر قطعی یا غیر سلطانی کیفیت کی وجہ سے اگر کوئی علاج و معالجہ کی نفع بخشی کا بھی منکر ہو جائے تو جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، ایسے آدمی پر بھی سنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام شاید قرین انصاف نہ ہوگا۔

ایسی صورت میں غور کرنے کا مقام ہے کہ پیدائش کی راہوں کے متعلق غور وفکر کا جو سلسلہ جاری ہے اور اس وقت تک ان ہی کو پیش نظر رکھ کر انسانی زندگی کے معاشی پہلو کے متعلق جو قوانین اور کلیات آئے دن بن رہے ہیں کبھی سرمایہ داری کے نظام میں انسان کی فردوس گم گشتہ کا سراغ لگایا جاتا ہے، اور مشورہ دیا جاتا ہے کہ سود خواری یا اولاد کبیر کی توریث۔ الغرض گنج سے گنج کھینچنے میں جس قوم کے افراد جس حد تک کامیاب ہوں گے۔ اسی حد تک اس قوم کا معاشی نظام ترقی کی منزلوں کو طے کرے گا۔ کبھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ انسان اگر اپنی کھوئی ہوئی جنت کو پھر پانا چاہتا ہے، تو ان تمام راہوں کو بند کر کے جن سے ملک وقوم کے خاص خاص افراد کی جیبوں میں دولت سمٹتی ہو، حکم دیا جاتا ہے کہ جو ہم میں غریب ہیں۔ وہ تو خیر غریب ہی ہیں۔ لیکن آدم کی اولاد میں تھوڑے بہت امیروں کی جو مقدار ہے، بزور شمشیر ان کو بھی غریب بنا دیا جائے۔ مجھے اس سے ابھی بحث نہیں کہ سرمایہ دوستی اور سرمایہ دشمنی ان دونوں متخالف نظریات میں معاشی فلاح و بہبود کے لحاظ سے صحیح کون ہے اور غلط کس کو قرار دیا جائے۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ جن علوم وفنون میں آئے دن ایسے متناقض نظریات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ ان ہی نظریات کو سلطانی فیصلوں کے رنگ میں پیش کرنا، خود بھی ان پر حد سے زیادہ اصرار کرنا۔ اور دوسروں کو بھی ان کے ماننے پر مجبور کرنا۔ اور اس حد تک مجبور کرنا کہ جس بدقسمت کو تھوڑا بہت بھی ان سے کچھ اختلاف ہو، ان پر سنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام لگا دینا کہاں تک درست ہوسکتا ہے، بلکہ حکیمانہ تحقیق (سائنٹفک ریسرچ) کا اقتضاء تو یہ تھا کہ لفظی سطوتوں، لسانی طنطنوں، افسانوی مغالطوں، شاعرانہ پیتروں سے دماغوں کو بالکلیہ آزاد کر کے اعتمادی کیفیت کو قوانین کے سلطانی رنگ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا، جن چیزوں میں سلطانیت کا رنگ تیز نظر آتا۔ اسی حد تک اعتماد ووثوق کی کیفیت میں بھی تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اور جس میں جس حد تک سلطانیت کا رنگ دھیما محسوس ہوتا ہے۔ اعتمادی کیفیت کے احساس پر بھی اسی حد تک کم زور دیا جاتا۔ اصل حقائق کی واشگافی کا یہی اور صرف یہی محتاط اور محفوظ ترین طریقہ ہے۔ اور یہی آزاد تنقیدی ذہنیت ہوسکتی تھی جسکے پیدا کرنے کے لئے قرآن میں اس قسم کی آیتوں کا مثلاً

﴿اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَی الْاَنْفُس﴾ (النجم:۲۳)

''نہیں ہے وہ (یعنی جن چیزوں کو کفار پیدائش وتخلیق کا وسیلہ و ذریعہ خیال کرتے تھے) لیکن چند نام (یا الفاظ) جسے رکھ لیا ہے تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں اتارا اللہ نے ان کیلئے سلطان نہیں پیروی کرتے ہیں وہ لیکن صرف اٹکل کی اور ان باتوں کی جنھیں اٹکا جی چاہتا ہے۔''

﴿مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا﴾ (النجم:۲۸)

''نہیں ہے ان کو اس کی دانش (صحیح) نہیں پیروی کر رہے ہیں وہ لیکن اٹکل کی اور اٹکل ''واقعہ'' سے آدمی کو بے نیاز نہیں کرسکتا''۔

بار بار اعادہ مختلف پیرایہ بیان سے کیا گیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۸۳۔۸۵

آیت : ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی﴾ (النجم:۲۹)

''نہیں ہے آدمی کے لئے مگر وہی جو اس نے کمایا اور قریب ہے کہ دکھلائی دے اسے اپنی کمائی''۔

قرآن کا مشہور قدرتی قانون

﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی﴾

کا تعلق جس طرح اخری معاملات اور نتائج سے ہے، اسی طرح یہ قانون دنیاوی کاروبار پر بھی چسپاں ہے، جیسے معادی زندگی میں ہر شخص اسی کے پانے کا حقدار ہوگا جو اس نے کمایا ہے اور اس کے سامنے اس کی کمائی ہی نتیجے کی شکل میں پیش ہوگی۔ یوں ہی معاشی زندگی میں ہر ایک کا نصیب اور حصہ اس کی محنت اور مشقت و کاوش کی مناسبت ہی پر مبنی ہے۔ وہ جتنی محنت و جاں فشانی کرتا ہے، اسی حساب سے وہ حصہ بھی پاتا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص۲

﴿الحدید﴾

آیت: ﴿ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾ (الحدید:۲۰)

''جانو اس بات کو، کچھ نہیں ہے یہ پست زندگی لیکن لعب (کھیل) اور لہو (غفلت) اور زینت (بناؤ سنگار) اور باہم آپس میں تفاخر (ایک دوسرے مقابلہ میں فخر کرنا) اور اموال (سرمایہ) اولاد کی کثرت میں مقابلہ مانند بارش کے کہ مسرور کرتی ہو کسانوں کو اس کی روئیدگی، پھر لہرانے لگتی ہیں (وہی روئیدگیاں) پھر دیکھتے ہو کہ پیلی پڑ گئیں وہی، پھر ہو جاتی، ہیں وہی چور چور (اور اس پہلے تماشے حیوۃ دنیا کے بعد) پچھلی زندگی میں سخت مار ہے اور مغفرت بھی اللہ کی طرف سے اور رضوان بھی ہے (یعنی حق تعالیٰ کی رضامندی) اور نہیں ہے یہ پست زندگی لیکن صرف فریب کا ایک سرمایہ۔''

قرآن مجید کی آیت

﴿ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴾

میں آدمی کی موجودہ پست دنیاوی زندگی کو بہ ظاہر پانچ ادوار میں جو تقسیم کیا گیا ہے، مشاہدہ سے بھی جس کی تصدیق ہو رہی ہے یعنی پیدا ہونے کے بعد آدمی پر پہلا حال جو طاری ہوتا ہے اس کی تعبیر لعب سے کی گئی ہے، لعب کھیل کود کا نام ہے بالفاظ دیگر ایسے اعمال وافعال جو اپنے اندر کسی نتیجہ کو نہیں رکھتے۔ عام خیال یہی ہے کہ بچپن میں بچے مثلاً مٹی خاک دھول کے گھروندے بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں، حالانکہ نہ ان گھروں میں کوئی رہ سکتا ہے نہ ان سے اور کسی قسم کا فائدہ کوئی اٹھا سکتا ہے، اس قسم کا کام آدمی صرف ابتدائی زندگی ہی میں کرتا ہے، اس وقت تک کرتا رہتا ہے جب تک اس میں دنیا کے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہ دور گذر جاتا ہے تو اس کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے، شائد اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی، ایام طفولیت کے کسی دور کے گذرنے کے بعد جو کچھ عام حالات میں کرنے والے کرتے ہیں، پہلے ان کی فہرست مرتب کر لینی چاہئے۔ تب معلوم ہو سکتا ہے کہ اس عام خیال میں حقیقت کا حصہ کتنا شریک ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور لعب والے کے گذرنے کے بعد یہ چار دور آدمی پر اور آتے ہیں۔

۱) لہوی دور کے معنی غفلت کے ہیں، طفولیت کے ختم ہونے کے بعد جب شبابی محرکات کا انسانی دماغ پر استیلا ہوتا ہے، وہی جس کا نام جوانی دیوانی رکھا گیا ہے، یہ غفلت اور سرمستی کا دور ہوتا ہے، ہر چیز سے غافل ہو کر عام حالات میں دیکھا یہی جاتا ہے کہ لوگ ان ہی جذبات اور ولولوں میں ڈوب جاتے ہیں جن کا تقاضا جوانی کے ان دنوں میں زور پکڑتا ہے۔

۲) پھر اسی کے ساتھ ساتھ اور اسی کے پیچھے پیچھے بننے اور سنورنے کا جذبہ آدمی پر مسلط ہوتا ہے صورت شکل کیسی ہی کچھ کیوں نہ ہو، لیکن جسے بھی دیکھئے نظر آتا ہے کہ اپنے بالوں کے ساتھ کھیل کھیل رہا ہے، سر، داڑھی، مونچھ کو اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہے، لباس میں، چال میں، ڈھال میں، الغرض اپنی اپنی بساط کے مطابق زیب و زینت میں عموماً لوگ مشغول ہو جاتے ہیں، اسی کا نام قرآن نے جیسا کہ میں سمجھتا ہوں ''زینت'' رکھا ہے، یہ فیشن اور بناؤ سنگار کا دور ہوتا ہے۔

۳) یہ دور بھی بتدریج گذر جاتا ہے، گذرتا رہتا ہے کہ اپنے اپنے دائرے میں بعض بعض کو اپنا مقابل بنا کر اس کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ان مشغلوں میں مصروف ہیں جن کا قرآن نے تفاخر نام رکھا ہے۔ اپنے نسب پر اپنے کمالات وصفات پر، شکل وصورت پر نظر آتا ہے کہ ہر ایک ناز کر رہا ہے اور کیسا ناز؟ کہ گویا اس کے مقابلہ میں دوسرا کچھ نہیں ہے۔

۴) ان سب کے بعد آخری میدان جس میں بہر حال ہر ایک کو بالآخر قدم رکھنا ہی پڑتا ہے وہ وہی ہے جس کا نام لوگوں نے ''عمل کا میدان'' رکھا ہے۔ دراصل ''عائلی زندگی'' یا گھر گھرہستی کی زندگی ہی کا نام عمل کا میدان رکھا گیا ہے، اور زندگی کا یہی دور سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے، لیکن اس دور میں داخل ہو کر کرنے والے جو کچھ کرتے رہتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو وہی بات حقیقت معلوم ہوگی جسے قرآن میں

﴿تَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ﴾

الاموال اور الاولاد کی کثرت میں باہمی مقابلہ کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

وہی بات یعنی ہر دائرے والے چند خاص افراد کو سامنے رکھ کر مقابلہ کا بازار گرم کرتے ہیں، عملی میدان کی اس زندگی میں پہلے تو دولت وثروت کا مقابلہ لڑا جاتا ہے، تنخواہیں ناپی جاتی ہیں آمدنیوں کا موازنہ کر کے اندر ہی اندر ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھ جانے کی فکروں اور کوششوں میں منہمک رہتا ہے۔ ''الاموال'' کے بعد پھر ''الاولاد'' کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے، بیٹے گنے جاتے ہیں، بیٹیاں شمار ہوتی ہیں، اور موقعہ مل جاتا ہے تو مقابلہ کے اس میدان کو پوتوں اور پرپوتوں، نبیروں اور نواسوں تک وسیع کر دیا جاتا ہے۔

''الاموال والاولاد'' کے تکاثر کا یہی مشغلہ عموماً ہم میں اکثروں کی زندگی کا آخری مشغلہ ہوتا ہے دم توڑ دینے والے اسی نقطہ پر پہنچ کر دم توڑ دیتے ہیں، مشرق ہو یا مغرب، قدیم دنیا ہو یا جدید ہر جگہ یہی تماشا ہے جو بنی آدم کے گھرانوں میں کھیلا اور دیکھا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کے ان پانچ ادوار میں سے طفولیت کے پہلے دور کے مشاغل کی نوعیت اگر لعب (کھیل کود) کی تھی، یعنی کرنے والے زندگی کے اس ابتدائی دور میں جو کچھ بھی کرتے رہتے ہیں، وہ لاحاصل اور بے نتیجہ ہوتے ہیں، اسی لئے نگاہوں میں ان اعمال وافعال کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، تو چار دور جو اس کے بعد آتے ہیں، یعنی لہویت، زینت، تفاخر، الاموال والاولاد میں تکاثر، ان ادوار میں جو مشاغل انجام دیئے جاتے ہیں، اگر ان کو بھی اسی نقطہ نظر سے جانچا جائے یعنی سوچا جائے کہ کوئی حاصل، کوئی

نتیجہ ان کا بھی ہے یا نہیں، تو میں نہیں جانتا کہ فرق پیدا کرنے والے یعنی لعبی دور کے طفلانہ اعمال اور باقی چارگانہ ادوار کے اعمال و افعال میں کیا فرق پیدا کر سکتے ہیں؟ پھر سب کچھ کر کرانے کے بعد غور کرنے والوں کو ایسا کونسا نتیجہ اور حاصل ہاتھ آتا ہے جسے واقعی حاصل اور نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے، اسی کے بعد قرآن ہی میں جو مثال بیان کی ہے، یعنی

﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا﴾

''مانند بارش کے کہ مسرور کرتی ہو کسانوں کو اس کی روئیدگی، پھر لہرانے لگتی ہیں (وہی روئیدگیاں) پھر دیکھتے ہو کہ پیلی پڑ گئیں وہی، پھر ہو جاتی ہیں وہی چور چور (یعنی بیلوں سے روند کر ان کو بھونسہ وغیرہ بنا لیتے ہیں)''۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ بارش کا پانی آسمان سے زمین پر آتا ہے، روئیدگیوں کو یہی بارش اگاتی ہے۔ ہریالیاں اور کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، پھر وہ زرد پڑنے لگتی ہیں، بالآخر گھاس بھونسہ بن کر ختم ہو جاتی ہیں جیسے یہ سارا تماشا بارش کا ہوتا ہے، یوں ہی زندگی کی نمائش انسانی اجسام میں سے کسی جسد کو طفولیت شباب اور شیخوخت (پیرانہ سالی) کے ادوار سے گذارتے ہوئے اس نقطہ پر پہنچا دیتی ہے جس پر زندگی کی اس نمائش کا خاتمہ ہو جاتا ہے سوال یہ ہے کہ بارش کے اس تماشے سے خود بارش کو جیسے کچھ ہاتھ نہیں آتا، انسانی جسد میں نمایاں ہو کر مختلف ادوار سے گذرنے والی زندگی ان تمام ادوار اور ان کی تمام نمائشوں سے خود اپنے لئے کس نتیجہ کو حاصل کرتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ بارش اور نباتی شکلوں میں بارش کی نمائشوں سے بارش کا پانی جیسے کسی نتیجہ کو حاصل نہیں کرتا، بجنسہ یہی حال اس زندگی اور الحیٰوۃ الدنیا کا ہے جس کا ظہور انسانی جسد میں ہوتا ہے اور ادوار پنجگانہ سے گذر کر موت پر جس کا خاتمہ ہوتا ہے بجائے بارش کے بارش کی نباتی نمائشوں سے الکفار (کسان) لذت گیر ہوتے ہیں، کچھ یہی حال ہمارا بھی ہے کہ ہم میں ایک کی زندگی اور زندگی کے ادوار دوسروں کے لئے ایک تماشہ بنے ہوئے ہیں، لیکن خود زندگی والے کو اپنی زندگی اور اس کے ان ادوار سے کوئی نتیجہ ہاتھ نہیں آتا، یوں ہی لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں، بچے بنتے ہیں، جوان ہوتے ہیں، بوڑھے بنتے ہیں اور مر جاتے ہیں، مرتے چلے جارہے ہیں اور کاش! بات اسی پر ختم ہو جاتی، یعنی الحیٰوۃ الدنیا اور اس کی مختلف نمائشیں بے نتیجہ اور لا حاصل ہو کر یونہی ختم ہوتی چلی جاتیں جیسے بارش اور اس کی نمائشیں خود بارش کے لحاظ سے بے نتیجہ بنتی چلی جاتی ہیں، لیکن قرآن میں آگے جو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

﴿وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ﴾

''(اور اس پہلے تماشے حیوۃ دنیا کے بعد) پچھلی زندگی میں سخت مار ہے اور مغفرت بھی اللہ کی طرف سے اور (رضوان) بھی ہے (یعنی حق تعالیٰ کی رضامندی)''۔

جس کا یہی مطلب ہوا کہ اپنی ان نمائشوں کو ختم کر کے انسانی زندگی ختم نہیں ہو جاتی یعنی اس طور پر ختم نہیں ہو جاتی جیسے بارش کی نباتی نمائشیں ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ بجائے ختم ہونے کے آدمی کی زندگی کو دو باتوں یعنی عذاب شدید (سخت مار) سے دوچار ہونا پڑتا ہے یا اس کے سامنے مغفرت کا وہ سرچشمہ آتا ہے جس میں غوطہ لگانے والے ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک وصاف ہو کر اپنے

تمام احساسات و جذبات کے مطابق دائرہ وجود کی اس مرکزی طاقت کو پا لیتے ہیں جس کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے، قرآنی اصطلاح میں جس کا نام "رضوان" اور "رضوان اللہ" ہے

الحیوۃ الدنیا کی پست زندگی اپنے ادوار کے ساتھ جب ختم ہو جاتی ہے تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ نفیاً یا اثباتاً جو اس کا جواب نہیں دے سکتے، نہ ان کے حواس دے سکتے ہیں اور نہ ان کی عقل دے سکتی ہے، وہ اپنے اس جہل سے ظاہر ہے کہ اس علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو پیغمبروں کو غیب و شہادت کے جاننے والے نے عطا کیا ہے۔ پس پیغامبروں کو واقعی خدا کے پیغامبر جو لوگ مان چکے ہیں، وہ یہ جاننے پر مجبور ہیں کہ اس پست زندگی کے بعد دوسری زندگی میں ان دو واقعات میں سے کسی ایک کے روبرو ان کو بہر حال ہونا پڑے گا، اور جب واقعہ یہی ہے تو پھر ان ہولناک ابدی نہ ختم ہونے والے نتائج کے مقابلہ میں ہماری موجودہ "الحیوۃ الدنیا" اور یہ سارے بے حاصل ادوار اس کے سوا اور کیا رہ جاتے ہیں جو مذکورہ بالا آیات کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ

﴿مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾

"اور نہیں ہے یہ پست زندگی لیکن صرف فریب کا ایک سرمایہ۔"

آئندہ پیش آنے والے اتنے اہم الاہم نتائج سے غافل بنا کر جس بے نتیجہ زندگی نے اپنے ان لا حاصل ادوار میں آدمی کو الجھالیا ہو، خود ہی سوچنا چاہیے کہ "سرمایہ فریب" یا "متاع الغرور" کے سوا اس کا نام اور کیا رکھا جائے۔

خیر یہ تو ان آیات کا مطلب ہوا، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ لا حاصلی اور بے نتیجگی کی وجہ سے الحیوۃ الدنیا کا ابتدائی دور اگر لعبی دور ہے، طفولیت اور طفولیت کے سارے مشاغل اگر صرف کھیل کود ہیں تو اس کے بعد آنے والے ادوار چارگانہ نہ سوچنے والوں کی نگاہوں میں خواہ جتنی بھی اہمیت رکھتے ہوں، لیکن اپنی بے ثمری ولا حاصلی کی وجہ سے ان کو بھی لعب یا کھیل کود کے سوا اور کوئی دوسری بات آخر کیوں سمجھی جائے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کبھی پوری "الحیوۃ الدنیا" ہی کو لہو و لعب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ مشاغل اور کاروبار کے لحاظ سے زندگی کے مختلف ادوار میں جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ صرف باہر میں ہوتی ہیں، ورنہ "اندر" کا نقطہ نظر ہر حال میں جوانی میں بھی بڑھاپے میں بھی لوگوں کا وہی رہتا ہے جو بچپن میں ہوتا ہے، یعنی نتیجہ سے بے پروا ہو کر صرف لذت و مسرت کے وقتی تقاضے کو سب ہی پورا کرتے رہتے ہیں، الا یہ کہ اپنی الدنیا کا رشتہ پیغمبروں کی راہ نمائی میں جن لوگوں نے الدین کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۲۶۵۔۲۶۹

آیت: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَنِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ (الحدید: ۲۷)

''رہبانیت جسے انہوں نے خود تراش لیا ہے نہیں فرض کیا ہے ہم نے اس کو ان پر، پھر نگرانی نہ کی انھوں نے رہبانیت کے (اصولوں کی) جیسی نگرانی انہیں کرنی چاہیے تھی۔ پھر دیدی ہم نے ان کے ایمان والوں کو ان کی مزدوری اور بہتیرے ان کے فساق ہیں۔''

دیکھنے میں تو بہ ظاہر یہ گنے چنے چند الفاظ ہیں۔ مگر میرے خیال میں اس آیت کا ایک ٹکڑا ''رہبانیت'' کی پوری تاریخ کا حامل ہے۔ مثلاً پہلا جز ''اِبْتَدَعُوْهَا'' (ان لوگوں نے خود تراش لیا ہے) ظاہر ہے کہ رہبانیت کو بجائے کسی دین اور مذہب کے ان نظریات میں شامل کر دیتا ہے جو براہِ راست انسانی نظر وفکر کے مرہونِ منت ہیں، گویا یہ ایک قسم کا فلسفہ ہے، مختلف اقوام کے مختلف افراد نے مختلف زمانوں میں مختلف عوامل وموثرات سے متاثر ہو کر کبھی کبھی اپنی زندگی اس تخیل کے تحت گذارنی چاہی ہے۔ تاریخ اس کی شہادت ادا کرتی ہے کہ یونانیوں اور رومانیوں کے رواقیس واشراقیین اسکندریہ کے فلاطونین ہندوستان کے جوگیہ وغیرہ نے فلسفہ کے ایک مکتب خیال کی شکل میں اسے پیش کیا تھا۔

دوسرا جز ''مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ'' (یعنی ہم نے اس نظریہ حیات کا مطالبہ ان سے کبھی نہیں کیا) جس کا یہی مطلب ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے علم وعمل کا جو نظام بنی آدم کو مذہب اور دین، دھرم وغیرہ کے ناموں سے ملتا رہا ہے اس میں اس غیر فطری نظریہ حیات کا کبھی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اس جز سے صرف اسلام ہی کی براءت رہبانیت سے ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ مذہب کی پوری تاریخ سے اس کی بے تعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر ہر مسلمان اس کے ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہے کہ عیسائی مذہب ہو یا یہودی دین، ابراہیمیؑ ملت ہو یا نوحیؑ دعوت، کسی کا رہبانیت سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ قرآن کے اس تاریخی بیان کو پڑھنے اور ماننے کے بعد بھی ہمیں ان بزرگوں پر تعجب ہوتا ہے جو کبھی عیسائی، کبھی کسی اور دین کے ساتھ اسلام کا مقابلہ کر کے دعویٰ کرتے ہیں کہ رہبانیت سے بے تعلقی یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ شاید ان کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے گویا کسی دین میں کبھی اس قسم کی راہبانہ زندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کیا قرآن کے نص صریح کی یہ خلاف ورزی نہیں ہے؟

تیسرا جز ''فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا'' یعنی جن لوگوں نے اس خود تراشیدہ فلسفہ کو اصول حیات تسلیم کر کے اسی کے مطابق زندگی گذارنی چاہی، قرآن کا یہ تاریخی بیان ہے کہ اس میں بھی جیسا کہ چاہئے تھا، کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا، جس کی وجہ ظاہر ہے، بعض خاص حالات مثلاً شدید ناکامی یا کسی سخت شخصی یا اجتماعی حادثہ سے متاثر ہو کر بعض زود اثر شدید الانفعال نفوس دنیا اور دنیاوی تعلقات سے دل کو سرد کر کے اس قسم کی خیالی، صرف خیالی زندگی کا نقشہ طے کرنے کی حد تک تو طے کر لیتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو جن فطری قوانین میں آدمی کی جبلت جکڑی ہوئی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ ان قوانین سے مسلسل جنگ میں انھوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت اور قوانین قدرت سے جنگ چھیڑ دینے کے بعد مسکین انسان کامیابی کی بھلا کیا توقع کر سکتا ہے۔ کامل استقلال اور غیر معمولی ضد سے بھی اگر کام لیا جائے پھر بھی پوری کامیابی قطعاً ناممکن ہے، اور یہی خبر قرآن ان کے متعلق دیتا ہے۔

چوتھا جز ''فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ'' یعنی ان میں جو ایمان والے ہیں۔ ان کو اپنی مزدوری مل جاتی ہے۔ لیکن

اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا جن غیر ضروری مشقتوں کو وہ برداشت کرتے ہیں۔ ان میں جس حد تک کامیابی ہوتی ہے، اس کی مزدوری ان کو مل جاتی ہے؟ بہ ظاہر یہی خیال گذرتا ہے۔ لیکن اگر واقعی قرآن کا یہی مطلب ہوتا تو چاہئے تھا کہ ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا '' (یعنی ان میں جو ایمان والے ہیں) کی جگہ کچھ اس قسم کی عبارت ہوتی کہ ان میں جن لوگوں نے اس اصول کی نگرانی کی یعنی (الـذیـن رعـوهـا) انھیں ان کا اجر دے دیا گیا، مگر جب یہ اسلوب بیان نہیں اختیار کیا گیا۔ تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کو صرف اپنے ایمان کا معاوضہ ملتا ہے۔ باقی جن غیر فطری مشاغل اور حالات میں اپنے آپ کو مبتلا کر کے جو دکھ اور مصیبت وہ اٹھاتے ہیں۔ چونکہ وہ خدا کی مرضی اور مطالبے کے تحت نہیں، بلکہ اپنی خواہش اور اپنی مرضی، اپنے خود تراشیدہ فلسفہ کے زیر اثر اٹھاتے ہیں، اس لئے خدا کے پاس اگر اس کا کچھ اجر نہ ہو، تو عقلاً ودیناً اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، پس اس کو جو کچھ ملے گا ایمان کے تحت ملے گا۔ اور یہ حال تو ان کا ہے جو اپنی زندگی میں ایمان اور ایمانی اقتضاؤں پر قائم بھی رہے ہوں۔ ورنہ اس کے بعد آیت کا آخری جز ''کَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ '' (یعنی ان میں اکثر وبیشتر فاسق ہو جاتے ہیں) یہ تو ہر ملک کی اشراقیت اور رہبانیت کے آخری انجام کی ایسی رپورٹ ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے غالباً دفتر کے دفتر درکار ہیں، کلیسا اور یورپی نظام کی پوری تاریخ ہندوستانی جوگیوں، یوگیوں، بھکشوؤں، مونکوں، وام مارگیوں، اگھوریوں، وغیرہ کے ہزار ہا ہزار سال کے ناگفتہ بہ حوادث و واقعات دہرانے پڑیں گے۔

سچ یہ ہے کہ قدرتی قوانین سے جنگ کرنے کا آخری انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہو سکتا تھا۔ جہاں تک واقعات سے معلوم ہوا ہے قرآن کی ترتیب کا بھی یہی اقتضا ہے کہ ابتداء میں جو اپنے آپ کو اس زندگی میں ڈالتے ہیں تازہ جوش اور تازہ تاثرات کے تحت ایک حد تک وہ تو نباہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انھی بے چاروں کی ظاہری شکل وصورت اختیار کر کے جو ان کے جانشین بنتے ہیں، چونکہ ان تاثرات سے وہ قطعاً خالی ہوتے ہیں۔ بلکہ عام طور پر عوام میں اس عجیب وغریب زندگی رکھنے والوں کے متعلق جو حُسنِ ظن پایا جاتا ہے، اس کو دیکھ کر اس گروہ میں وہ شریک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ظاہری راہبانہ شکل وصورت جس سے بہ ظاہر ترکِ دنیا کا یہ اعلان کرتے ہیں۔ اسی کو پوری طاقت کے ساتھ حصولِ دُنیا کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، جن کے یہ جانشین ہوتے ہیں۔ عوام کا ان کے ساتھ جو روایتی حُسنِ ظن باقی رہتا ہے، اس کے پردے میں پھر یہ کرتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا نمایاں جرم چونکہ ان کا معاشی جرم ہوتا ہے۔ یعنی ہر قسم کے اکتسابی مشاغل سے الگ تھلگ ہو کر ایک طرف تو توانائیوں کے سارے سرمائے کو جو قدرت انہیں عطا کرتی ہے۔ رائگاں اور ضائع کرتے رہتے ہیں۔ اور ٹھیک کسی عضو کے ناسور کا جو حال ہوتا ہے کہ خونِ حیات کو پیپ اور ریم بنا بنا کر ضائع کرتا رہتا ہے۔ اور دوسری طرف ایسے اعضا جو اس کے قریب ہوتے ہیں، ان کی غذا بھی کھینچتا رہتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی توانائیوں کو ضائع کر کے بیچارے عوام کے گاڑھے پسینوں کی کمائی کو مختلف حیلوں سے بہ ایں طور چوستے رہتے ہیں کہ ان سے یہ جو کچھ لیتے ہیں، اس کے معاوضے میں ان کو کچھ نہیں دیتے، چند فرضی ڈھکوسلے جن سے ان کا ضمیر خود بھی واقف ہوتا ہے، ان بے چاروں کی تسلی کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ اتنا بڑا سخت جرم ہے کہ ان کے دوسرے بعض بدترین فاسقانہ جرائم سے خاموشی اختیار کرنے کے باوجود قرآن نے نہایت تیز وتند لہجے میں ان کے اس جرم کا اعلان ان کے الفاظ میں کیا ہے۔

﴿اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ O يَوْمَ

يُحْمٰى عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾(التوبہ:۳۴،۳۵)

''بہت سے احبار (مذہبی علماء) اور رہبان (مذہبی مشائخ) کھاتے ہیں لوگوں کا مال بذریعہ باطل (جھوٹ) کے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے۔اور جو دفینہ کرتے ہیں سونا اور چاندی نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو ان کو مژدہ دیدیجئے دکھ بھرے عذاب کا۔اس دن تپایا جائے گا ان پر وہی دفینہ جہنم کی آگ میں پھر داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں یہ وہ ہے جسے تم نے جمع کیا تھا اپنے لئے پس چکھو عذاب اس چیز کا جسے تم نے جمع کیا تھا۔''

ا گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۷۔۹

﴿الحشر﴾

آیت : ﴿نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ (الحشر:۱۹)

''بھول گئے وہ اللہ کو، پس بھلا دیا اللہ نے ان کو اپنے آپ سے۔''

قرآنی نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ کا جو مفاد و اقتضاء ہے۔

شرک قدیم ہو یا جدید آثار و نتائج بھی دونوں ہی کے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں سب کی تفصیل تو مشکل ہے لیکن چند کھلی واضح چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے مثلاً خدا فراموشی آدمی کو خود فراموشی کے ذہنی عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے قرآنی قانون ﴿نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾

یا مآلاً اسی کے قریب قریب نفسیاتی مکافات و مجازات کا یہ قدرتی دستور، یعنی ''آغاز فراموشوں'' کا دل و دماغ ''انجام فراموشی'' کی آفت سے ماؤف ہو جاتا ہے دوسرے لفظوں میں جس کا حاصل یہی ہے کہ ''انجام فراموشی'' کی بصیرت سے ان کو محروم کر دیا جاتا ہے، جو ''آغاز'' سے آنکھیں چراتے ہوئے اپنے جینے کا پروگرام بناتے ہیں اور اپنی زندگی کے قیمتی سرمائے کے ساتھ کاروبار کرتے ہوئے نہ یہ سوچتے ہیں اور نہ سوچنا چاہتے ہیں کہ جہاں سے ان کو یہ سرمایہ ملا ہے وہاں کا منشا کیا ہے؟ یہی ناشکری، نمک حرامی اور کفر کی ذہنیت ہے، یوں تو سارا قرآن ہی اس ''قدرتی قانون'' کے ذکر سے بھرا ہوا ہے لیکن سورہ ممتحنہ کے خاتمہ کی آیتیں جن میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ:

﴿لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ﴾ (الممتحنہ : ۱۳)

''نہ میل جول رکھنا ان لوگوں سے جن پر اللہ کا غصہ بھڑک چکا ہے، وہ ''الآخرۃ'' (یعنی انجام) سے مایوس ہو چکے ہیں (اسی طرح مایوس) جیسے ''الکفار'' (ناشکروں کا طبقہ) مایوس ہو چکا ہے قبر والوں سے۔''

ان الفاظ میں ایک طرف تو یہ بتایا گیا ہے کہ قبر والوں (یعنی اصحاب قبور) سے مایوسی کا احساس کفر کی پیداوار ہے اور دوسری طرف اس کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ''انجام سے مایوسی کی یہ ذہنیت'' اللہ کے غصے کا نتیجہ ہے۔ اور یہی میری غرض ہے کہ ''انجام اندیشی'' کی بصیرت سے محرومی، سمجھنے والے خواہ اسے خرد و دانش کا ہی تقاضا کیوں نہ سمجھتے ہوں، لیکن یاس و قنوط کا یہ احساس درحقیقت قدرتی انتقام کا ایک باطنی اور ذہنی رنگ ہے۔ ''آغاز'' کی ذمہ داریوں سے بے اعتنائی ''انجام'' سے مایوسی کی اس کیفیت کو دلوں میں پیدا کرتی ہے اور اس وقت تک پیدا کرتی رہے گی، جب تک کہ ''آغاز'' سے لا پرواہی اختیار کی جائے گی۔ لاکھ سمجھایا جائے مگر مایوسوں پر سمجھ کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، قرآن ہی میں یہ فرماتے ہوئے کہ خالق کائنات نے

﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (الانعام : ۱۲)

''رحمت اور مہربانی کو اپنے اوپر واجب ٹھہرالیا ہے (اس کی مہربانی اور رحمت ہی کا اقتضاء ہے) کہ اکٹھا کرے گا تمہیں قیامت کے دن (قیامت کا وہی دن) جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔''

مطلب جس کا یہی ہے کہ جینا چاہتے ہیں ان کو ہمیشہ کے لیے مٹایا اور نیست و نابود کر کے نہیں رکھ دیا جائے گا۔ بلکہ پیدا کرنے والے کی رحمت ہی کا یہ اقتضا ہے کہ دنیا کی فرسودہ زندگی سے بھی زیادہ تر و تازہ حیات انہیں بخشی جائے گی۔

فہمائش کا یہ کتنا پیارا، کتنا دل آویز اور اثر انگیز لہجہ ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جاتا کہ جس پر کچھ بھی واجب نہیں، وہی

اپنے اوپر رحم اور مہربانی کو واجب ٹھہراتے ہوئے، مرنے والوں کو دلاسا دے رہا ہے کہ تم زندہ ہی رہو گے۔ مگر پڑھیے اسی کے بعد یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ۔

﴿اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ﴾(الانعام : ۱۲)

''جنہوں نے اپنا دیوالہ نکال لیا ہے اور خسارے کے جو شکار ہو گئے ہیں وہ کبھی نہ مانیں گے''۔

یہ ''دیوالہ'' اور ''خسارہ'' جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، اس کا تعلق زندگی کے اسی سرمائے سے ہے، جس میں زندگی کے آغاز کے متعلق یک سوئی حاصل کیے بغیر کاروباری تصرفات میں لوگ مشغول ہو جاتے ہیں آگاہ کیا گیا ہے کہ لاکھ ان کو سمجھایا جائے کہ تم مٹو گے نہیں، مگر وہ اڑتے ہی چلے جائیں گے کہ ہم تو مٹ ہی کر رہیں گے، ہٹ دھرمی یا اصرار بے باکی یہ دماغی کیفیت، سزائی کیفیت کے سوا بتایئے کہ اسے اور کیا سمجھا جائے!

ان دو قدرتی شکنجوں کے ساتھ تیسرا قدرتی ''شکنجہ'' وہ بھی ہے، جس میں دبے اور کسے ہوئے ذہنی سزا پانے والے قدرت کے مخفی انتقامی ہاتھوں سے سزا پاتے رہتے ہیں۔ اپنے لفظوں میں جس کی تعبیر

''احد او کل احد''

سے کر کے اردو میں اسی کا ترجمہ

''ایک یا ہر ایک''

کر دیا کرتا ہوں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک خالق کی سامنے سے بھاگنے والے مجبور ہیں کہ مخلوقات جن کی تعداد گنی نہیں جا سکتی، ان ہی کے پیچھے بھاگے بھاگے پھریں۔ جو ایک سے نہیں ڈرتا، اسے ہر ایک سے ڈرنا پڑتا ہے وہی ہر ایک کے آگے جھکنے پر بے بس ہو جاتے ہیں جو اس ایک کے آگے جھکنا نہیں چاہتے۔ یہ قدرت کا ایک ایسا قدرتی شکنجہ ہے، جس کی گرفت سے نکلنے والے نکلنا بھی چاہیں تو نکل نہیں سکتے۔ آدمی کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کر کے جیے اور مرے، دیکھے کہ آسودگی، راحت و عافیت کی ضمانت کس میں ہے؟ قرآن میں ان ہی دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا گیا ہے کہ

﴿ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾(یوسف : ۳۹)

''بہت سے پروردگاروں سے (پرورش کا تعلق قائم کر کے جینا) یہ بہتر ہے یا تنہا اللہ، جو سب پر سب سے غالب ہے (اسی ایک کو اپنا پروردگار بنا لینا؟)''۔

اسی واقعہ کو دوسرے پیرائے میں یوں بھی سمجھایا گیا ہے۔ سورہ زمر میں ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ﴾(الزمر : ۲۹)

''اللہ ایک مثال پیش کرتا ہے ایک آدمی تو ایسا ہے جو باہم چند کش مکش رکھنے والوں کے ساجھے میں ہے اور دوسرا آدمی وہ ہے جو مسلم ایک ہی شخص کے ساتھ مختص ہو؟''

اس مثال کو پیش کر کے پوچھا گیا ہے:

﴿هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا﴾ (الزمر : ۲۹)

کیا یہ دونوں برابر ہو جائیں گے؟

جواب تجربہ کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ وہی بتا سکتا ہے کہ زندگی کی ان دونوں مثالی شکلوں میں زندگی کب اور کس حال میں رہ جاتی ہے۔

بہرحال ایک کی نیازمندی ہر ایک سے جب آدمی کو بے نیاز کر رہی ہو، ایک کا ڈر ہر ایک سے آدمی کو نڈر بنا رہا ہو، ایک کا سجدہ ہر ایک کے آگے ماتھا رگڑنے کی ذلت سے بچا لیتا ہو قدرت کے اس قانون سے استفادہ کی توفیق سے محرومی یقیناً سزا ہی کی ایک شکل ہو سکتی ہے جو نمک حرامی کے مجرم ناشکروں کو دی جاتی ہے اور مرنے سے پہلے ہی دی جاتی ہے، زندان مصر میں یوسفی خطبہ کا یہ فقرہ یعنی:

﴿ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ ﴾ (یوسف ۳۸:)

''ہمارے لیے یہ جائز نہیں رکھا گیا ہے کہ کسی چیز کو بھی اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ ہم پر بھی اللہ کا فضل ہے اور عام لوگوں پر بھی ہے۔''

اس کی قدر و قیمت اب سمجھ میں آتی ہے۔

قرآن جس زمانے میں نازل ہو رہا تھا اس وقت اس سے پہلے بھگتنے والے ان سزاؤں کو کس طرح بھگت رہے تھے؟ جاہلیت ہی میں نہیں بلکہ یورپ و امریکہ کی ''بقراطیت'' میں بھی اس کا جواب آپ کو مل سکتا ہے، کم از کم میرا ذاتی احساس یہی ہے کہ زیادہ مہیب اور زیادہ خوف ناک قالب میں یہی باطنی سزائیں آج دنیا کے سروں پر کھیل رہی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ یورپ و امریکہ کی ''نشمت جدیدہ'' کی پیدا کی ہوئی مادی زندگی میں ان کے کوڑھ جس طرح پھوٹ پڑے ہیں، جو پھوڑے اور گھاؤ سر نکال رہے ہیں، جو گندگی، سڑاندھ اور عفونت ان سے ابل رہی ہے۔ شاید ان ''دماغ پاش'' بھبھکوں کا تجربہ گزری ہوئی جاہلیت کے زمانے میں بھی مشکل ہی سے لوگوں کو ہوا ہوگا۔

میں جو کچھ عرض کرتا ہوں اسے پڑھیے اور بتلائیے کہ اپنے احساس میں کس حد تک فقیر حق بجانب ہے۔

دیکھیے ''خدا فراموشی'' کی سزا میں ''خود فراموشی'' کے عذاب کو تہذیب جدید کی نئی اور ماڈرن مشرکانہ ذہنیت جس طریقے سے خرید چکی ہے اور اپنی اس ''خود فراموشی'' پر اصرار و ناز جس حد تک ترقی کر کے پہنچ چکا ہے اس کی تفصیلی داستان آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں۔ تحقیق و تلاش کی علمی فہرست میں دیکھ چکے کہ ذرہ سے آفتاب تک کیڑے مکوڑوں، جنگل کے بھیڑیوں، اور درندوں، سانپوں اور بچھوؤں تک کے سامنے ''کس لیے'' کا سوال کو زمین سے اٹھا کر سیاروں تک بھی پہنچایا جا چکا ہے۔ سورج کے اندر جو داغ اور دھبے دکھائی دیتے ہیں، پوچھا جا رہا ہے وہ کیوں ہیں اور کس لیے ہیں؟ مریخ کے سیارے میں دوربینوں سے جن نشانوں، اور لکیروں کا پتہ چلا ہے، کیوں اور کس لیے کے سوالات کے نشانے وہ بھی بن چکے ہیں۔

لیکن زمین اور آسمان کی ساری پیداواروں میں کس لیے کے اسی سوال سے محروم، قطعی محروم خود ان کا اپنا وجود بنا ہوا ہے، انسان کس لیے پیدا ہوا ہے، کس قدرتی نصب العین کی تکمیل آدمی کے وجود سے ہوتی ہے؟ عرض ہی کر چکا ہوں کہ یہی سوال ان کو بھلا دیا گیا ہے، ان کی مثال پانچ مسافروں کی اس ٹولی کی نظر آتی ہے، جن میں ہر ایک اپنے رفیقوں کو اسی طریقے سے گنتا تھا کہ خود اپنے آپ کو گننا بھول جاتا تھا، کہرام مچا ہوا تھا کہ ہمارے پانچ رفیقوں میں کوئی نہ کوئی رفیق ضرور ڈوب مرا ہے۔ باہم پوچھتے تھے کہ بجائے

پانچ کے آخر میزان سب کی کل چار ہی کیوں ٹھہرتی ہے؟ آج دنیا کا نیا ''انسان'' اس دماغی حادثہ کا شکار ہے، یقین مانیے کہ ''خدا'' جب تک یاد نہ آئے گا، اس وقت تک خود اپنے آپ کو بھی وہ کبھی یاد نہ آئیں گے۔

انسان کس لیے ہے؟ اس سوال کا جواب تو جواب میرا خیال تو یہی ہے کہ سوال کی یاد بھی ان کے حافظہ میں انگڑائی کیا کروٹ بھی نہیں بدل سکتی، یہ ''خود فراموشی'' اسی ''خدا فراموشی'' کی قدرتی سزا ہے۔ اپنے سوا کسی دوسری چیز کو آدمی بھول جائے یہ تو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن اپنے آپ کو بھی بہ ثبات عقل و ہوش کوئی بھول جائے، اپنے حافظے سے خود نکل پڑے، بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، مگر جو واقعہ آپ کے سامنے ہے، بتائیے اس کا انکار کیسے کیا جائے؟ یقیناً اپنے آپ سے آدمی بھلایا جا چکا ہے، خود اپنے حافظے سے اس کی اپنی یاد چھینی جا چکی ہے۔ اسی لیے تو اس کو میں ''ذہنی عذاب'' سمجھتا ہوں کہ بات جو سمجھ میں نہیں آتی، وہی واقعہ بن کر ہم سب کے سامنے آ چکی ہے! آخر اس کو عذاب نہ سمجھا جائے تو اور کیا سمجھا جائے؟ ''خدا فراموشی'' ''خود فراموشی'' کے عذاب کو آدمی پر مسلط کرتی ہے، زور تو

﴿ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنۡسٰهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡ ﴾(الحشر : ۱۹)

''بھول گئے وہ اللہ کو، پس بھلا دیا اللہ نے ان کو اپنے آپ سے۔''

کے قرآنی قانون کا تھا اب دیکھیے ''آغاز'' سے بے اعتنائی ''انجام'' سے آدمی کو اندھا کیسے بنا دیتی ہے۔''

﴿ءَ اِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا ذٰلِکَ رَجۡعٌۢ بَعِیۡدٌ ﴾(ق : ۳)

''جب ہم مر جائیں گے اور خاک بن جائیں گے، پھر زندگی واپس ہوگی یہ دور از عقل خیال ہے۔''

یہ احساس تو عرب کے جاہل بت پرست مشرکین کا تھا، لیکن آج نئی روشنی میں دیکھیے کیا ہو رہا ہے؟ یہ انسانی افکار پر ایک ازم کے بعد دوسرے ازم کی، دوسرے کے بعد تیسرے ازم کی ڈاک گاڑی مسلسل یکے بعد دیگرے، جو چھوڑی جا رہی ہے ان سارے ازموں کے انبار یا طومار کے اندر اگر صحیح طور پر ٹٹو لیے گا تو صرف یہی ہاتھ آئے گا کہ ''ماضی'' تو خیر ''ماضی'' ہی ہو چکا، ہر ''حال'' کو دوزخ ثابت کرتے ہوئے ہر ایک دوسرے کو اور ہر پہلی نسل پچھلی نسلوں کو ''مستقبل '' میں آدمی کے فردوس گم گشتہ کی پیداوار، صرف امیدوار، اس طریقے سے بناتی چلی جا رہی ہے کہ ہر امید دلانے والے کے سامنے سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ''انجام'' کے سوال کو اوجھل اور اوٹ میں ڈال دیا گیا ہے اور یوں دوسروں کو ''مستقبل'' کی جنت کی امید دلانے والے خود ''حال'' ہی کی جہنموں میں دم توڑتے چلے جا رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ''ناتمام زندگی'' کو بھی ''ناکام زندگی'' بنا کر چھوڑ دیا ہے اسی لیے تو میں کہا کرتا ہوں۔

''جنت کا انکار کر کے دیکھو! یہی خاکی زندگی جہنم بن کر تم سے لپٹ پڑے گی''۔

باقی ''احد او کل احد'' یعنی وہی ''ایک یا ہر ایک''۔'' کا قدرتی شکنجہ، پرانے شرک کے مخبوطوں کا اس شکنجے کے اندر پھڑ پھڑانے اور تڑپنے کا نظارہ تو جتنا دردناک ہے، لیکن مادی شرک کی ''عصری ذہنیت'' کے تماشے بھی اس سلسلے میں کیا کچھ کم دل چسپ یا کم دل دوز ہیں؟ ایک کو چھوڑ کر بھاگنے والے آج کس کس کے پیچھے کہاں کہاں بھاگ بھاگ کر پہنچ رہے ہیں؟ آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے، زبان اور قلم سے اسے کیا دکھایا جائے؟ ایک سے نڈر بن کر اپنے اوپر جن جن چیزوں کے ڈر کو لوگوں نے مسلط کر لیا ہے کیا ان کو ہم گن سکتے ہیں؟ پانی کا ایک قطرہ جس زمانے میں صرف زہریلے، کاٹ کھانے والے جراثیم کا سمندر بن چکا ہو، ہوا کی

ہر موج سی جرمس اور بکٹریا کی آندھی ٹھہرائی جارہی ہو؟ گویا دوسرے لفظوں میں ساری دنیا دہشت وخوف، اندیشہ اور ہیبت کی دوزخ کا قالب اختیار کر چکی ہے۔ بدتمیزی کے اسی طوفان میں انسانیت کی بہتی ہوئی لاش سمجھی جاتی ہو، کہ بہ رہی ہے ایسی لاش جس کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث، عذاب کے سوا بتایا جائے کہ اس ''فکری روش'' اور تصور کے اس طریقہ کو ہم اور کیا قرار دیں؟

حق تو یہ کہ ''اوہام وخرافات'' کے پرانے عہد میں پرانے پیپل اور برگد کے ہر پیڑ پر شیطان کا گھونسلا اور املی کے ہرا کیلے درخت پر مان لیا جاتا تھا کہ بھوت پریت بسیرا لیتے ہیں، چڑیلوں سے باور کرلیا جاتا تھا کہ ہر ویرانہ آباد ہے، خالی مکانوں کو جنات اور پریاں اپنا مسکن بنالیتی ہیں۔ گزرے ہوئے لوگوں کے ان پارینہ احساسات پر قہقہہ لگانے کا حق میری سمجھ میں تو نہیں آتا، ان لوگوں کے لیے کیسے باقی رہا ہے، جن کے لیے آج ہر لنگڑا مچھر دیوانے ہاتھ سے بھی زیادہ خوف ناک بن چکا ہے، جس کی ہر بھنبھناہٹ ان کے لیے موت کی آہٹ اور مرگ کا پیغام بن جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ باور کرایا جارہا ہے، یہ سب جھوٹ ہے کہ جیسے ان پرانے اوہامی خرافات پارینہ میں بھی کہنے والے آج بھی مانتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ''حقیقت'' کے دھوکے بھی مخفی تھے۔ میں مانتا ہوں کہ آج بھی جو کچھ پھیلایا جارہا ہے، اس کی بھی کچھ نہ کچھ ایسی ''بنیاد'' ضرور ہے، جس کی تجربہ سے تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن سوال اس خفقانی دورے ہے، جس کی بدولت راستہ کی ہر گری پڑی رسی سانپ بن کر لوگوں کے سامنے لہرانے لگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سانپ سے بھی راستوں کے چلنے والے دو چار ہوجاتے ہیں، لیکن ہر رسی کو دیکھ کر اسی طرح بھاگنا جیسے سانپ کو دیکھ کر آدمی بھاگتا ہو، دماغی خبط کے سوا بتایا جائے کہ اسے آخر اور کیا باور کیا جائے؟ ایک ہی ارادہ، ایک ہی حکم، ایک ہی اذن ایک ہی فعل کا یہ نظام محکم جس کا نام عالم ہے، انتشاری کثرتوں کی بکھری ہوئی دنیا کی شکل جن لوگوں کے لیے اختیار کر چکا ہے۔ انتشار اور کیسا انتشار؟ گویا کائنات کیا ہے؟ ایک میدان ہے، جس میں بگٹٹ گھوڑے ادھر سے ادھر سرپٹ بھاگے جارہے ہیں، کوئی نہیں جانتا کہ کب، کہاں، کس کو اپنی ٹاپوں سے کچل کر رکھ دیں گے۔ ان کی جھپٹ میں کون کس وقت آجائے گا۔ حد ہے اس دماغی کوفت، اور ''ذہنی دکھ'' کی جس کے بھبھل میں انسانی احساسات جھوک دیے گئے ہیں، کوئی مانے یہ نہ مانے لیکن ہے یہ قدرت کے اسی ''شکنجہ'' کی گرفت کا نتیجہ جس کا نام میں نے ''ایک یا ہر ایک'' رکھ لیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، چاہا گیا کہ ایک کا ڈر دلوں سے نکال دیا جائے، ابھی اس ایک کا ڈر پورے طور پر نکلا بھی نہ تھا کہ ہر ایک کا ڈر ان ہی دلوں میں گھس پڑا۔ ایک سے ڈرو ورنہ ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا یہ تو قدرت کا قانون ہے۔ اس قانون کی زد سے بچ کر نکل جانے کی صورت ہی کیا ہے؟ مخلوق پرستی کے اصنامی نظام کے زیر اثر اگلوں نے بھی یہی کیا تھا اور اب جو خالق سے روٹھ کر مخلوقات ہی میں سب کچھ ڈھونڈھنے کا نیا سائنٹفک طریقہ جاری ہوا ہے، اس میں بھی یہی کیا جارہا ہے، اور جو کچھ کیا جارہا ہے اس کا نتیجہ بھی بھگتا جارہا ہے۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ ''ایک'' سے بھی سرگرانیوں کا عارضہ پھیلا دیا گیا، لیکن ایک سے روٹھ کر ہر ایک کے منانے کی مہم سر کرنے کے لیے جو آمادہ ہوئے دیکھا جاتا ہے کہ کثرت کے اس بحر ناپیدا کنار میں وہ بھی اسباب وعلل کی چند کڑیوں کے بعد تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آگے کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ''مجہول اعتماد'' کی مبہوتی کیفیت کے سوا خود ان ہی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو غریب پوچھنے والے کی تسلی وہ کیا کریں گے؟ حال آں کہ ایک کو جب چھوڑ ہی دیا گیا تھا تو ''ہر ایک'' کو قابو میں لائے بغیر اطمینان وسکون کی جو ضمانت بھی دی جائے گی، وہ جھوٹی اور قطعاً جھوٹی ضمانت اور ان سائنٹفک ضمانت ہوگی اور یقین ماہیے کہ اس ''ضمانت'' کے حاصل کرنے میں عقل وحواس والے نہ پہلے کبھی کامیاب ہوئے اور نہ آیندہ ہوسکتے ہیں۔

بہر حال اس قصے کو کہاں تک دراز کیا جائے؟ خلاصہ یہی ہے کہ ''خالق'' جس کا سب کچھ ہے اس کے ساتھ طوطا چشمیوں کی راہ کل اختیار کی گئی ہو یا آج بے باکیوں کی راہ اسی کے متعلق آج کھولی گئی ہو، نتیجہ اس باغیانہ طریقہ کار کا ایک ہی رنگ میں چاہیے بھی یہی کہ سامنے آئے اور وہی سب کے سامنے آیا، جو تماشہ عاد و ثمود کے زمانے میں دیکھا گیا تھا، صرف اشارہ کیا ہے، غور کرنے والے چاہیں تو ان اجمالی اشاروں کی روشنی میں تفصیلات کو خود سوچ سکتے ہیں۔ مگر آثار و نتائج کے اشتراک و یک رنگی کے باوجود اس کا اعتراف بھی واقعہ کا اعتراف ہوگا کہ ''مخلوق پرستی'' کا ''اصنامی قالب'' اور شرک قدیم کی جاہلی نوعیت یعنی ''بت پرستی'' کے پرانے فرسودہ مسلک کا ایک پہلو ایسا ''فکری مغالطہ'' بنا دیا ہے، جس میں پھنس جانے کے بعد گلو خلاصی کا مسئلہ پہلے بھی کافی دشوار ثابت ہوا ہے اور آج بھی اس کی نہ سمجھنے والی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی آسان نہیں ہے۔[1]

---

[1] گیلانیؒ، مناظر حسن، سیدہ، الدین القیم، ص ۲۴۷۔۲۵۵

﴿الملک﴾

آیت : ﴿تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (الملک:۱)

''برکت والی وہ ذات ہے، جس کے ہاتھ ملک ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

خدا کی تحمید ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، شبہ ہوا کہ ہر چیز میں تو بری چیزیں، مثلاً: موت، بیاری بھی داخل ہیں، یا نہیں؟ اگر نہیں ہیں، تو خداوند تعالیٰ کی قدرت کامل نہیں، مثلاً: فرض کرو کہ ایک شعبدہ گر تمہارے سامنے خلق کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ہر چیز بنا سکتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے ایک چٹکی خاک کی لی اور پھونک کر کے ایک خوبصورت کبوتر اپنے جھولے سے نکال دیتا ہے، پھر خرگوش، پھر گلاب کے پھول وغیرہ پیدا کرتا ہے تم اس سے کہتے ہو کہ کیا تم سانپ بھی بنا سکتے ہو، بچھو بھی پیدا کر سکتے ہو، وہ اس کا جواب اگر نفی میں دے گا، تو کیا اس کا شعبدہ بہ نسبت دوسرے شعبدہ گر کے جو گلاب کے پھول کے ساتھ سانپ کے پھن بھی دکھاتا ہے، ناقص نہیں؟ بلاتشبیہ اگر خداوند تعالیٰ صرف حیات پر قادر ہوں اور موت پر نہ ہوں، تو ان کی قدرت اسی طرح ناقص سمجھی جائے گی، قدرت تمام اسی وقت ہو سکتی ہے کہ دونوں پر قدرت ہو اور اگر یہ چیزیں تحت قدرت داخل کی جاتی ہیں، تو لازم آتا ہے کہ خدا خالق شر ہو جائے، قرآن مجید نے دوسری شق اختیار کی اور اس کے بعد فرمایا:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ﴾ (الملک:۲)

''جس نے پیدا کیا موت کو اور حیات کو۔''

بس صرف لفظ ''خلق'' سے اعتراض کا جواب ہو گیا، کیونکہ ''خلق'' اور ''اتصف'' میں بہت فرق ہے، بیشک خدا موت کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتا، مگر پیدا کرتا ہے۔ خرابی شر کے ساتھ ملوث ہونے میں ہے، نہ کہ پیدا کرنے میں، خلق تو دونوں ہی کا کمال ہے، گلاب کے پھول دکھانے میں شعبدہ گر کی چابک دستی اور کمال مشق کی اگر دلیل ملتی ہے، تو ہمیشہ یہی سانپ کے پیدا کرنے میں بھی ہے۔ الحاصل خلق شر و خیر دونوں کمال ہیں۔ نقص، شر کے ساتھ اتصاف میں ہے اور خدا اسکے ساتھ متصف نہیں، صرف ان دونوں کا خالق ہے، یا یوں کہو کہ شر کے مصدر ہونے میں خرابی ہے، نہ کہ خالق ہونے میں۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مقالات گیلانی، حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری (مرتب)، ص ۷۴-۷۵

﴿المعارج﴾

آیت: ﴿إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا﴾ (المعارج:۱۹)

''قطعاً آدمی لالچی اور بے صبرا بنا کر پیدا کیا گیا۔''

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا

هلوع عربی زبان کا ایک لفظ ہے۔ انسانی نفسیات کی اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ قاضی بیضاوی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ای شدید الحرص قلیل الصبر

یعنی سخت لالچی اور بہت کم صبر رکھنے والا۔

غالباً صحاح کی مشہور روایت

لو کان لا بن ادم و ادیان من مال لا بتغی ثالثا[1]

اگر آدم کے بچے کو دو دو وادی بھر مال دیا جائے تو چاہے گا وہ تیسری وادی کو۔

قرآن کے اسی لفظ هلوع کی یہ توضیح وتفسیر ہے۔ بعض صحابہؓ نے اسی بنیاد پر یعنی هلوع کے لفظ کا چوں کہ یہی حاصل ہے۔ اسی لئے اس حدیث کو انھوں نے قرآن ہی کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بجنسہ حدیث کے یہ الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ مقصد وہی ہے کہ قرآن کے لفظ هلوع کا یہ مفاد ہے۔ اسی طرح سورہ والعادیات میں یہ فرمانے کے بعد کہ

﴿إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ﴾ (العدیت:۶)

''قطعاً آدمی اپنے رب کا ناشکرا ہے۔''

یعنی آدمی کی یہ عام عادت ہے کہ حاصل شدہ نعمتوں کی قدر و قیمت سے غافل ہو جاتا ہے۔ ان کے متعلق کسی قسم کے احساس شکر کو اپنے اندر پیدا نہیں کرتا، نعمتیں زائل ہو کر اپنی قیمت جب تک آدمی پر ثابت نہیں کرتیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کچھ اسے ملا ہی نہیں۔ اور ان ''یافتہ'' سہولتوں سے بے پروا ہو کر دیکھا جاتا ہے کہ ہمیشہ نایافتہ تمناؤں اور آرزوؤں میں الجھا رہتا ہے۔ صرف بینائی ہی کی ایک نعمت ہے۔ روپیہ رکھتے ہوئے مشکل ہی سے ایسا کوئی آدمی ہوگا جو سب کچھ دے کر اسی بینائی کو خریدنے پر اس وقت آمادہ نہ ہو جاتا ہو۔ جب خدانخواستہ اس کے ضائع ہونے کا خطرہ دھمکی دینے لگے، اسی پر دوسری نعمتوں کو قیاس کرنا چاہیے۔ مگر جب تک یہ نعمتیں اس سے چھنتی نہیں ہیں۔ انہیں گویا وہ آنکھ بھی نہیں لگاتا۔ اور ان سب کے ہوتے ہوئے ان چیزوں کی فکر میں جو ابھی حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ مگر چاہتا ہے کہ وہ حاصل ہوں، پریشان ادھر سے ادھر مارا مارا پھرتا ہے چہرے پر ایسی حالت طاری کرتا ہے کہ گویا اس وقت تک قدرت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا اس حرمان نصیب کو کبھی موقعہ ہی نہیں ملا، امیر ہوں یا غریب، اس باب میں سب کا عام حال یہی ہے، بہرحال فطرت انسانی کی اسی عام کنودیت (ناشکری) کا ذکر کرنے کے بعد اسی موقع پر قرآن مجید میں

﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾ (العدیت:۸)

''اور آدمی ''الخیر'' کی محبت میں انتہا پسند واقع ہوا ہے''۔

---

1. البخاری، محمد بن اسماعیل، ابی عبداللہ، صحیح البخاری، کتاب الرقاق باب ما یتقی من فتنة المال [۶۴۳۶]، ص ۱۱۱۷، مکتبۃ دار السلام، الطبعة الثانیۃ ذوالحجہ ۱۴۱۹

جوفرمایا گیا ہے، یہ بھی غور کیا جائے تو اسی لفظ ھلوع ہی کے مفاد کی دوسری وسیع تعبیر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ھلوع کے لفظ سے تو صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی حد سے زیادہ لالچی ہے اور کسی لفظ پر اس کے دل کو قرار نہیں ہوتا، جو کچھ مل جاتا ہے، اسے تو ملا ہی ہوا سمجھ کر ان چیزوں کی فکروں میں ڈوب جاتا ہے جو ابھی نہیں ملی ہیں، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں کھودنے والے نے کوئی ایسی عمیق، اندھی کھائی کھودی ہے جو کسی طرح بھرنے کو آتی ہی نہیں۔ اور کے بعد اور، کا مطالبہ مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پوری شدت کے ساتھ زندگی بھر اس پر مسلط رہتا ہے۔ پھر اس مطالبہ کا رخ اگر ایک ہی قسم کی کسی چیز کی طرف ہوتا تو غنیمت تھا۔ اس دوسری آیت میں یہ فرما کر کہ ایک دو چیزوں ہی کی حد تک اس کا یہ مطالبہ محدود نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جس پر انسانی فطرت کے لحاظ سے الخیر کے لفظ کا اطلاق ہوسکتا ہے، یعنی ہر وہ چیز جو آدمی کو بھلی معلوم ہو، الخیر کی ان تمام قسموں کے ساتھ آدمی کی فطرت کا ھلوعی تعلق ہے۔ اور ان کی چاہ میں وہ شدید یعنی انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ الخیر کے چند امتیازی افراد کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ قرآن ہی میں دوسری جگہ بایں الفاظ کیا گیا ہے، یعنی

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ﴾ (آل عمران:۱۴)

''آراستہ کی گئی ہیں لوگوں کے لئے خواہشیں عورتوں (نرینا اولاد یعنی) بیٹوں کی اور سونے چاندی کے ڈھیر کے ڈھیر اور گھوڑے نشان زدہ خوبصورت اور مویشیاں اور کھیتی۔''

چھوٹے ہوں یا بڑے، مشرقی ہوں، یا مغربی، عہد قدیم کے تاریک قرون والے ہوں یا بجلی کے روشن دنوں میں زندگی گزارنے والے، ان تمام چیزوں کی ھلوعیت اور حب شدید ہر ایک کی فطرت میں راسخ ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۱۲-۱۱۳

﴿الدھر﴾

آیت: ﴿وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الدھر:۳۰)

''نہیں چاہتے ہو تم مگر یہ کہ چاہے اللہ''۔

افعال واعمال اور اعتقادات وافکار میں انسانی فطرت کو جو اختیار حاصل ہے وہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ایک وہ جو خدا کی تعلیم و مرضی کے مطابق ہیں یعنی ''پن یا بر'' اسی پر قائم رہنے کا نام عبدیت ہے دوسرے وہ جو خدا کی تعلیم و مرضی کے مخالف ہیں اسے ''اثم یا پاپ'' کہتے ہیں۔

حقیقت انسانی کے اس اختیار کی نوعیت کیا ہے اس کی تفصیل میں مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں کہ کن فیکونی مخلوقات صرف اپنی پیدائش ہی میں نہیں بلکہ اپنی بقا میں بھی ہر لمحہ ہر لحظہ اپنے خالق قیوم کے مسلسل عمل تخلیق کی محتاج ہیں اور صرف وجود ہی نہیں بلکہ ذاتاً اور فعلاً وآثاراً بھی ہر لحاظ سے کائنات کا ہر ذرہ حق تعالیٰ سے یہی نسبت رکھتا ہے، اور یہی نسبت خود انسان کو بھی ذات حق کے ساتھ ہے۔ یعنی آدمی بھی اپنی ذات میں اپنے صفات وکمالات اور افعال واعمال میں ہر وقت بغیر کسی انقطاع کے رب قیوم کے عمل تخلیق کا محتاج ہے، تو ایسی صورت میں جہاں دوسرے صفات وکمالات کی تخلیق آدمی میں اسی نوعیت کے ساتھ ہو رہی ہے تو ظاہر ہے کہ اختیار و اقتدار کی صفت کا بھی یہی حال ہونا چاہیے۔اور یہی مذہب کا دعویٰ بھی ہے کہ جس طرح بینائی، شنوائی وغیرہ کے صفات حق تعالیٰ کے مسلسل عمل تخلیق سے آدمی میں پیدا ہو رہے ہیں، یہی حال انسان کی اس صفت کا بھی ہے جس کا نام اختیار واقتدار ہے۔

پس یقیناً انسان میں اختیار پیدا ہو رہا ہے لیکن اس اختیار کے وجود اور بقا کا سلسلہ ہر لحظہ خدا کے اختیار اور ارادے کے ساتھ وابستہ ہے۔جس وقت جس طرح چاہے اپنے فیض تخلیقی کو وہ رُک سکتا ہے اور روک لیتا ہے۔قطع نظر اس مشاہدے کے، کہ انسانی اختیارات ایک خاص حد پر ختم ہو جاتے ہیں مثلاً انسان کھا سکتا ہے لیکن ہر چیز نہیں کھا سکتا، چل سکتا ہے لیکن ہر چیز پر نہیں چل سکتا، دیکھ سکتا ہے لیکن ہر جگہ سے ہر چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ وقس علی ہذا۔

پھر جن حدود میں یہ اپنے آپ کو مختار بھی پاتا ہے، کیا ٹھیک انہی حدود میں بسا اوقات مجبور نہیں ہو جاتا؟ پس اصل واقعہ وہی ہے کہ گو انسان میں اختیار ہے، لیکن اس اختیار پر اسے اختیار نہیں ہے، بلکہ اس کا اختیار اپنے وجود و بقا میں، تاثیر ونتیجہ میں ہر لحظہ اختیار الٰہی کے ساتھ وابستہ اور اس کی توجہ والتفات کا دست نگر ہے، جس وقت جس حد تک خدا اس اختیار سے چاہے انسان کو محروم کر سکتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ پس آدمی نہ آفاقی کائنات کی طرح مجبور مطلق ہے، جہاں فاعل وفعل کے درمیان قوت انتخابیہ کا پتہ بھی نہیں، اور نہ خدا کی طرح مختار مطلق ہے کہ اس کا اختیار نہ کسی کے اختیار سے وابستہ ہے اور نہ کوئی اس سے اختیار سلب کر سکتا ہے۔ بلکہ جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ انسان کا مقام جبر واختیار کے درمیان ہے یعنی وہ مختار بھی ہے اور مجبور بھی ہے، جب تک خدا چاہے اس اختیار کو اس میں پیدا کرتا رہے، جب چاہے چھین لے یہی مطلب ہے ﴿وَمَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾.

﴿وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (النحل:۹)

اگر اللہ چاہے تو تم سب کو سیدھی راہ پر لگا دے۔

وغیرہ قرآنی آیتوں کا، جن میں انسانی مشیت وارادہ کو ارادہ حق ومشیت حق کے ساتھ وابستہ ظاہر کیا گیا ہے حتیٰ کہ اسی بنیاد پر پیغمبروں کے ایمانی مطالبہ پر کافر کہا کرتے تھے۔

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا﴾ (الانعام: ۱۴۸)

''اگر خدا چاہتا تو ہم اور ہمارے آباء و اجداد شرک نہ کرتے''۔

یہ سچ ہے کہ انسانی اختیار کا یہی حل ہے یعنی اختیار کو چھین کر اگر حق تعالیٰ چاہیں تو لوگوں کو بجائے شرک کے توحید پر مجبور کر سکتے ہیں۔ لیکن اس مطالبہ کے پھر یہ معنی ہوں گے۔ کہ مختار انسان کو مجبور کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر انسان سے انسانیت یعنی خلیفہ سے خلافت چھین لی جائے، جو نہ خدا کی صفات کا اقتضا ہے اور نہ فطرت انسانی کا، آخر ہم میں کون ہے جو سور یا بندر بننے کے لیے تیار ہے؟ مٹی بننے سے لوگ کیوں گھبراتے ہیں؟ یعنی مر کر قبر میں جانا نہیں چاہتے، یہی بات ہے کہ مختار انسان ان صورتوں میں مجبور بن جاتا ہے، اور اس کا مقام عالی اس سے چھن جاتا ہے جسے اس کی فطرت برداشت نہیں کر سکتی۔

بہر حال ان آیتوں سے یہ سمجھنا کہ خدا ہی نے انسان کو کفر و فسق پر مجبور کر دیا، فلسفہ تخلیقی اور فطرت انسانی سے جہالت کا نتیجہ ہے۔ *''چوں کہ خدا نے آدمی کو مثلاً توحید پر مجبور نہیں کیا۔ اس کا یہ مطلب کیسے لیا جا سکتا ہے کہ اس نے شرک و کفر پر مجبور کیا؟ بلکہ واقعہ وہی ہے کہ توحید پر چاہتا تو آدمی کو خدا مجبور کرتا تھا لیکن اس وقت آدمی خلیفہ نہیں بلکہ من جملہ آفاقی کائنات کی ہستیوں کے ایک مجبور ہستی بن جاتا۔ خلافت کے مقام پر اسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک کہ شرک و توحید میں مثلاً انتخاب کا موقع اس کے لیے باقی رہے''*۔ اور بات بھی یہی ہے کہ وہ (انسان) اور اس کے تمام کمالات و صفات، حتیٰ کہ اس کا اقتدار و اختیار الغرض فعل و فاعل، اس کا اول و آخر اور وسط کے تمام اسباب و قوانین، سب کے سب رب قیوم کے مسلسل، غیر منقطع عمل تخلیق سے ہی پیدا ہو رہے ہیں اور اپنی بقا و وجود میں بھی رب قیوم ہی کی نظر التفات کے دست نگر ہیں، تاہم اسباب و علل کے سلسلے میں کسی نہ کسی جگہ وہ چیز بھی ضرور چھپی ہوئی ہے، جس کا نام اختیار اور قوت فیصلہ و انتخاب ہے اور جو ہمیں تمام آفاقی کائنات سے ممتاز کرتی ہے، اسی نے انسان کی ذمہ داری کے دامن کو تھاما اور مجازات کے قانون کو پیدا کر کے ''شر'' کی آگ بھڑکائی، اعمال و افعال انسانی کے اسی انتساب کا نام کسب رکھا گیا ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ انسانی اعمال و افعال اور اس کے سارے اسباب و نتائج کا خالق تو خدا ہے، لیکن ان کا سبب انسان ہے اور یہی مطلب ہے قرآنی آیت۔

﴿وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الصافات:۹۶)

''اللہ نے پیدا کیا تم کو اور اس کو جو تم کرتے ہو''۔[1]

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۱۴۷۔۱۴۹

﴿الانفطار﴾

آیت : ﴿فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ﴾ (الانفطار:۸)

''جس صورت کے ساتھ چاہا تجھے جوڑ دیا''۔

آدمی کا حال یہ ہے کہ باوجود آدمی ہونے کے نہ کسی کی صورت ہی دوسروں کی صورتوں سے ملتی ہے نہ آنکھیں ملتی ہیں، نہ ناک ملتی ہے، انتہا یہ ہے کہ ایک کی آواز دوسرے کی آواز سے ایک کی چال دوسرے کی چال سے بھی الگ ہو کر پہچانی جاتی ہے۔ یہ

﴿فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ﴾

کے ارادہ قاہرہ کا حیرت انگیز تماشا ہے، باوجودیکہ ہم میں ہر ایک کی آنکھیں، ہر ایک کے کان، ہر ایک کے ابرو، غرض تقریباً ایک ایک عضو، ایک ایک جوڑ، ایک ایک بند کا محل و مقام ہر ایک میں وہی ہے جو دوسروں میں ہے ایسا کون ہے جس کی آنکھیں بجائے پیشانی کے کلوں پر لگائی گئی ہوں یا اس کی ناک بجائے چہرے کے مونڈھے پر چپکائی گئی ہو، سب میں سب کچھ ایک ہی جگہ ایک ہی مقام پر قائم رکھتے ہوئے سب کو سب سے جدا کر دینا۔ اتنا جدا کہ کروڑوں کے مجمع میں ہر ایک پہچانا جاتا ہے، اپنی شکل سے، صورت سے، لب و لہجہ سے، چال ڈھال سے اور جو حال ظاہر کا ہے یہی اور بجنسہ یہی حال باطنی صفات و جذبات عواطف و میلانات کا بھی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ لاکھوں لاکھ اشتراکی نقاط کے باوجود تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ دو آدمی کی طبیعت بالکلیہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے ایک نہیں ہو سکتی، اسی طرح ایک نہیں ہو سکتی، جس طرح سمجھا جاتا ہے کہ ایک شخص کا انگوٹھے کا نشان دوسروں کے نشان سے نہیں مل سکتا۔[۱]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، مقدمہ تدوین فقہ، ص ۱۸۱۔۱۸۲

﴿البروج﴾

آیت: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ O فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ (البروج:۲۱،۲۲)

''بلکہ یہ قرآن ہے بڑی شان والا، لوح محفوظ میں لکھا ہوا''۔

خود قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت خود اس کتاب کے محفوظ کرنے کا سامان اس حد تک کر چکی تھی کہ دوسری آسمانی کتابوں کے ساتھ مختلف حوادثات وواقعات جو پیش آتے رہے ان کا قطعی طور پر شروع ہی سے انسداد کر دیا گیا تھا۔ سورۃ البروج میں ہے:۔

﴿هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ O فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ﴾(البروج: ۱۸)

''کیا تمہارے پاس جتھوں کی خبر پہنچی ہے یعنی فرعون اور ثمود کے جتھوں کی''۔

اس سوالیہ فقرے کے بعد قرآن ہی میں اس دعوے کا اعلان کیا گیا یعنی:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ O فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾(البروج: ۲۱)

بقول مولانا گیلانی اس کا بظاہر یہی مطلب ہوتا ہے کہ فرعون وثمود جیسی قوموں کی سی جبار حکومتوں کی طاقت بھی قرآن کو غیر محفوظ کرنے کی کوشش کسی زمانہ میں بھی خدانخواستہ اگر کرے گی تو ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تیرہ سو سال سے قرآن کے اس دعوے کی جو دوست نہیں ہیں، وہ بھی تصدیق کر رہے ہیں۔

''ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں''۔

یہ ایک غیر مذہب کے آدمی ''وان ہیم'' (جرمنی) کا ایسا منصفانہ اعتراف ہے کہ جو قرآن کی تاریخ سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا ہے، خدا کا کلام اس کو نہ بھی مانے، لیکن ''وان ہیم'' نے جو بات کہی ہے اس کے اعتراف واقرار پر تو اپنے آپ کو وہ بہر حال مجبور پائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کتاب کو جن خصوصیتوں کے ساتھ دنیا کے حوالے کیا تھا ابتداء سے اس وقت تک بغیر ادنیٰ تغیر وتبدل اور سر مو تفاوت کے وہ اسی طرح نسلاً بعد نسل کروڑ ہا کروڑ مسلمانوں میں اس طریقہ سے منتقل ہوتی ہوئی چلی آرہی ہے کہ سال دو سال تو خیر بڑی بات ہے ایک لحہ کے لئے بھی نہ قرآن ہی مسلمانوں سے کبھی جدا ہوا اور نہ مسلمان قرآن سے جدا ہوئے اور اب تو طباعت واشاعت وغیرہ کے لامحدود ذرائع کی پیدائش کا نتیجہ یہ ہو چکا ہے کہ میر وسودا کی غزلوں یا اسی قسم کی دوسری معمولی چیزوں کو کوئی اب دنیا سے مٹا نہیں سکتا تو قرآن کے مٹنے مٹانے کا بھلا اب امکان ہی کیا باقی رہا؟

اس وقت تک میں نے قرآن کی انہی اندرونی شہادتوں کا ذکر کیا ہے جن کے نتائج اور مفاد کو وہ بھی مانتے ہیں اور ان کو ماننا بھی چاہیے جنہوں نے اب تک اس کتاب کو خدا کی کتاب تسلیم نہیں کیا ہے۔ باقی قرآن جن کے نزدیک خدا کی کتاب ہے ان کے لئے تو اس سلسلہ میں بقول مولانا گیلانی خود قرآن ہی نے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔

﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ (حم سجدہ:۴۲)

''قرآن میں نہ سامنے سے الباطل کے گھسنے کی گنجائش ہے اور نہ پیچھے سے''۔

اس کا حاصل یہی تو ہے کہ الباطل (یعنی قرآن کا جو جز نہیں ہے) اس کے لئے خدا نے ذمہ داری لی ہے کہ چاہنے والے کسی راستہ بھی چاہیں کہ قرآن میں اس کو داخل کر دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کو خدا کے الفاظ جو تسلیم کر چکا ہے کیا وہ اپنے آپ کو مسلمان باقی رکھ سکتا ہے اگر کسی لفظ یا شوشہ تک کے اضافہ کا قرآن میں وہ تصور کر سکے؟

اور جو حال اضافہ کا ہے نکسہ یہی کیفیت کمی کی بھی ہے۔ مولانا گیلانی نے اس سلسلہ میں سورۃ القیامہ کی آیت ''اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ O ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ'' (القیامہ: ۱۷،۱۸) کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اگر چہ نئے مگر بالکل صحیح نتائج پیدا کیے ہیں، مولانا کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا اتارنے والا خدائے ذوالجلال جب خود فرماتا ہے:۔

﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ﴾ (القیامہ: ۱۷)

''قطعاً ہم پر قرآن کے جمع رکھنے کی ذمہ داری ہے۔''

تو اس کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے کہ قرآن میں جن چیزوں کو خدا جمع کر چکا ہے ان کو قرآن سے کوئی نکال دے یا اپنی جگہ سے ہٹا دے بلکہ اسی کے بعد اگر غور کیا جائے تو ''قرانہٗ'' کے لفظ کا اضافہ ''جمعہٗ'' کے بعد بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ سمجھا جائے تو نظر آئے گا کہ بعض پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کے ازالہ کا اس میں سامان مل سکتا ہے، سوال ہو سکتا تھا کہ صرف جمع کرنے اور باقی رکھنے کی ذمہ داری'' اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ '' کے الفاظ سے لی گئی ہے جس کا مفاد یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن کے کسی جز کو خدا غائب نہ ہونے دے گا اور قرآن دنیا میں اپنے تمام اجزاء کے ساتھ رہتی دنیا تک موجود رہے گا۔ لیکن اسی دنیا میں بیسیوں کتابیں ایسی ہیں جن کا پڑھنے والا اب کوئی باقی نہیں رہا، ایسی صورت میں کتاب کا دنیا میں رہنا نہ رہنا دونوں باتیں برابر ہیں۔ اب اگر سوچئے تو اس خطرہ کا جواب ''قرانہٗ'' کے لفظ میں آپ پا سکتے ہیں یعنی اس کی بھی ذمہ داری ''قـرانـہ'' کے لفظ سے لی گئی کہ قیامت تک اس کتاب کے پڑھنے والوں کو خدا پیدا کرتا رہے گا۔ اور اس وقت تک یہ ذمہ داری جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہے خدا پوری کر رہا ہے، آخر اس ''قـرانـہ'' کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جیسے قرآنی اجزاء کے جمع رکھنے کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے اسی طرح اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کا ذمہ دار بھی وہ خود ہی ہے۔ آگے سوال ہو سکتا تھا کہ پڑھنے والے بھی باقی رہیں لیکن سمجھنے اور سمجھانے والے غائب ہو جائیں تو اس وقت بھی کتاب کا افادہ ختم ہو جائے گا جیسے آج مثلاً وید کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس کی زبان اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ لغت کی مدد سے بھی اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ مزید وضاحت کیلئے مولانا گیلانی حاشیے میں رقمطراز ہیں۔

پنڈت سمندر لال جی اپنی مشہور کتاب ''گیتا'' اور قرآن'' میں وید کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی (یعنی ویدوں کی) زبان اتنی پرانی اور عجیب ہے اور ایک ایک منتر کے اتنے اتنے ارتھ لگائے جا سکتے ہیں کہ بے پڑھے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ودوانوں (علماء) کے لئے بھی ہزاروں برس سے وید ایک پہیلی رہا ہے اور ہمیشہ پہیلی ہی رہے گا۔

اسی وسوسہ کی ضمانت اللہ تعالیٰ کے قول:۔

﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ (القیامہ: ۱۹)

''پھر ہم ہی پر ہے اس کا بیان بھی۔''

کے الفاظ میں آپ پا سکتے ہیں۔ آخر جس کتاب کے معانی ومطالب کے بیان وتشریح کی ذمہ داری اس خدا نے لی ہو جس کا وجود ماضی وحال ومستقبل سب سے مساوی تعلق رکھتا ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنی اس ذمہ داری کو تاریخ کے ہر دور میں کیوں پوری نہ فرمائے گا؟ قرآن سے یہی سمجھ آتا ہے اور یہی دیکھا بھی جا رہا ہے کہ ہر زمانہ کے اقتضاء کے مطابق قرآنی معانی ومطالب کی تشریح وتعبیر کرنے والے مسلسل چلے آ رہے ہیں۔ دراصل انہی تفصیلات کا اجمالاً ذکر قرآن کی مشہور آیات میں فرمایا گیا ہے جسے عموماً مولوی اپنے وعظوں میں لوگوں کو سناتے ہی رہتے ہیں۔ یعنی:۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾(الحجر: ۹)

''ہم ہی نے اس ذکر (چونک پیدا کرنے والی کتاب) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی قطعاً حفاظت کرنے والے ہیں۔''

بہر حال بیرونی شہادتوں سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے تو قرآن کی اندرونی شہادتوں ہی سے ان سارے سوالوں کے جوابوں کو ہم حاصل کر سکتے ہیں جو قرآن جیسی کسی کتاب کے متعلق دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، تدوین قرآن، ص ۴۸۔۵۳

﴿الفجر﴾

آیت: ﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّىْٓ اَكْرَمَنِ O وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّىْٓ اَهَانَنِ O كَلَّا﴾ (الفجر:۱۵،۱۶)

''مگر آدمی سو جب جانچتا ہے اس کا مالک اس کو، تب عزت عطا کرتا ہے اسے اور نعمت سے سرفراز کرتا ہے اس کو تو کہنے لگتا ہے وہی آدمی کہ میرے مالک نے میری عزت بڑھائی۔ اور آدمی ہی کو جب اس کا مالک جانچتا ہے تب نپی تلی کر دیتا ہے روزی کو اس کے، تو کہنے لگتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل وخوار کر دیا''۔ ہرگز ''نہیں۔''

میں دوسروں کا کیا کہوں، خود اپنا حال بھی مدت تک اس آیت کے متعلق عجیب تھا۔ یعنی ابتدائے زندگی میں اس کا جو ترجمہ سمجھ میں آیا تھا، اس کی بنیاد پر یہ خیال گذرتا تھا کہ اللہ میاں نے جس بندے کو نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ وہ اگر یہ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے نعمت سے سرفراز فرمایا تو غلط کیا کہتا ہے، آخر وہ یہ نہ کہے تو کیا کہے۔ پھر اس کو کلا کے توبیخی لفظ سے ڈانٹنے کے کیا معنی؟ اسی طرح دوسرے جزء کے متعلق بھی یہی وسوسہ ہوتا تھا کہ ضیق معاش میں مبتلا ہو کر جو بیچارہ اپنے ہم جنسوں میں ہلکا اور سبک ہو رہا ہے، اہانت وذلت کی اس کیفیت کا اگر اظہار کرتا ہے تو ایک واقعہ کا اظہار کرتا ہے، اگرچہ اس پچھلی بات کے متعلق یہ بھی خیال گذرتا تھا کہ اس میں مالک کی شکایت کا پہلو چونکہ پیدا ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ اسی کے متعلق تنبیہ کی گئی ہو، حافظ کا شعر یاد آجاتا تھا۔

گناہ گرچہ نہ بود اختیار ما حافظ   تو در طریق ادب کوش گو گناہ من ست

لیکن خیر ''طریق ادب'' کے ذیل میں ربی اھانن (میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا) کی شکایت کو تو داخل کیا جاسکتا ہے۔ مگر پہلے جزء میں تو اس کی بھی گنجائش نہ تھی بلکہ

﴿اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (الضحیٰ:۱۱)

تو اپنے رب کی نعمت کا چرچا کر۔

یا اسی کے مفاد کو دہرانے والی یہ حدیث

فلیر اثر نعمته علیه

پس چاہیے کہ دکھائے اللہ کی نعمت کے اثر کو اپنے اوپر۔

وغیرہ میں تو اسی کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ نعمت سے جو سرفراز ہو، چاہیے کہ وہ اس کا اعلان کرے، پھر جن پر اکرام کیا گیا اور جو نعمتوں سے نوازے گئے ہیں، وہی بیچارے ربی اکرمن (میرے مالک نے میرا اکرام واعزاز کیا) کے الفاظ کے ساتھ تحدث بالنعمۃ کے حکم کی تعمیل اگر کرتے ہیں، تو غلطی کیا کرتے ہیں۔ زجر وتوبیخ کا مستحق ان کو اس مقام پر کیوں ٹھہرایا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ سالہا سال تک اسی الجھن میں الجھتا رہا، کتابوں میں بھی دیکھتا تھا، لیکن ژولیدگی کا ازالہ نہیں ہوتا تھا۔

مدت کے بعد جو بات تھی جب وہ واضح ہوئی تو صرف یہی نہیں کہ اس مقام کے متعلق جو شکوک تھے اُن ہی کا ازالہ ہو گیا، بلکہ اس سوال کے یعنی الرزق کو بانٹنے والے نے بسط وقدر کے دو مختلف پیمانوں پر کیوں تقسیم کیا ہے۔ صحیح علم کی روشنی میں اس کا جو واقعی جواب تھا، وہ بھی مل گیا، اور یہ معلوم ہوا کہ ان دو مختلف پیمانوں پر رزق پانے والوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی رزق کی نوعیت

کے متعلق بغیر کسی استحقاق کے بے بنیاد غلط احساسات جو اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔ الرزق کے خود بانٹنے والے نے صحیح علم عطا کر کے ان غلط احساسات کو چاہا ہے کہ مٹا دیا جائے اور یہ بھی یہی بات کہ الرزق کی تقسیم میں یہ طریقہ کار بانٹنے والے نے کیوں اختیار کیا۔ اس کے صحیح جواب کا واقعی علم ظاہر ہے کہ رزق کے بانٹنے والے اور دینے والے ہی کو ہو سکتا ہے، دینے والا ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کیوں دے رہا ہے، لینے والے کیا بتا سکتے ہیں اور کیسے بتا سکتے ہیں کہ دینے والے نے اُس پیمانے پر نہیں اُس پیمانے پر اس شکل میں نہیں اس شکل میں انھیں کیوں دیا یا کیوں دے رہا ہے، علمی دیانت و امانت کا اقتضاء زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ اس کیوں کے جواب میں جہل کا اعتراف کر لیا جائے، جس چیز کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کہہ دیں کہ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں، اور جب تک دینے والا خود نہ بتا دے ہم کچھ جان بھی نہیں سکتے، قطعاً نہیں جان سکتے، حقائق و واقعات کے صحیح علم اور صادق تحقیق کی یہی اور صرف ایک یہی متعین راہ ہے۔ اس سے ہٹ کر کہنے والے جو کچھ بھی کہیں گے، یا جو کچھ انھوں نے کہا ہے، اس کی وقعت خود آفریدہ اوہام اور خود تراشیدہ وسوسوں سے زیادہ قطعاً زیادہ نہیں ہے، اب علم و تحقیق کے اس صحیح معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر غور کیجئے کہ بسط کے پیمانے پر جن لوگوں کو یہاں روزی مل رہی ہے، مذکورہ بالا علمی و تحقیقی معیار کی بنیاد پر کیا ان کے لئے یہ جائز ہوگا کہ روزی دینے والے سے علم پائے بغیر وہ خود بخود یہ نقارہ پیٹنے لگیں کہ دوسروں کے مقابلے میں میرا انتخاب عزت و نعمت کے لئے کیا گیا ہے، اور دینے والے کا یہ مقصود ہے کہ اپنے ابنائے جنس میں مجھے معزز و مفتخر کیا جائے، کیا جاننے سے پہلے کسی چیز کے جاننے کا یہ بے بنیاد دعویٰ نہیں ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ علمی امانت کے مقررہ حدود سے ہٹ کر عقلی ٹٹول سے کام لیتے ہوئے آدمی اگر کچھ خیال کر سکتا ہے تو یہی خیال کر سکتا ہے کہ دینے والے پر نہ تو میرا قرض باقی تھا، اس پر میں نے یا میرے باپ دادوں نے کسی قسم کا کوئی احسان بھی نہیں کیا تھا، میرا کوئی خاص رشتہ ناطہ بھی اس کے ساتھ نہیں ہے، ایسا رشتہ یا تعلق جو صرف میری ذات ہی کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ تعلق اس کے ساتھ اگر ہے بھی تو وہی تعلق جو اس کی ہر مخلوق اس کے ساتھ رکھتی ہے، الغرض العیاذ باللہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں نہ بھتیجا، نہ میرا وہ مقروض ہے اور نہ ممنون کرم، ایسی صورت میں عقل اگر کچھ سوچ سکتی ہے تو یہی سوچ سکتی ہے کہ بلا وجہ مجھے امتیاز بخشنے اور میرے ساتھ ترجیحی سلوک روا رکھنے کا کوئی سبب جب نہیں ہے تو یہ خیال کہ دوسروں کے مقابلے میں میرا انتخاب کر کے خصوصیت کے ساتھ میری عزت افزائی کی گئی ہے، یعنی قرآن کے الفاظ میں

ربی اکرمن

میرے مالک نے مجھے عزت بخشی۔

کا دعویٰ بسطی معاش رکھنے والوں کی طرف سے خود ہی غور کرنا چاہیئے کہ کتنا مضحک، بے بنیاد قطعاً بے سروپا دعویٰ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ بسط کے پیمانے پر ان کو کیوں روزی مل رہی ہے؟ اولاً تو اس کیوں کے جواب میں صحیح منطق کی رو سے جہل کا اعتراف، یہی ان کا صحیح علمی مقام تھا، ثانیاً بجائے دینے والے کے ان پانے والوں کے لئے اگر کچھ نہ کچھ جواب تراش ہی لینا ضروری تھا، تو جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس کا اقتضاء بھی یہ قطعاً نہ تھا کہ جواب میں وہ ربی اکرمن (میرے مالک نے مجھے عزت بخشی) کا ڈھنڈورا پیٹنے لگیں، لیکن کیا کیجئے کہ جاہل انسان کو بسا اوقات اپنے جہل پر علم کا دھوکہ لگتا ہے۔ اس کے بعد دلوں میں ایسے خیالات، زبانوں پر ایسے مقالات جاری ہو جاتے ہیں جن کے متعلق ادنیٰ تامل سے بھی اگر کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ جس

کے سوچنے کا انھیں کوئی حق نہ تھا، وہی وہ سوچ رہے ہیں اور بولنے کی جو بات نہ تھی وہی وہ بول رہے ہیں، یعنی جھوٹ سوچ رہے ہیں جھوٹ بول رہے ہیں!

اور جو حال اس سلسلہ میں بسطیوں کا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ قدری پیانے پر رزق پانے والے بھی اسی غلطی کے شکار ہیں۔ وہی علمی بددیانتی کہ جس کے جاننے کا کوئی صحیح علمی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا اسی کے جاننے اور جان کر غلط قطعاً غلط احساسات کا اسی بے بنیاد وہم کو سبب بنائے بیٹھے ہوئے ہیں آخر ٹھیک خرچ کے مطابق نپی تلی شکل میں جنھیں دینے والا رزق عطا کر رہا ہے، یعنی قدری پیانے پر جو رزق پا رہے ہیں، ان کی طرف سے یہ اعلان کہ پیدا کرنے والے نے قدری رزق دے کر چاہا ہے کہ اپنے ہم جنسوں میں ہمیں رسوا اور ذلیل ہو کر جینا پڑے یعنی قرآنی تعبیر میں

ربی اھانن

میرے مالک نے مجھے رسوا اور ذلیل کر دیا۔

کے احساسات سے جو خود اپنے آپ کو بھی جلاتے رہتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو ان مغالطی وسوسوں میں مبتلا کرنے کے جرم کے مجرم ہو رہے ہیں کہ مذہب نے جس ذات کی رحمتوں اور رافتوں کا اتنی بلند آہنگیوں سے چرچا پھیلایا ہے۔ ذرہ ذرہ میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس کی مہربانیوں، کرم فرمائیوں کا مطالعہ کیا جائے رحم سے بھری ہوئی اس ذات نے بغیر کسی سابق قصور کے ان بیچاروں کو رسوائی کی اس جہنم اور ذلت کی اس دوزخ میں کیوں جھونک دیا ہے، آخر یہ فیصلہ کہ ذلیل وخوار ہی کرنے کے لئے قدریوں کے ساتھ قدرت یہ برتاؤ کرتی ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ تحقیق وعلم نے قدری پیانے پر رزق پانے والوں کو ایسے کون سے مقدمات دیئے ہیں جن کی روشنی میں ان کے دماغوں نے ربی اھانن (میرے مالک نے مجھے رسوا کر دیا) کے اس نتیجہ کو پیدا کیا ہے؟ دینے والے سے پوچھے بغیر خود پانے والوں کو اس فیصلے کا اختیار کیا دنیا کی کوئی منطق دے سکتی ہے؟ سوچا جائے تو یہاں بھی منطق سے کام لینے والوں نے الٹی منطق ہی سے کام لیا ہے، حالانکہ درحقیقت نہ سیدھی منطق ہی کا حق ان کو پہنچتا تھا، نہ الٹی منطق کا، بلکہ وہی بات یعنی اعتراف جہل، ان کا صحیح علم اگر کچھ ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا۔ مگر جب منطق ہی کے دامن کو انھوں نے پکڑا تھا، عقل ہی سے فیصلہ مانگنے پر یہ مضطر ومجبور تھے، تو اسی سے ان کو پوچھنا تھا کہ میں نہ تھا، پیدا کرنے والے نے مجھے پیدا کیا، ان کمالات وصفات کے ساتھ پیدا کیا، جن کا نام انسانی کمالات ہے، مجھے بینائی بخشی گئی، شنوائی بخشی گئی، فہم وفراست فکر ونظر کی قوتیں مجھ میں بھری گئیں، ایسی قوتیں بھری گئیں، جن میں ہر ایک بجائے خود انمول نعمتیں ہیں۔ ان نعمتوں کی کوئی قیمت دینے والے کو میں نے ادا نہیں کی تھی، بغیر کسی معاوضہ اور مزدوری کے مجاناً ان نعمتوں سے میں نوازا گیا، پھر کیا یہ عقل کا مشورہ ہو سکتا ہے کہ وہی جس نے میرے ساتھ یہ سب کچھ کیا، بلاوجہ کسی قصور وجرم کے بغیر میری رسوائی اور خواری کے درپے ہو جائے۔ ذلت کا طوق پہنا کر میرے بھائیوں کے درمیان بر سر بازار وہی میری رسوائیوں کے تماشے سے لذت گیر ہونے لگے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہی قصہ یعنی بتانے کا جو واقعی حقدار تھا، اس سے پوچھے بغیر یہ جو ربی اھانن، ربی اھانن یعنی (ہائے ہائے قدری رزق دے کر میرے مالک نے مجھے رسوا کر دیا) کے ساتھ قدری پیانے پر رزق پانے والوں کا گروہ کوچہ وبازار میں جو چلاتا چیختا پھرتا ہے اور احساس اہانت کی دہکتی انگیٹھی کو اپنے سینوں میں لئے ادھر ادھر جو مارا مارا پھرتا ہے، کسی حیثیت سے بھی ان کا یہ

فیصلہ اور اس فیصلہ کا اثر احساس اہانت کیا علم کے صحیح معیار پر یا مسکین بدنام عقل ہی کی راہ نمائی میں ایک لمحہ کے لئے بھی قابل التفات یا مستحق توجہ ہو سکتا ہے؟!

''ابتلاہ'' کا لفظ جسے مذکورہ بالا دو آیتوں میں فقط دو دفعہ دہرا دیا گیا ہے غور کرنے والے اگر اس میں غور کریں گے تو مسئلہ کے ایجابی پہلو کے متعلق وہ جو کچھ بھی جاننا اور دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ یقین کیجئے کہ سب کچھ اسی ایک لفظ میں ان کو مل جاتا، پہلے ''ابتلاہ'' کے اس لفظ کے جو معنی ہیں، اسے سمجھ لیجئے، پھر جن مطالب پر وہ مشتمل ہے، خود بخود دیکھنے والوں کی سمجھ میں آنے لگیں گے۔

ابتلاہ کے آخر میں ہ کا جو حرف ہے، یہ تو ضمیر ہے اور انسان اس کا مرجع ہے، رہ جاتا ہے اب صرف ابتلا یہ ماضی کا صیغہ ہے، مصدر اس کی ابتلاء ہے جو اردو میں بھی عموماً مستعمل ہے، امتحان یا آزمانا، جانچنا اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ تو اب ابتلاہ کا ترجمہ ہوا، آدمی کے رب نے آدمی کا امتحان لیا، یا آزمایا، جانچا، یہ تو اس لفظ کے لغوی معنی ہوئے، رہا مطلب سو غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ امتحان لیا آزمانے، جانچنے، کے الفاظ انسان کی طرف جب منسوب ہوتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ جس کا امتحان لیا جاتا ہے، اس کے ایسے حالات جن سے امتحان لینے والا ناواقف ہوتا ہے، چاہتا ہے کہ امتحان کے ذریعہ سے ان ہی حالات کو جانے، مثلاً اس کے معلومات کیسے ہیں، فلاں علم میں اس کی استعداد کیسی ہے، یہ یا اسی قسم کے نامعلوم امور سے واقفیت امتحان لینے والے کی غرض ہوتی ہے۔ پھر خدا کی طرف بھی امتحان کے لفظ کو جب منسوب کیا جاتا ہے تو العیاذ باللہ اس کا بھی کیا یہی مطلب ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ یعنی خدا بندوں کے جن حالات سے ناواقف ہے، امتحان میں ڈال کر چاہتا ہے کہ ان ہی حالات کو وہ جانے، خدا کو سرے سے نہ ماننا یہ دوسری بات ہے، لیکن خدا کو خدا مان کر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کو اس مطلب کے انتساب کی جرات ہو سکتی ہے؟ پس سوال یہی ہے کہ کسی کا امتحان جب خدا لینا چاہتا ہے یا کسی کو آزمانا یا جانچنا چاہتا ہے تو پھر اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ عام مذاہب و ادیان میں عموماً، خصوصاً قرآن میں بکثرت ابتلاء یا اسی کے ہم معنی الفاظ کا انتساب حق تعالیٰ کی طرف کیا گیا ہے؟ دریافت طلب یہی بات ہے کہ اس وقت اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ جب یہ مسلم ہے کہ خدا کی باتوں کو مخلوقات اور مخلوقات کے صفات و افعال کے مماثل قرار دینا مذہباً ناجائز ہے، کم از کم قرآن نے لیس کمثلہ شئی (کوئی چیز خدا کے مانند نہیں ہے) کا اعلان کر کے مسلمانوں کو اس سے منع کر دیا ہے کہ ذات میں ہو یا صفات میں، یا افعال میں، الغرض کسی اعتبار سے کسی چیز کو خدا کے مماثل نہ ٹھہرانا چاہیے یہی وجہ ہے کہ سماعت بصارت علم وحیات وغیرہ جیسے صفات قرآن میں جو خدا کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، سب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی نسبت سے ان کو وہ مطلب قطعاً نہیں ہے جو انسان کی طرف ان ہی صفات کو منسوب کرنے کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔[۱]

خدا کی طرف ابتلاء وامتحان کے الفاظ جو منسوب کئے جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا، امتحان لے کر ان ہی کو جاننا چاہتا ہے، بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے، اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلاء و امتحان ہے۔

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۶۳۔۱۶۶

۲ ایضاً، ص ۱۶۷

اب آیئے، بسط وقدر کے دو مختلف پیمانوں پر رزق کی تقسیم کے متعلق غرانی ادہام اور غلط خیالات کی تردید کے بعد قرآن میں جو ایجابی علم ابتلاء کے لفظ سے دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب متعین کیجئے۔ اللہ اللہ بات کیا تھی اور غلط معلومات سے انسان کی فکری معکوسیت کن کن غلط نتیجوں کو پیدا کر رہی تھی، بسطی پیمانے پر رزق پانے والے اپنے بافیدہ خیالات میں مگن ہو کر اکڑ رہے تھے، اترا رہے تھے کہ ان کا اکرام کیا گیا، اپنے ہم چشموں، ہم جنسوں میں ان کا سرا ونچا کیا گیا ہے۔ گویا قدرت کے چہیتوں اور پیاروں میں ہیں، یوں ہی ضرورت کے مطابق قدر کے پیمانے پر جن کی روزیاں مہیا ہو رہی ہیں، خود اپنے دماغ کے بھپھاروں سے گرم گرم ہو ہو کر کڑھ رہے تھے، کڑکڑا رہے تھے کہ ہمیں پیدا کر کے رسوا کیا گیا، یہی ایک رونا تھا، جس کے ساتھ وہ رو رہے تھے، غم کے آنسوؤں سے اپنے چہروں کو دھو رہے تھے، مگر یہ تو خود تراشیدہ خیالات، غلط معلومات سے نکالے ہوئے غلط نتائج تھے، ظاہر ہے کہ ابتلاء کا خدائی اعلان اب جس حقیقت کو واشگاف کر رہا ہے، یعنی ناواقفوں، جاہلوں کو واقف بنایا جا رہا ہے کہ تقسیم رزق کی دونوں شکلوں اور دونوں پیمانوں میں بانٹنے والے اور تقسیم کرنے والے کی غرض یہ ہے کہ جس کسی کو جس پیمانے پر بھی بسط کے پیمانے پر ہو یا قدر کے پیمانے پر جو کچھ بھی جس شکل میں دیا جا رہا ہے، ہر ایک سے دینے والے کا یہ مطالبہ ہے کہ جو کچھ انھیں دیا جا رہا ہے اس کے استعمال کے صحیح اور غلط طریقوں میں سے جو صحیح طریقہ ہے اسی کو اختیار کریں، جس کے دوسرے معنی یہی ہوئے کہ معیشت کے ان دونوں حالوں (بسط وقدر) دونوں میں بظاہر یہ جو معلوم ہوتا تھا کہ دیا گیا ہے، واقعہ کے صحیح علم کی روشنی میں اب سوجھ رہا ہے کہ درحقیقت ہر ایک سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق سچ پوچھو تو مانگا گیا ہے۔ اسی لئے تو سمجھا جاتا ہے کہ رزق میں جو یہاں بڑھائے گئے ہیں نہ جاننے کی وجہ سے اپنے اپنے دلوں میں خواہ وہ کسی قسم کے خیالات پکار رہے ہوں، لیکن جو واقعہ ہے اس کے جان لینے کے بعد یہی کہنا پڑتا ہے کہ دراصل ان کی ذمہ داریاں بڑھائی گئی ہیں، اور الرزق جن کا گھٹایا گیا ہے، ناواقفیت کی وجہ سے اپنے متعلق خواہ جس قسم کا بھی غلط خیال وہ قائم کرلیں۔ لیکن سچی بات حقیقت کے مطابق یہی ہے کہ دراصل ان کی ذمہ داریاں گھٹائی گئی ہیں، جاننے والے سے جو واقعہ ہے اس کا صحیح علم پانے کے بعد سمجھنے والوں نے یہی سمجھا ہے۔ بلکہ اس کے سوا اور کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے یہاں تو خیر ''اجمال'' سے بھی کام لیا گیا ہے۔ سورۃ ''الانعام'' کو ختم کرتے ہوئے اسی اجمال کی تفصیل خود قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے۔

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (الانعام:۱۶۵)

''اور خدا ہی ہے جس نے زمین مین تم کو اپنا جانشین (خلیفہ) بنایا اور تم میں بعض کو بعض سے درجوں میں اونچا کر دیا (یہ اس لئے کیا گیا ہے) کہ جانچے خدا تمہیں ان چیزوں کے متعلق جو تمہیں اس نے دی ہیں۔ قطعاً تمہارا مالک زود انتقام بھی ہے اور قطعاً بلاشبہ وہی بہت بڑا بخشنے والا اور بہت زیادہ رحم کرنیوالا ہے۔''

جس کا حاصل یہی ہے کہ زمین اور زمین کی پیداواروں پر قابو عطا کر کے مدارج و مراتب کا جو اختلاف نسل انسانی کے افراد میں پیدا کر دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دینے والے نے جس کسی کو جو کچھ دیا ہے، اسی لئے دیا ہے تا کہ وہ جانچے اور آزمائے، گویا الفجر میں جو بات مجمل تھی وہی یہاں مفصل ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص:۱۶۸۔۱۷۰

آیت: ﴿ کَلَّا بَل لَّا تُکْرِمُونَ الْیَتِیْمَ O وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ﴾ (الفجر: ۱۷، ۱۸)

''بلکہ تم یتیموں کا اکرام نہیں کرتے اور المسکین کے کھانے پر لوگوں کو آمادہ نہیں کرتے۔''

سورۃ الفجر کی آیت میں جس میں بسطی رزق کے متعلق اکرامی نظریہ کی تردید کلا (ہرگز نہیں) کے لفظ سے فرمانے کے بعد یہ جو ارشاد ہوا ہے۔

﴿ بَل لَّا تُکْرِمُونَ الْیَتِیْمَ O وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ﴾

اس میں بسطیوں کی ذمہ داریوں کا اظہار اجمالی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ قرآن اپنے مطالبات کو عائد کرتے ہوئے کتنی نازک منطقیانہ تعبیر میں ان کو پیش کرتا ہے۔ بطور نمونے کے ان الفاظ کی کچھ تشریح اگر کر دی جائے تو غالباً نامناسب نہ ہوگا مطلب یہ ہے کہ نعمت وعزت پانے کے بعد پانے والوں میں جو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ میرا اکرام کیا گیا ہے، اور مجھے عزت بخشی گئی ہے، قرآن نے کلا کے لفظ سے تو چاہا ہے کہ لوگ اس خیال کو اپنے اندر سے نکال دیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نعمت وعزت پانے والا تو خیر اپنے اندر سے اس خیال کو نکال بھی دے سکتا ہے، لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ نعمت و دولت عزت و ثروت سے جو یہاں سرفراز ہوتے ہیں انھیں بہر حال دوسرے لوگ معزز اور بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں، کسی کے پاس کچھ نہ ہو، علم نہ ہو، فضل نہ ہو، فضائل وکمالات کے جتنے سلسلے ہیں سب ہی سے خالی ہو، لیکن اگر کسی جاگیر پر وہ قابض ہے، کسی فرم کا وہ مالک ہے، تو لوگ باوجود کچھ نہ ہونے کے محض اسی دولت وثروت کی وجہ سے اسے اپنوں میں بڑا آدمی ہی خیال کرتے ہیں، عموماً آبادیوں کے بڑے آدمی کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں الرزق اسے بسطی پیمانہ پر میسر آرہا ہے۔ پھر قرآن کلا (ہرگز نہیں) کے لفظ سے تردید جو کر رہا ہے۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نعمت وعزت کو صرف اپنے اعزاز اور اپنے بڑاپا کا ذریعہ بنالینا، قرآن نے دراصل لوگوں کو اس سے روکا ہے، روک کر پھر اسی عزت وشرف سے جو فطرتاً دولت وثروت رکھنے والوں کو حاصل ہو جاتی ہے، اس کے استعمال کے صحیح ذریعہ کی طرف ان آیتوں میں راہنمائی فرمائی گئی ہے، مقصد یہ ہے کہ جو عزت دولتمندوں کو حاصل ہوتی ہے، چاہا یہ جاتا ہے کہ اس عزت اور بڑائی کو ان لوگوں کی عزت اور بڑائی کا ذریعہ بنایا جائے، جنھیں دنیا بلاوجہ اپنی آنکھوں سے گرادیتی ہے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت ان بچوں کی ہوتی ہے جو اپنے باپ کے سارے سے محروم ہو جاتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ تقریبوں میں، شادیوں میں، تہواروں اور عیدوں کے مواقع پر کہ باپ رکھنے والے بچے اچھے اچھے کپڑوں میں اپنے اپنے باپوں کے ساتھ خوش خوش اچھلتے کودتے ناز نخرے کرتے آرہے ہیں، دل میں جس چیز کے خریدنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، ابا جی کہہ کر باپ کی فطری محبت کو ابھار ابھار کر کام نکال رہے ہیں، لیکن ان ہی مجلسوں میں وہ بچے بھی ہوتے ہیں جن کے باپ مرچکے ہیں وہ اپنے دل کی آرزو کس سے کہیں، ابا جی فلاں چیز بک رہی ہے، لے دیجئے، کس سے کہیں۔ ان کے نازوں کا اٹھانے والا اس پورے مجمع میں کوئی نہیں ہوتا، جوان کی طاقت تھی وہ سپرد خاک ہو چکی، دل ہلا دینے والی کیفیت ہوتی ہے، جب مجمع میں کوئی بچہ اس شان کے ساتھ شریک ہوتا ہے، یہی وقت ہے ان لوگوں کی آزمائش کا جنھیں بڑائی بخشی گئی ہے، اور عزت عطا کی گئی ہے کہ اپنی بڑائی اور اپنی عزت سے کام لیتے ہوئے سوسائٹی کی اس معصوم کس مپرس ہستی کو بڑائی عطا کریں، ایک ایسا تعلق اس کے ساتھ پیدا کریں

کہ ان کی بڑائی کی وجہ سے ان بچوں کو بھی عام نگاہوں میں بڑائی پیدا ہو جائے، گویا ان کی عزت کی وجہ سے لوگ ان بچوں کی بھی عزت کرنے لگیں، اکرام یتیم کا یہی مطلب ہے۔

اور یہ حال تو ان بچوں کا ہے جن میں انسانی کمالات وقویٰ کی ابھی نشو ونما نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان ہی کے ساتھ ہر مجمع، ہر آبادی میں انسانوں ہی کا ایک طبقہ وہ بھی پایا جاتا ہے۔ جن کی قوتیں ارتقائی مدارج کو طے کرنے کے بعد کسی وجہ سے ساکن اور معطل ہوگئیں، اور اسی وجہ سے بسا اوقات معمولی کھانے کی ضرورت بھی وہ اپنے دست وبازو سے پوری نہیں کر سکتے، ان ہی کو قرآن کی اصطلاح میں المسکین کہا گیا ہے، ان لوگوں کو جنھیں بسطی پیمانہ پر روزی ملتی ہے۔ یعنی ضروریات زندگی میں خرچ کرنے کے بعد جن کے پاس پس ماند ہو جاتا ہے، ان ہی لوگوں کو آمادہ کیا گیا کہ یہ پس ماند دولت اس لئے تمہیں نہیں دی گئی ہے کہ صرف اپنے ہم جنسوں، ہم چشموں میں اپنی بڑائی کا آلہ اس کو بناؤ، بلکہ تمہارے ابنائے جنس میں کسب وسعی کی قوتیں جن کی ٹھنڈی پڑگئی ہیں صرف یہی نہیں کہ ان کو کھلاؤ، بلکہ مذکورہ بالا آیت میں تحاضون کا لفظ فرمایا گیا ہے۔ جس کا مصدر محاضہ ہے۔ محاضہ کے معنی ہیں باہم مل کر لوگوں کو آمادہ کرنا، تو اب مطلب یہ ہوا کہ ارباب ثروت کو ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس کی وجہ سے نہ صرف خود بلکہ دوسرے دولتمندوں میں بھی مسکینوں کی امداد واعانت کا جذبہ پیدا ہو، گویا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ لوگ امداد مساکین میں ایک دوسرے پر سبقت چاہنے لگیں۔ اور یہ تعلیم اس عام قاعدے پر مبنی ہے کہ عموماً ہر سوسائٹی اور ہر سماج زیادہ تر اپنے طریقہ کار میں دولت مندوں ہی کو نمونہ بناتی ہے، جس ملک کے دولت منداپنی دولت کو کھیلوں، تماشوں، عیاشیوں، فضول خرچیوں میں صرف کرتے ہیں۔ دیکھا دیکھی دوسرے بھی ان ہی بیہودہ مشاغل میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور جہاں دولت مندوں میں نیکیوں، غربا پروریوں، مساکین نوازیوں کی رسم جاری ہو جاتی ہے، تو دوسرے بھی ان کو دیکھ کر خیر کے ان ہی ابواب میں اپنی پس ماندہ دولت کو صرف کرتے ہیں۔

الحاصل قرآن کے اشارے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت ونعمت، عزت وآبرو جنھیں دی جاتی ہے، اسی لئے دی جاتی ہے۔ اور یہی اس بڑائی اور اکرام کا صحیح استعمال ہے۔ جو نعمت وعزت کی وجہ سے آدمی کو حاصل ہوتا ہے، قرآنی آیت

﴿اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ﴾ (القصص:۷۷)

''نیکی کر جیسے خدا نے تیرے ساتھ نیکی کی''۔

میں بھی اس حسن سلوک کا جو قدرت کسی کے ساتھ کرتی ہے۔ یہی صحیح استعمال بتایا گیا ہے اور میرا تو خیال ہے کہ ''الشکر'' کے لفظ سے مذہب میں جس چیز کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس کا ایک بڑا اور اہم پہلو خداداد نعمتوں کا یہی استعمال ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص: ۱۷۵۔۱۷۷

﴿البلد﴾

آیت : ﴿اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ﴾ (البلد:۵)

''کیا وہ خیال کرتا ہے کہ بس نہ چلے گا اس پر کسی کا''۔

خرچ کرنے والوں میں ایک طبقہ جوان لوگوں کا ہے جن کے ''سرمایہ'' میں ابتلائی ذمہ داریوں کے متعلق تو ایک حبہ بھی نہیں ہوتا، لیکن خود اسی ''سرمایہ'' کو ممکنہ خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں، قرآن میں ایک عجیب اشارہ ان لوگوں کے متعلق بھی پایا جاتا ہے، سورۃ البلد میں جن کی طرف

﴿اَھۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ (البلد:۶)

''کھپایا ہے میں نے مال ڈھیروں۔''

کے دعویٰ کو منسوب کیا گیا ہے وہیں ایک فقرہ بالکل اسی کے متصل یہ بھی ہے، یعنی

﴿اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ﴾

دوسروں سے مجھے بحث نہیں، لیکن میرے خیال میں اس آیت کے متعلق جو بات آتی ہے اسے عرض کرتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ مال اور سرمایہ میں خلود بخشی کی قوت پاکر ''جمع وعد'' کی تدبیروں پر عمل کرنے والوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ صرف یہی نہیں کہ ان کا یہ خیال غلط ہے، بلکہ ننانوے کے اس پھیر میں الجھ جانے والوں کو اسی وقت بھرکس نکال دینے والی ''الحطمہ'' اور ایک ایسی نفسیاتی کیفیت میں جھونک دیا جاتا ہے جو اپنی اندرونی لکد کوب سے انھیں چور چور کرتی رہتی ہے اور وہ بیچارے باطن کے ان ہی آتشیں کیفیات میں الٹتے پلٹتے رہتے ہیں، اسی طرح خرچ کرنے کے متعلق یہ خیال کہ وہ خطرات سے محفوظ کر کے آدمی کو اطمینانی زندگی بسر کرنے کا موقعہ عطا کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا سوال یعنی ''وہ کیا خیال کرتا ہے کہ بس نہ چلے گا اس پر کسی کا'' اس میں بھی گویا چونکایا گیا ہے کہ خطرات سے محفوظ ہو جانے کے مقصد میں وہ کامیاب ہوا ہے یا ناکام ہوا ہے۔ اس کے پتہ چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سوال کو اپنے دل میں اٹھائے اور سوچے کہ دولت کی خواہ جتنی بڑی سے بڑی مقدار اس مقصد کے لئے خرچ کی جائے، پھر بھی آدمی کیا اپنے آپ کو اور اپنے سرمایہ کو خطرات سے محفوظ پاتا ہے؟ یعنی بس نہ چلے گا اب اس پر کسی کا، اسی سوال کو اٹھا کر دیکھئے اس کے دل کا اس کے دماغ کا احساس کیا ہے؟ بلا شبہ عجب سوال ہے، وہی نہیں جو بیچارے انسداد خطرات کی راہ میں دس بیس ماہوار خرچ کرتے ہیں، بلکہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کروڑہا کروڑ حتیٰ کہ آج تو اربہا ارب کے خرچ کرنے والوں کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ خرچ کرنے کی حد تک تو وہ خرچ کرتے رہتے ہیں، خوب خرچ کرتے رہتے ہیں، لاکھوں لاکھ تعداد والی فوجیں رکھتے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ ہتھیار اور اسلحہ تیار کرتے ہیں، نظم وضبط وقائم کرنے کے لئے اپنے سرمایہ کا تقریباً اکثر و بیشتر حصہ اسی راہ میں بہاتے رہتے ہیں، عوام کی ہمدردیوں کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پیٹ کو نہ سہی، پاؤں ہی کو آرام پہنچانے کے لئے ریلیں بناتے ہیں، سڑکیں تعمیر کرتے ہیں عوام کا کام نکلتا ہو یا نہ نکلتا ہو، لیکن کہتے یہی ہیں کہ ان ہی کو روشن دماغ بنانے کے لئے تعلیم گاہیں کھولتے ہیں، یونیورسٹیاں قائم کرتے ہیں، لیکن باوجود سب کچھ کرنے کے دوسرے ہی نہیں وہ خود بھی جانتے ہیں کہ قرآنی سوال،

﴿اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ﴾

''کیا خیال کرتا ہے وہ کہ اب بس نہ چلے گا اس پر کسی کا۔''

کے جواب میں ''نہیں'' کے سوا ان اربوں اور کھربوں کے خرچ کرنے والوں کی طرف سے بھی کم از کم اس وقت تک کوئی دوسرا جواب نہیں ملا ہے، ایک خطرہ مٹتا ہے، تو دس خطرات دانت نکالے پورب سے پچھم سے دکھن سے اتر سے جھانکنے لگتے ہیں، ہر

تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد "سرمایہ" کی بڑی سے بڑی مقدار ان ہی سر لگانے والے خطرات کی راہوں میں آگ اور دھواں بن بن کر قرآنی آیت

﴿حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (ہود:۱۶)

"تہس نہس ہو کر رہ گیا جو کچھ کیا دھرا تھا انھوں نے اور بے نتیجہ ہو کر رہ گیا جو کچھ وہ کرتے تھے۔"

کا تماشا عبرت پذیر نگاہوں کے سامنے پیش کرتی رہتی ہے، خرچ کر کر کے چھوٹے دائروں کے خطرات سے اس قسم کے خرچ کرنے والے پاتے ہیں کہ وہ محفوظ ہو گئے کہ اچانک اس سے بڑے خطرے کو دیکھتے ہیں کہ سر پر کھڑا دھمکا رہا ہے، آدمی کیا کرے کتنا خرچ کرے، تاریخ جن جن خرچ کرنے والوں کے قصے سناتی ہے، سناتی جاتی ہے، بتاتی جاتی ہے کہ خرچ کے ہر پیمانے پر خطروں کا لوگوں کو شکار ہونا پڑا کتنے دن کی بات ہے، ابھی ابھی گذری ہے۔ آدھی دنیا اور اس کی پیداواروں کا شخصی مالک زار جس کے ذاتی مصارف کی فہرست تیار کرنے والوں نے یہ تیار کی ہے کہ۔

> "جو ٹوپی پہنتا تھا وہ مسلم ایک جگ مگ جگ مگ کرنے والا گویا ایک شعلہ تھا ایک نہیں، دو بڑے بڑے موتیوں کے ہار اس پر لپٹے ہوئے تھے، سامنے سب سے اوپر ایک لعل تھا، جس پر الماس کی ایک صلیب چڑھائی گئی تھی ہاتھ میں ملکہ کتھرائن کا وہ عصا تھا جو صرف زر خالص سے ڈھالا گیا تھا، جس کے اوپر رنگ رنگ کے انمول جواہر جڑے ہوئے تھے، عصا کے سر پر ایک لٹو تھا الماس کا، اور اس کے سوا بھی وقتاً فوقتاً استعمال کے لئے اس کے خزانے میں جو جواہرات رہتے تھے، جن میں الماس، زمرد، یاقوت وغیرہ سب ہی طرح کی چیزیں تھیں۔ جن کی مجموعی قیمت کا اندازہ اسی ملین پونڈ (ایک ارب بیس کروڑ روپے) سے کیا جاتا تھا، اور جن میں بعض جواہر کی تاریخ ہزار ہزار سال سے بھی متجاوز تھی۔"

لیکن وہ بھی جب واقعہ نے ثابت کر دیا کہ لن یقدر علیہ احد (نہیں قابو چل سکتا ہے کسی کا اس پر) کے مقام تک نہ پہنچ سکا، اور بہ ہزار بے کسی و بے بسی وہ بھی اس کے بچے بھی۔ اس کی محبوبہ بیوی بھی اسی کے سامنے تڑپا تڑپا کر ذبح کئے گئے، تو جن مسکینوں نے خود اپنا اور اپنے عزیزوں، اپنے رشتہ داروں اور دوسرے حق داروں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر ہزار یا لاکھ وغیرہ اعداد کی صورت میں کچھ سرمایہ جمع کر لیا ہے، کس بنیاد پر ان غریبوں سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ ہر ایک کے قابو سے باہر ہو جانے کا دعویٰ کر کے خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر سکیں،

خلاصہ یہی ہے کہ اپنی بسطی معیشت میں اللہ اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں سے انحراف و اعراض کرنے والوں کو نہ تو سرمایہ کے جمع کرنے میں چین کی صورت میسر آتی ہے اور نہ خرچ ہی کرنے میں "سکون" کا کوئی حصہ انھیں نصیب ہوتا ہے، دیکھا یہی جا رہا ہے، اور قرآن میں جو کچھ سنا گیا ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اضطراب اور بے چینی، تڑپ اور قلق، خلش اور تپش، سوز اور جلن، درد اور کرب گھٹن اور کڑھن کی سانس ان کے اندر بھی جاتی ہے اور وہی باہر بھی آتی ہے، ان ہی بدبو آتشیں گرم گرم سانسوں کے ساتھ یہ جیتے بھی ہیں، اور جس دن مرتے ہیں تو آخری سانس بھی ان کی باطن کی ان ہی متعفن گندی کیفیتوں میں ٹوٹتی ہے، مرنے سے پہلے ہی قدرت کا انتقام ان کے معاشی جرائم کی سزا ان دردناک خمیازوں کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص: ۲۲۷-۲۳۰

﴿اللیل﴾

آیت : ﴿ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ○وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ○فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلۡیُسۡرٰی ﴾ (اللیل:۵،۶،۷)

''تو جس نے دیا، اور ڈرا، اور تصدیق کی اس نے الحسنٰی کی یعنی اچھی باتوں کی تو قریب ہے کہ ہم آسان کریں اس پر سہولت کی زندگی کو۔''

کھلی ہوئی بات ہے کہ معیشت میں بسط کی خواہش اسی لئے کی جاتی ہے کہ بسطی معیشت سے زندگی میں سہولت اور آسانی پیدا ہوتی ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مال و دولت کی غرض یہی سمجھی جاتی ہے کہ خواہشوں کی تکمیل اور ضرورتوں کی فراہمی میں ان سے امداد ملتی ہے، لیکن بسطی معیشت کا یہ مقصد کیا ہر حال میں پورا ہوتا ہے قرآن ہی کی آیت ہے۔

﴿ فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ○وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ○فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلۡیُسۡرٰی ﴾

''تو جس نے دیا، اور ڈرا، اور تصدیق کی اس نے الحسنٰی کی یعنی اچھی باتوں کی تو قریب ہے کہ ہم آسان کریں اس پر سہولت کی زندگی کو۔''

جس کا مطلب بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''الیسریٰ'' یعنی آسانیوں اور سہولتوں والی زندگی کی راہ ان ہی لوگوں کے لئے آسان کی جاتی ہے، جو دیتے ہیں، دینے کا مقصد یہی ہے کہ جو ذمہ داریاں ان کے مال پر عائد کی گئی ہیں، ان ذمہ داریوں کو پوری کرتے ہیں، آگے واتقی وصدق بالحسنی (یعنی ڈرا اور اچھی باتوں کی تصدیق کی) یہ ان اسباب کی تشریح ہے جو ذمہ داریوں کے ادا کرنے پر آدمی کو آمادہ کرتے ہیں، یعنی خدا سے جو ڈرتا ہے وہ اچھی باتیں جنھیں خدا پسند کرتا ہے، انھیں وہ مانتا ہے، ظاہر ہے خدا کی ذمہ داریوں کا خیال ایسے آدمی کو نہ ہوگا تو کسے ہوگا''۔

بہر حال قرآن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ الیسریٰ (آسان زندگی) کے حاصل کرنے کی راہ یہ ہے کہ خُدا کے خوف سے خُدا کی مرضی کے مطابق حق داروں تک ان کے حقوق پہنچائے جائیں۔[1]

عطا (داد و دہش) جو تقویٰ اور الحسنٰی کی تصدیق پر مبنی ہو، فرمایا گیا ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ''الیسریٰ'' کو آسان کر دیا جائے ''الیسریٰ'' (آسان زندگی) ایک عام اور مطلق لفظ ہے جو ہر قسم کی زندگی کو عام ہے اگر یہ سمجھا جائے اور یہی سمجھا بھی گیا ہے کہ موجودہ زندگی ایسوں پر آسان کر دی جاتی ہے تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ صدقہ سے رد بلا ہوتا ہے یا اسی قسم کی دوسری آسانیاں میسر آتی ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق موجودہ زندگی ہی سے ہے، بخاری کے حوالے سے میں نے بتایا تھا کہ چٹان کے ڈھنگ جانے کی وجہ سے جو لوگ غار میں بند ہو گئے تھے، اپنے عمل کے بدلہ سے انھوں نے اسی زندگی میں نفع اٹھایا تھا یا باغ کی آمدنی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے آب پاشی کے جو فوائد حاصل کرتا تھا، ان ساری روائتوں کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ خیر و خیرات وصدقات ومبرات وغیرہ کے نتائج سے موجودہ زندگی میں بھی کرنے والے کے لئے قدرت سہولت مہیا کرتی ہے، یعنی یسریٰ کو آسان کرتی ہے۔ اسی کے بالمقابل قرآن سے سورہ نون میں باغ والوں کا جو مشہور تمثیلی قصہ بیان کیا گیا ہے کہ مسکینوں

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۲۰۴

اور غریبوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لئے چاہا تھا کہ پھلوں کو صبح سویرے تڑکے توڑ کر نکل جائیں، لیکن قبل اس کے کہ وہ باغ پہنچیں قدرت کی طرف سے ان کا باغ اور اس کے پھل برباد ہو چکے تھے تو اس قصہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے نیکی کے بدلہ کا ظہور اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے، اسی طرح معاشی سرمایہ کی بربادی پر بدی اور بدنیتی کا بھی اثر پڑتا ہے۔

اسی طرح قرآن کے احسن القصص (قصہ حضرت یوسف علیہ السلام) حضرت والا کی مختلف آزمائشوں کے تذکرے کے بعد جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شاہ مصر نے خزائن الارض (زمین کی آمدنیوں) کو ان کے سپرد کر کے سرزمین مصر کی حکومت ان کے حوالے کر دی تھی تو یہ ارشاد فرمانے کے بعد بھی یعنی

﴿كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ﴾ (یوسف:۵۶)

''یوں ہی اقتدار بخشا ہم نے یوسف کو زمین (مصر) پر ٹھکانہ بناتے تھے وہ (یوسف علیہ السلام) جہاں چاہتے تھے۔''

حق تعالیٰ نے عمومی رنگ میں جو یہ اعلان کیا ہے۔

﴿نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (یوسف:۵۶)

''پہنچاتے ہیں ہم اپنی رحمت جسے چاہتے ہیں اور نہیں ضائع کرتے ہیں ہم مزدوری ان لوگوں کی جو بھلائی کرنے والے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ اس آیۂ کریمہ قدسیہ میں اسی دولت و ثروت اقتدار و اختیار کو جو زمین مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو مل گیا تھا۔''رحمتنا'' (یعنی ہماری رحمت اور مہربانی) کے لفظ سے اس کی تعبیر کی گئی، جس کے یہی معنیٰ ہیں کہ حق تعالیٰ کی رحمتوں اور مہربانیوں کا ظہور کبھی دنیاوی دولت و ثروت کی شکل میں بھی ہوتا ہے اور آگے یہ فرما کر ہم محسنوں کی مزدوری کو ضائع نہیں کرتے، اس سے بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دنیاوی نعمت و عزت جو مصر میں ملی تھی، یہ ان کے احسانی اعمال و افعال کا بدلہ و اجر تھا، خود یوسف علیہ السلام کی زبان مبارک کا یہ فقرہ قرآن ہی میں جو محفوظ ہے یعنی مصر میں خدا نے ان پر جو نوازشیں فرمائیں اور ان کا بچھڑا ہوا خاندان وطن سے چل کر مصر میں ان کے پاس جب آ گیا تو آپ نے فرمایا،

﴿قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (یوسف:۹۰)

''ہم پر بڑا اکرم کیا اللہ تعالیٰ نے جو ڈرتا ہے اور صبر سے کام لیتا ہے تو قطعاً اللہ تعالیٰ بھلائی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔''

تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ وہ اپنے احسانی اعمال و افعال کا صلہ ان آسانیوں اور سہولتوں کو قرار دے رہے تھے جو اس وقت ان کو مصر میں میسر آئی تھیں۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص:۲۷۲۔۲۷۳

آیت: ﴿وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى O وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى O فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ (الیل: ۸، ۹، ۱۰)

''اور جو بخیل بنا اور بے نیاز بنا اور اچھی باتوں کو جس نے جھٹلایا، پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے اس کے لئے العسریٰ کو یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو''۔

جو لوگ بجائے اعطاء (داد و دہش) کے بخل کا رویہ اختیار کرتے ہیں، کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اسی کی طرف جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے، یعنی مال و دولت روپیہ پیسے میں ان کو یہ خاصیت محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں سے آدمی کو یہ بے نیاز کر دیتے ہیں، اور بہ ظاہر روپے میں کچھ یہ خصوصیت نظر بھی آتی ہے، ایک غریب آدمی آج کی ضرورتوں کی پوری ہو جانے کے بعد پریشان رہتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ اپنی ضرورتوں کے لئے کس کس کے پاس جانا پڑے گا۔ کس کس سے کہنا ہوگا، لیکن اسی کے مقابلہ میں جس کا سرمایہ فرض کیجئے کہ کسی بنک میں جمع ہے۔ وہ ہر حال میں چہ غم رہتا ہے۔ ہر ضرورت جو پیش آسکتی ہے، اس کے متعلق مطمئن رہتا ہے کہ قاضی الحاجات ہمارے پاس موجود ہے جس کھانے کی خواہش دل میں پیدا ہوگی اسے کھا سکتا ہوں، جس لباس کے پہننے کو جی چاہے گا، بنوا سکتا ہوں، جہاں جانے کی ضرورت ہوگی جا سکتا ہوں، حتیٰ کہ جس ڈاکٹر کو چاہوں گا بیمار پڑنے کی صورت میں بلوا سکتا ہوں، جس دوا کی طبیب ضرورت ظاہر کرے گا منگوا سکتا ہوں، روپے کے متعلق ''استغنا'' یا ''غنا بخشی'' کا یہی نظریہ ہے جو ارباب بخل پر مسلط ہوتا ہے اور بہ ظاہر یہ ایک عقل کی بات بھی معلوم ہوتی ہے، روپے کے متعلق یہی احساس ایسوں کو اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیاز بناتا چلا جاتا ہے، نہ صرف انسانوں سے ہی، بلکہ بہ تدریج ایک کیفیت قلب میں ان کے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی کیفیت جس کا انھیں ممکن ہے شعور بھی نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ روپے کی استغنائیت ان کو خدا سے بھی بالآخر بے تعلق بنا کر رہتی ہے اور ہے بھی یہی بات کہ خدا کی ضرورت تو اسی بیچارے کو ہوتی ہے جو اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہو اور سرمایہ دار خواہ واقعہ میں کتنا ہی بے سہارا ہو، لیکن روپے کا ایک نشہ ہوتا ہے، جو بے سہارا ہونے کے احساس کو اس کے اندر پیدا ہونے نہیں دیتا، اور یہ تو خیر اس کے نفس کی ایک باطنی کیفیت ہوتی ہے، لیکن دوسرا جملہ وکذب بالحسنٰی (جھٹلاتا ہے وہ اچھی باتوں کو) یہی چیز اس باطنی کیفیت کے راز کو فاش کرتی رہتی ہے، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ الحسنٰی (یعنی ہر ایسی بات جو اچھی سمجھی جاتی ہے) قدرتاً بخل زدہ، انسان انھیں جھٹلاتا ہے، اس کے دل سے انسانیت کی ہمدردی نکل جاتی ہے، صلہ رحمی، غربا پروری، حسن سلوک الغرض تمام اخلاقی خوبیاں، کردار کی بلندیاں، اس کی نگاہوں میں حماقت اور نادانی بن جاتی ہیں، آخر ان باتوں کی پرواہ کیوں کرے؟ آدمی ان چیزوں کی پابندی یا خدا کے ڈر سے کرتا ہے یا مخلوق خدا کے خیال سے، لیکن جس پر اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیازی و استغناء کا احساس مسلط ہو، وہ کسی کا خیال ہی کیوں کرنے لگا، اپنی تمام بے مروتیوں، بداخلاقیوں کے متعلق دل میں وہ ایک ہی جواب رکھتا ہے کہ کوئی میرا کیا کرے لے گا؟ اس ''تکذیب بالحسنٰی'' کے ردعمل میں اگرچہ اسے ہر قسم کی رسوائیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، عمومیت اس سے بے نیاز رہتی ہے، محفلوں میں مجلسوں میں لوگ اس کی دنائتوں، خباثتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بنی آدم کے عام قلوب میں اس قسم کے لوگوں کے متعلق جو ایک قسم کی عداوت پائی جاتی ہے اور خلق اللہ کی ساری لعنتوں اور ملامتوں کی تہہ میں عداوت کا یہی

مخفی جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اسی عداوت کا یہ پرتو نہیں ہوتا۔ جس کے متعلق بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ "بخیل خدا کا دشمن ہے" مگر باوجود ان تمام باتوں کے اس کے قلب کا استغناء اس کے آگے کوئی میرا کیا کر لے گا، اسی جواب کو دہراتا رہتا ہے، اور ہے بھی یہی بات کہ بیچارے عوام اس کا کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن کیسی عجیب بات ہے جو اس کے بعد اسی آیت کے آخر میں، یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾

"پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے اس کے لئے "العسریٰ" کو یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو"۔

معلوم نہیں قرآن کے ان الفاظ کا مطلب دوسرے کیا سمجھتے ہیں، لیکن مجھ پر تو یہی یہی کھولا گیا ہے، یعنی عوام ظاہر ہے کہ ایسوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن جس نے اسے یہ دولت دی ہے، کیا اس کے پنجہ اقتدار سے بھی وہ نکل جاتا ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا چاہے تو اس دولت کو اس سے چھین لے یا دولت ہی کیا، وہ تو قادر ہے کہ زندگی اور زندگی کے جن احساسات پر یہ بولیاں وہ بولتا رہتا ہے اسی زندگی سے جب چاہے اسے محروم کر دے، یہ تو خیر عام بات ہے، اور رات دن یہ ہوتا ہی رہتا ہے مذکورہ بالا قرآنی الفاظ میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ اس سے الگ بات ہے، یعنی سب کچھ کو اس کے قبضہ اقتدار میں دیتے ہوئے، قدرت کی یہ عجیب مخفی تدبیر ہے کہ جس دولت وثروت روپے پیسے کو آدمی زندگی کی سہولتوں کے لئے حاصل کرتا ہے اور غالباً بخل زدہ آدمی بھی مال اندوزی کی راہ میں ابتداً جب قدم رکھتا ہے تو اسی عام خیال کے زیر اثر ہی رکھتا ہے۔ لیکن قدرت کی قہاریت کا یہ کیسا عجیب نظارہ ہے کہ جب روپے پیسے پر اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، تو بجائے "الیسریٰ" (آسان زندگی) کے العسریٰ (سخت دشواریوں سے بھری زندگی) اس پر آسان کر دی جاتی ہے، وہ سب کچھ کھا سکتا ہے۔ لیکن کچھ کھا نہیں سکتا۔ سب کچھ پہن سکتا ہے، لیکن کچھ پہن نہیں سکتا، الغرض اپنے اپنے دائرے کے اعتبار سے آرام وعیش کی جن جن صورتوں کو وہ مہیا کر سکتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک سے وہ محروم کر دیا گیا ہے، اتنا محروم کہ غربت، انتہائی غربت کی زندگی رکھنے والوں کو بھی جو سہولتیں میسر آتی ہیں عموماً بخل کے ان روگیوں کو وہ بھی نصیب نہیں ہوتیں، سچ پوچھئے تو ایسوں کو دیکھ کر بے ساختہ

ایں طرفہ تماشا بیں لب تشنہ بآب اندر

کا مصرعہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے، گویا بہتی ہوئی خنک ریز موجوں کے نیچے حالانکہ اسے بٹھایا جاتا ہے۔ موجوں پر موجیں گذرتی رہتی ہیں، اسی پر سے گذرتی رہتی ہیں، لیکن اس کور بخت کور نصیب کی تشنہ لبی اور محرومی اپنے حال پر باقی رہتی ہے، بہر حال حق تعالیٰ کی ذمہ داریوں سے انحراف واعراض کر کے بخل کی راہ جو اختیار کرتے ہیں، ان کے متعلق قرآنی آیت

﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾

پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے اس کے لئے العسریٰ کو (یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی

زندگی کو)

کا مشاہدہ ایک ایسا تفسیری مشاہدہ ہے جس کی زندہ مثالیں دُنیا کی آبادیوں میں جہاں ڈھونڈیے آپ کو مل سکتی ہیں، ہر قسم کی سہولتوں پر قابو یافتہ ہونے کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ زندگی کی دشوار ترین شکلوں کو اپنے آپ پر اس قسم کا آدمی کتنا آسان بنائے ہوئے ہیں، اور جیسے ان مثالوں کی کمی نہیں ہے، قرآنی الفاظ

﴿كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾

''جھٹلاتا ہے وہ ''الحسنیٰ'' کو (یعنی جو باتیں اچھی سمجھی جاتی ہیں)''۔

کے لئے بھی بجائے کتابوں کے کسی بخل زدہ فطرت کی زندگی کا مطالعہ ہی کافی ہوسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جن واقعات کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ میرے نزدیک تو قرآن فہمی کے لئے وہی بس کرتے ہیں، کسی کو زیادہ شوق ہو تو جاحظ کی مشہور ''کتاب البخلاء'' کے مطالعہ سے اپنے شوق کو وہ پورا کر سکتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ''الحسنیٰ'' کی تکذیب کے متعلق تو کوئی میرا کیا کرلے گا؟ یہ جواب بھی وہ رکھتا ہے۔ اس تکذیب کے ردِعمل کا ظہور جن شکلوں میں ہوتا ہے، ان کے متعلق بھی یہ سمجھ کر کہ حاسدوں کو بکنے دو، وہ میرا بگاڑ ہی کیا سکتے ہیں، شائد اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہو، اگرچہ سچ تو یہ ہے کہ معیشت کی تنگی وضیق کے لئے اس کی یہی رسوائیاں کافی ہوسکتی ہیں، اور میں نہیں جانتا کہ انسانی احساسات رکھتے ہوئے یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ خلق اللہ کی لعنتوں اور ملامتوں کی چوٹ اس کے دل پر نہیں پڑتی مال کا ایک بڑا مصرف جیسا کہ حضرت حسین علیہ السلام سے مروی ہے، عزت اور آبرو ہی کا بچانا ہے۔ لیکن قدرت کا یہ بھی انتقام ہی ہے کہ اسی مال سے رسوائیوں اور بے عزتیوں کے خریدنے پر وہ مجبور کیا جاتا ہے، تاہم جو اذیت اپنی بے عزتی بے آبروئی سے آدمی کی ہوتی ہے۔ چوں کہ قلب کی یہ ایک مخفی کیفیت ہے جس پر گذرتی ہے وہی اس کا صحیح اندازہ کرسکتا ہے، دوسروں کے مشاہدہ کی یہ چیز نہیں؛

مگر دوسری سزا یعنی ''العسریٰ کی تیسیر'' یعنی دشوار اور کٹھن زندگی جو اس پر آسان کردی جاتی ہے اور سزا کے اس سلسلہ میں بآب اندر رہ کر جس ''تشنہ لبی'' کا تماشا یہ طبقہ دکھاتا چلا آرہا ہے، یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، سہولتوں اور آسانیوں کے لئے جو چیز حاصل کی جاتی ہے، مغالطوں میں مبتلا ہو کر اسی کو اپنی دشواریوں اور سختیوں کا وہ ذریعہ بنالیتا ہے۔[1]

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص: ۲۰۵۔۲۰۷

آیت: ﴿لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى O الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى﴾ (اللیل: ۱۵، ۱۶)

''نہ داخل ہوگا اس (جہنم) میں مگر سب سے بڑا بد بخت وہی ہے جس نے جھٹلایا اور پیٹھ پھیری''۔

قرآن کی یہ آیت تو ایسی آیت ہے کہ جدلی مفسرین سے بھی جہاں تک میں نے دیکھا ہے اب تک کوئی تشفی بخش تاویل نہیں بن پڑی ہے۔ قرآن کے صریح الفاظ کا مقتضا یہ ہے کہ مسلمان جو اور کچھ نہ سہی مگر پیغمبر کو جھٹلا کر ان سے رشتہ توڑنے کا مجرم نہیں ہے کیوں کہ اس جرم کا مجرم تو مسلمان ہی باقی نہیں رہتا بہ ہر حال مسلمان جہنم میں داخل نہ ہوگا اس کے سوا کوئی دوسرا مطلب اس آیت کا اس وقت تک نہیں لیا جا سکتا جب تک کہ قرآنی الفاظ کے ساتھ خود اپنے الفاظ کو بھی باہر سے شریک نہ کیا جائے۔ جدلی تاویل والوں نے یہی کیا بھی ہے۔

* کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن ہی میں دوسری جگہ جب یہ فرمایا گیا ہے کہ شرک کے سوا اور جتنے جرائم ہیں ان کی معافی کو خدا نے اپنے اختیار اور مشیت کے ساتھ متعلق کر دیا ہے۔ اب اگر اس آیت کا وہی مطلب لیا جائے جو بہ ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو شرک کے سوا دوسرے سارے جرائم کے متعلق یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے مرتکب کو سزا نہیں دی جائے گی یعنی سزا کی معافی مشیت کے ساتھ وابستہ نہ رہی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جہنم سے بچ جانے کا مطلب یہ کیسے لے لیا گیا کہ سزا سے بھی مجرم بچ گیا۔ کیا سزا کے لیے جہنم جانا ضروری ہے؟ آخر حدیثوں میں جو آیا ہے کہ دنیا کے مصائب گناہوں کے کفارہ بن جاتے ہیں تو اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیاوی مصائب کی شکل میں بھی مجرم سزا بھگت لیتا ہے۔ قرآنی آیت من یعمل سوا یجزبہ (جو کرے گا برائی اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا) جب نازل ہوئی تو بخاری وغیرہ میں ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہر گناہ کا جب بدلہ ضروری ہے تو ہم میں ایسا کون ہے جس سے برائی صادر نہیں ہوئی ہے؟ مطلب یہ تھا کہ مغفرت و شفاعت وغیرہ کی گنجائش اس آیت کے بعد باقی نہ رہی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت بھی یہی سمجھایا تھا کہ سزا کے لئے یہ کیوں سمجھتے ہو کہ مجرم کو جہنم ہی میں جانا پڑے گا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کے مصائب حتیٰ کہ پاؤں میں کسی کے کانٹا بھی جو چبھ جاتا ہے یہ بھی جرم کی سزا کی ایک شکل ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس کی تعبیر یہ کی ہے کہ سزا کی تخفیف و تحویل کی یہ شکل مثلاً مجرم قتل کا مستحق تھا اس کی گریہ وزاری پر قتل کی سزا حبس سے یا حبس کی سزا تازیانے سے تازیانے کی سزا زبانی تحقیر و اہانت سے بدل دی جائے، رحم و مغفرت کا برتاؤ بھی مجرم کے ساتھ کیا گیا اور جرم کی سزا بھی اس نے چکھ لی۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے مکتوب میں لکھا ہے کہ ''اہل کبائر کے گناہ ایشاں بہ مغرت نہ آمدہ اند بہ توبہ شفاعت یا بہ مجرد عفو و احسان و نیز آں کبائر را بہ آلام و محن دینوی باشد و سکرات موت مفرنہ ساختہ، امید است کہ در عذاب آں ہا۔ جمعے را بہ عذاب قبر کفایت کنندہ و جمعے دیگر را با وجود ملتجائے قبر ما احوال قیامت وشدائد آں روز اکتفا فرمانند واز گناہاں باقی نگذارند کہ محتاج ''بعذاب نار'' گردند ص ۳۱۸ ج ا مکتوب ۳۶۶ جس کا مطلب یہی ہوا کہ کبیرہ گناہوں کے مجرموں کی سزا کے لیے جہنم کے عذاب کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ توبہ و شفاعت یا حق تعالیٰ کے فضل و کرم کی دستگیریوں سے اگر وہ محروم ہو گئے تو دنیاوی سکرات موت کی سختیوں اور قبر یا برزخ کی پریشانیوں پھر میدان قیامت کی ہول

تا کیوں یہ سب ملا کر اتنی کافی سزا کی صورتیں ان لوگوں کے لیے ہیں کہ جہنم جانے کی سزا پانے کے لیے ان کو ضرورت نہ ہو گی۔ اس بنیاد پر قرآنی آیت میں قطعاً کسی مزید اضافے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ابن سیرینؒ سے یہ روایت جو نقل کی گئی ہے کہ چالیس سال پہلے کسی کو انہوں نے مفلس جو کہہ دیا تھا اس کی سزا ان کو تجارتی خسارہ اور قید میں بھگتنی پڑی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے جہنم کے اس قسم کی سزاؤں کو مسلمانوں کے لیے کافی سمجھتے تھے جو جہنم سے پہلے اسی زندگی میں یا برزخ یا حشر کی زندگی میں لوگوں کو جھیلنی پڑے گی۔ پس یہ عقیدہ کہ مسلمان جہنم میں نہ جائے گا اور اپنی بدکرداریوں کی سزا بھی بھگتے گا دونوں میں کوئی تعارض و تناقص باقی نہیں رہتا۔ البتہ مسلمانوں کے لیے یہ دشواری ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ سزا اور جزا کے جس قصے کو عموماً یہ سمجھ کر کہ جب پیش آئے گا دیکھا جائے گا۔ یعنی ادھار سودے کے خریداروں کی ذہنیت جو ہوتی ہے، عموماً اسی ذہنیت میں مسلمان بھی مبتلا نظر آتے ہیں اس کو بدلنے کی ضرورت ہو گی کیوں کہ ادھار کے قصے کا زیادہ تر تعلق غیر مسلم اقوام کے ساتھ محدود ہو کر رہ جاتا ہے جو اس وقت تک رسول اللہ ﷺ کی رسالات کو جھٹلانے پر اصرار کرتے رہے ہیں اور مسلمانوں کے لیے بجائے ادھار کے نقد یعنی اسی زندگی میں اپنے کرتوتوں کی سزاؤں کے بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے یا زیادہ سے زیادہ قبر و حشر جسر تک ان کے لیے سزایابی کا وہ میدان وسیع باقی نہیں رہتا جو جھٹلانے والے کفار کے لیے جہنم کی لامحدود زمانے کی شکل میں کھلا ہوا ہے *[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مقالات احسانی، ص ۱۰۸۔۱۰۹

﴿التین﴾

آیت : ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ Oثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ﴾ (التین:۴،۵)

''یہ واقعہ ہے کہ پیدا کیا ہم نے آدمی کو سب سے اچھے قالب میں، پھر پلٹا دیا ہم نے اسی آدمی کو اس طور پر کہ سارے نیچوں میں سب سے زیادہ نیچے وہی ہو گیا۔''

رسوائیوں اور خواریوں کی شکار انسانیت جیسے پرانی مشرکانہ ذہنیت یعنی مخلوق پرستی کے دور میں ہو گئی تھی، آج بھی جدید مادی تہذیب میں ذلت و پستی، بے قدری و لا حاصلی کا یہ داغ، سیاہ داغ اس کی پیشانی سے نہیں مٹا ہے۔ آخر کائنات کی صفوں میں سب سے زیادہ بے قیمت، بے نتیجہ، لا حاصل بن کر رہ جانا، حقارت و ذلت، خواری اور رسوائی کے سوا اسے اور کیا سمجھا جائے؟ کوئی شبہ نہیں اور اسے ماننا ہی چاہیے کہ اس حد تک شرک قدیم ہو یا جدید، دونوں ہی کا حال کچھ ایک سا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اشتراک و یک رنگی۔ معاذ اللہ انسانی شرافت و کرامت کے چہرے کی وہ سیاہیاں جو ''مخلوق پرستی'' کے ہاتھوں پھیری گئیں، وہی جس کی بدولت گویا ساری مخلوقات اور ساری کائنات ہی کو حق حاصل ہو گیا کہ آدمی کے معبود اور ''الٰہ'' بن جائیں اور بن جائیں کیا معنی؟ ان میں کون سی چیز ایسی باقی رہ گئی ہے، جس کی بندگی کا پٹہ آدم کے بچوں کے گلے میں نہیں بندھ چکا ہے یا اس وقت تک نہیں بندھا ہوا ہے؟ اف! جوان سب میں اونچا، سب سے بڑا، سب سے مکرم، سب سے زیادہ محترم و گرامی عزت والا تھا، وہی سب کے نیچے جا پڑا۔ ساری کائنات ہی گویا اس پر چڑھ بیٹھی، سب ہی، آقا کیا باضابطہ رب اور معبود بن گئے اور انسانیت کے نیچے جھکی ہوئی، پسی ہوئی 'انسانیت' کراہتی رہی اور اس وقت تک کراہ رہی ہے۔ قرآن کی سورہ التین کی آیتوں

﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ Oثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ﴾

کا مطلب لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ لیکن آگے جو خبر دی گئی کہ ایمان اور عمل صالح والوں کے سوا سب ہی اس حال میں گرفتار ہوئے یعنی سارے نیچوں کے نیچے ہو گئے، اپنا خیال تو اس کی روشنی میں اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ جو واقعہ پیش آ چکا ہے، آنکھوں سے جو کچھ دیکھا جا رہا ہے، یہ اسی کی تصویر ہے۔ شرک کے دور قدیم میں بھی اس کا تماشا کیا گیا تھا اور نئے مادی چولے میں شرک کی اس ''ذہنیت'' نے آج یورپ و امریکہ سے جو سر نکالا، وہ بھی ''انسانیت'' کو اسی دردناک انجام تک تقریباً پہنچا چکی ہے۔ کم از کم آدمی کا وجود سب سے زیادہ بے قیمت بن کر تو رہ ہی گیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص ۲۶۳، ۲۶۴

﴿العلق﴾

آیت : ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (العلق:۵)

''اور سکھائیں خدا نے انسان کو وہ باتیں جنھیں وہ نہیں جانتا۔''

بہ ظاہر شاید یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنی لامحدود نعمتوں میں سے ان الفاظ کے ذریعے سے ایک خاص نعمت (علم) کو یاد دلا کر حق تعالیٰ نے بندوں پر اپنا احسان جتلایا ہے، ہاں یہ بھی بڑا احسان ہے اور مستحق ہے کہ محسن اپنے اس احسان کو جتلائے۔ لیکن یہ تو ایک عام بات ہوئی، غور کرنے کی چیز تو محل اور مقام کی خصوصیت، نیز وہ الفاظ ہیں جن سے اس نعمت کا اظہار فرمایا گیا ہے، طولِ کلامی کے الزام سے پھر ڈر رہا ہوں لیکن جو کہنا چاہتا ہوں، اگر الزام کے ڈر سے اسی کو چھوڑتا چلا جاؤں، تو پھر لکھنے کی اس دردسری کے خریدنے کی حاجت ہی کیا تھی، قرآن میں تو سب ہی کچھ لکھا ہوا ہے، خواہ اسے سمجھا اور سمجھایا جائے یا نہ سمجھا جائے نہ سمجھایا جائے۔

میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ قرآن کا نزول عربی زبان میں شروع ہوا تھا تا کہ عربی جن کی مادری زبان ہے، اُن کے لئے بھی، اور جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے، اُن کے لئے بھی۔ الغرض بنی آدم کے تمام گھرانوں، ہر ملک ہر قوم کے ہر ہر فرد کے لئے رہتی دنیا تک اس کو آخری پیغام بنایا جائے۔

اس پر کھلا ہوا سوال ہوسکتا تھا اور اسے ہونا ہی چاہئے کہ عربی جن کی زبان ہے ان کے لئے تو عربی میں اترنے والا یہ پیغام پیغام بن سکتا ہے، لیکن جن بیچاروں کی زبان عربی نہیں ہے، ان کو عربی زبان کا مخاطب بنانا کیا قرین انصاف ہوسکتا ہے۔ اسلام کے عمومی پیغام ہونے پر پہلا اعتراض یہی ہوسکتا تھا جہاں تک میں سمجھتا ہوں اعتراض سے پہلے اسی کا جواب پہلی وحی کے اس فقرے میں دیدیا گیا ہے۔ توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان اور غیر انسانی انواع میں یہی تو فرق ہے کہ آدمی کے سوا جاننے والی علم و احساس رکھنے والی جتنی ہستیاں ہیں، ان کی یہ خصوصیت ہے کہ سیکھنے سکھانے یا اکتساب و تعلیم کے بغیر شکم مادری ہی سے چند خاص جبلی الہامات کہیے یا احساسات یا معلومات اپنے ساتھ لاتی ہیں، ان میں جو جب تک جیتا ہے، اپنی پوری زندگی ان ہی بھنڈ گنے چنے مقررہ الہامات و فطری احساسات ہی کے تحت گذارتا ہے، بط کا بچہ انڈے سے نکلتا ہے، سکھانے والوں سے قطعاً کچھ سیکھے بغیر دیکھا جاتا ہے کہ پانی میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی تیرنے لگتا ہے۔ شناوری یقیناً ایک علمی کمال ہے، جو بط کے بچوں کو بخشنے والے کی طرف سے بخشا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ بط کی ابتدا بھی اسی کمال سے ہوتی ہے۔ اور بوڑھی ہو کر جب کوئی بط مرتی ہے، تو اس وہی کمال کے سوا اس کی پوری زندگی میں کسی اکتسابی کمال کا قطعاً بال برابر بھی اضافہ نہیں ہوتا، اور بطخ تو ایک مثال ہے۔ ماوراء انسانی جانداروں اور علم و احساس رکھنے والے حیوانوں میں سب کا ہر ایک کا یہی حال اور قطعاً یہی حال ہے، ان کے لئے قدرت کا یہی قانون ہے، جس چیز کے عالم بنا کر وہ پیدا کئے جاتے ہیں، خواہ وہ علم جتنا بھی دقیق، جتنا بھی پیچیدہ ہو، ان مہندسانہ چابکدستیوں ہی کا علم کیوں نہ ہو شہد کی مکھیاں جس کی مدد سے ان چھتوں اور محالوں کو بناتی ہیں، جن کی اقلیدسی نادرہ کاریوں کو دیکھ کر ریاضیاتی عقول والے بھی چکرا رہے ہیں، بیا جیسی چڑیا، یا جونک جیسے کیڑوں کے وہ فطری احساسات ہی کیوں نہ ہوں، جن کی بدولت پیش آنے سے پہلے طوفانی ہواؤں یا سیلابوں کی نوعیت اور ان کے بہاؤ کی سمت کا ان پر انکشاف ہو جاتا ہے۔

مگر با ایں ہمہ ان میں ہر ایک کا علم ان ہی معلومات اور ان ہی احساسات تک محدود رہتا ہے، قطعاً ان ہی تک محدود رہتا ہے۔ جنھیں بھرنے والا پیدا ہونے سے پیشتر ہی ان کی جہتوں میں بھر دیتا ہے اسی لئے جس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کا سرمایہ یہی ہوتا ہے اور جس دن مرتے ہیں، کسی قسم کا کوئی مزید اضافہ اس سرمایہ میں نہیں ہوتا۔

لیکن اسی کے مقابلے میں بنی آدم یا الانسان کو دیکھئے، پیدا تو ہوتا ہے بے سروسامانی جہل و نادانی کی انتہائی ناقص عیوب میں لتھڑا ہوا، لیکن اسی کے ساتھ اس کی اس عجیب وغریب حیرت انگیز صلاحیت و قابلیت کا کون انکار کر سکتا ہے، جو نہ جانی ہوئی چیزوں کے جان لینے، اور سیکھ لینے کی اس میں قدرتی طور پر پائی جاتی ہے۔ بلاشبہ وہ جس وقت شکم مادر سے نکلتا ہے، شائد اس وقت کچھ نہیں جانتا، یا جو کچھ جانتا ہے۔ وہ نہ جاننے کے برابر ہوتا ہے۔ مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے، جانتا چلا جاتا ہے، سیکھتا چلا جاتا ہے، ان ہی باتوں کو جانتا چلا جاتا ہے۔ سیکھتا چلا جاتا ہے، جنھیں وہ نہیں جانتا تھا، قطعاً نہیں جانتا تھا، مالم یعلم (جسے انسان نہیں جانتا) ان ہی کے متعلق علّم (سکھاتا ہے اس کو) کے عمل کے قبول کرنے کی جو فطری صلاحیت آدمی میں پائی جاتی ہے، قرآنی آیت **علم الانسان ما لم یعلم** میں جہاں تک میرا خیال ہے اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور یہی جواب ہے اس سوال کا کہ جو عربی نہیں جانتے ہیں وہ بھی عربی زبان میں اترنیوالے پیغام کے صحیح مخاطب اور اس کے سمجھنے، اس پر عمل کرنے کے مکلف کیسے بنائے جاسکتے ہیں، نہ جانی ہوئی چیزوں سے سیکھنے اور جاننے کی صلاحیت ہی جس کی فطرت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ کیا اپنی اس عجیب و غریب تعلیمی قابلیت پر متنبہ ہونے کے بعد اس بیجا سوال کی جرات وہ کر سکتا ہے؟

باہر سے جو ضعف اور کمزوریوں، انتہائی کمزوریوں کے حال میں پیدا ہوتا ہے۔ تعلم و اکتساب علم یا نہ جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی صلاحیت ہی کی بدولت دیکھا جارہا ہے کہ سارے زور آوروں کو اپنے آگے بے زور بنائے ہوئے ہے۔ ہاتھیوں کو جھکائے ہوئے ہے، اونٹوں کو دبائے ہوئے، سانڈوں کو سدھائے ہوئے ہے، شیروں کو پھنسائے ہوئے ہے، وھیلوں کا شکار کر رہا ہے، گینڈوں کو للکار رہا ہے، اور یہاں کون ہے جو اس کی دہائی نہیں پکار رہا ہے۔

پس کوئی شبہ نہیں کہ پیدا ہونے کی حد تک تو آدمی زادہ عقل و خرد ہوش و تمیز سے بیگانہ ہو کر پیدا ہوتا ہے، اس کی حیثیت یقیناً گوشت کے ایک زندہ مضغہ اور ناتراشیدہ کندے ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن جب مرتا ہے تو ان ہونے والوں میں نہیں دیکھا گیا اور کیا اب نہیں دیکھا جارہا ہے، روزمرہ آئے دن دیکھا جارہا ہے، ہر جگہ دیکھا جارہا ہے کہ ان میں کتنے علامہ و حکیم، ڈاکٹر و طبیب، حبر و نحریر ہو ہو کر مر رہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ انسان کی ساری تسخیری کرشمہ سازیاں کائنات کے گوشہ گوشہ میں خاک و آب و آتش و باد کے ہر طبقہ میں جو نظر آرہی ہیں، یہ سارا تماشا یا ساری تفسیر قرآن کی آیت

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (العلق:۵)

''سکھائیں الانسان کو وہ باتیں جنھیں وہ نہیں جانتا۔''

ہی کے چند لفظی فقرے ہی ''نادانستہ'' کو ''دانستہ'' بنانے کا یہی باطنی سلیقہ ہی تو آدمی کا ہے جس میں اس کی ساری اختراعی کارفرمائیوں اور ایجادی نادرہ نمائیوں کی ضمانت پوشیدہ ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۳۱۔۱۳۳

﴿الھمزہ﴾

آیت: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللهِ الْمُوقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۝ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾ (الھمزہ:۱۔۹)

''تف ہے ہر چشمک مارنے والے عیب چینی کرنے والے کے لئے جو جمع کرتا ہے مال کو اور گنتا رہتا ہے اس کو خیال کرتا ہے کہ دوام بخشا ہے مال اس کا، ہرگز نہیں، وہ جھونک دیا جاتا ہے الحطمہ میں اور کس نے تجھے بتایا کہ الحطمہ کیا چیز ہے، آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی، چڑھ جاتی ہے دلوں پر اس آگ کے پٹ بند ہیں لمبے لمبے کھمبوں میں''۔

قرآن کی ایک پوری سورۃ جس کا سورہ ھمزہ نام ہے۔عم یتسالون ہی کے پارے کی مشہور سورۃ ہے۔اس میں بھی ایک معاشی مسئلہ کے ایک خاص پہلو کو بیان کیا گیا ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے واللیل میں مال اور سرمایہ کے متعلق ''نظریہ غنا بخشی'' اور جن آثار ونتائج تک یہ نظریہ آدمی کو پہنچاتا ہے،اسی طرح مذکورہ بالا سورۃ یعنی سورہ ہمزہ میں اسی مال اور سرمایہ کی بابت ایک دوسرا عام خیال جو پایا جاتا ہے،اسی کی تعبیر

﴿يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ﴾

''خیال کرتا ہے کہ دوام بخشا ہے اس کو مال اس کا''

کے الفاظ میں کی گئی ہے،یعنی یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ زندگی کی راحتوں اور سہولتوں کو دیرپا بنانے کی یا قرآنی اصطلاح کی رو سے ''خلود بخشی'' کی کیفیت مال میں پائی جاتی ہے اور اسی بنیاد پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ کا ذخیرہ جتنا زیادہ بڑھایا جائے گا،راحتوں اور سہولتوں کی دیرپائی اور خلود کی ضمانت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جاتی ہے۔مثلاً دوسو روپے ماہوار کے خرچ سے زندگی کا جو معیار قائم ہوتا ہے،اس معیار کو وہی برقرار رکھ سکتا ہے جو اس آمدنی کو قائم رکھے،اور اس معیار کو جو بلند کرنا چاہتا ہے، چاہیے کہ اپنی آمدنی کو بھی بڑھائے۔

مال کے متعلق ''خلود بخشی'' کا یہی نظریہ ہے جو صرف ''جمع'' مال کے سمیٹنے ہی پر نہیں۔بلکہ ان گوناگوں پیچیدہ تدبیروں اور ترکیبوں پر آدمی کو آمادہ کرتا ہے،قرآن میں جس کی طرف ''عددہ'' کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔بہ ظاہر یہ ایک لفظ معلوم ہوتا ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، یہی ایک لفظ ان تمام حسابی چکروں کو حاوی ہے،جن کی عامیانہ تعبیر ''ننانونے کے پھیر'' سے کی جاتی ہے، بلکہ اگر وسعت نظری سے کام لیا جائے تو اکاؤنٹ اور فینانس وغیرہ کے پرشوکت الفاظ سے موجودہ زمانے میں مالی کاروبار کے جن شعبوں کو موسوم کیا جاتا ہے ان پر بھی ''عددہ'' کے قرآنی لفظ کو ہم منطبق کرسکتے ہیں۔

آگے قرآن میں ''کلا'' کا لفظ ہے، جو ایک تردیدی کلمہ ہے،جس کا اردو ترجمہ ''ہرگز نہیں'' کیا گیا ہے۔اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ''جمع وعد'' کی یہ ہنگامہ آرائیاں،خلود اور دیرپائی کے جس مقصد کے لئے لوگ برپا کئے ہوئے ہیں،اور خیال

کرتے ہیں کہ سرمایہ کے متعلق ''جمع وعد'' کی یہ تدبیریں خلودی نصب العین کے حاصل کرنے میں انہیں کامیاب بنائیں گی، قطعاً غلط ہے،اس کے بعد جو یہ الفاظ ہیں۔

﴿لَيُنۢبَذَنَّ. فِى الْحُطَمَةِ O وَمَآ اَدْرٰكَ مَاالْحُطَمَةُ O نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ O الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ O اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ O فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾

''قطعاً جھونک دیا جاتا ہے وہ ''الحطمہ'' میں اور کس نے بتایا تجھے کہ الحطمہ کیا چیز ہے،آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی جو چڑھ جاتی ہے دلوں پر،اس آگ کے پٹ بند ہیں ان لوگوں پر لمبے لمبے کھمبوں میں''۔

لفظی ترجمہ تو قرآنی الفاظ کے سامنے لکھ دیا گیا ہے،لیکن مطلب اس کا کیا ہے؟ موجودہ زندگی کے بعد جو دوسری زندگی آنے والی ہے۔کیا ان کیفیات وحالات سے اس زندگی میں ان لوگوں کو دوچار ہونا پڑے گا یا آئندہ زندگی کے سوا موجودہ زندگی میں بھی ہم ان کیفیتوں کو ان لوگوں کے اندر پا سکتے ہیں۔جن کی طرف ''جمع وعد'' کے ان آثار اور نتائج کو منسوب کیا گیا ہے،سورۃ کے ابتدائی الفاظ

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ﴾

''تف ہے ہر چشمک مارنے والے عیب چینی کرنے والے کے لئے''۔

کو پہلے سمجھ لینا چاہیے،ممکن ہے کہ اسی سے اس سوال کا جواب بھی نکل آئے۔

ہمزہ کا مادہ ہمز ہے،اور لمزہ کا مادہ لمز ہے۔ہمز کے معنی کچوکے لگانے کے ہیں۔مہمیز کا لفظ اردو میں بھی اسی ہمز سے بنا ہے۔سوار اپنے جوتوں میں لوہے کی کیل جیسی چیز اس لئے لگاتے ہیں کہ گھوڑے کو ایڑ لگانے کی ضرورت جب ہوتی ہے تو کچوکے لگانے کا کام اسی کیل سے لیتے ہیں،قریب قریب لمز کا مفہوم بھی یہی ہے،منجملہ اور معانی کے منتہی الارب میں زدن وسوختن یعنی مارنا اور جلانا بھی لمز کا ترجمہ کیا گیا ہے،یہ تو ان الفاظ کے ابتدائی معانی تھے،بعد کو یہ محاورہ ہو گیا کہ جن کے اقوال وافعال سے دل مجروح و زخمی ہوتے ہوں اور اپنی گفتار،رفتار سے لوگوں کو جو جلاتے ہوں،ان ہی کو ہمزہ لمزہ کے نام سے موسوم کرنے لگے،اسی لئے عامہ مفسرین نے چشمک زنی کرنے والے،فقرے کسنے والوں کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کرنے والے نقل بنانے والے غیبت کرنے والے وغیرہ الفاظ میں ہمزہ لمزہ کی تشریح کی ہے،اب غور کرنے کی بات یہی ہے کہ مال کے متعلق ''جمع وعد'' کے گورکھ دھندوں میں جو لوگ شب وروز منہمک ومشغول رہتے ہیں ان کا ہمز ولمز کے ان صفات سے کیا تعلق ہے؟

بات یہ ہے کہ ''خلود بخشی' اور دیرپائی'' کی ضمانت مال اور سرمایہ میں محسوس کر کے ''جمع وعد'' کی اس مہم میں،کرنے والوں کو یوں تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے،لیکن حاصل سب کا یہی ہوتا ہے کہ جو آچکا ہے۔اس سرمایہ کے ایک ایک پیسہ کی نگرانی کی جائے،اور جو ابھی نہیں آیا ہے اس کے آنے کے ممکنہ ذرائع کو کسی طرح ضائع ہونے نہ دیا جائے۔اب اسی کے ساتھ اکبر مرحوم کی اس حقیقت طرازی کو بھی سامنے رکھ لیجئے جو انھوں نے فرمایا ہے۔

یہ بات ہے صاف مجھ سے سن لے　　　کتاب میں اس کو کیا پڑھے گا

حدود فطرت کے ہیں مقرر　　　جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

اور یہی بات اس سرمایہ پر بھی صادق آتی ہے جو زندگی گذارنے کے لئے دنیا میں آدمی کو دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سرمایہ پر جو لوگ ''جمع وعد'' کا عمل شروع کرتے ہیں تو لازماً ان کے سامنے دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں، اگر اپنے سرمائے کے بڑھانے میں کامیاب ہوئے تو قدرتاً دوسروں کا سرمایہ گھٹ جائے گا۔ اور اگر ناکام ہوئے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ دوسروں کا سرمایہ بڑھ گیا اور ان کا گھٹ گیا، جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ''جمع وعد'' کی مہم کا یہی وہ نقطہ ہے جو مقابلہ کے اس میدان میں آدمی کو بہر حال گھسیٹ کرلے ہی آتا ہے جس کی طرف قرآن ہی میں دوسری جگہ

﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ O حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (التکاثر:۱،۲)

غفلت میں ڈال دیا تم کو التکاثر نے (یعنی دولت کے بڑھانے میں باہمی مقابلہ نے) حتی کہ زیارت کی تم نے قبروں کی۔

کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے ''التکاثر'' کا مادہ کثرت ہے، یہی کثرت جب ''تکاثر'' کی شکل اختیار کرلیتی ہے تو کثرت طلبی میں مقابلہ اور Competition کا مفہوم اس سے سمجھا جاتا ہے، یہ التکاثر کا خبط ایک ایسا خبط ہے کہ وہی آدمی جو صرف زندگی کی حقیقی ضرورتوں کی تکمیل کے ارادے سے معاشی جدوجہد کی راہوں میں ابتداءً قدم رکھتا ہے، اگر کہیں ننانوے کے پھیر میں پڑ کر ''التکاثر'' کے میدان مقابلہ میں کود جاتا ہے تو آئے دن یہ دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت کا سوال ایسوں کے سامنے سے ہٹ گیا اور صرف مقابلہ کا بھوت سر پر سوا ہو گیا، جیسے جیسے آگے بڑھنے کے مواقع مقابلہ کے اس میدان میں لوگوں کو ملتے چلے جاتے ہیں۔ اس مقابلہ کا دائرہ بھی بدلتا جاتا ہے، ابتداء میں کسی گاؤں کے باشندوں سے مقابلہ تھا، تو گاؤں سے آگے بڑھ کر اب کسی تعلقہ کے سرمایہ داروں کو اپنا ہم چشم بنالیا جاتا ہے، یونہی تعلقہ سے آگے بڑھ کر ضلع ضلع کے دائرے کو چھوڑ کر صوبہ، صوبہ سے نکل کر ملک، اور ملک کے دائرے کو بھی توڑ کر ساری دنیا میں چاہتا ہے کہ اسی کا گھوڑا اس راہ میں سب سے آگے نکل جائے، بلکہ ممکن ہے کہ بعضوں میں انسانیت کی ساری تاریخ میں بھی اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا جذبہ ''التکاثر'' کی راہ میں مسلط ہو جائے۔ الھاکم (غفلت میں ڈال دیا تم کو) کے الفاظ سے قرآن نے اس دماغی خبط کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں ''التکاثر'' کے بیمار مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ مسلسل مقابلہ کے اسی میدان میں آئے دن ان کو یہ دکھایا جاتا ہے کہ ان ہی کے ساتھ چلنے والوں میں کتنے ہیں جو گرتے جاتے ہیں، ٹپکتے جاتے ہیں، قبروں میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ''التکاثر'' کے خبطیوں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی، اور یہی مطلب ہے قرآن کے الفاظ کا

﴿حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (التکاثر:۲)

حتیٰ کہ زیارت کر چکے تم قبروں کی۔

ایک دو قبروں ہی نہیں بلکہ ''المقابر'' جو ''قبر'' کی جمع ہی نہیں بلکہ منتہی الجموع یعنی جمع کی انتہائی شکل کا صیغہ ہے، ان ''المقابر'' کی زیارت بھی مقابلہ کے ان دیوانوں میں چونک پیدا نہیں کرتی، اور کبھی دوسروں کی قبروں کو دیکھ کر اپنے قبری انجام کا خیال ان کے سامنے آتا بھی ہے تو فوراً اپنی تسلی اور اس دماغی خبط کی تصحیح کے لئے اپنے سامنے اپنی آئندہ نسلوں کو یہ لے آتے ہیں، گویا توجیہہ یہ کر لی جاتی ہے کہ مقابلہ کے میدان کے ان نتائج سے اگر مجھے تمتع اور استفادہ کا موقع قبر نہ دے سکے گی تو کیا ہوگا، میری آئندہ نسلیں تو اس سے مستفید ہوتی رہیں گی۔ یوں ''المقابر'' کی زیارت جس تنبیہ کو ان میں بیدار کر سکتی تھی، توجیہ کی اسی لوری کو سنا کر اسے بھی یہ سلا دیتے ہیں، اور ہر طرف سے بے خوف ہو کر ''التکاثر'' کے اس میدان میں اپنا نصب العین اسی مقصد کو بنا لیتے ہیں۔

قرآن میں دوسری جگہ جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں ان الفاظ میں اسے بیان کیا گیا ہے، یعنی

﴿وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا﴾ (الفجر:۱۹)

''اور التراث کو تم کھار ہے ہو سمیٹ کر کھانے کی شکل میں''۔

آیت کریمہ میں ''التراث'' کا لفظ ''وارث'' کی بدلی ہوئی شکل ہے، عربی زبان میں اس وزن اور اس شکل کے الفاظ اشتراک کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں، گویا پہلی نسلوں کے ساتھ پچھلی نسلیں جس سرمایہ میں شریک ہوں، ان ہی کو ''التراث'' کہتے ہیں۔ دوسرا جز اسی آیت میں ''اکل لم'' کا ہے، اکل کے معنی تو کھانے کے ہیں، رہا لم کا لفظ، تو عربی زبان میں ''رجل ملم'' اس شخص کو کہتے ہیں جو قوم کے بکھرے ہوئے افراد کو سمیٹ کر کسی نقطہ پر جمع کرنے والا ہو، منتہی الارب میں ہے ''رجل ملم'' (جمع کنندہ قوم یا عشیرہ پراگندہ را) لغت کی اسی کتاب میں مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ اسی بنیاد پر یہ کیا گیا ہے؛

تاکلون التراث اکلا لما ای نصیبکم و نصیب صاحبکم

تم کھار ہے ہو التراث کو اکل لم کی شکل میں یعنی اپنا حصہ بھی اور اپنے ساتھی کا حصہ بھی کھا جاتے ہو۔

حاصل اس کا یہی ہوا کہ سرمایہ اور دولت سے استفادہ کی یہ شکل کہ پہلی نسلوں سے پچھلی نسلوں تک وہ بایں شکل منتقل ہوتی چلی جائے کہ دوسروں تک قطعاً اس سرمایہ کا کوئی حصہ نہ پہنچ سکے، بلکہ جو کچھ ہو دانہ دانہ، رتی رتی، سب ایک ہی خاندان خاص نسل اور خاص طبقہ ہی تک پوری طاقت کے ساتھ اس طور پر اس کو محدود رکھنے کی کوشش کی جائے کہ کسی غیر کے منہ میں اس کی کوئی کھیل بھی اڑ کر نہ پہنچ سکے گویا وہی بات جس کے انسداد کے لئے صلحی فتوحات کے مقبوضات اور آمدنیوں کے متعلق قرآن میں

﴿لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾ (الحشر:۷)

''تاکہ نہ بن جائے ایسی دولت جو تمہارے سرمایہ داروں ہی کے درمیان (گھومتی رہے)''

کا قانون نافذ کیا گیا ہے، ٹھیک اسی کے توڑ پر یہ ''اکل لم'' سرمایہ داروں کا ایک خاص شیوہ ہے مسٹر ڈارلنگ نے امریکہ و یورپ کے موجودہ نظام سرمایہ داری کی تعریف کرتے ہوئے یہ الفاظ جو لکھے ہیں:

''یہ قبضہ میں رکھنے والوں اور تعاقب کرنے والوں کی محض اجتماعی صورتیں ہیں''۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ قرآنی الفاظ ''اکل لم'' ہی کی گویا یہ تفسیر ہے اور اسی کے بعد وہ حالت اس راہ کے چلنے والوں کی ہو جاتی ہے جس کی طرف بخاری کی مشہور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بایں الفاظ یعنی

فهو کالآ کل الذی لا یشبع[1]

اس شخص کی حالت جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔

فرمایا ہے، بلکہ قرآن کا وہ تمثیلی بیان گویا ان ہی لوگوں کی ایک زندہ تصویر ہے۔ یعنی اس مثالی شخص کا ذکر کرتے ہوئے جو زمین کی مٹی پکڑ کر بیٹھ گیا تھا، یا قرآنی الفاظ

﴿اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ﴾ (الاعراف:۱۷۶)

ہمیشہ کے لئے گڑ گیا زمین میں اور پیچھے چل پڑا اپنی خواہش کے۔

کی کیفیت جس پر مسلط ہو گئی تھی، اسی کے متعلق ارشاد ہے۔

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾

تو اس کی مثال اس کتے جیسی ہے کہ اگر اسے دھتکارو جب بھی ہانپنے لگے گا نہ دھتکارو جب بھی ہانپنے لگے گا۔

(الاعراف:۱۷۶)

سرمایہ کے متعلق یہ خیال کہ زندگی کی ضروریات و حاجات کی تکمیل کا وہ ذریعہ ہے، یہ چیز تو اس کے سامنے سے ہٹ جاتی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے ''سرمایہ'' اور ''مال'' بذات خود اس کا مقصود و مطلب بن جاتا ہے اسی لئے ہر حال میں ''جمع وعد'' کا یہ مریض ہانپتا ہی رہتا ہے، ملے جب بھی، نہ ملے جب بھی کتوں کی طرح زبان نکالے اپنے اوپر حرص کی ایک ایسی کیفیت طاری کئے رہتا ہے کہ گویا اسے اب تک کچھ ملا ہی نہیں ہے، ''جمع کرتا جائے، گنتا چلا جائے'' اس کا کام اب فقط یہی رہ جاتا ہے، قرآن ہی میں

﴿وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ (الفجر:۲۰)

''اور چاہتے ہو مال کو ''حب جم'' کے ساتھ''۔

جو فرمایا گیا ہے، اگرچہ میں اپنے خاص نقطہ نظر کی بنیاد پر بجائے مبسوط الرزق طبقات کے یہ زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ اس آیت کا تعلق قدری رزق پانے والوں کے اس گروہ سے سمجھا جائے، جو رزق کے اس قدری پیمانے کو اپنی اہانت و ذلت کا سبب ٹھہرا لیتے ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر اس کو عام رکھا جائے، کیونکہ سرمایہ داروں کا یہ گروہ بھی یقیناً مال سے اسی قسم کا عشق مفرط پیدا کر لیتا ہے۔ یعنی ہر چیز سے ٹوٹ کر صرف مال ہی کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے شب و روز وہ ''جمع وعد'' ہی کے ادھیڑ بن میں مبتلا رہتا ہے، اپنی ساری عقلی اور ذہنی قوتوں کی جولانیوں کی آماجگاہ ''جمع وعد'' کے مقابلہ کے اسی میدان کو قرار دے لیتا ہے، اسی میں رات دن وہ ''التکاثر'' والے مقابلہ میں مشغول و منہمک رہتا ہے، اور یہی چیز اس میں اس خیال کو پیدا کر دیتی ہے، کہ جو کچھ بھی

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، ابی عبداللہ، صحیح البخاری، کتاب الجهاد باب فضل النفقة فی سبیل اللہ [۲۸۴۲] ص ۴۷۱، مکتبۃ دار السلام، الطبعۃ الثانیۃ ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ

اس کے پاس جمع ہوگیا ہے یہ اس کی عددی کرتبوں اور معاشی مہارتوں کا نتیجہ ہے، قرآن کے سب سے بڑے تاریخی سرمایہ دار (قارون) کے حوالہ سے یہ فقرہ جو منقول ہے، یعنی وہ کہتا تھا کہ

﴿ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ﴾ (القصص:۷۸)

''اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ مجھے یہ دولت جو دی گئی ہے، یہ میرے اس علم کا نتیجہ ہے جو میرے پاس ہے''۔

وہ اسی خیال کی ترجمانی ہے، جس کا پیدا ہونا اس قسم کے لوگوں میں ان کے اعمال وافعال کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ اسی بنیاد پر ان کی زبانوں پر اس قسم کے فقرے جو جاری ہوتے ہیں۔

﴿ اَنْ تَبِیْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴾ (الکھف:۳۵)

''قطعاً اب (میرا قائم کیا ہوا یہ نظام آمدنی) برباد نہیں ہوسکتا۔''

یا اسی کے قریب قریب متعدد مقامات پر قرآن ہی میں ان کی طرف جو الفاظ منسوب کیے گئے ہیں تو وہ اسی زعم باطل کا نتیجہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قبضہ اقتدار میں جو کچھ بھی آیا ہے یہ ان کی حسابی اور عددی چالاکیوں اور فینانشل چابکدستیوں کا ثمرہ ہے۔

اور یہی مقام ہے جس پر پہنچنے والوں کا ہمز ولمز کے ان امراض میں مبتلا ہوجانا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ جن کا قرآن کی مذکورہ بالا سورہ ہمزہ میں ذکر کیا گیا ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایسا آدمی جو رزق کی بسطی حالت میں ہو یا قدری میں، دونوں کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ دونوں رزق کے قدرتی پیمانے ہیں، ظاہر ہے کہ کسی حال میں ہو، ایسے آدمی کی نگاہ رزق کے معاملہ میں قدرت اور اس کی مشیت ہی پر جمی رہتی ہے، لیکن جو

﴿ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ﴾ (القصص:۷۸)

دیا گیا ہے مجھے میرے اس علم کی بناء پر جو میرے پاس ہے۔

کے مغالطہ میں الجھ گیا یا الجھا دیا گیا ہو، وہ ان لوگوں کو بھی جو مقابلہ کے میدان میں اس سے پیچھے رہ گئے ہوں اور ان کو بھی جو آگے بڑھ گئے ہوں، دونوں ہی کے دونوں حالتوں کا ذمہ دار خود ان ہی کو قرار دیگا اور دے گا کیا معنی تجربہ شاہد ہے کہ قرار دیتا ہے، ایسی صورت میں یہ دیکھا گیا ہے، اور دیکھا جاتا ہے کہ ''جمع وعد'' کی مہم میں عموماً ناکام زیادہ تر وہی بیچارے رہ جاتے ہیں جو اپنی آمدی کو زندگی کی سہولتوں اور راحتوں میں خرچ کرتے ہیں، خواہ خود اپنی ذات سے اس کا تعلق ہو یا اپنے بال بچوں اعزہ واقرباء اور دوسرے مستحقین پر انھوں نے خرچ کیا ہو، اب کھلی ہوئی بات ہے کہ خرچ کرنے والوں کو جو راحت وآرام رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے وغیرہ میں نصیب ہوسکتا ہے، یہ بات اس کم بخت وکم نصیب کو کیسے میسر آسکتی ہے جس نے اپنے ہر ہر پیسے پر پہرا بٹھا دیا ہو اور ''جمع وعد'' کی اس مہم میں جو ہر وقت اسی فکر میں غلطاں پیچاں ہو کہ جو آچکا ہے وہ جانے نہ پائے اور جو آسکتا ہے، اس کے آنے

کا کوئی موقعہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، ظاہر ہے کہ دولت اور سرمایہ میں جو اس سے فروتر ہیں، ان کی رفاہیت، اور خوش باشی کو دیکھ دیکھ کر اگر اس میں رشک وحسد کی آگ جل اٹھے تو تعجب نہ ہونا چاہیے، جس کے پاس سب کچھ ہے وہ تو اکوں اور جھکوں پر مارا مارا یا جوتیاں ہی چٹکارتا بازاروں میں گھومتا پھرے، اور جس کے پاس کچھ نہیں ہے وہ موٹروں اور جوڑیوں پر اڑا پھرے۔ اس حال کو دیکھ کر بے چین ہو جانا ایک قدرتی بات ہوتی ہے اور اسی باطنی سوزش پر پانی ڈالنے کے لئے وہ ان خرچ کرنے والوں پر ہمزی کلمات کے ساتھ برسنے لگتا ہے، خصوصاً اگر اس خرچ کرنے والے غیر سرمایہ دار انسان کو کسی وقت سرمایہ دار صاحب سے کچھ لینے کی ضرورت پیش آجائے، خواہ وہ قرض ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو، لیکن مطالبہ کی تکمیل کا معاملہ تو بعد کا ہے، سب سے پہلے اس بیچارہ کو ان شعلوں میں دیر تک جھلسنا پڑتا ہے، جن کی صورت تو بہ ظاہر نصیحت اور خیر خواہی کی ہوتی ہے، لیکن درحقیقت حقیقی محرک اس کی تہہ میں وہی آگ ہوتی ہے، جو ان سرمایہ داروں کے دلوں میں چھپی ہوتی ہے۔ چونکہ ان ظالموں کو اس قسم کے بے سرمایہ لوگوں سے خوف بھی نہیں ہوتا، اسی لئے جلی کٹی جو بھی سنانی ہوتی ہے، عموماً ان کے منہ پر سنائی جاتی ہے، قرآن ہی میں ایک جگہ ان ہی سرمایہ داروں کے متعلق یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں۔

﴿الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (النساء:۳۷)

''وہی جو بخل اختیار کرتے ہیں اور حکم دیتے ہیں لوگوں کو بخل کے اختیار کرنے کا اور چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اپنے فضل سے اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کیا ہے''۔

تو ایک پہلو اس کا یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اسی قسم کے مواقع پر پہلے تو خرچ کرنے والوں کو یہ کفایت، شعاری عاقبت بینی وغیرہ کے الفاظ میں بخل کی تعلیم دیتے ہیں، اور اسی کے ساتھ جب سب کچھ سنا لینے کے بعد مطلب پر آتے ہیں تو بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہ کتمان فضل سے کام لیتے ہیں یعنی کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو خود کچھ نہیں ہے، خیر یہ صورت تو ان کے ساتھ پیش آتی ہے، جو میدان مقابلہ میں پیچھے رہ جاتے ہیں، باقی آگے نکلنے والوں کے منہ پر تو ممکن ہے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑے لیکن پس پشت یہ شکست خوردہ میدان مقابلہ میں ہارنے والا سرمایہ دار ہر گفتنی و ناگفتنی کو اس کی طرف منسوب کرتا ہے، اور ان ہی باتوں کو اس کی کامیابی اور اپنی ناکامی کی وجہ قرار دیتا ہے، اس نے بے ایمانی کی، دھوکہ دیا، فریب سے کام لیا، یہ کیا، وہ کیا، حالانکہ یہ بھی جو کچھ ہوتا ہے، اسی حسد کی آگ کے ظہور کی ایک شکل ہوتی ہے جس میں ''جمع وعد'' کا یہ ماہر سرمایہ دار جلتا بھنتا رہتا ہے۔ بعض علماء نے ہمزہ لمزہ کے ان دو لفظوں کی تفسیر کرتے ہوئے یہ جو لکھا ہے۔

العیب فی الوجه لمز و فی الغیب همز و قیل عکس ذلک و یدخل فیه السخریه و الا ستحزاء و المحاکاة

''سامنے منہ پر کسی کو برا بھلا کہنا یہ تو لمز ہے، اور پیٹھ پیچھے کہنا ہمز ہے بعض ان دونوں الفاظ کی تشریح بالعکس اس کے کرتے ہیں۔ بہرحال مسخرا پن کسی کے ساتھ کرنا، کسی کا ٹھٹھا اڑانا، کسی کی نقل بنانی ہمز ولمز کے نیچے

یہ ساری باتیں داخل ہیں"۔

تو اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے میں اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمزہ اور لمزہ کے ان دو قرآنی الفاظ میں سے ایک کا تعلق اگر ان لوگوں سے رکھا جائے جو جمع وعد کی مہم میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور دوسرے کے متعلق یہ قرار دیا جائے کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اس مہم میں آگے بڑھ جاتے ہیں، تو اس مشہور علمی قاعدے کی بنیاد پر یعنی تجدید سے تاسیس بہتر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دو لفظوں کا ایک ہی مصداق قرار دینا، اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ دو کو دو مختلف معانی پر محمول کیا جائے، اگر ایسا کیا جائے تو یہ زیادہ مناسب ہے۔

اب خیال کیجئے، اس شخص کے نفسی کیفیات اور باطنی واردات کا جو مال میں خلود بخشی کی کرامتوں کو پوشیدہ قرار دے کر جمع وعد کے گھن چکر میں مبتلا ہو گیا ہو، اور اسی اندرونی گردش نے بالآخر اس کو ہمز ولمز کے مقام تک پہنچا دیا ہو، وہ ان سے بھی بگڑا ہوا ہے، جو (س) سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور ان سے بھی روٹھا ہوا ہے جو آگے نکلے ہوئے ہیں، اسی کے ساتھ آئے ہوئے پیسے کے متعلق جو طے کئے ہوئے ہو کہ اسے نکلنے نہ دیا جائے گا، اور ہر وہ پیسہ جو ابھی نہیں آیا ہے۔ لیکن اس کے آنے کا کچھ بھی امکان ہے، اس کے متعلق بھی یہ فیصلہ کر چکا ہو کہ بہر حال اس کو آنا ہی چاہیئے، خود ہی سوچنا چاہیے کہ باہر سے ایسا آدمی خواہ کچھ ہی نظر آتا ہو، لیکن اندر جھانک کر دیکھیے، بجز آگ ہی آگ کے اس میں اور بھی کچھ ہو سکتا ہے، خصوصاً زندگی کی ناگزیر ضروریات میں آئے ہوئے پیسوں میں سے کچھ پیسوں کا خرچ ہوتا رہنا چونکہ بہر حال یقینی ہے، اسی طرح جن آمدنیوں کے حصول کا امکان پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں ان کا حاصل ہونا کب ضروری ہے۔ پھر کون اندازہ کر سکتا ہے اس چوٹ کا جو نکل نکل کر ہر پیسہ اس کے دل پر لگاتا رہتا ہے، اسی طرح جس کے آنے کا امکان تھا۔ جب اس آمدنی سے اسے محروم ہونا پڑتا ہے اس کے قلق اور بے چینی کی صحیح روئداد وہی دے سکتا ہے، جس پر گذرتی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایسوں کے لئے خرچ ہونے ہی کی صورت میں نہیں بلکہ خرچ ہو جانے، یا جمع شدہ سرمایہ کے ضائع ہو جانے کے خطرات بھی جن بھیانک صورتوں میں انھیں ڈراتے اور دھمکاتے رہتے ہیں۔ اور مختلف اندیشے اور احتمالات جن جن شکلوں میں انھیں کپکپاتے رہتے ہیں، بجائے خود بھی ایک مستقل بلائے جان کی صورت میں اس کے اندر تہلکہ مچاتے رہتے ہیں جس سے نجات کی کوئی صورت اس کے پاس نہیں ہوتی، آخر اس راہ کے بعض تجربہ کاروں سے کتابوں میں اس قسم کے اعترافات جو ملتے ہیں، مثلاً امریکہ کے مشہور کروڑ پتی کارینگی کا یہ زبان زد عام فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا،

"لاکھ پتی (ملینیر) کبھی مسکرا نہیں سکتا"۔

یا اسی قارون آباد کے دوسرے شاہ دولت راک فیلر آنجہانی کے متعلق یہ لطیفہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ کسی مجلس میں "کامیابی" کے عنوان پر بحث ہو رہی تھی، راک فیلر نے اٹھ کر اس وقت تقریر کی۔

"کیا ان کی مراد کامیابی سے مال و دولت کمانا ہے، کیا اسی کا نام کامیابی ہے؟ میں کہتا ہوں، اور مجھے کہنے کا حق ہے کہ سب سے بڑا مفلس وہی ہے جس کے پاس مال کے سوا اور کچھ نہ ہو، میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے ابتداہی میں اس کا اختیار دیا جاتا کہ کس قسم کی زندگی چاہتا ہوں، تو میں اپنے لئے یہ اختیار کرتا کہ میرے پاس کچھ نہ ہو،

یا ہو تو بہت تھوڑا، بقدر ضرورت ہو، لیکن اس کے ساتھ مجھے بتا دیا جائے کہ میرے جینے کا مقصد کیا ہے؟''

ان اعترافات کی تہہ میں بجز ان نفسیاتی کیفیات وحالات کے اور کونسی چیز چھپی ہوئی ہے، اور آپ پڑھیے اس کے بعد سورہ ہمزہ کے ترجمہ کا یہ ٹکڑا۔

''وہ جو مال جمع کرتا اور گنتا ہے، اسے خیال کرتا ہے کہ مال اسے خلود اور دیرپائی عطا کرتا ہے، ہرگز نہیں، قطعا وہ جھونک دیا جاتا ہے الحطمہ (یعنی چور چور کر دینے والی میں) اور یہ الحطمہ کیا چیز ہے؟ آگے ہے اللہ کی سلگائی ہوئی، چڑھ جاتی ہے دلوں پر اور اس آگ (کے پٹ) بند کر دیئے جاتے ہیں (اس پر) جو لمبے لمبے ستونوں پر کھڑی ہے''۔

یہ صحیح ہے کہ حقیقی رنگ میں یہ کیفیت تو ان کے سامنے اسی وقت پیش آئے گی، جب ہر حقیقت اپنی اصلی رنگ میں نمایاں ہوگی، لیکن جو ''کل'' ہونے والا ہے، دیکھنے والے چاہیں تو آج بھی اس آتشیں مکان کا تماشا کر سکتے ہیں، جس کی دیواریں بھی آگ ہی کی ہیں، اور جس کی چھت بھی آگ ہی کی ہے ایسی چھت جو لمبے لمبے ستونوں پر قائم ہے، اور اسی آتشیں مکان میں اسے جھونک کر پٹ بند کر دیا گیا ہے، نکلنے کی راہیں چاروں طرف سے مسدود ہیں، آخر قرآن ہی میں تو

﴿وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ (التوبۃ:۴۹)

''اور قطعاً جہنم گھیرے ہوئے کافروں کو۔''

فرمایا گیا ہے، کم ازکم

﴿اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ (الکھف:۲۹)

''اس جہنم کے سراپردوں نے ان کا احاطہ کر لیا ہے۔''

اس کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جو چیز آج اندر ہے، وہی تو کل باہر نکل آئے گی اجساد کا تروح اور ارواح کا تجسد ارباب حقائق کا مسلمہ ہے، اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ ''جمع وعد'' کے مجرموں کے متعلق سورہ ہمزہ کی جس سزا کو صرف ادھار ہی ادھار سمجھا جا رہا ہے اگر غور کیا جائے تو اسی سورہ کے الفاظ میں ''نقد'' کی جھلک بھی ان لوگوں کو نظر آ سکتی ہے، جو مال وسرمایہ کے ساتھ انسانی نفسیات کے تعلقات کا مطالعہ ان قرآنی آیات کی روشنی میں کریں گے، یقیناً سوچنے والوں کو اس ''آتشیں گرداب'' کی کچھ موجیں آج بھی محسوس ہو سکتی ہیں جس میں پھنس کر ''جمع وعد'' کے ان مجرموں کو ہر حال میں چکراتے ہی رہنا پڑتا ہے، یہی جذبہ قدرت کی سلگائی ہوئی آگ کی شکل اختیار کر کے ان کی چھاتیوں پر چڑھ کر مونگ دلتی رہتی ہے، باہر سے دیکھنے والوں کو یہ بیچارے نظر آتے ہیں کہ ان کے اوپر بھی روپیہ ہے اور نیچے بھی روپیہ ہے، وہ روپیوں ہی میں جاگتے اور اسی میں سوتے ہیں، لیکن جس کی نظر اندر کا کچھ بھی اندازہ کر سکتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ قرآنی اشارات کی تصدیق میں وہ شک کر سکتا ہے، بلکہ ہمز ولمز کے جو شعلے ان کی زبانوں سے نکلتے رہتے ہیں، سچ پوچھئے تو جو کچھ ان کے اندر ہوتا ہے، وہی ان شکلوں میں ان کی زبانوں کی راہ سے باہر نکلتا رہتا ہے۔ گویا باطن کی شہادت ظاہر کی یہ حالت ہوتی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۲۱۰-۲۱۹

آیت : ﴿یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ﴾ (الھمزہ:۳)

''خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشتا ہے۔''

اس آیت نے میرے ذہن کو ایک عجیب مسئلہ کی طرف منتقل کر دیا ہے، میں نہیں کہتا کہ قرآنی الفاظ کی یہ تفسیر ہے، بلکہ میرا صرف یہ ایک ذہنی انتقال ہے، غور کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دیتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے قصے میں جس ''الشجرۃ'' کا ذکر ہے، اگرچہ کتابوں میں اس کے متعلق بیسیوں اقوال پائے جاتے ہیں، اور ان ہی اقوال میں سے عوام میں ایک قول یعنی یہ بات کہ وہ گیہوں کا درخت تھا، جس کے قریب جانے سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، زیادہ مشہور ہو گیا ہے، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی صحیح روایت سے نہ یہ ثابت ہے اور نہ دوسرے اقوال کی تائید کسی صحیح حدیث سے ہوتی ہے، اسی لئے علامہ شہاب محمود آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھ دیا ہے کہ۔

الاولیٰ عدم القطع بها

''زیادہ بہتر ہے کہ کسی قول کے متعلق قطعی فیصلہ نہ کیا جائے''۔

اسی لئے میرا عقیدہ بھی اگرچہ یہی ہے کہ جس چیز کو خدا نے مبہم چھوڑ دیا، ہم خواہ مخواہ اس کی تعیین میں کیوں سر کھپائیں، خصوصاً جب اس کا کوئی نفع بھی نہ ہو، آخر اگر یہ متعین بھی ہو جائے کہ وہ گیہوں یا انگور، یا عقل یا حیات ہی کا درخت تھا تو اس سے کوئی خاص علمی یا عملی نتیجہ کیا حاصل ہوتا ہے۔

لیکن اگر حضرت آدمؑ کے اس قصہ کو صرف قصہ کی حیثیت سے نہ پڑھا جائے، بلکہ اولاد آدم کی موجودہ زندگی میں اس قصہ کے اجزاء سے نفع اٹھانے کا ارادہ کیا جائے، تو اس وقت دوسرے اجزاء سے قطع نظر کرتے ہوئے میں ''الشجرۃ'' کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں جب یہ موجود ہے کہ بہکاتے ہوئے ''الشیطان'' نے حضرت آدم کو کہا کہ

﴿هَلْ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْکٍ لَّا یَبْلٰی﴾ (طہٰ:۱۲۰)

''کیا راہ نمائی کروں تمہاری ہمیشگی کے درخت کی طرف''۔

اور دوسری جگہ اسی کی شرح کرتے ہوئے شیطان ہی کی زبان سے یہ ادا کرایا گیا ہے کہ اس نے آدمؑ و حواؑ کو یہ سمجھایا تھا کہ خدا نے اس ''الشجرۃ'' سے تم دونوں کو اس لئے روکا ہے کہ اس ''الشجرۃ'' کے استعمال کے بعد تم دونوں کو ''خلود'' حاصل ہو جائے گا، یعنی تکونا من الخالدین (ہو جاؤ گے تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں میں) کا جو حاصل ہے۔

اب ایک طرف اس مسئلے کو سامنے رکھ لیجئے، اور دوسری طرف سورہ ہمزہ کے اس مضمون پر غور کیجئے کہ آدمی مال اور سرمایہ ہی کے متعلق خیال کرتا ہے کہ اس میں ''خلود بخشی'' کی کیفیت پائی جاتی ہے، اس کے بعد اگر یہ سمجھا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس عالم میں اس وقت تھے اس وقت ان کے سامنے خواہ کسی صورت میں وہ چیز پیش ہوئی ہو، لیکن آدم کی اولاد کے سامنے وہی آج مال اور سرمایہ کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ہے، تو جہاں تک قرآئن کا اقتضاء ہے، یہ خیال چنداں بعید نہیں قرار دیا جا سکتا، آخر ان امور پر غور کیجئے۔

۱)۔ حضرت آدم اور ان کی بیوی حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ

﴿کلا منها رغدا حيث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظالمين﴾

''دونوں کھاؤ اس باغ میں جی بھر کر جہاں سے جی چاہے۔اور نہ قریب پھٹکنا اس درخت کے، کیونکہ تب ہو جاؤ گے تم اپنی حد سے نکلنے والے، یعنی ظالموں میں ہو جاؤ گے''۔

آج یہی دیکھا جاتا ہے کہ اولادِ آدم کے سوا زندگی کی تمام ضرورتوں کی محتاج ہستیاں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اس طور پر زندگی گزار رہی ہیں کہ صبح سے شام تک خوب کھاتی پیتی چرتی چگتی رہتی ہیں۔لیکن ان میں کوئی بھی اپنی ضرورتوں کے متعلق خلود اور دیرپائی کی ضمانت میں سرگرداں نہیں ہے۔ان سب میں صرف ایک آدم زاد ہے جو آج کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد ''کل'' کے متعلق ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے عدم اطمینان کی اسی کیفیت کے ازالہ کے لئے وہ اس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے، جس کے متعلق ''خلود بخشی'' کا خیال اس میں پیدا ہو گیا ہے۔یعنی مال اور سرمایہ گویا آج جو مل رہا ہے، کل وہی ملتا رہے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ضمانت مال اور سرمایہ ہی میں مستور ہے۔

۲) حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ ''شجرہ الخلد'' کے چکھنے کے ساتھ ہی ان کے سواۃ (چھپانے کی چیزیں) کھل گئیں، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے، بلکہ قرآن ہی کے حوالہ سے گذر چکا کہ مال کی محبت میں جب بخل کی راہ آدمی اختیار کرتا ہے تو ''الحسنیٰ'' یعنی اچھی باتوں کی تکذیب شروع کر دیتا ہے، گویا یوں مال اور سرمایہ کی محبت اس کے عیوب کو کھول دیتی ہے۔

۳) اسی ''الشجر ہ'' کے چکھنے کا نتیجہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ان کو ہبوط اور اتر جانے کا حکم دیا گیا۔حق تعالیٰ کی درگاہ میں قرب کا جو مقام ان کو حاصل تھا اسی سے وہ اتار دیئے گئے، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے سارے احتیاجی تعلقات اسی مال کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔بندے اور خدا کے درمیان جو احتیاجی تعلق رہنا چاہئے، وہ تعلق باقی نہیں رہتا۔قرآن میں بھی من بخل واستغنیٰ کے الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۴) مال میں جیسے غنا بخشی کی کیفیت بہ ظاہر لوگوں کو محسوس ہوتی ہے۔گویا عدم احتیاج کا جو ایک پہلو فرشتوں میں پایا جاتا ہے، اسی ملکوتی پہلو کی تکمیل کی ایک شکل مال میں پائی جاتی ہے۔حضرت آدم کو بھی شیطان نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ اس ''الشجر ہ'' کے استعمال سے چوں کہ ملک (فرشتہ) بن سکتے ہو، اس لئے خدا نے تم کو اس سے روکا ہے۔

۵) شیطان نے اس ''شجرہ الخلد'' کی ایک صفت ملک لا یبلیٰ بھی بیان کی تھی، یعنی یہ ایک ایسی چیز ہے جو پرانی اور کہنہ نہیں ہوتی، معاشیات کے ماہرین اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ فرسودگی اور کہنگی دنیا کی دوسری چیزوں پر جلد طاری ہو جاتی ہے، لیکن سونا اور چاندی میں یہ بات نہیں پائی جاتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ ہی ایک ایسی چیز ہے کہ کسی کو قرض میں اگر آج دیا جائے اور سو سال بعد واپس لیا جائے۔تو نہ دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ سو سال کی اس مدت میں تمہارے روپے پرانے اور فرسودہ ہو گئے، اور نہ لینے والا واپس لیتے ہوئے یہ خیال کر سکتا ہے، بلکہ جس تر و تازہ حال میں روپیہ دیا جاتا ہے، خواہ کتنی ہی مدت بعد واپس ہو، اسی حال میں واپس بھی لیا جاتا ہے، ایسی مملوکہ شئے جو پرانی نہ ہو، میں تو خیال کرتا ہوں کہ دنیا میں روپے کے سوا شاید ہی کوئی دوسری چیز ہو۔

۶) ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی ''شجرۃ الخلد'' کی سزا میں ہبوط اور نزول کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ ''تمہارے بعض بعض

کے دشمن رہیں گے۔" یعنی بعضکم لبعض عدو۔ آدمؑ کی اولاد میں بھی آج جتنے جھگڑے رگڑے، جنگ و جدال چھوٹے پیمانوں پر ہوں یا بڑے پیمانوں پر، آخری چیز ان تمام لڑائیوں اور جھگڑوں کی تہہ میں عموماً یہی مال و دولت ہی ہوتی ہے۔
میرے ذہنی انتقال کے اسباب یہی تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک صحیح ہے، صرف دماغ میں ایک بات آئی تھی، مدتوں سے کھٹک رہی تھی، اس کا اظہار کر دیا گیا والعلم عند الله تعالیٰ وهو اعلم بمراده [1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، اسلامی معاشیات، ص ۲۱۹-۲۲۲

فصل سوم

سورۃ الکھف کے تفسیری نکات

﴿الکھف﴾

آیت: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ (الکھف:۱)

''سراہئے اللہ کو جس نے اتاری کتاب اپنے بندے پر اور نہ رکھی کتاب اتارنے والے اللہ نے اس میں کسی قسم کی کوئی کجی۔''

سمجھا آپ نے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کا کیا مطلب؟ کھولا گیا ہے کہ ہر وہ کمال یا صفت جو تعریف و توصیف کی مستحق نظر آتی ہے یہ ''اللہ'' یعنی اس کی ذات کے ساتھ مختص ہے، جس کی کارفرمائیوں کی یہ کائنات جلوہ گاہ ہے، جس کا حاصل یہی تو ہوا کہ جس میں کچھ نہ تھا اس سے نہیں بلکہ جس میں سب کچھ ہے اسی سے ہے، جس کسی کو جو کچھ بھی ملا ہے جس کا سب کچھ ہے اور جس میں سب کچھ ہے، حیات ہے، علم ہے، قدرت ہے، ارادہ ہے، رحم ہے، رافت ہے، جو اس سے پیدا ہوا ہے، خیال تو کیجئے کہ ان مایوسیوں اور وسواسی، محرومیوں سے اس کو کیا واسطہ، جو یہ سوچتا ہے کہ جس میں کچھ نہ تھا، اسی سے نکل کر میں دنیا میں آیا ہوں اور اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی کچھ باقی نہ رہوں گا۔

جس کے پاس سب کچھ ہے، اگر دستگیری کے لئے اسی کی طرف وہ ہاتھ بڑھائیں جن کے کے پاس کچھ نہیں ہے اور یوں وہ بے یاروں کی یاوری، غمخواروں کی غم خواری، ناداروں کی دارائی کرے اور ان کی خالی جھولیوں کو بھر دے، بھرتا چلا جائے۔ سوال یہی ہے کہ پستی سے نکال کر بلندی کی طرف چڑھانے کے لئے کچھ نہ رکھنے والوں کی طرف سے یہ سب کچھ رکھنے والی ہستی کی اپنے مقام رفیع سے نزولی توجہ کیا کسی حیثیت سے کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس کے تسلیم کرنے میں انسانی فطرت اپنے اندر کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھنجھلاہٹ محسوس کرے؟

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' یعنی تمام قابل تعریف خوبیوں اور زیبائیوں کے سرچشمہ اور اسی کامل وجود کو بنیاد بنا کر نزول کے بعد ارتقاء کا یہی وہ نظریہ ہے جسے ''سورۃ الکھف'' کی پہلی سطر میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کے بعد ان الفاظ میں ہم پاتے ہیں، فرمایا گیا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کی حقیقت کو پیش کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے۔

الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ

''جس نے اتاری کتاب اپنے بندے پر۔''

ان الفاظ سے یہی علم تو بخشا گیا ہے کہ بندہ جس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا، اس پر الحمد والے اللہ نے یعنی جس کے پاس سب کچھ ہے اپنی کتاب اتار دی، اور یوں جو نیچے تھے ان کو اونچا کرنے کی راہ اس نے کھولی۔

نزول اور اتار کے ارتقاء اور چڑھاؤ کے اس فطری اور طبعی طریقے کا مقابلہ عہد جاہلیت کے اس ارتقائی وسوسہ سے کیجئے جس میں ''کچھ نہیں'' سے باور کرایا جاتا ہے کہ سب کچھ نکل آیا ہے۔ سمجھایا جاتا ہے کہ مادہ جس میں کچھ نہ تھا، نہ زندگی تھی، نہ علم، نہ ارادہ، وہی ان کمالات و صفات کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا جو اس کے لئے نامعلوم اور مجہول ہی نہیں تھے بلکہ بذات خود معدوم اور قطعاً معدوم تھے۔ جاہل طالب اور مجہول بلکہ مطلق معدوم مطلوب، یہ عجیب و غریب ارتقائی لطیفہ آپ دیکھ رہے ہیں، پیچ در پیچ الجھنوں میں گتھا ہوا ہے، اس میں ان مجہول و معدوم کمالات و صفات کی طلب کیسے پیدا ہوئی؟ اس طلب کے بعد اپنی انتخابی قوت سے کام

لے کر ناقص صفات کو چھوڑتے ہوئے، کامل صفات کو چنتے ہوئے، وہ آگے آخر کس بل بوتے پر بڑھ رہا ہے، اور اسی بے جان، بے عقل و تمیز طالب کو یہ معدوم مطلق صفات آخر کیسے مل گئے؟ جن سے آج مادے کا وجود آراستہ و پیراستہ نظر آرہا ہے، یہ کتنی ٹیڑھی کڑی پیچ و خم والی راہ ہے جس پر "کچھ نہیں سے سب کچھ نکل آنے" کے فلسفہ یا وسوسہ نے ان کو ڈال دیا، جس معمہ کو اس توجیہ سے آج حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ تفہیم کے اس طریقہ سے، انصاف شرط ہے، سلجھتا ہے، یا اس کی الجھنیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں، اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جن کی فطرت ابھی سلامتی کے نقطہ نظر سے زیادہ دور نہیں ہوئی ہے، ورنہ توڑی مروڑی طبیعتوں میں یہی الٹی باتیں سیدھی بن بن کر اترتی چلی جارہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عہد جاہلیت کی یہ باتیں سیدھی ہیں، لیکن سرشت بشری کے سب سے بڑے نباض رومیؒ کا فیصلہ تو یہ ہے کہ

؎ چون فسون دیو در دلہائے کج
می رود چوں کفش در پائے کج

ٹیڑھے پاؤں میں ٹیڑھا جوتا اگر فٹ ہو جائے تو آپ ہی بتائیے کہ اس کے سوا اور ہوتا کیا؟ بہر حال میں تو سمجھتا ہوں کہ سورہ کہف کے مذکورہ بالا الفاظ میں الحمدللہ پر بنیاد قائم کر کے نزول کے بعد ارتقاء کی جو راہ پیش کی گئی ہے اس کی یعنی ارتقاء کی اس راہ پر چلانے والی الکتب یا قدرتی دستور العمل اور ہدایت نامے کی پہلی خصوصیت:

وَ لَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا

"اور نہ رکھی کتاب اتارنے والے اللہ نے اس میں کسی قسم کی کوئی کجی۔"

جو بیان کی گئی ہے اس کا مطلب جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ عوج یعنی پیچ و خم، کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا کوئی رشتہ نہیں ہے، وہ خود سیدھی ہے، سیدھی بات بتاتی ہے، سیدھی راہ پر چلتی ہے، فکر و نظر کی مصنوعی ورزشوں اور سوفسطائیت کے مغالطی کرتبوں سے جن کے دل، جن کے دماغ الٹے پلٹے مسلے دلے نہیں گئے ہیں، تجربہ کر کے دیکھ لیجئے ان کے اندر یہ کتاب اتر جائے گی، اترتی چلی جائے گی، ان کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ اس کتاب کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور یہ کتاب ان کے لئے پیدا کی گئی ہے مگر دجالی فتنوں کی آنچ سے پگھلائی ہوئی ٹیڑھی، ترچھی ذہنیتوں اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالے ہوئے کج دماغوں، پھرے ہوئے سروں، سے یہ کتاب اچٹ جاتی ہے۔ نہ وہ اس کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں نہ یہ کتاب اپنے واقعی وزن کو انہیں محسوس کرا سکتی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، المیزان ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۳۱-۳۴

آیت : ﴿قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا O مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا﴾ (الکھف:۲،۳)

''ٹھیک اتاری، تاکہ ڈرسنا دے ایک سخت آفت کا اس کی طرف سے اور بشارت دیجئے ان ایمان لانے والوں کو جو اچھے کام کر رہے ہیں (اس بات کی) کہ ان کے لئے اچھا معاوضہ ہے، ٹھہرے رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش ۔''

دوسری خصوصیت اس ''الکتاب'' اور زندگی کے قدرتی دستور العمل کی ایک اور صرف ایک ''قیما'' کے لفظ سے ظاہر کی گئی ہے۔

دیکھنے میں ہے تو بظاہر یہ ایک لفظ جس کا حاصل یا ترجمہ جیسا کہ فقیر کا خیال ہے اور مفسرین کی کافی تعداد اس خیال کی موید ہے، یعنی علاوہ اس خصوصیت کے اس کتاب اور اس کی تعلیمات میں کسی قسم کی کجی نہیں پائی جاتی۔ دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ لازوال، غیر فانی، انمٹ، اٹل حقائق اور اصول پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ قیام و بقا کی شدت اور حد سے زیادہ استحکام واستواری پر ''قیــم'' کا یہ لفظ دلالت کرتا ہے جس کے سوا کچھ نہ رہے گا، جو ایسا برقرار و باقی رہنے والا ہے اور ہر چیز جو کچھ بھی اس کے سوا ہے سب کے قیام و بقا کی ضمانت جس کی قدوس و پاک ذات کے ساتھ وابستہ ہے، اس کو القیوم بھی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ خود قائم و برقرار ہے۔ سب کو وہی اور اس کا ارادہ قائم و برقرار رکھے، ٹھہرائے ہوئے اور تھامے ہوئے ہے'' خیر یہ تو ''قیم'' کے اس قرآنی لفظ کے گویا لفظی تحقیق تھی۔[1]

''قیم'' کا یہ لفظ جس سے بندے پر نازل ہونے والی ''الـکتاب'' کے مشتملات وتعلیمات کی خصوصیات ظاہر کی گئی ہے لازوال، غیر فانی حقائق کا یہ وہ مجموعہ ہے، تاریخ کے نامعلوم عہد سے جس پر انسانیت کی تعمیر و ترقی کی بنیاد قائم کرنے کی دعوت دی گئی، نوح نے بھی انکی طرف بلایا اور ابراہیم نے بھی، موسیٰ نے بھی اور عیسیٰ نے بھی علیہم السلام۔ سارے ''الـنبیـون'' اور اللہ کے رسولوں نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں، ہر بستی کے رہنے والوں کو ان ہی کی طرف پکارا جس کے پاس کچھ نہیں ہے مگر سب کچھ کے پانے اور حاصل کرنے کی فطری آرزو اپنے اندر رکھتا ہے، چاہیئے کہ وہ آگے بڑھے اور جس کے پاس سب کچھ ہے، اسی سے جو کچھ پانا چاہتا ہے، پاتا چلا جائے۔ پہلوں کو جو ''الـکتـاب'' دی گئی اس میں بھی یہی تھا اور اسی ''الـکتـاب'' کی آخری شکل میں بھی اسی کی صلائے عام دی گئی ہے۔[2]

لِّيُنْذِرَ (تاکہ دھمکائے) کے لفظ سے دوسری آیت کا آغاز کیا گیا ہے اور بجائے کنائے اور اشارے کے نسبتاً زیادہ واضح اور صاف لفظوں میں قرآن کا یہ بیان شروع ہوتا ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا دھمکی سے اس بیان کی ابتدا کی گئی ہے۔ قدرتی طور پر تین ہی سوالات اس کی دھمکی کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں یعنی

۱۔ کس چیز کی دھمکی دجالی فتنے سے تعلق رکھنے والی اس سورۃ میں دی گئی ہے؟

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۳۴۔۳۵

[2] ایضاً، ص ۳۷

۲۔ کیا دھمکی عام ہے، یا کسی خاص طبقہ اور خاص قسم کے صفات واحساسات رکھنے والوں کی طرف اس دھمکی کا رخ ہے؟

۳۔ اگر عام نہیں بلکہ دھمکی کا رخ کسی خاص طبقہ کی طرف ہے اور یہی واقعہ بھی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن کی طرف دھمکی کا رخ ہے ان کی خصوصیات کیا ہیں اور جن کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اس کی دھمکی اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے ان کو ڈرنا نہ چاہئے ان کو کن امتیازی اوصاف سے پہچانا جا سکتا ہے؟

ان ہی تینوں سوالوں کا جواب بعد کی آیتوں میں دیا گیا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے قرآنی الفاظ کی روشنی میں ان ہی تینوں سوالوں کے جوابوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کس چیز کی دھمکی دی گئی ہے؟ یہی پہلا سوال تھا دجالی فتنہ کی جن خصوصیتوں کو بیان کر چکا ہوں ذرا ان کو دماغ میں تازہ کر لیجئے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ تیرہ سو سال پیشتر سر زمین عرب کی بیابانی آبادی میں اس پیشین گوئی کا اعلان الہامی امداد کے بغیر کیسے ممکن تھا؟ کلیدی لفظ جس کے سمجھ لینے کے بعد واقعہ خود آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو جائے گا وہ بـــاس کا لفظ ہے۔

یوں تو لغت میں مثلاً قاموس کے فارسی ترجمہ 'منتھی الارب'' میں 'باس'' کے لفظ کو لکھ کر حسب ذیل معانی درج کئے ہیں، یعنی 'بیم و عذاب و سختی و قوت، حرب و دلیری'' مگر سارے معانی جو اس لفظ کے نیچے درج کئے جاتے ہیں قدر مشترک ان کا اگر نکالا جائے تو وہ یہی ہو سکتا ہے کہ فطرت انسانی میں ناگواری جن حالات و واقعات سے پیدا ہوتی ہے منجملہ دوسرے الفاظ کے عربی میں اس کی تعبیر'' بـاس'' بھی ہے مگر یہ تو'' بـاس'' کی لغوی تشریح ہے قرآن میں ایک سو سے زائد مقامات میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے، مثلاً عرب کے یہود کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔'' باسھم بینھم شدید'' یا عذابوں کے متعلق اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ کبھی وہ اوپر سے آتے ہیں اور کبھی نیچے سے، تیسری شکل اسی عذاب کی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر'' یـذیـق بـاسـھـم بـاس بعض'' کا منظر قدرت کی طرف سے قائم کر دیا جاتا ہے، جس کا مطلب یہی ہے کہ ایک کی چوٹ دوسرے کو لگائی جاتی ہے۔

اسی طرح سورۃ البقرہ میں صبر کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے'' حین الباس '' بھی فرمایا گیا ہے۔ الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامات میں'' بـاس '' کے لفظ کی جو تفسیر کی گئی ہے اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حرب وقتال، جنگ و جدال کی وجہ سے جو دکھ اور تکلیف لڑائی کے ہر فریق کو پہنچتی ہے قرآن اسی دکھ اور تکلیف کو'' باس '' کہتا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کا قرآنی محاورہ ہے اس محاورہ کو پیش نظر رکھئے، اب سوچئے آگے کے ان قرآنی الفاظ کو یعنی فرمایا گیا ہے۔

''لینذر باسا شدیدا من لدنہ''

''تا کہ دھمکائے باس شدید سے جو لدنی ہے۔''

۱؎ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کی خصوصیتوں کے لئے کتاب'' دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال'' کا باب اول ملاحظہ فرمائیں۔

''بأس'' کا مفہوم تو متعین ہو ہی چکا، جو جنگ اور جنگ سے پیدا شدہ مصائب اور تکلیفوں کی تعبیر ہے، آگے ''شدیدا'' کی قید کا اضافہ کیا گیا ہے جس کا مادہ شدت ہے اور شدت سختی کو کہتے ہیں معلوم ہوا کہ جنگ اور اس کے لائے ہوئے مصائب جن کی دھمکی دی گئی ہے وہ معمولی نہ ہوں گے اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی ہے بلکہ شدید کے بعد ''مـن لـدنـه'' کے الفاظ ہیں، جیسے علم کی قرآن کی رو سے دو قسمیں ہیں، یعنی ایک قسم علم کی تو وہ ہوتی ہے جسے تعلیم کے مقررہ طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور دوسری قسم علم ہی کی ایک یہ بھی سمجھی جاتی ہے جو عالم اسباب کے توسط کے بغیر براہ راست حق تعالیٰ کے حضور سے عطا کیا جاتا ہے اسی دوسری قسم کا نام اردو میں بھی ''عـلـم لـدنـی'' مشہور ہوگیا ہے۔ بظاہر یہ محاورہ اسی سورہ کہف کے دوسرے مقام سے ماخوذ ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات جس شخص سے ہوئی تھی سمجھا جاتا ہے کہ ان کا نام خضر علیہ السلام تھا ان ہی کی دوسری خصوصیتوں کے ساتھ ایک خصوصیت یہ بھی بتائی گئی ہے۔

وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (الکھف:٦٥)

''اور سکھلایا ہم نے اس کو (یعنی خضر علیہ السلام) کو اپنے حضور سے علم۔''

بہر حال ''بـاس شدید'' کے ساتھ ''مـن لدنه'' کا اضافہ دھمکی میں جو کیا گیا ہے، بغیر کسی تاویل کے اس کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ شدید جنگ جس کی یہاں دھمکی دی گئی ہے اسباب وعلل سے بالاتر ہوگی اور براہ راست قدرت کی طرف سے ایسے ''من لدنی'' حالات پیش آئیں گے کہ اسباب کی راہ سے مقابلہ کرنیوالوں کے سارے عقلی داؤ پیچ اور فکری تگ و دو، ذہنی ادھیڑ بن سب کے سب بیکار ہوکر رہ جائیں گے، کیونکہ اسباب کی راہ سے تو ان ہی چیزوں کا مقابلہ ممکن ہے جو اسباب ہی کی راہوں سے پیدا ہو رہی ہوں، لیکن ''مـن لـدنـی'' قانون کے تحت قدرت کا ہاتھ جب چیزوں کو پیدا کرلے گا ان کا مقابلہ بھلا کون کرسکتا ہے۔[1]

بہر حال مومن ہو یا غیر مومن جب تک ''مسبب'' براہ راست سامنے نہ آجائے، اسباب کے تجربے کی راہیں دونوں پر کھلی رہتی ہیں، لیکن سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ''بـاس شـدیـد'' کا ظہور ''مـن لـدنـی'' رنگ میں آدم کی اولاد کے سامنے ہونے لگے کہ اسباب کے ترکش کے سارے تیر اس وقت بے کار ہو جائیں گے، جن کے نزدیک عالم اسبابی نظام کسی ''واحـد مسبب'' کے ارادے کے ساتھ وابستہ نہیں ہے، ان کے تجربوں کا سلسلہ تو شاید اس وقت بھی باقی رہے گا، لیکن ان کے یہی تجربات ہی بتاتے چلے جائیں گے کہ

جتنا پھڑکو جال کے اندر
جال گھسے کھال کے اندر

یہ ''من لدنی'' عذاب کا دور ہوگا اس وقت العیاذ باللہ

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۴۰۔۴۲

''مـن لـدنـی'' کے اعلان کے ساتھ وہ سامنے آجائے گا اور ثابت کرتا چلا جائے گا کہ یہ بکسپھے عنکبوتی تاروں سے بھی زیادہ کمزور اسباب اب کیا کام دیں گے، مگر اسباب وعلل میں جکڑی ہوئی اس دنیا میں جن کی نظر ''مسبب'' کی طرف سے نہیں ہٹی ہے کیا خود مسبب کے سامنے آجانے کے بعد بھی وہ اسی طرح اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کریں گے، جیسے اخیر ''مسـبـب'' والے اسباب میں الجھے ہوئے لوگ اپنے آپ کو بے سہارا پائیں گے؟

''من لدنی باس شدید'' کی دھمکی کے بعد اسی سوال کا جواب

وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ

''اور بشارت دیتا ہے ان ماننے والوں کو جو بھلے کام کرتے رہتے ہیں۔''

دیا گیا ہے، جس کا مطلب یہی ہے کہ براہ راست ''مسبب'' کا سامنے آجانا، اس میں ان کے لئے دہشت ہے جو شروع ہی سے

ہر لحظہ بہ شکل دگر آں یار برآمد

کے یقین پر اپنا قدم جمائے ہوئے ہیں، اسباب کی رو سے جب چیزیں پیدا ہو رہی تھیں تو ان کو بھی وہی پیدا کر رہا تھا اور آج اگر وہ اسباب کے حجاب کو اٹھا کر سامنے آگیا ہے تو جو کچھ بھی پیدا ہوگا اسی کے ارادے، اسی کے حکم، اسی کے اذن، سے پیدا ہوگا۔ یہ ''المومنین'' کا گروہ ہوگا۔ انہوں نے اس کو پہچانا اور مانا جسے خالق تعالیٰ نے اپنی مرضی سے آگاہ فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اسی کی ''مرضی'' کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مطالبہ ان لوگوں سے کیا جائے جو ہماری پیدا کی ہوئی دنیا میں رہتے ہیں اور خود وہ بھی ہمارے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں، اسی کا نام ''ایمان'' ہے اور خالق کی ظاہر کی ہوئی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام ''عمل صالح'' ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ''بے ایمانی'' صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ خدا کا انکار کیا جائے بلکہ ''خدا'' کو مان کر، خدا کی مرضی کی تلاش کو غیر ضروری ٹھہرانا یا خدا کی بخشی ہوئی آگاہی سے باغی ہو کر خود اپنے تراشیدہ، بافیدہ خیالات وساوس کے متعلق یہ سمجھنا کہ یہ ''خدا کی مرضی'' ہے اور اپنی ہی من مانی باتوں کی پیروی کے متعلق سمجھنا کہ ہم خدا کی مرضی کی پیروی کر رہے ہیں ''بے ایمانی'' کے دائرے میں یہ ساری چیزیں داخل ہیں۔ پس تباہی اور بربادی اگر ہے تو صرف ان ہی کے لیے ہے، جنہوں نے ایمان کی راہ کو چھوڑ کر ''بے ایمانی'' کا راستہ پکڑا اپنے آپ کو مسبب کی مرضی کے مطابق بنانے کا جو موقع ان کو دیا گیا تھا، اس قیمتی موقع کو کھو دیا۔

بہر حال اسباب کا پردہ ہٹا کر براہ راست ''مسبب'' ہی سامنے آجائے تو اس وقت اس کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی ہر خواہش اور ہر احساس کے مخالف اگر چاہیں اور وہی ''بـاس شـدیـد'' کے رنگ میں ان کے ظاہر و باطن کو محیط ہو جائے اور اسی کی آگ ان کے اندر اور باہر کو پکڑ لے تو جو کچھ انہوں نے کیا تھا خود سوچنا چاہئے کہ اس کا انجام بجز اس کے اور کیا ہوتا؟

خلاصہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کو جو ''مسبب'' کی مرضی سے آگاہ کرنے والے بزرگوں یعنی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو مان کر اسی کی مرضی کے مطابق جینے اور مرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، قرآن نے اس ''مـن لـدنـی'' عذاب اور اس کے نتائج کی طرف

سے قطعی طور پر نڈر اور بے خوف بنا کر یہ بشارت ان کو سنائی ہے کہ اب تو "اسباب" کا قصہ ختم ہو گیا، تم اب کیوں ڈرو بلکہ خوش ہو جاؤ کہ تمہاری سعی و عمل جس کا رخ مسبب ہی کی طرف تھا، اب اس کی قیمت تمہارے سامنے آئے گی۔ اسباب فانی تھے، اس لئے ان کے نتائج بھی فانی تھے، لیکن انسانی توانائیوں کے وہ نتائج جو غیر فانی طاقت کی مطابقت کی راہ سے پیدا ہوتے رہے، چاہیے کہ وہ بھی غیر فانی ہوں، اسی کی اطلاع

اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا O مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا

"بلاشک وشبہ ان کے لئے اجر حسن ہے، مگن رہیں گے اس میں ہمیشہ ہمیش"۔

کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ یعنی حق تعالیٰ یا مسبب الاسباب کی مرضی کے مطابق جینے کی کوشش جس اجر و معاوضہ کو پیدا کرے گی، نہ ایسی چیزیں ہوں گی جو فطرت انسانی اور اس کے احساسات کے مطابق ہوں گی، اور اپنی اپنی کوششوں کے اس معاوضہ سے کوشش کرنیوالے اس طرح مستفید ہوتے رہیں گے کہ استفادہ کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا بلکہ "اَجْرًا" کے ساتھ "حَسَنًا" کی صفت کا اضافہ جو کیا گیا ہے، یہ اضافہ بھی بلاوجہ نہیں ہے۔

ظاہر ہے مادہ اس لفظ کا "حسن" ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کا علم حاصل کر کے جو اس پر اور اس کے نتائج پر غیر متزلزل اعتماد اپنے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے، اور خدا کی ظاہر کی ہوئی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عزم راسخ کر کے مر جانے کا قطعی فیصلہ کر چکے ہیں، وہ ایمان اور عمل صالح والی اس زندگی کے نتیجہ کو ایسی شکل میں اپنے سامنے پائیں گے جس کا سب سے بڑا نمایاں امتیاز حسن و جمال ہوگا، اور فطرت انسانی کا سچ پوچھیے تو سب سے بڑا مطالبہ یہی "حسن و جمال" ہے بھی۔

لہلہاتے ہوئے مرغزار، بہتے ہوئے پانی، ہرے بھرے باغ، کھلے ہوئے پھول، گدرائے ہوئے پھل، الغرض نباتی، حیوانی، انسانی یا اس سب کے سوا سارے کونی طبقات میں آدمی کی فطرت حسن ہی کی تلاش کرتی ہے، جمال ہی کی جستجو اس کی سرشت کا سب سے بڑا امتیازی سرمایہ ہے، جو نہ گدھوں میں پایا ہے اور نہ گھوڑوں میں، آخر بھینسوں کو بین باجے پر سر دھنتے کس نے پایا ہے؟ کس بکرے کو دیکھا گیا ہے کہ کسی "پیکر جمیل" کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا ہو؟ لب جو سبزہ زاروں کے کنارے پہنچ کر اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہو، اجر کے ساتھ "حسن" کے لفظ نے ذہن کو تو ان ہی "جمالی مظاہر" کی طرف منتقل کر دیا، جن کی قرآنی تعبیر "الجنة" سے کی گئی ہے۔[1]

جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزار رہے ہیں اس آیت میں ان کو تسلی دے دی گئی ہے کہ ان کو ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ جیسے ولدیت کا عقیدہ اپنے آثار و نتائج کو پیدا کرتا چلا جائے گا تا آیں کہ "صعید جرز" (اجاڑ میدان) کے مہیب مستقبل کو زمین پر کھینچ کر وہ لے آئے، اسی طرح ایمان و عمل صالح کے نتائج "اجر حسن" اور اچھے اچھے معاوضہ کی صورت میں بھی مسلسل ان لوگوں کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے جنہوں نے عمل صالح پیدا کرنے والی ایمانی زندگی کے بسر کرنے کا

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خد و خال، ص ۴۴۔۴۷

قطعی فیصلہ کرلیا ہے۔ ''ما کثین فیه ابدا '' (یعنی ڈٹے رہیں گے اسی اجر حسن اور اچھے معاوضہ کی نشاط آفرینیوں اور نشاط انگیزیوں میں ہمیشہ ہمیش) اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مسرت ونشاط کی اس کیفیت میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا، خواہ ما علی الارض (زمین پر جو کچھ ہے) اس کے ساتھ جو صورت حال بھی پیش آجائے۔

مژدہ سنانے کو قرآن نے یہ مژدہ سنا تو دیا ہے اور ماحول کے حالات سے بے تعلق ہوکر پڑھنے والے جب خالص ایمانی احساسات کے تحت قرآن میں اس کو پڑھتے ہیں تو دل میں ایمان کی خنکی بھی پاتے ہیں اور جو مومن ہے چاہیے اس خنکی کو اپنے اندر پائے بلکہ قرآن کے الفاظ چونکہ مطلق ہیں، یعنی اجر حسن کے ظہور کو موجودہ دنیاوی زندگی یا آخرت کی زندگی (جو دوبارہ بخشی جائے گی) کسی ایک کے ساتھ قرآن نے چونکہ اس اجر حسن کو محدود ومقید نہیں کیا ہے، اس لئے بظاہر الاولی والاخرۃ دونوں پر یہ قرآنی ضمانت اور بشارت چاہئے تو یہی کہ حاوی سمجھی جائے۔ واللہ اعلم بمرادہ[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۰۱۔۱۰۲

آیت: ﴿ وَّ يُنۡذِرَ الَّذِيۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۞ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِهِمۡ‌ؕ كَبُـرَتۡ كَلِمَةً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ‌ؕ اِنۡ يَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا كَذِبًا ﴾ (الکھف: ۴،۵)

''تا کہ دھمکائے ان لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ اللہ نے صاحبزادہ بنالیا، نہیں ہے اس کا علم ان کو کچھ بھی، نہ ان کو ہے، اور نہ ان کے باپ دادوں کو ہے، بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے نہیں بول رہے ہیں وہ مگر صرف جھوٹ۔''

''من لدنی، باس شدید'' (خود حضوری، سخت جنگ) جس دھمکی سے اس سورۃ کی گویا ابتداء کی گئی ہے، اس دھمکی کے متعلق یہ سوال کہ اس کا رخ آیا ساری انسانیت کی طرف ہے یا بنی آدم کے کسی خاص طبقہ کو اس دھمکی کا قرآن نے اپنا نشانہ ٹھہرایا ہے؟ دراصل اسی سوال کا جواب مندرجہ بالا آیات میں دیا گیا ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ خالق عالم کی طرف ولدیت کے عقیدے کا انتساب، یہ عیسائیوں کا صرف عقیدہ ہی نہیں ہے، بلکہ اسی ''اعتقاد'' پر عیسائیت یا کرسچیٹی کی بنیاد قائم ہے۔ عیسائیت کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے۔

اور آج عیسائیوں کی بڑی اکثریت یورپ و امریکہ میں آباد ہے۔ جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہی ہوا کہ براہ راست رخ اس ''من لدنی، باس شدید'' کا ان ہی ممالک اور ان کے آبادکاروں کی طرف ہے۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کسی مختصر لفظ مثلاً ''نصاریٰ'' یا اسی قسم کے الفاظ سے بھی اسی مفہوم کو قرآن ادا کر دیتا۔ مثلاً کہہ دیا جاتا کہ دھمکایا جاتا ہے نصاریٰ کو یا عیسائیوں کو، مگر باوجود شدید اختصار پسندی کے ان ہی عیسائیوں کی تعبیر مذکورہ الفاظ سے اس موقعہ پر جو کی گئی ہے، اور ساتھ ہی ان کے اس عقیدے کی تنقید میں ایک سے زیادہ فقرے جو قرآن نے یہاں استعمال کئے ہیں، کیا صرف یہ زور خطابت ہے؟ ایسے الفاظ ہیں کہ ان پر غور کئے بغیر صرف کہتے ہوئے کہ مراد ان الفاظ سے عیسائی ہیں، کیا یہ مناسب ہے کہ ہم بھی اسی طرح گزر جائیں جیسے عموماً لوگ گزر رہے ہیں؟

کسی آدمی کی کتاب کے ساتھ تو اس قسم کا سلوک شاید قابل برداشت بھی ہوسکتا ہے، مگر علام الغیوب، الحکیم الخبیر کے کلام کے ساتھ اس کی جسارت دلوں میں کیسے پیدا ہوتی ہے؟ میں تو اس کو سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں۔ یہ خالق عالم کا کلام، اسی خالق عالم کا کلام ہے جس کا کام عالم کا موجودہ نظام ہے۔ جب اس کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہی ہے کہ بظاہر دیکھنے میں خواہ وہ جتنا بھی مختصر اور چھوٹا نظر آئے، ایٹم کے حقیر ذرات ہی کیوں نہ ہوں؟ لیکن ان ہی ذرات میں سے کسی ذرے کو لے کر لوگوں نے جب سوچا، اور سوچنے کا جو حق تھا اسے ادا کیا، تو کون نہیں جانتا کہ اسی ایک ذرے سے قوت کا طوفان ابل پڑا، کیسا طوفان؟ جس قدرت کے کام کا یہ حال ہو انصاف شرط ہے، اسی عجیب و غریب نرالے کام والے کا کلام جب ہمارے سامنے آئے تو کیا اس کے ساتھ یہ انصاف ہوگا کہ جس مطلب کو چار مستقل فقروں میں اس نے ادا کیا ہے، اسی مطلب کو ایک لفظ ''عیسائیوں'' یا ''نصاریٰ'' یا اسی قسم کے لفظ دو لفظ سے ادا کر کے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ خدا کے کلام کو ہم نے سمجھ لیا، اور اس کے سمجھنے کا جو حق تھا اسے ادا کر دیا۔ ما لکم کیف تحکمون

وَّ يُنۡذِرَ الَّذِيۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (الکھف: ۴)

''اور دھمکائے ان لوگوں کو جنھوں نے کہا کہ اللہ نے ولد بنالیا''

یہی پہلا فقرہ ہے، جن الفاظ میں عیسائیوں کے بنیادی عقیدے کی تعبیر قرآن نے اس مقام پر کی ہے، ان میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق میرے نزدیک ''ولد'' کا لفظ ہے، اردو میں عموماً لڑکا، بیٹا، بچہ وغیرہ کے الفاظ سے ''ولد'' کے لفظ کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ شاید کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ عربی ہی میں ابن کا دوسرا لفظ ہے۔ اس میں اور ولد کے اس لفظ میں معنی کے اعتبار سے کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے، گویا دونوں ہم معنی، مرادف الفاظ ہیں۔

مگر ادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ ''ولد'' کا لفظ ولادت سے ماخوذ ہے، فارسی میں ''زادن'' اور اردو میں ''جننا'' جس کے معنی ہیں، جس کا مطلب یہی ہوا کہ جب کسی کو کسی کا ولد ہم ٹھہراتے ہیں، تو گویا ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ولد اس شخص سے جس کا ولد ٹھہرایا گیا ہے، ولادت اور زائیدگی، یعنی جننے کا تعلق رکھتا ہے، اب ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ زادن، یا جننے، یعنی ولادت کے اس لفظ کا اطلاق حال کی جس صورت پر کیا جاتا ہے اس کی واقعی حقیقت کیا ہوتی ہے؟

فرض کیجئے کہ زید ولد ہے، اور عمرو مثلاً زید کا والد ہے ان دونوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کیا عمرو والد اپنے ولد زید کا خالق ہوتا ہے یعنی زید کو کتم عدم، اور مطلق نیستی کے پردے سے نکال کر عمرو اس کو وجود عطا کرتا ہے؟ یقیناً واقعہ کی یہ قطعاً غلط تعبیر ہوگی۔ زید حوینہ کی شکل میں والد کے اندر نمودار ہوتا ہے اور عمرو جو والد ہے صرف اسی حوینہ یا نطفہ کو زید کی ماں کے رحم میں منتقل کر دیتا ہے۔ ولد یعنی زید کی ذات اس کا وجود، وجود کے سارے لوازم وصفات، صفات کے ثمرات ونتائج، ان میں سے کسی چیز کو اپنے والد عمرو سے زید نہیں پاتا، بلکہ بقول شخصے والد کی حیثیت ولد کے حساب سے صرف ایک گزرگاہ کی ہوتی ہے، جس سے اپنی ہستی کی ایک خاص منزل (یعنی عالم حوینیت یا نطفیت) میں ولد کو گزرنا پڑتا ہے۔ نیست کو ہست کرنا اگر خلق کے یہی معنی ہیں تو اس معنی کی رو سے قطعاً اپنے ولد کا کوئی والد خالق نہیں ہوتا۔ اور خلق کا ترجمہ اگر گھڑنا کیا جائے، جیسے سنار سونے چاندی سے زیور گھڑتا ہے، یا پتھر پر تراش خراش کا عمل کر کے بت تراش مجسمہ یا بت وغیرہ بناتا ہے تو اس معنی کی رو سے بھی ولد اپنے والد کی مخلوق نہیں ہوتا کیونکہ ولد میں صفات وکمالات کا جو سرمایہ پایا جاتا ہے اس میں والد کو جیسا کہ سب جانتے ہیں قطعاً دخل نہیں ہوتا، والد بے چارہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جس نطفہ کو اس نے منتقل کیا وہ مرد بن کر پیدا ہوگا یا عورت بن کر، اس کی ظاہری شکل وصورت کیا ہوگی اور باطنی صفات اس کے کیا ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو وہ جانتا ہی نہیں ان ہی کو وہ غریب بنائے گا کیا؟

اور یہ پہلی قابل غور بات ہے جو ولد کے اس خاص لفظ سے سمجھ میں آتی ہے، حاصل جس کا یہی ہوا کہ ولد ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ ولد اپنے والد کا مخلوق نہیں ہے، کسی معنی اور کسی حیثیت سے مخلوق نہیں ہے۔

اب دوسری بات جو اسی ولد کے لفظ کا قدرتی اقتضاء ہے، اسے بھی سوچئے۔ آپ جانتے ہیں کہ گھوڑے سے جو چیز قانون ولادت کے تحت پیدا ہوگی وہ گھوڑا ہی ہوگی، اور جیسے گھوڑے سے ہاتھی نہیں گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے، یہی حال ہر اس چیز کا ہے جس میں والد ولد ہونے کا تعلق پایا جاتا ہو۔ آخر بلغ سے چھچھوندر اور چوہے سے چیل، گدھے سے لومڑی کی ولادت کا تماشا کس نے دیکھا؟

یہ دونوں مقدمات جو بداہتہً بغیر کسی تاویل وتوجیہ کے لفظ ولد سے سمجھ میں آتے ہیں، ان کو سامنے رکھ لیجئے اور اب سوچئے

کہ اللہ یا خالق عالم" تعالیٰ عما یقولون علوا کبیرا" کے لئے ولد ٹھہرانے والوں نے ولدیت کے اس دعویٰ کو اپنا عقیدہ بنا کر درحقیقت کیا مانا ہے اور اپنے دین وایمان کی بنیاد انہوں نے کس چیز پر قائم کر رکھی ہے؟ یقیناً یہی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی بھی ایسی ہے جو خدا کی مخلوق نہیں ہے، نہ خود خدا کی مخلوق ہے اور نہ اس کے صفات وکمالات خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں یہ تو عقیدہ توحید کا سلبی پہلو ہوا یعنی ولد، ولد کی ذات، اس کی صفات وکمالات، اللہ تعالیٰ کے عمل تخلیق کے رہین منت نہیں ہیں یعنی خدا کے وہ مخلوق نہیں ہیں یہ تو پہلے مقدمہ کا اقتضا ہوا۔

اور دوسرا مقدمہ یعنی وہی بات کہ ہاتھی سے ہاتھی، اونٹ سے اونٹ ہی پیدا ہوتا ہے تو قانون ولادت کے تحت خدا سے (العیاذ باللہ) پیدا ہونے والا ولد بجز خدا ہونے کے اور کیا ہوگا؟ گھوڑے سے گھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے اس کا مطلب جیسے یہ ہے اور اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ پیدا ہونیوالے ولد گھوڑے میں گھوڑا اپنے (فرسیۃ) کے ان سارے صفات ولوازم کا ظہور ضروری اور ناگزیر ہے جو اس کے والد گھوڑے میں پائے جاتے ہیں، پھر خدا کے لئے عقیدے کو منسوب کرنے کے کیا یہی معنی نہ ہوئے کہ خدائی کے سارے کمالات کے متعلق ہم یہ مان رہے ہیں کہ خدا کے اس ولد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اور یہ ہے وہ مہیب ومدہش شکل اس عقیدے کی جس پر عیسائیت کی بنیاد قائم ہے، اس حقیقت سے سچ پوچھئے تو ولد ہی کا یہ لفظ پردہ ہٹا سکتا ہے، ورنہ ابن کا لفظ جسے عموماً ولد کا مرادف سمجھا جاتا ہے خود اس لفظ کی ساخت میں ایسی کوئی چیز شریک نہیں ہے، جس کے سوراخ سے عیسائیت کی اس بھیانک اور مکروہ ترین شکل کو ہم جھانک سکتے تھے۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے ولد یعنی زائیدہ اولاد سے محبت وشفقت وغیرہ کے جس تعلق کو آدمی فطرتاً رکھتا ہے یہی تعلق کسی ایسی ہستی سے اگر پیدا ہو جائے جو ولد نہ ہو تو ابن کے لفظ سے اس کو مخاطب کرنے کا عربی میں معلوم ہوتا ہے کہ عام رواج تھا خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ:

نحن ابناء الله۔ "ہم لوگ خدا کے بیٹے ہیں"۔

یہود بھی اس کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ مطلب ان کا یہ ہوتا تھا کہ دوسری نسلوں کے مقابلے میں اسرائیل کی اولاد، یعنی بنی اسرائیل سے خدا اسی قسم کا ربط وتعلق رکھتا ہے جو کسی بیٹے کے ساتھ باپ کا ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اپنے آپ کو یہودی "خدازادہ یا ولد اللہ (العیاذ باللہ) نہیں سمجھتے تھے بلکہ بارگاہ رب العزت میں غیر معمولی امتیازی مقام ہم رکھتے ہیں وہ اس کے مدعی تھے اور اس کی تعبیر نحن ابناء الله سے کرتے تھے۔ قرآن میں صرف یہ فرماتے ہوئے کہ:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (المائدہ:۱۸)

"کہہ دو کہ پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے خدا تمہیں سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم آدمی ہو، ان ہی چیزوں میں سے ایک چیز ہو جنہیں خدا نے پیدا کیا۔"

ان کے اس دعویٰ پر اور کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

آخر "ابن الله" کا دعویٰ اور "ولد الله" کا دعویٰ دونوں کا مآل ایک ہی قرار دیا جائے تو پھر عیسائیوں کی اس عقیدے

کے ساتھ خصوصیت ہی کیا باقی رہتی ہے، ابناء اللہ کے مدعی تو قرآن ہی کے رو سے خود یہودی بھی تھے۔

کچھ بھی ہو ولد کا قرآنی لفظ جس کا بار بار اعادہ تقریباً ہر اس موقع پر کیا گیا ہے جہاں جہاں عیسائیوں کے اس عقیدے کا ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہے میرے نزدیک براہ راست قرآن کا یہی ایک لفظ سمجھا رہا ہے کہ درحقیقت عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خالق عالم کے سوا ایک اور ہستی بھی ہے جو خدا کی مخلوق بھی نہیں ہے اور سارے خدائی صفات و کمالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اگر چہ عیسائی اس کو اللہ نہیں بلکہ 'ولد اللہ' کہتے ہیں، مگر 'ولد اللہ'' ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ بھی اللہ ہے۔[1]

شرک اور مشرکیت کے وہ سارے قصے جن میں خالق کے سوا ہر معبود کو مخلوق مان کر معبود بنالیا جاتا ہے، ان کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے کم از کم اتنا دشوار تو نہیں ہے جتنی دشواری ''شرک'' کی اس عجیب وغریب قسم کی وجہ سے پیش آگئی جس کی بنیاد ''ولدیت'' کے عقیدے پر قائم ہے کہ اس میں خالق کے سوا ایک ایسی ہستی کو معبود بنا لینے کی کوشش کی گئی ہے جو مخلوق نہیں بلکہ (العیاذ باللہ) خدا کا مولود ہے اور تماشا یہ کہ ''مولود'' مان کر یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ عیسائیت کا بھی بنیادی عقیدہ ''شرک'' نہیں بلکہ خالص توحید ہی ہے۔

کہ 'ولد اللہ'' اللہ کی مخلوقیت سے بھی باہر ہو جاتا ہے اور ولدیت کا لازمی اقتضا یہی ہے کہ اللہ کا ولد بھی (العیاذ باللہ) اللہ ہی ہو۔

اور قصہ کچھ اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو جاتا، اب تک تو اس پر بحث کی گئی کہ ''نظریہ ولدیت'' کی بنیاد پر ولد کے متعلق ماننے والوں کو کن کن باتوں کے ماننے پر مجبور ہونا پڑا، مگر دوسرا پہلو یعنی اسی ''نظریہ ولدیت'' کے لحاظ سے خود والد کی طرف کن ناگفتہ بہ امور کے منسوب کرنے پر اس کے قائل بے بس ہیں اب اسے ملاحظہ فرمایئے۔

ظاہر ہے کہ ولد کا لفظ والد کے ساتھ قدرتاً والدہ کے مسئلہ کو بھی ذہن کے سامنے لے آتا ہے جس کے بعد اب آگے میں کیا عرض کروں؟ ہم جن کے ذکر سے کیا معنی! خیال سے بھی کانپ اٹھتے ہیں مگر ولدیت کے اسی حیرت انگیز بدترین گھناؤنے نظریہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ماننے والوں نے ولد کے ساتھ والد کو مانا اور والد کے ساتھ والدہ کو اور والدہ کے ساتھ (العیاذ باللہ) والدین کے سارے فرائض کو اپنے ایمان کا جز بنانے پر وہ مجبور ہوئے۔

یہاں تک تو مطلب ہوا پہلی آیت یعنی

"وَّ يُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا" کا۔ اب آگے چلئے، ارشاد ہوتا ہے۔

مالهم به من علم ولا لاٰبآئهم .

''نہیں ہے ان کو اس کا کچھ بھی علم، نہ ان کے باپ دادوں کو''۔

سوچئے قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی چیز کے علم اور جاننے کی دو ہی صورتیں ہیں، یعنی جاننے والوں کو براہ راست اس کا علم حاصل ہوا ہو یا براہ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ یعنی براہ راست جاننے والوں سے اس کی خبر پہنچی ہو۔ بالواسطہ

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۴۸۔۵۳

بلاواسطہ علم کی یہی دو قسمیں ہیں۔ اب غور فرمائیے کہ ''نظریہ ولدیت'' یعنی بجائے مخلوق قرار دینے کے کسی شخص کو خالق عالم جل مجدہ کا ''مولود'' ٹھہرا لینا اور مولود ٹھہرانے کے بعد انسانیت کے اس متفقہ کلی فیصلے کے خلاف کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے، بجائے اس کے ایک خاص ذات کو خدا کی ''مخلوقیت'' کے دائرے سے خارج کر دینا اور اللہ کے ساتھ ولد اللہ کا اضافہ کر کے درحقیقت ایک اور اللہ کو مان لینا، پھر والد کے ساتھ والدہ بنانے کے لئے انسانی گھرانے کی ایک عورت کے متعلق یہ تسلیم کر لینا کہ والدہ ہونے کے فرائض اسی نے انجام دیئے اور اسی سلسلہ میں جن ناگفتہ بہ تصورات سے دل و دماغ کو گزرنا پڑتا ہے، ان کو دینی عقیدے کی حیثیت دینی، ایک پورا فلسفہ اسی ولدیت کا بنا لینا، ہزاروں لاکھوں کتابوں کے سوا اسی عقیدے کی خیالی صورتوں کو معابد اور گرجوں کے در و دیوار پر تصویری لباس بھی عطا کرنا اور جہاں جہاں موقع ملتا چلا گیا وہاں مجسموں اور سنگی و برنجی پیکروں میں بھی ان کو ڈھالنا۔

سوال یہی ہے کہ ان سارے اعتقادی طوفانوں کے نیچے کسی حیثیت سے، کسی جگہ کسی منزل میں کوئی ایسی بات بھی نظر آتی ہے جس کے متعلق اعتقاد رکھنے والوں کا یہ گروہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ براہ راست اس کا علم اسے حاصل ہو، یا اسے نہیں تو اس کے باپ دادوں میں کوئی ایسا گزرا ہے جسے اس سلسلہ میں کسی قسم کے مشاہدات یا تجربے کا کسی حیثیت سے کبھی موقع میسر آیا تھا؟

کتنے مہیب، کتنے دہشت ناک، کتنے مکروہ اور گھناونے، ناگفتہ بہ دعوؤں پر ''ولدیت'' کا یہ عقیدہ مشتمل ہے، لیکن عقیدہ رکھنے والے انصاف سے بتائیں کہ ان میں سے کل نہیں، کسی ایک ہی جزو کے جاننے کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ وہ کر سکتے ہیں؟ انہوں نے اپنے اوپر کتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں لادی ہیں! خدا کی مخلوقیت سے ایک شخص کے خارج ہونے کے مدعی ہیں۔ اللہ کے ساتھ معناً ایک نئے اللہ کا اضافہ کر رہے ہیں الملک القدوس کی طرف وہ ایسی باتیں منسوب کر رہے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں شاید وہ خود بھی سوچ نہیں سکتے مگر ان ذمہ داریوں کی بنیاد کس چیز پر قائم ہے، آپ دیکھ رہے ہیں ''کچھ نہیں'' کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

زیادہ سے زیادہ کچھ کہنے کی یہ جرأت اگر کر سکتے ہیں تو یہی کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب بغیر ''والد'' کے ''والدہ'' مریم (علیہا الصلوٰۃ والسلام) سے پیدا ہوئے تو آخر ان کا والد کس کو ٹھہرایا جائے؟ سوال تو خیر ایک حد تک پیدا ہو سکتا ہے مگر ابھی سوال سے نہیں، بحث جواب سے ہے یعنی یہ کہہ دینا کہ جب انسانوں میں ان کا کوئی والد نہ تھا تو ہم نے اللہ تعالیٰ ہی کو ان کا والد مان لیا۔

اسی جواب کے متعلق میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس دعویٰ کی بنیاد کیا ہے؟ کیا زید کا باپ اگر عمرو نہ ہو تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ زید کا باپ بکر ہے، خود سوچئے کہ ایسا دعویٰ علم پر مبنی ہوگا؟ پھر اتنی بات کہ کوئی آدمی حضرت مسیح علیہ السلام کا باپ نہ تھا محض اس سے یہ منطقی نتیجہ کیسے نکل آیا کہ آدمی جس کا باپ نہ ہو، اس کا باپ یقیناً خدا ہی ہے، ایک بے بنیاد جاہلانہ وسوسہ کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ اور اب اس کے بعد اندازہ کیجئے اس تیسری آیت کے صحیح وزن کا جو مذکورہ بالا دو آیتوں کے بعد، یعنی نظریہ ''ولدیت'' کے متعلق یہ بتانے کے بعد کہ

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾

کسی قسم کے علم پر اس کی بنیاد قائم نہیں ہے، قرآن نے بہت بڑی بات کی ہے جو ان کے (عیسائیوں کے) منہ

سے نکل رہی ہے،نہیں بول رہے ہیں یہ مگر صرف جھوٹ۔

کے پرزور الفاظ میں جو تنقید کی ہے کیا واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے اس سے بڑا دعویٰ خود سوچئے اور کیا ہوگا کہ ایک ایسی پادر ہوا بات جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی اور انسانیت کی ساری تاریخ میں جو کبھی سوچی نہیں گئی تھی، اسی کو مان کر الٰہیات کے سارے نظام ہی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا گیا۔

یقیناً حق تعالیٰ کے متعلق جتنی غلط سے غلط،مہمل سے مہمل باتیں اب تک منسوب کی گئی ہیں ان میں سب سے بڑی بات وہ ہے جو نظریہ ولدیت کے معتقدوں کے منہ سے نکل رہی ہے اور کمال یہ ہے کہ حقیقت سے ذرہ برابر بھی لگاؤ ان کے اس ادعائی عقیدے کو نہیں ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ علم کی کسی قسم کی تائید اس خیال کی یہ حاصل نہیں کر سکتے نہ خود اپنے خواص کی شہادت کو دلیل میں وہ پیش کر سکتے ہیں اور نہ اپنے باپ دادوں کی شہادت کو۔ اور عقل سے تائید تو خیر بڑی بات ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس طریقے سے بھی سوچا جائے بجز تردید کے عقل کی راہ میں بھی ان کو اور کچھ نہیں مل سکتا۔ اسی ''نظریہ ولدیت'' کا ذکر کرتے ہوئے قرآن ہی میں دوسری جگہ جو یہ ارشاد ہوا ہے۔

﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا﴾ (مریم:۹۰)

''قریب ہے کہ اس سے (یعنی عقیدہ ولدیت کی وجہ سے) پھٹ پڑیں آسمان اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے زمین اور گر پڑیں پہاڑ کانپ کر۔''

تو جو نہیں سوچتے، انہیں حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑھے چڑھے الفاظ میں جن سے زمین و آسمان بھی کانپ اٹھیں آخر قرآن نے اس عقیدے کی تنقید کیوں کی ہے؟ بظاہر اسی قسم کے مقامات میں بداندیشوں کو شاعرانہ مبالغوں یا خطیبانہ اغراق کا دھوکہ عموماً ہوا کرتا ہے حالانکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ خواہ الفاظ جتنے بھی بلند و بالا ہوں بال برابر بھی ''قرآن'' حقیقت سے کبھی نہیں ہٹتا، الفاظ کی بلندی خبر دیتی ہے کہ حقیقت جس کی تعبیر الفاظ سے کی گئی وہ خود بھی اپنے اندر غیر معمولی بلندی رکھتی ہے۔

آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ چکرا کر گر پڑیں۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ ''نظریہ ولدیت'' کے متعلق آپ ابھی سن چکے ہیں کہ درحقیقت خدا کے ساتھ دوسرے خدا کے اضافہ کی یہ ایک مخفی تدبیر اور تعبیری چال ہے اور کون نہیں جانتا کہ خدا کے ساتھ خدا کے اضافہ کا مطلب جیسا کہ خود قرآن میں بھی اعلان کیا گیا ہے کہ آسمان و زمین کے فساد اور بگاڑ کے نتیجہ کو یہ صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔

پھر مندرجہ بالا الفاظ میں بجز اس کے کہ اس لزومی منطقی نتیجہ کو دہرایا گیا ہے اور بھی کچھ کیا گیا ہے؟ یعنی خدا کے ساتھ دوسرے خدا کا وجود نظام عالم کی تباہی کو مقتضی ہے۔[1]

بجائے مخلوقات کے خالق کے ساتھ کسی ایسے وجود کو اگر مانا جائے گا جو اس کی مخلوقیت کے دائرے سے خارج ہو، تو اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا جو قرآن نے بیان کیا یعنی عالم کا سارا نظام الٹ پلٹ اور ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔[2]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۵۸-۶۲

[2] ایضاً، ص ۶۳

ذرا سوچنا چاہئے ان لوگوں کو جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کو جو قطعاً خدازادے نہ تھے، منسوب کرنے والے جب ان کی ولدیت کو خدا کی طرف (العیاذ باللہ) منسوب کرتے ہیں کیا وہ نہیں سوچتے کہ وہ مسیح (علیہ السلام) کو بھی گالی دے رہے ہیں اور اگر سوچیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ درحقیقت حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کررہے ہیں جسے خدا تو شاید، ایک شائستہ آدمی بھی اپنی طرف اس کے انتساب کو برداشت نہیں کرسکتا۔

آخر ایسی عورت جو آپ کی بیوی نہ ہو، اس کے ساتھ آپ کو اگر متہم کیا جائے تو یہ تہمت آپ کے لئے کیا قابل برداشت ہوسکتی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ولدیت کے اس عقیدہ کو ماننے والے دراصل حضرت مسیح (علیہ السلام) کو بھی گالیاں دے رہے ہیں، ان کی پاک، طاہرہ ومطہرہ والدہ معصومہ عفیفہ کو بھی بے آبرو کررہے ہیں۔

اور کاش ان میں کچھ سمجھ ہوتی تو خیال کرسکتے تھے کہ اپنے ارحم الراحمین، مالک وخالق (تعالیٰ اللہ عما یفترون) کے ساتھ بھی سب وشتم کی گستاخیوں کے مرتکب ہورہے ہیں۔

اور کیسی گستاخیاں؟ کیسی شوخ چشمیاں! جنہیں خود برداشت نہیں کرسکتے، توقع رکھتے ہیں کہ خدا اسے برداشت کرے گا۔ آسمان وزمین، پہاڑ کے پھٹنے کا بعض لوگوں نے یہ مطلب جو بیان کیا ہے کہ یہ عربی زبان کا ایک پیرایہ بیان ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ ان چیزوں میں اگر احساس ہوتا تو ان گالیوں سے وہ درہم برہم ہوجائیں۔

بہرحال عقلی احساسات اور جذباتی تاثرات پر یہ سارا زور وظلم محض اس لئے کیا گیا کہ حضرت مسیح کا انسانوں میں جب کوئی شخص باپ نہ تھا تو آخر کسی نہ کسی کو چاہیے کہ آپ کا باپ ٹھہرایا جائے، حالانکہ خود یہی ایک غیر عقلی تقاضا ہے۔ کائنات کی ساری چیزیں جنہیں خالق عالم پیدا فرمارہے ہیں، خواہ بالواسطہ پیدا ہورہی ہوں یا بلاواسطہ، ادیان وملل کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں ہر چیز درحقیقت حق تعالیٰ کے کلمہ کن سے پیدا ہورہی ہیں، یعنی حق تعالیٰ کا تخلیقی ارادہ اور حکم پیدائش صرف وہی ہر چیز کے پیدا ہونے کی واحد ضمانت ہے، بلاواسطہ پیدا ہونے والی چیزیں جن کا تعلق "عالم امر" سے ہے ان کا بھی یہی حال ہے، اور چیز سے چیزوں کی پیدائش کا جو سلسلہ عالم میں نظر آتا ہے، گو بظاہر یہاں وسائط نظر آتے ہیں، لیکن وسائط کو کسی چیز کی پیدائش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تخلیق وآفرینش یہ کام براہ راست خالق تعالیٰ کا ہے اور کوئی مانے یا نہ مانے مگر عیسائی جو بہرحال ایک دینی اور مذہبی امت ہے، اس کا دینی عقیدہ بھی یقیناً یہی ہے پھر ان گنت چیزیں جب کلمہ کن سے پیدا ہورہی ہیں، کونسی دشواری تھی اگر ایک مسیح (علیہ السلام) کی پیدائش کو بھی حق تعالیٰ کے اسی تخلیقی ارادے اور کلمہ کن کا نتیجہ مان لینے سے عقل ہی پر کسی قسم کا بار پڑتا تھا اور نہ جذبات ہی کو ٹھیس لگتی تھی، مگر انہوں نے نہ عقلی احساسات ہی کی پروا کی اور نہ جذباتی تاثرات کا خیال ان کے آڑے آیا، اور ایک ایسا دعویٰ کر بیٹھے جس سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ کیسے عجیب وغریب تماشے پیدا ہوئے۔ پیش ہونے کے ساتھ ہی عقل جس خیال کو تے کردیتی ہو، جذبات میں جس سے طوفانی ہیجان پیدا ہوجائے اسی کو وہ خود بھی نگلنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو نگلوانا چاہتے ہیں۔ پھر قرآن اگر یہ کہتا ہے کہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے کبرت کلمة تخرج من افواههم یا ایسی بھاری بات جو نہ کبھی سنی گئی اور نہ دیکھی گئی یعنی لقد جئتم شیئا اِدًا تو انصاف شرط ہے کہ جس چیز کو انہوں نے مانا ہے اس کی صحیح تعبیر کے لئے اور کیا کہا جاتا؟[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۶۵۔۶۷

آیت: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾ (الکھف:٦)

''تو کیا ایسا ہوگا کہ تم اپنی جان کھودینے والے بن جاؤ گے ان کے (یعنی عقیدہ ولدیت کے ماننے والوں کے) آثار پر اگر نہ ایمان لائے وہ اس بات پر (قرآن پر) مارے غم واندوہ کے۔''

یوں تو سورۂ کہف اول سے آخر تک عجیب وغریب اشارات پر مشتمل ہے لیکن کم از کم میرا اپنا ذاتی خیال یہی ہے کہ اس سورۂ میں بھی یہ آیت اور آیت میں بھی ''اثارھم'' کا جزو غیر معمولی توجہ کا مستحق ہے۔ آثار کا لفظ اثر کی جمع ہے، جو اردو میں بھی مستعمل ہے، جس سے شاید وہ صحیح مفہوم دماغوں میں نہ آئے جو خالص عربی زبان میں اثر کے اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے۔ لغت میں اس کی تشریح فارسی کے ان الفاظ سے کی گئی ہے، منتہی الارب میں ہے ''اثر بقیہ چیزے ونشان''

آگے بیان کیا گیا ہے کہ نقش قدم کو بھی اسی لئے اثر کہتے ہیں، پھر عربی کا ایک محاورہ نقل کیا ہے، کہتے ہیں اثر ابعد عین ''درحق کسے گویند کہ حاصل از دست دادہ وآثار ونشان اوطلب نماید'' یعنی اپنی چیز کوئی کھو بیٹھا ہو اور اس کے بعد اس چیز کے آثار اور نشانیوں کو تلاش کرتا ہو۔

حاصل یہی ہے کہ اپنے بعد جن نتائج اور نشانیوں کو چیز چھوڑتی ہے۔ ان ہی کی تعبیر عربی زبان میں آثار کے لفظ سے کرتے ہیں، یہ لغوی تشریح تو آثار کے لفظ کی ہوئی۔

دوسرا لفظ آیت میں بَاخِعٌ کا ہے جس کا مادہ بخع ہے، عام طور پر بخع کا ترجمہ ہلاک کرنا، کردیا جاتا ہے، مگر عربی زبان کے ایسے محاورے اور زبان زد فقرے مثلاً بخع الارض بالزراعۃ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمین پر اتنی کاشت کی گئی کہ روئیدگی کی صلاحیت جاتی رہی، اس طرح ''بخع الرکیۃ'' اس وقت بولتے ہیں جب کھودتے ہوئے زمین کے اس طبقہ تک آدمی پہنچ جائے جہاں سے کنویں کا پانی ابلنے لگے۔ بہرحال کسی معاملہ میں جدوجہد کو اس کے آخری حدود تک پہنچا دینا بخع کا عربی لفظ اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

تیسرا لفظ اسف کا ہے، غم واندوہ اس کا ترجمہ کردیا جاتا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ غم واندوہ حزن وملال کی ایک تو عام کیفیت ہوتی ہے لیکن یہی کیفیت جب شدت اور تیزی میں آخری شکل اختیار کرلیتی ہے جس کے بعد قلبی کلفت اور بے چینی کا کوئی درجہ سوچا نہیں جاسکتا، تب اسف کے لفظ سے قلب کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی لئے ایسی زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت قطعی طور پر باقی نہ رہی ہو، ایسی زمین کو ارض اسفتہ کہتے ہیں۔

ان لغوی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے سیدھے اور سادہ الفاظ میں مندرجہ بالا آیت کا خلاصہ یہی ہوسکتا ہے کہ قرآن پر ایمان لاکر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے علم وعمل کی تصحیح سے عیسائی قوم اگر محروم رہ گئی ہے تو قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ ان عیسائیوں پر افسوس کرتے ہوئے تم اپنے آپ کو ہلاک کردو گے بلکہ جن آثار ونتائج اور عواقب کو ولدیت کا عقیدہ رکھنے والی یہ قوم دنیا میں چھوڑ کر جانے والی ہے، ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو مخاطب بنا کر یہ پوچھا جارہا ہے کہ ان کو سوچ سوچ کر کیا اپنے آپ کو ہلاک کردو

گے؟

یہ ہے حاصل اور خلاصہ قرآنی الفاظ کا، اب ظاہر ہے کہ قرآن میں العیاذ باللہ شاعری تو نہیں کی گئی ہے بلکہ جو حقیقت تھی صحیح صحیح بچے تلے الفاظ میں اسی کا اظہار کیا گیا ہے، اور اسی واقعہ سے آگاہی بخشی گئی ہے۔

پس آنحضرت ﷺ کی یہ نفسیاتی کیفیت، یعنی غم والم کا ایسا طوفان آپ کے اندر امنڈ تا تھا کہ اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی زندگی تک کو قربان کرنے کے لئے آپ آمادہ تھے، اگر یہ واقعہ تھا، اور واقعہ کے سوا کسی دوسرے پہلو کا احتمال ہی کیا ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ ''عقیدہ ولدیت'' کے وہ مہیب روح فرسا، جان گداز نتائج کیا تھے، جن سے رسول اللہ ﷺ اس حد تک متاثر تھے، یقیناً وہ چلتی پھرتی کوئی معمولی بات نہیں ہوسکتی اس لئے میں نے عرض کیا کہ اس آیت میں سب سے زیادہ توجہ و تامل کا مستحق ''اثارھم'' کا جزو ہے، اور اب میں اسی ''اثارھم'' کی تھوڑی بہت تفصیل کرنا چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہوگا کہ آثار اورھم ان ہی دولفظوں میں درحقیقت نسل انسانی کے ایک خاص طبقہ کی کتنی طویل وعریض تاریخ بند ہے۔[1]

قرآن میں ''اثارھم'' کا لفظ جو فرمایا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اس پر غور کیجئے جیسا کہ ظاہر ہے اثار، اثر کی جمع ہے منتہی الارب میں لفظ اثر کی تشریح فارسی کے ان لفظوں سے کی ہے:

''بقیہ چیزی ونشان قدم، ومنہ، قطع اللہ اثرہ یعنی بہ برود خدائے نشان قدم اورا''

جس کا حاصل یہی ہوا کہ اپنے پیچھے کوئی چیز جن نشانیوں کو چھوڑ جائے ان ہی کو اس چیز کا اثر یا آثار عربی میں کہتے ہیں۔

یہ تو ''آثار'' کے لفظ کی لغوی شرح ہوئی، آگے ھم کی ضمیر، سو ظاہر ہے کہ اس کا مرجع اور اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو ''عقیدت ولدیت'' کے قائل تھے۔

اس کے بعد اب اجمالی تفصیلات کو اپنے سامنے لایئے جن سے گزرتے ہوئے ''عقیدہ ولدیت'' موجودہ دور تک پہنچا ہے۔

جن لوگوں نے شروع شروع میں خالق عالم کے متعلق ''ولدیت'' کے اس عقیدہ کو تراشا، دنیا سے وہ چلے گئے ان کے بعد کلیسا اور کلیسا سے پوپ کی ذریت پادری پیدا ہوئے۔ پھر اس نظام کے تحت جن ناگفتہ بہ حالات سے یورپ کے عوام کو گزرنا پڑا جس سے احتجاجی ذہنیت پیدا ہوئی اور وہی احتجاجیت آگے بڑھتے ہوئے یہی نہیں کہ صرف پوپ اور کلیسا کے اقتدار کی منکر ہوگئی بلکہ جوں جوں ایک فریق کا تشدد بڑھتا جاتا تھا فریق مقابل کی سختیاں اور منہ زوریاں بھی اسی نسبت سے ترقی پذیر ہوتی رہیں، تا ایں کہ مسیح کے حواری پطرس کے وجود کا بھی انکار کیا گیا۔ آخر میں مسیح کا وجود بھی مشکوک ٹھہرایا گیا اور بالآخر اس کی انتہاء العیاذ باللہ اس شک پر ہوئی جس کے بعد انسان کے لئے اپنی انسانیت کو باقی رکھنے کے لئے کوئی ٹیک ہی باقی نہیں رہتی یعنی خود مسیح کے باپ کا دوسرے لفظوں میں کہئے کہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود میں شک اندازیوں کی راہیں یورپ میں درست ہونے لگیں اور گو

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۶۸۔۶۹

عمومیت کی زبان پر خدا بھی باقی رہا بلکہ خدا کا مسیح بھی، مسیح کی انجیل بھی لیکن اس طویل وعریض آبادی کے اکابر کے دل میں سچ پوچھئے تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

دل کی بات دل ہی تک محدود کب رہتی، آخر مشرقی یورپ میں شیوعی یا بالشویکی نظام نے سر اٹھایا، جس میں زبانوں سے بھی وہی کہلوایا جاتا ہے اور کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جسے مغربی یورپ کے باشندے اب تک اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے، اور اس کے بعد قدرتاً انسانی نسلوں اور دوسرے حیوانی سلسلوں میں کسی فرق کا باقی رکھنا ناممکن ہو گیا۔ جیسے ایک مکھی پیدا ہوتی ہے، جان لے کر پیدا ہوتی ہے، احساس لے کر پیدا ہوتی ہے، اور اپنے جیسی ہی چند مکھیوں کو پیدا کر کے ناپید ہو جاتی ہے۔ آدمی کی قدر و قیمت کی کوئی وجہ باقی نہ رہی کہ اس سے زیادہ کسی امتیاز خاص کی مستحق قرار دی جائے۔

مکھیوں کی جتنی تعداد بھی مر جائے، مار ڈالی جائے جیسے یہ کوئی اہم واقعہ نہیں ہے، آج یہی تصور ان کے متعلق بھی دلوں میں جاگزیں ہو رہا ہے، جو آدمی بن کر دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن کا مسجود ملائکہ ''عقیدہ ولدیت'' کی چوٹ کھاتے ہوئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ذلت وخواری کے کتنے تاریک ومہیب خندق میں جا گرا۔

اور یہ ہے میرے نزدیک قرآنی لفظ اثارھم کا مطلب، جس کے لئے چاہئے تھا کہ کئی جلدیں لکھی جائیں، لیکن اس کام کو دوسروں کے لئے چھوڑ کر اپنے ٹوٹے پھوٹے پیش کردہ اشارات پر قناعت کرتے ہوئے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جس کی پیغمبرانہ بصیرت کے سامنے ''عقیدہ ولدیت'' کے ان جان گداز، روح فرسا آثار کا ہر پہلو نمایاں ہو، جس کا کچھ حصہ تو سامنے آچکا ہے، اور نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کیڑوں اور مکوڑوں، مکھیوں اور پتنگوں کی صفوں میں شریک ہونے والے اس انسان پر آئندہ ''ولدیت'' کا یہی عقیدہ اور کن آثار کو لانے والا ہے۔

الغرض جو کچھ گزر چکا یا گزر رہا ہے اور آئندہ گزرنے والا ہے ان سے آگاہی کے بعد اگر ''انسانیت'' کے سب سے بڑے غمخوار و بہی خواہ (ﷺ) پر یہ حال طاری ہو جائے کہ ان ''اثار'' سے بچانے کے لئے وہ اپنا سب کچھ حتی کہ اپنی جان تک کی بازی لگانے کے لئے تیار تھے تو کس حیثیت سے یہ بات محل تعجب ہو سکتی ہے؟[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خد و خال، ص: ۹۲۔۹۴

آیت: ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا O وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا﴾ (الکھف: ۷،۸)

''ہم نے بنایا (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، زمین کے لئے زیب و زینت تا کہ ہم جانچیں کہ ان میں (یعنی انسانوں میں) عملاً سب سے اچھا کون ہے۔ اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں کو) جو زمین پر ہیں، میدان اجاڑ۔''

الحمدللہ کو سورہ کہف کا پہلا عشرہ کہیے یا رکوع کی آخری دو آیتوں پر ہم پہنچ گئے ہیں، ان ہی دو آیتوں کا حاصل اور ترجمہ آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے اصل الفاظ قرآن مجید کے یہ ہیں:

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا O وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (الکھف، ۷،۸)

ان میں پہلی آیت میں اگر چہ بظاہر تخلیق کائنات کی اسی عام توجیہ کا ذکر ہے جس کا قرآن میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف الفاظ میں اعادہ کیا گیا ہے، اپنے الفاظ میں جس کا خلاصہ خاکسار نے یہ کر لیا ہے:

''یہاں جو کچھ ہے سب انسان کے لئے اور انسان اس کے لئے ہے جس کا سب کچھ ہے''۔

لیکن تخلیق کائنات کی اس عام توجیہ کی تعبیر جن خاص الفاظ میں یہاں کی گئی ہے اور جس موقع و محل پر ہم اس کو پاتے ہیں ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوچیے۔ ظاہر ہے کہ ماعلی الارض یعنی وہ ساری چیزیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں، جن سے مٹی اور کیچڑ کے اس ڈھیر کو جس کا نام زمین ہے، زینت بخشی گئی ہے۔ ان میں جہاں اونچے اونچے پہاڑ، سرسبز وادیوں کے آغوش میں بہتی ندیاں، غاٹے بھرنے والے سمندر، لہلہاتے ہوئے پھول، پھلوں سے لدے ہوئے درخت، ہرے بھرے باغ، جنگل، کھلے پر فضا میدان، یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں، ان ہی میں یقیناً گرد و غبار کے اس تودہ کی آرائش کی ضمانت خود انسانی وجود میں بھی مستور ہے۔ وہ خود بھی زمین کی زینت ہے، اور اس کے اندر قدرتی سلیقہ اس بات کا جو رکھا گیا ہے کہ معمولی معمولی چیزوں کو اپنی ذہانت اور صنعتی چابک دستیوں کی مدد سے حسن و جمال کے بہترین دل آویز سانچوں میں ڈھال کر رکھ دیتا ہے، بلاشبہ زمین کی سجاوٹ و بناوٹ حسن و رعنائی کو انسان کے اس فطری سلیقہ سے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ ماننا چاہیے کہ ''ماعلی الارض'' یا پشت زمین کی دوسری چیزوں کے ساتھ خود انسانی وجود کے پہلو نے بھی جنت سے نکالے ہوئے یا جنت کے وارث انسان کے رہنے بسنے کے قابل زمین کے اس خاکی کرے کو بنا دیا، گویا یوں سمجھئے کہ ایک گونہ اشک شوئی کی ایک صورت عارضی مستقر کی اس شکل میں اس آدمی کے لئے نکل آئی جو بہشت بریں کا باشندہ و متوطن تھا۔

کچھ بھی ہو ''ماعلی الارض'' یعنی زمین پر جو کچھ ہے اس کے جھمیلے میں شریک ہو کر آدمی کا وجود بھی زمین کی حسن افزائیوں اور جمال آرائیوں میں کافی حصہ لے رہا ہے مگر اپنے اس سلیقہ سے جیسا کہ قرآن توجہ دلا رہا ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس چیز کے حسن و جمال میں وہ اضافہ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خود انسان نہیں بلکہ خاک اور دھول کا یہی مجموعہ زمین ہے یہی حاصل ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا کے الفاظ کا۔

اسی لئے آگے فرمایا گیا ہے کہ محاسن وکمالات کے جو لامحدود ذخیرے زمین میں نہیں بلکہ خود انسانی فطرت کے اندر دبے ہوئے ہیں۔ ان کو بروئے کار لانے کی تدبیر ہے کہ الانسان لامحدود کمالات والے خالق کائنات سے ربط پیدا کرے اور اعمال کے حسن وقبح، بھلائی، برائی کا واحد معیار اسی کی مرضی مبارک کو ٹھہرالے اور یہی مطلب ہے۔

لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

کا یعنی ''تاکہ جانچیں (یا آزمائش کریں) ہم اس بات کو کہ ان میں (انسانوں میں) عملاً سب سے اچھا کون ہے''۔

بلکہ یوں تو مجموعی طور پر آیت کے ان دوٹکڑوں سے ادھر بھی گویا اشارہ مل سکتا ہے کہ الانسان کی طرف منسوب ہو کر اور اس کے لئے وقتی مستقر یا قیام گاہ بننے کی نسبت نے جب زمین کو حسن وجمال سے مالا مال کر دیا اور اس کی بہت سی پوشیدہ صلاحیتیں انسانی وجود کے ساتھ مربوط ہو کر منصۂ شہود وظہور پر جلوہ گر ہو رہی ہیں تو اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ خالق کائنات کے ساتھ وابستگی اور ربط انسانی وجود کے کن مخفی ذخیروں کو باہر لا سکتا ہے۔[1]

اب آیئے اور اس پر غور کیجئے کہ انسانی وجود کے ان دو پہلوؤں یعنی ایک پہلو تو وہ ہے جس سے زمین کے حسن وجمال کے اضافہ اور فروغ میں مدد مل رہی ہے، اور دوسرا پہلو وہ ہے جس کے ساتھ خود انسانی وجود کے باطنی محاسن اور معنوی کمالات کے ظہور و بروز کا مسئلہ وابستہ ہے، ان دونوں پہلوؤں کا تذکرہ عقیدہ ولدیت کے چھوڑے ہوئے آثار کے بعد کیوں کیا گیا ہے؟

عرض کر چکا ہوں کہ دین سے بے دینی کی پیدائش کا جو حادثہ عیسائی ممالک اور کلیسائی علاقوں میں پیش آیا کش مکش اور تصادم کے اس قصے میں بڑھتے ہوئے لوگوں کا جذبہ ضد وعداوت، بغض ونفرت صرف خدا انکار ذہنیت ہی تک پہنچ کر نہیں ٹھہرا، بلکہ مذہب اور دین کے نام سے لامذہبیت اور بے دینی کی فرعونی حرکتوں اور طاغوتی شرارتوں کی جو جہنم عوام پر بھڑکائی گئی اس نے لوگوں کو (یہ واقعہ ہے کہ) بالآخر ''خدا بے زاری'' کے حدود تک دھکیل کر پہنچا دیا۔ آج یورپ وامریکہ والے اپنے ''خدا بے زار تمدن'' کی توجیہ میں جو باتیں بھی بنائیں، فلسفہ کی پشت پناہی حاصل کریں غریب سائنس کے سر اس کا الزام تھوپیں یا تھپوائیں لیکن بصیرت کی آنکھوں سے جنہوں نے ان ممالک کے باشندوں کی دینی تاریخ اور مذہبی قلابازیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ درحقیقت خود اس مذہب اور مذہبیت کے نمائندوں کے طرز عمل نے اس نتیجہ تک ان کو پہنچا دیا جہاں یہ غریب آج کھڑے ہوئے ہیں، یہ صحیح ہے کہ پہنچ جانے کے بعد فلسفیانہ چرب زبانیوں اور مسائل سائنس کے غلط استعمال سے بھی بعد کو مدد حاصل کی گئی، مگر حقیقی اسباب بے دینی کی اس زندگی کے وہی ہیں جن کی طرف قرآن نے اثارھم کے دو لفظوں سے اشارہ کیا ہے۔

بہر حال واقعہ ہو چکا ہے اور سب کے سامنے ہے اپنی اس ''خدا بے زاری'' کی خصوصیت کو عموماً اب وہ چھپاتے بھی نہیں، بلکہ اس تاریخی قلابازی کی آخری شکل جس کا نام اشتراکیت یا بولشوازم وغیرہ ہے جیسا کہ کہنے والے کہتے ہیں، ان کے پرچم کا سب

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۹۴-۹۶

سے نمایاں امتیازی طغراہی یہ ہے کہ ''ہم خدا سے بے زار ہیں''

انصاف کی یہی بات یہی ہے کہ آج اشتراکیوں کی طرف خدا بے زاری کے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی منسوب کیا جارہا ہے اور بظاہر اسے نئی بات ٹھہرانے کی جتنی کوششیں بھی ہورہی ہوں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ان کا قصور اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ان کے بدنام کرنے والوں کے دلوں میں جو کچھ تھا، جرات سے کام لے کر اسی کو بدنام کئے جانے والے اپنی زبانوں پر بھی لے آئے ہیں، گویا جو ''اندر'' تھا وہی ''باہر'' نکل آیا ہے۔

پس دل والے ہوں یا زبان والے، اندر والے ہوں یا باہر والے، یقیناً ان دونوں میں سے کسی کی سوسائٹی میں اس کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ انسانی وجود کے اس پہلو کو سوچیں بھی جس میں زمین کے حسن و جمال کے فروغ و اضافہ کا نہیں بلکہ براہ راست خود اسی انسانی وجود کے معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے ظہور کا راز پوشیدہ ہے۔ آخر خدا بیزار ذہنیت میں خدا طلبی اور خدا کا خیال خود ہی بتایئے کہ کس راہ سے آئے۔ خدا کی مرضی کو انسانی اعمال و انفعال کے حسن وقبح کا معیار بنانے کی صورت ہی کیا باقی رہی ہے جب سے خدا ہی کا وزن دلوں سے نکل چکا ہے تو خدا کی مرضی کی تلاش کا جذبہ آخر کس راہ سے ابھرے یا ابھارا جائے۔

سچ تو یہ ہے کہ تھانے میں رپٹ لکھوانے کا لطیفہ لطیفہ ہی ہو مگر خدا کا نام لینے والے مہذب وشائستہ مجالس کی شرکت کے استحقاق سے آج محروم ہو جاتا ہے کیا اس کی واقعیت کا بھی کوئی انکار کرسکتا ہے؟ پھر نتیجہ کیا ہوا؟ وہ آپ کے اور ہمارے سامنے ہے۔ انسانی وجود کا خدائی پہلو مفلوج و مردہ ہو کر رہ گیا۔ لے دے کر جو چیز باقی رہ گئی وہ اب صرف یہی ہے کہ اس مٹی اور کیچڑ کے تودے کے ساتھ انسانیت لپٹ پڑی ہے اس کے سوا اور کوئی دوسرا کام آدمی کے لئے نہیں رہ گیا ہے کہ زمین کی گری پڑی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر ان کے حسن میں حسن کا، قیمت میں قیمت کا اضافہ کرتا چلا جائے۔ لامحدود توانائیوں کا جو گراں قدر بیش قیمت ذخیرہ اس کے استعمال کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے، انجام یہ ہے کہ زمینی رعنائیوں کے بڑھانے میں خواہ اڈیسن ہی بن کر کوئی کیوں نہ مرتا ہو لیکن انسانی محاسن وکمال کے لحاظ سے ایک نومولود بچہ کی جو حالت ہوتی ہے وہی حال اس بڈھے کا اس وقت بھی ہوتا ہے جب زندگی کے تمام مرحلوں کو طے کر کے زمین سے وہ رخصت ہوتا ہے گویا اس لحاظ سے اسی حال میں وہ مرتا ہے جس حال میں پیدا ہوا تھا۔ خواہ زمینی حسن زیبائش اور سج دھج کے اضافہ میں کسی قسم کے غیر معمولی کارنامے اس سے کیوں نہ ظاہر ہوئے ہوں۔

عقیدہ ولدیت کے آثار نے دنیا میں جس حشر کو آج برپا کر رکھا ہے وہ یہی ہے۔ مٹی بڑھ رہی ہے، بڑھتی چلی جارہی ہے، چمک رہی ہے، چمکتی چلی جارہی ہے اس کے حسن و جمال میں اضافہ پر اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے مگر انسان گر رہا ہے گرتا چلا جاتا ہے، بجھ رہا ہے، بجھتا چلا جارہا ہے اور میں نے شاید غلط کہا کہ جس حال میں پیدا ہوا تھا اسی حال میں مرتا ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ پیدائش کے وقت کم ازکم معصوم حیوان یا غیر مضر جانور تو وہ رہتا ہے لیکن اس ''خدا بے زار'' تمدن کے زیر اثر زندگی بسر کرنے والوں میں خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مرنے والے مرنے کے وقت شیطان کی بھی ناک کاٹ کر مرتے ہیں، آج ان ہی شیطانی انسانوں نے اسی ''جنت نما'' زمین کو اذیت رسانی میں قریب قریب جہنم کے حدود تک پہنچا دیا ہے۔

لیکن یہ تو وہ ہے جو ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے، مگر آئندہ یہی صورت حال کس مہیب ڈراؤنے انجام کو آدمی کے سامنے لانے

والی ہے جہاں تک میرا خیال ہے مذکورہ بالا آیتوں میں سے آخری آیت میں شاید اسی کا جواب تلاش کرنے والوں کو مل سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات سے قطعی بےتعلق و بےگانہ ہو کر اپنی خدا بےزار زندگی کے ساتھ جو راضی اور مطمئن ہو چکے ہیں۔ان کے اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ توانائیوں کا وہ سارا سرمایہ، صلاحیتوں کا سارا ذخیرہ جو انسانی وجود میں بھرا گیا تھا خالق تعالٰی سے ٹوٹ کر کلیۃً زمین ہی کے بناؤ سنگار کی طرف اس کا رخ مڑ گیا۔ایک طرف اس یکسوئی کے رخاپن کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ارضی بناؤ سنگار، آرائش وزیبائش کے نت نئے سامانوں سے دنیا جیسے اس عہد میں بھری اور بھرتی چلی جا رہی ہے انسانیت کی تاریخ یا کم از کم تاریخ معلوم میں اس کی قطعاً کوئی نظیر نہیں ہے ہر نیا دن نئے انکشافات، جدید مصنوعات وایجادات کو اپنے جلو میں لا رہا ہے ابھی ایک تماشا ختم بھی نہیں ہو پاتا کہ دوسرا نظارہ دعوت نظر دینے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم بھی دیکھ رہے ہیں اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں، لیکن زمین کی زیب وزینت کے قصوں میں ڈوب کر خود اپنے اور اپنے محاسن و جمال کو فراموش قطعاً فراموش کر دینے والا انسان ایجادات واختراعات کی ان راہوں سے زیب وزینت کے ساز وسامان کے ساتھ ساتھ اسی زمین کی ویرانی و بربادی کے سامانوں کو بھی غیب سے گھسیٹ گھسیٹ کر دائرہ ظہور وجود میں جولا رہا ہے، دنیا کی آنکھوں سے کیا اوجھل ہیں؟ دیکھئے وہ ایٹم بم کے جہنمی ذرات ہیں اور یہ ہائیڈروجن کے ان دیکھے کرامات ہیں۔یہ ان آتش بداماں ایجادات واختراعات کے سوا، ہیں جن کا دنیا اب تک تجربہ کر چکی ہے، دیکھئے ان کو اور پڑھئے قرآن میں۔

﴿وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا﴾

''اور ہم بنا دینے والے ہیں (ان ساری چیزوں) کو جو زمین پر ہیں، میدان اجاڑ''۔

خود سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔الانسان خالق سے ٹوٹ کر صرف زمین کے ساتھ لپٹ کر رہ گیا اور اپنا سب سے بڑا کمال یہی سمجھ بیٹھا کہ زمین کے زیوروں میں ایک زیور اور اس کے گلے کا ہار بن کر اسی کے سینے پر لوٹ پوٹ کر ختم ہو جائے، اپنے خیال میں ختم ہو جائے۔جو خالق کے لئے تھا وہ ''گردن خر'' کا طوق بن کر بھی رہ جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ ایک زندہ جانور کی گردن کا تو ہار ہے مگر وہ تو اسی خیال سے مست ومسرور ہے کہ کیچڑ اور مٹی کے لئے زیور بن گیا ہوں۔انفرادی ہستیوں کا حشر اسے نہیں چونکا سکا تھا کہ نسل کا تسلسل، تسلسل کا بھروسہ اس کے سینے کا مرہم، جھوٹا مرہم بنا ہوا تھا۔لیکن ''ہم بنا دینے والے ہیں (ان سب چیزوں کو) جو زمین پر ہی میدان اجاڑ'' یہ طفلی تسلی کے اس مرہم کو مجروح سینوں پر دیر تک باقی رہنے دیگا۔پس

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما [1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۹۷-۱۰۰

آیت : ﴿أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا﴾ (الکھف:۹)

''کیا تم سوچتے ہو کہ اصحاب کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں کوئی عجیب (نشانی) تھے۔''

اس میں مخاطب کو تعجب اور حیرانی کا شکار قرار دیتے ہوئے آگے قصے کو جو بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق کھلا ہوا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعجب کا اظہار کیا کس نے تھا؟ جو قرآن نے یہ پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، کیا اس سوال کا جواب بیرونی روایات کی پشت پناہی کے بغیر ناممکن ہے؟

میرا خیال تو یہی ہے کہ پہلے رکوع کی پہلی تبشیری ضمانت آدمی کو حیرت اور تعجب میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ عقیدہ ولدیت کے آثار جن حالات کو دنیا میں کھینچ کر لانے والے تھے (جن میں ہم اس وقت مبتلا ہیں) بلا شبہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں آدمی اپنے ایمان کی اور ایمانی قوت سے عمل صالح کے حدود کی حفاظت میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟ اسی سوال کے جواب میں قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم عقیدہ ولدیت کے آثار ہی کو دیکھ دیکھ کر خفقان میں مبتلا ہوئے چلے جا رہے ہیں، باہم ایک دوسرے سے گھبرا گھبرا کر پوچھتے ہو کہ متاع ایمانی کے بچا لینے کی کیا کوئی ممکن صورت رہ گئی ہے؟ عمل صالح کی زندگی گزارنے کی گنجائش کیا اس ماحول میں باقی رہی ہے، جسے بتدریج عقیدہ ولدیت کے آثار نے دنیا میں پیدا کر دیا ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک گزرے ہوئے واقعہ کو سنا کر قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ کتنی نازک ترین گھڑیوں میں بچانے والوں نے اپنے ایمان کو بھی بچا لیا تھا اور عمل صالح کی زندگی بھی ان کی بے داغ رہی اور اسی زندگی کے اجر حسن یا اچھے معاوضہ کو بھی مسلسل بغیر کسی انقطاع کے وہ اپنے سامنے پاتے رہے، گویا یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ جب سارا ماحول آدمی کا بے ایمانی اور بد عملی سے بھر جائے تو اس وقت بھی ایمان اور عمل صالح کی زندگی کے بچا لینے کا عملی طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

یقیناً ''عقیدہ ولدیت'' کے آثار کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس اچنبھے کی سب سے بڑی بات اور تعجب کا سب سے بڑا اہم سوال یہی ہو سکتا تھا کہ اس زمانہ میں بھی کیا ایمان اور عمل صالح کو بچا لینے کا کوئی امکان باقی رہ گیا ہے؟ یہ ایک قدرتی سوال ہے جو دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور جواب بھی حیرت میں غوطہ دینے والے اسی سوال کا یہ دیا گیا ہے کہ ایمان اس قسم کی آزمائشوں سے گزرتا ہی رہا ہے۔ کہف والے بیچارے جن حالات سے دو چار ہو گئے تھے اور ان ہی حالات میں ایمان و عمل اور اس کے نتائج کے بچا لینے میں وہ کامیاب ہوئے۔ کیا تم اس کو کوئی ایسا عجیب و غریب اور شاذ و نادر واقعہ خیال کرتے ہو جو کسی اصول و قانون کے تحت نہیں بلکہ محض اتفاقاً پیش آ گیا تھا۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۰۲-۱۰۳

آیت: ﴿إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا﴾ (الکھف: ۱۰، ۱۱، ۱۲)

''جب پناہ لی جوانوں نے کہف (کھوہ) میں تو کہا انہوں نے اے ہمارے پروردگار اعطا فرما اپنے پاس سے ہمیں ''رحمت'' اور فراہم فرما ہمارے معاملہ میں ''رشد''، پس تھپک دیا ہے ہم نے ان کے کانوں میں کہف میں چند سال گنتی کے پھر ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ ہم جانیں (یعنی اس علم کو ظاہر کر دیں) کہ دونوں فریق میں سے کس نے اس مدت کا احصا کیا جس میں وہ غار میں ٹھہرے۔''

پہلی بات اس تعبیر میں یہی بیان کی گئی ہے کہ ایمانی آزمائش میں مبتلا ہونے والوں نے اپنے علاقے کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا اور اسی فیصلہ کے مطابق وہ ''الکھف'' (کھوہ) میں پناہ لینے کے لئے چلے گئے یعنی ایسے مقام کا انتخاب بود و باش کے لئے کیا جہاں اس عہد کی عام بے ایمان، ادھرم، ناستک، سوسائٹی کی گندہ لہروں سے محفوظ رہنے کی ان کو توقع ہو سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمانی آزمائش کے ان حالات میں علیحدگی اور ''کنارہ کشی'' کی یہ تدبیر بذات خود کوئی اہم بات نہیں ہے بلکہ پہلی بات ان حالات میں دل میں اگر آتی ہے تو یہی آتی ہے کہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

مگر اس شاعرانہ خیال کی خوش گواری اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ خیال صرف خیال ہے لیکن خیالی حدود سے نکل کر عمل کی سرحد میں قدم جس وقت رکھا جاتا ہے اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیال اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ شاعروں نے اس کو مشہور کر رکھا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ انسان فطرتاً انس پسند پیدا ہوا ہے تنہا کسی ایسی جگہ زیادہ دن تک وہ ٹھہر نہیں سکتا جہاں انس حاصل کرنے کے لئے اسی کے ہم جنس، ہم مذاق افراد کا ملنا ناممکن ہو جائے۔ ''آدمی فطرتاً مدنی الطبع ہے'' اس کا بھی مطلب یہی ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ عام سوسائٹی سے کنارہ کشی کے بعد معاشی سہولتوں کے بھی دروازے عموماً بند ہو جاتے ہیں حالانکہ سدّ رمق ہی کی حد تک سہی، جس سے جان کا رشتہ بدن کے ساتھ باقی رہے، کم از کم اس کی ضرورت ہر اس شخص کو ہوتی ہے جو فرشتہ نہیں بلکہ آدمی بنا کر دنیا میں پیدا کیا گیا ہے، اور تیسری بات تجربہ کی اس سلسلہ میں وہی ہے کہ جس کا مشاہدہ بداوت کی زندگی رکھنے والوں میں ہمیشہ کیا گیا ہے۔ قرآن میں بھی بداوت کی اسی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ذہنی پستی اس حد تک زوال پذیر ہوتے ہوئے پہنچ جاتی ہے کہ

أَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ (التوبۃ: ۹۷)

''زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں (بدوی زندگی رکھنے والے) اس امر کے کہ اللہ کی اتاری ہوئی باتوں کے حدود کو نہ پہچانیں''۔

دہ مرد دہ مرد مرد را احمق کند

مشہور بات ہے۔

تہذیب وتمدن کے ماحول سے عزلت گزینی اسی لئے ایک طرف اگر اس ماحول کے سمی اثرات اور زہریلے نتائج سے محفوظ رہنے کی ایک کارگر تدبیر ہے تو دوسری طرف اس قسم کی زندگی قدرتاً دماغ کو کند، عقل کو تاریک بناتی بھی چلتی ہے۔

آپ ان باتوں کو اپنے سامنے رکھ لیجئے اور اب غور کیجئے کہ اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر کی آیتوں میں سب سے پہلی بات تو آپ کو یہی نظر آئے گی کہ کہفی زندگی بسر کرنے والوں کو قرآن بجائے فرد واحد "فتیۃ" (یعنی نوجوانوں کی ایک ٹولی) قرار دیتا ہے۔

آپ چاہیں تو اس سے یہ نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں کہ ایمانی آزمائش کے زمانے میں جب یہ محسوس ہو رہا ہو کہ تہذیب وتمدن کے عام ماحول میں رہ کر ایمان وعمل صالح کی زندگی کے اقتضاؤں کی تکمیل میں کامیابی نہیں ہو سکتی اور نجات کی راہ یہی نظر آتی ہو کہ اس ماحول سے رشتہ منقطع کر کے بود وباش کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو اس قسم کے خبیث شیطانی ماحول سے دور ہو تو قرآن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اپنے ہم مذاق، ہم مشرب افراد کو آمادہ کیا جائے کہ اس کہفی زندگی میں ساتھ دے کر ایک دوسرے کے لئے باعث انس بھی ثابت ہوں اور ضرورت کے وقت باہم ایک دوسرے کی دست گیری وغمگساری بھی کر سکتے ہوں۔ دوسری بات قصہ کی اسی اجمالی تعبیر سے جو سمجھ میں آتی ہے وہ کہفی زندگی کا فیصلہ کرنے والوں کا یہ نقطہ نظر ہے کہ انہوں نے اس زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ہر طرف سے ٹوٹ کر اپنی پرورش کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ لو لگائی تھی، فرمایا گیا ہے کہ "فقالوا ربنا" (انہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار) جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ربوبیت اور پرورش کے جھوٹے یا مجازی مظاہر ہیں ان سے یک لخت بے تعلق ہو کر اس نئی زندگی کی راہ میں اپنے "رب صادق" اور "سچے پروردگار" کے دامن کو انہوں نے تھام لیا تھا، وہ عام اسباب کی دنیا سے کنارہ کش ہو رہے تھے لیکن جو اسباب کا محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہے وہ ان سے الگ ہو کر کیسے جی سکتا ہے؟ اس لئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے مجازی اسباب سے تو علیحدگی اختیار کی تھی لیکن جو مسبب الاسباب اور اسباب کا پیدا کرنے والا ہے اس کو پوری طاقت کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ اپنے احتیاج ان عام نتائج کے بعد درحقیقت خصوصی توجہ کے مستحق ان کی دعا کے دونوں فقرے ہیں جن کا پہلا فقرہ ہے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً

"اے ہمارے پروردگار! عطا فرما اپنے پاس سے ہمیں "رحمت"۔

اور دوسرا فقرہ یہ ہے کہ:

وَّ هَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا

"اور فراہم فرما! ہمارے معاملہ میں "رشد"

"رشد" عربی زبان کا لفظ ہے جسے قرآن میں بار بار استعمال کیا گیا ہے خصوصاً "غیّ" کے مقابلہ میں "الرشد" کے اسی لفظ کو استعمال کر کے قرآن ہی بتا رہا ہے کہ انسان کی فکری ونظری قوت سے اس کا تعلق ہے۔ یہی فکری ونظری قوت جب غلط نتیجہ تک پہنچتی ہے تو اس کا نام "غیّ" ہے اور ٹھیک اصل حقیقت تک فکر ونظر کی رسائی کی صلاحیت کا نام "رشد" ہے۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دعا کے دوسرے فقرے کا تعلق چونکہ باطنی احساسات اور معنوی رجحانات سے ہے تو مطلب اس کا یہی ہوا کہ

سوسائٹی کے گندے اور خبیث رجحانات کے مقابلہ میں جس ایمانی مسلک کی توفیق ان کو میسر آئی تھی جس کی تعبیر اَمْرِنَا کے لفظ سے دعا میں کی گئی ہے، اپنے اسی ایمان مسلک کے متعلق حق تعالیٰ سے وہ آرزو کر رہے تھے کہ کجی اور گمراہی سے بچاتے ہوئے ان کی فکر و نظر کی قوتوں میں رشد کی روشنی پیدا کی جائے یعنی ایمانی ترقی اور باطنی سلوک کی راہ میں چاہتے تھے کہ جو قدم بھی اٹھے رشد کی یہی معنوی روشنی ان کو آگے بڑھاتے ہوئے لئے چلی جائے۔ اس تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی دعا کے پہلے فقرے میں ''رحمت'' کا جو لفظ پایا جاتا ہے اس کا مطلب بھی متعین ہو جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ یوں تو رحمت اور وہ بھی رب السموٰت والارض کی قرآنا ہر چیز میں سمائی ہوئی ہے۔ رَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ (ہر شئے میں میری رحمت پھیلی ہوئی ہے) (الاعراف:۱۵۶) قرآن ہی کی آیت ہے مگر یہاں ''رحمت'' کے اس لفظ کا استعمال جب ''رشد'' کی معنوی و باطنی صفت کے مقابلہ میں کیا گیا ہے تو اس قرینہ سے یہی سمجھنا چاہیے کہ معنوی و باطنی ضرورتوں کے مقابلہ میں ان حاجتوں کے متعلق پروردگار عالم کی رحمت کی استدعا وہ کر رہے تھے جن کی تعبیر ہم ظاہری اور معاشی ضرورتوں سے کر سکتے ہیں، حاصل یہی ہوا کہ ملک کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کے بعد قدرتاً جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہی دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں یعنی معاشی ضرورتوں کا مسئلہ اور فکری و نظری قوتوں کے انحطاط و زوال کا خطرہ، الغرض ظاہر و باطن کی ان ہی دونوں اہم ضرورتوں میں حق تعالیٰ کی غیبی پشت پناہیوں کی درخواست پر ان کی یہ دعا کم از کم اس خاکسار کو مشتمل نظر آ رہی ہے۔

اس کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ ''رشد'' کی درخواست دعا کے دوسرے فقروں میں جو ان کی طرف سے پیش ہوئی ہے اگر چہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی آرزو کی تکمیل کے لئے قدرت کی طرف سے کہفی زندگی میں کیا کیا انتظامات کئے گئے تھے مگر بظاہر جہاں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایمانیوں کی یہ ٹولی ایک دوسرے کے ساتھ حق اور صبر کی تواصی کے فرض کو ادا کر کے جیسا چاہئے ان کے ''رشد'' کی حفاظت کرتی ہوگی وہیں اس پر کیوں تعجب کیا جائے کہ ایمانی راہ کے دوسرے چلنے والے جو ان سے پہلے گزر چکے تھے ان کی تعلیمات اور مشوروں سے بھی مستفید ہونے کا موقع ان کی رفتی یادگاروں سے ان کو عزلت اور کنارہ کشی کی زندگی میں مل گیا ہو بالفاظ دیگر ان کے پاس دوسرے انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں سے کچھ صحائف و مخطوطات اور ان ہی پیغمبروں کے ماننے والوں کی لکھی ہوئی کچھ کتابیں ہوں جن سے ان کی رشدی بصیرت روشنی حاصل کرتی ہو، تو اس کے انکار کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ یہ جو ''الکھف'' کے ساتھ ''الرقیم'' کے لفظ کی طرف بھی ان کی اضافت کی گئی ہے۔ تفسیر کی عام کتابوں میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف جن کے متعلق اگر چہ یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے کہ:

لا ادری ما الرقیم

''میں نہیں جانتا کہ ''رقیم'' کیا چیز ہے۔

تو ان ہی تفسیروں میں ان کا یہ قول بھی ملتا ہے، درمنثور میں ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''من طریق علی عن ابن عباسؓ قال الرقیم الکتاب''

علی کی یہ روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ''الرقیم'' ''الکتاب'' ہے۔

علی جن کا پورا نام علی بن ابی طلحہ الہاشمی ہے جو جانتے ہیں کہ ابن عباسؓ (کے تفسیری اقوال کی روایت میں ان کا کیا مرتبہ

ہے) کی تفسیر میں کتنی قوت ہے۔

بہر حال میری غرض یہی ہے کہ ''الرقیم'' سے کیا مراد ہے؟ اگر اس کا متعین کرنا ضروری ہو تو لغت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اور لکھی ہوئی چیز کو ''الرقیم'' کہتے تھے، اور صحابہؓ کے اقوال میں بھی مستند ترین قول یہی ہے کہ ''الرقیم'' سے مراد الکتاب ہے۔ ایسی صورت میں کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان کی دعا کے دوسرے فقرے یعنی اپنے امر کے متعلق ''رشد'' کی جس روشنی کے مہیا کرنے کی درخواست انہوں نے بارگاہ الٰہی میں پیش کی تھی، اسی درخواست کی منظوری ''الرقیم'' کو مہیا کر کے قدرت کی طرف سے ہوئی تھی۔

خلاصہ یہ کہ کہفی زندگی کی دونوں اہم ضرورتیں یعنی معاشی سہولتیں ان کے لئے من لدنی طور پر فراہم کی جائیں اور باطنی روشنی کی بقاوارتقا ان دونوں ضرورتوں کا انتظام اپنے رب کے سپرد کر کے کہفی زندگی میں وہ داخل ہو گئے۔ اس کے بعد قصہ کی اجمالی تعبیر میں دو فقرے اور پائے جاتے ہیں۔ پہلا فقرہ تو یہ ہے:

فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا

''پس تھپک دیا ہے ہم نے ان کے کانوں میں کہف میں چند سال گنتی کے۔''

بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ''رشد'' کی معنوی بصیرت ہی کی حفاظت کا یہ سامان بھی قدرت کی طرف سے ان کے لئے کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ فاسد اور بگڑی ہوئی سوسائٹی سے جسمانی طور پر علیحدگی عموماً اس وقت تک چنداں مفید ثابت نہیں ہوتی جب تک کہ سوسائٹی کے فساد و بگاڑ کے اس عہد کے ذکر واذکار، گپ شپ، جھوٹ، خرافات سے بھی اپنے آپ کو بے تعلق نہ کر لیا جائے۔ اس زمانے میں تو خیر اخبارات نکلتے ہیں جن میں جھوٹ کے ساتھ ساتھ کچھ سچی خبریں بھی چھپتی رہتی ہیں اور دوراز کار اور ایسے واقعات کا علم بھی پڑھنے والوں کو ان کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے جن سے شخصی نہ سہی لیکن قومی یا ملکی اغراض پڑھنے والوں کے بھی یک گونہ وابستہ رہتے ہیں اور خواہ کسی قسم کا عملی حصہ ان حوادث و واقعات کے تغیر و تبدل میں لینے کی گنجائش وہ نہ رکھتے ہوں مگر جہل کے مقابلہ میں یہی سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان واقعات کا علم تو حاصل ہو گیا اگرچہ سچی بات یہی ہے کہ اخبار خوانوں یا ریڈیو سننے والوں کی اکثریت کا خبروں کے پڑھنے اور سننے، پھر باہم ملنے جلنے والوں سے تنقید و گفتگو کرنے ''پھر موافق و ناموافق خبروں سے مسرت و الم کے تاثرات دلوں میں قدرتاً جو پیدا ہوتے رہتے ہیں ان قصوں میں سوچا جائے گا تو نظر آئے گا کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر روز اپنے عزیز اوقات کا بڑا قیمتی حصہ بلا وجہ ضائع ہوتا رہتا ہے اور اس طرح پر ضائع ہوتا رہتا ہے جس کے معاوضہ کی توقع نہ اس زندگی میں ضائع کرنے والوں کو ہوتی ہے اور نہ مرنے کے بعد آنے والی زندگی میں ان کا معاوضہ کسی شکل میں ان کے آگے آئے گا۔

پھر ذرا سوچئے ان دنوں کو جب بجائے اخبارات و جرائد کے ہر بولنے والی زبان اخبار کا ایک ورق اور سچی جھوٹی خبروں کے گھڑنے والے دماغ پریس کی حیثیت حاصل کئے ہوئے تھے۔ جس کے جی میں جو بھی آتا خبر بنا کر اسے پھیلا دیا کرتا تھا اور ایک سے دوسرے تک پھیلتے ہوئے خبریں زمین کے کناروں تک چلی جاتی تھیں۔ راہ کا ہر راہی اس سمت کا روزنامہ ہوتا تھا، جدھر سے وہ آتا تھا اپنے اپنے ہر ملنے والے کی کان میں کچھ ڈالتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا تھا۔ آج اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس راہ سے انسانی زندگی کے گرامی قدر اوقات کو شیطان کس بے دردی کے ساتھ برباد کر رہا تھا اور وقت کی بربادی تو خیر ایک منفی حالت ہے۔

ان ہی راہوں سے وساوس واوہام کے طوفان اوران کی پیدا کی ہوئی تاریکیوں اوران کی پھیلائی ہوئی گندگیوں کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ فلسفہ اور حکمت، شعریت وخطابت، اور کیا کیا بتایا جائے کن مدہش اور مہیب ناموں سے انسانی دل ودماغ کو مرعوب کرنے کی کوشش ان ہی ابلیسی بوالہواسیوں کی راہ سے نہیں کی گئی یا نہیں کی جارہی ہے۔

اوروں کا خیال کچھ ہی ہو لیکن اپنا تجربہ تو یہی ہے کہ ''رشد'' و ''ہدایت'' کی لاہوتی روشنی سے صحیح طور سے استفادہ ان لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہے جنہوں نے اسی ''روشنی'' کے ساتھ ان ظلمات اور تاریکیوں کی موجوں کو بھی اپنے اندر گزرنے کے لئے آزادی دے رکھی ہو، جو فاسد سوسائٹی کے دل ودماغ سے نکل نکل کر ماحول کو متاثر کر رہی ہوں۔

کچھ بھی ہو، اپنا ذہن تو مذکورہ بالا آیت جس میں فرمایا گیا ہے کہ چند سال کیلئے ان کے کانوں کو ہم نے تھپک دیا تھا۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا

اس سے ادھر منتقل ہوتا ہے کہ رشد کی جس روشنی کی فراہمی کی استدعا بارگاہ ربانی میں ان لوگوں نے پیش کی تھی اسی کے سلسلہ میں اور جو قدرتی تائیدیں ان کو میسر آئی ہوں گی ان ہی کے ساتھ شاید یہ بھی کیا گیا کہ اپنے ملک کی سوسائٹی کے جس متعفن اور سڑے ہوئے ماحول سے نکل کر کھلی زندگی کے نیچے انہوں نے پناہ لی تھی۔ اس سوسائٹی میں گزرنے والے حوادث وواقعات اور اس میں پیدا ہونے والے گندے افکار وخیالات سے بھی ان کے کانوں کا رشتہ توڑ دیا گیا تھا اور بجائے اس کے کھلی زندگی میں ان کے ''رشد'' کی بقا اور ارتقاء کا جو سامان پیدا کیا گیا تھا اسی میں وہ مگن تھے۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اسی سے

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا

پھر ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ ہم جانیں (یعنی اس علم کو ظاہر کر دیں) کہ دونوں فریق میں سے کسی نے اس مدت کا احصا کیا جس میں وہ غار میں ٹھہرے۔''

قرآن کی اس آیت کا مطلب بھی با آسانی سمجھ میں آجاتا ہے جس پر قصہ کی اجمالی تعبیر کو قرآن نے ختم کیا ہے۔

صرف ایک لفظ یعنی ''احصی'' سے کیا مراد ہے؟ اس کو طے کر لیجئے بات انشاء اللہ آپ کی سمجھ میں بھی آجائے گی۔ یوں تو ''حصی'' کے مادہ سے ماخوذ ہے، شمار کرنا اور گننا جس کا ٹھیٹ لغوی ترجمہ ہے، عام مترجمین نے یہی ترجمہ درج بھی کیا ہے لیکن بجنسہ یہی ''احصی'' ماضی کا صیغہ ''اسماء حسنیٰ'' والی مشہور حدیث میں بھی استعمال کیا گیا ہے لغت حدیث کی کتاب ''نہایہ'' میں ابن اثیر نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اطاق قيام حقها و اطاق العمل بمقتضا ها."

''(اسماء حسنیٰ کا جو حق تھا) اس حق کو ادا کیا اوران کا جو مقتضی تھا اسے پورا کیا۔''

راغب نے بھی ''مفردات'' میں قرآنی الفاظ ''لن تحصوہ'' کو درج کر کے کی قراءت سے اس کی شرح کی ہے، پھر حدیث:

نفس تنجیها خیر لک من امارة لا تحصیها

''اپنی جان لے کر پار نکل جانا یہ تمہارے لئے اس امارت اور افسری سے بہتر ہے جس کے حقوق سے تم عہدہ برآنہ ہو۔''

سے بھی ''احصی'' کے اس مطلب کو سمجھنا چاہا۔ ارباب تحقیق کی ان شہادتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سورہ کہف کی اس آیت کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ جو مدت اس عرصہ میں گزری، اس زمانہ کی جو قدر و قیمت تھی اس کو ان دونوں فریق میں سے کون صحیح معنوں میں حاصل کر سکا؟ یعنی ملک کی عام سوسائٹی سے الگ ہو کر کہفی زندگی جن لوگوں نے اختیار کی تھی وہ اپنے وقت کی صحیح قیمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے یا فاسد اور گندی سوسائٹی میں جو گھلے ملے رہے انہوں نے اپنے وقت کو ضائع ہونے سے بچایا۔

ظاہر ہے کہ اس راہ میں وہی یقیناً کامیاب رہے جنہوں نے وقت کی فاسد سوسائٹی اور اس کے گندے ماحول کے حوادث وسوانح اور پیدا ہونے والے افکار و خیالات سے الگ تھلگ رہ کر ہر چیز سے کان کو بند کئے ہوئے ''رشد'' کی روشنی میں کہفی زندگی کی اس مدت کو گزارا تھا۔ آخر یہ مطلب اگر نہ لیا جائے تو یہ بات کہ کہفی زندگی کی یہ مدت جنتری کے حساب سے کتنی تھی؟ اس کے جاننے یا نہ جاننے کو اہمیت اس موقع پر کیا تھی؟ جسے قرآن ان کی کہفی زندگی کا آخری نتیجہ قرار دے رہا ہے۔

بہر حال اصحاب کہف کے قصہ کی اجمالی تعبیر سے قرآن کی جن آیتوں کا تعلق ہے ان سے تو صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ نا موافق حالات پر غالب آنے یا ان سے مقابلہ کرنے کا امکان جب محسوس ہو کہ باقی نہیں رہا ہے تو اس وقت ایمان و عمل صالح کی زندگی کے بچا لینے کی تدبیر یہ ہے کہ کہفی زندگی اختیار کر لی جائے اور یہ کہفی زندگی میں معاشی دشواریوں کے ساتھ فکری جمود اور ذہنی خمود کا خطرہ قدرتاً جو پیدا ہوتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے کہ حق تعالیٰ سے ان دونوں خطروں سے محفوظ رہنے کی دعا کی جائے اور یہ وہی مشورہ ہے جس کی طرف ان صحیح حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں آیا ہے کہ ایسا وقت بھی آنے والا ہے جس میں القاعد، بیٹھنے والا القائم (کھڑا رہنے والا) سے اور الماشی، معمولی چال چلنے والا الساعی (دوڑنے والے) سے بہتر ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اس زمانہ میں بجائے میدان میں آنے کے چاہئے کہ مومن اپنے گھر کا ٹاٹ بن کر پڑ جائے۔ بخاری کی مشہور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یوشک ان یکون خیر مال المسلم غنم یتبع بها شعف الجبال و مواقع القطر یفر بدینه من الفتن.[1]

''قریب ہے کہ مسلمانوں کا بہترین مال بکریاں ہوں گی جن کے پیچھے پیچھے پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کے چشموں کی طرف اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لئے بھاگا پھرے گا۔''

حدیث کا مفاد بھی یہی ہے۔[2]

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، ابی عبد اللہ، صحیح البخاری، کتاب الفتن باب التعرب فی الفتنة [۷۰۸۸]، ص ۱۲۲۲، مکتبة دار السلام، الطبعة الثانیة ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ

[2] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۱۱۔۱۲۰

آیت: ﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى O وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا﴾ (الکہف: ۱۴،۱۳)

''ہم تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں (ان کہف والوں) کی خبر کو حق کے ساتھ (یہ کہف والے) چند نوجوان تھے ایمان لے آئے تھے وہ اپنے رب پر اور ہم نے ہدی (یعنی راست بینی اور حق یابی) میں ان کو بڑھا دیا اور باندھ دیا ہم نے ان کے قلوب پر یعنی دلوں پر (اور دیکھو) جب وہ کھڑے ہوئے، پھر بولے ہمارا پالنے والا آسمانوں اور زمین کا پالنے والا ہے ہرگز نہیں اس کے سوا ہم کسی الہ کو پکاریں گے اگر ایسی بات ہم نے کہی تو (حقیقت سے) یہ ہٹی ہوئی بات ہوگی۔''

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ.

''ہم تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں (ان کہف والوں) کی خبر کو حق کے ساتھ''

حق کے ساتھ، یہ ایک قرآنی محاورہ ہے اور مختلف مقامات معانی میں استعمال کیا گیا ہے، یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ قصہ صرف برائے قصہ نہیں سنایا جائے گا بلکہ سنانے کا مقصد یہ ہے کہ اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگ اس قصہ سے حصہ حاصل کریں، آگے اسی قصہ کی تفصیلی تعبیر شروع ہوئی ہے، پہلی خبر اس سلسلہ میں یہ دی گئی ہے کہ:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ

''(یہ کہف والے) چند نوجوان تھے، ایمان لے آئے تھے وہ اپنے رب پر۔''

''اپنے رب پر ایمان لانا'' یہی ان نوجوانوں کا اختیاری فعل تھا۔ چاہتے تو جیسے ان کی قوم کی اکثریت اپنی اس پرورش کرنے والی قوت سے لاپروائی اور بے اعتنائی کا طریقہ اختیار کئے ہوئے زندگی گزار رہی تھی، وہ بھی اسی طریقہ کو اختیار کر لیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنے رب کی یافت کا جو قدرتی طریقہ ایمان کا ہے اس کا رشتہ ''رب'' سے قائم کر کے مومن بن گئے، یہاں تک تو ان کا کام تھا جسے ان نوجوانوں نے انجام دیا، اب سنئے اسی ایمان کا اجر حسن ان کے سامنے کن کن شکلوں میں مسلسل آتا چلا گیا، اس کے بعد اطلاع دی گئی ہے۔

وَزِدْنٰهُمْ هُدًى

''اور ہم نے ہدی (یعنی راست بینی اور حق یابی) میں ان کو بڑھا دیا۔

سمجھا آپ نے یہ کیا کہا گیا؟ نوجوانوں نے اپنے رب پر ایمان لانے کے فرض کو پورا کیا تھا، تب اس کا معاوضہ اور اجر حسن ان کو انکے رب کی طرف سے ایک معنوی دولت اور باطنی نعمت کی شکل میں عطا کیا گیا، یعنی باہر میں تو بظاہر کسی قسم کی کوئی ایسی چیز ان نوجوانوں کے سامنے نہیں آئی جسے دیکھنے والے ان کے ایمان کا اجر و معاوضہ قرار دیتے لیکن اندر ہی اندر ان کی بصیرت کی روشنی میں قدرت کی طرف سے اضافہ شروع ہوا۔ ایمان سے پہلے جن باتوں کا تصور بھی ان کے لئے دشوار بلکہ شاید ناممکن تھا ان ہی کو وہ پا رہے تھے اور قدرت کی پیدا کی ہوئی اس معنوی روشنی میں ان ہی کو وہ دیکھ رہے تھے تا ایں کہ باطنی سلوک کی اس راہ میں چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام تک پہنچ گئے جس کی خبر قرآن سے اسی کے بعد ان الفاظ میں دی ہے، فرمایا گیا ہے:

وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

''اور باندھ دیا ہم نے ان کے قلوب پر یعنی دلوں پر''

''قلوب'' قلب کی جمع ہے۔ یہ وجود انسانی کے اس عنصر کی تعبیر ہے جس کا کام ہی انقلاب ہے، یعنی یہ کہ الٹنا پلٹتا رہے۔ یہی ہے لامحدود اسباب کا یہ گھنا جنگل جس کا نام عالم یا دنیا ہے۔ اس عالم کے رب سے جب تک انسانی وجود کا یہ چنچل حصہ بیگانہ اور نا مانوس رہتا ہے، اس وقت تک بجز اس بات کے کہ ایک سبب سے منتقل ہو کر دوسرے سبب اور دوسرے سے تیسرے سبب کی وادی میں سراسیمہ ہو کر بھٹکتا رہے، بلکہ سراسیمگی وحیرانی وسرگردانی میں جس کی حرکت جتنی زیادہ تیز ہوتی ہے وہی رب پر ایمان سے محروم رہ جانے والی مجلسوں میں ستایش اور شاباشی کا زیادہ مستحق ٹھہرایا جاتا ہے۔

لیکن ایمان کی راہ سے اپنی پرورش کرنے والی قوت کو جو پالیتے ہیں اور اس ایمان کے معاوضہ میں معنوی بصیرت کی جو روشنی ان کو رب کی طرف سے ارزانی ہوتی ہے اس باطنی روشنی کی شدت جس حد تک بڑھتی جاتی ہے اسی حد تک ان کے آگے اصل حقیقت اور ''ربوبیت'' کا صادق نظارہ بے نقاب ہونے لگتا ہے تا ایں کہ وہی ''قلب مضطرب'' یا انسانی وجود کا ''بے چین عنصر'' قلب، سکون وقرار کے ایسے خنک برف خانے میں اپنے آپ کو پاتا ہے جس کی صحیح تعبیر یہی ہوسکتی ہے کہ ہر طرف سے توڑ کر اسی قلب کو ''ربوبیت'' کے حقیقی سرچشمہ کے ساتھ گویا باندھ دیا گیا ہے۔

طمانیت وسکون کی اسی کیفیت کو لوگ روپے کے ڈھیروں، بینک کے پاس بکوں اور سرمایہ کی دوسری منقولہ وغیر منقولہ جائیدادوں کے اندر ڈھونڈھتے ہی رہتے ہیں لیکن اپنے رب کے ساتھ قلب کے مربوط ہو جانے کی مذکورہ بالا باطنی نعمت سے جو سرفراز کیا جاتا ہے اس کے پاس باہر میں خواہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اپنے باطن کو ہر چیز سے کسا کسایا جاتا ہے، دماغ نام رکھئے یا دل، عقل کہئے یا دانش، ڈانواڈول رہنے کی لعنت سے اس کو نجات مل جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے اقدامات کی جرات اس میں پیدا ہو جاتی ہے جن کو رب سے ٹوٹے ہوئے غیر مربوط قلب والے شاید سوچ بھی نہیں سکتے خود ان ہی یعنی نوجوانوں کے متعلق آگے ان کے قصہ کی تفصیلی تعبیر میں جو یہ خبر دی گئی ہے کہ:

﴿اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا﴾

''(اور دیکھو) جب وہ کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا پالنے والا آسمانوں اور زمین کا پالنے والا ہے۔ ہرگز نہیں اس کے سوا ہم کسی الٰہ کو پکاریں گے اگر ایسی بات ہم نے کہی تو (حقیقت سے) یہ ہٹی ہوئی بات ہوگی۔''

ہدایت کی باطنی روشنی جوان میں بڑھائی گئی تھی اسی روشنی میں انہوں نے پایا کہ ہماری پرورش جو قوت کر رہی ہے وہی پالنے والی قوت آسمانوں اور زمین (اور ان دونوں میں رہنے والی ہستیوں کی) بھی پروردگار ہے، وحدانی ربوبیت کے اس جلوے نے ان کے لئے آبادی اور بن دونوں کو ایک کر دیا۔ ان کی قوم جو ایمان اور ایمان سے پیدا ہونے والی اس بصیرت سے محروم تھی ان کے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لامحدود کثرتوں کے اس نظام کی ربوبیت و پروردگاری کے لئے صرف ایک ہی ''رب'' کیسے کافی ہوسکتا ہے، اسی لئے ایک خالق کے وجود کو ربوبیت اور پروردگاری کے لئے ناکافی ٹھہراتے ہوئے انہوں نے دوسری ہستیوں کے ساتھ وہی رشتہ قائم کر لیا تھا جو رشتہ بندوں اور ان کے معبود میں ہوتا ہے یعنی ان سے مدد حاصل کرنے کے لئے ان کی عبادت کرتے تھے، ان سے دعائیں مانگتے تھے، ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے نوجوانوں کی یہ ٹولی اپنی باطنی روشنی میں خالق عالم کی پروردگاری کو پا رہی تھی کہ کافی ہے اور قطعاً کافی ہے اور ان کی قوم اسی ربوبیت اور پروردگاری کے لئے مزید قوتوں کا اضافہ کر رہی تھی۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۲۲۔۱۲۵

آیت: ﴿ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ ﴾ (الکھف:۱۵)

''اس ہماری قوم نے (خالق عالم) کے سوا دوسروں کو اپنا معبود ٹھہرالیا ہے، کیوں نہیں لاتی (اپنے اس دعویٰ پر کوئی ایسی کھلی ہوئی دلیل جو عقل پر چھا جائے۔''

علم مناظرہ کی اصطلاح میں نوجوانوں کی حیثیت منکر کی تھی، اور مدعی ہونے کا مقام ان کی قوم کو حاصل تھا، مسلم بات ہے کہ بار ثبوت ہمیشہ مدعی کے سر ہوتا ہے منکر کے لئے انکار کافی ہے اسی لئے نوجوانوں نے کہا، قرآن نے نقل کیا ہے کہ وہ بولے:

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَوْ لَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ (الکھف:۱۵)

''دلیل'' جو عقل پر چھا جائے'' یہی سلطان کے لفظ کا گویا ترجمہ ہے، سلطان کے ساتھ انہوں نے بین'' کے لفظ کا اضافہ کیا ''کھلی ہوئی'' ہے، بظاہر ان کا مطلب یہ تھا کہ جھوٹے سچے قصے، پرانی روایتیں اوہامی وساوس کی پشت پناہی میں مشرکانہ اعمال و افعال کو جاری رکھنا، یہ دوسری بات ہے کوئی ان کو ''دلیل'' یا ''سلطان'' ٹھہرالے تو یہ اس کی ذاتی اصطلاح ہوگی لیکن ایسی کھلی دلیل جو اپنے وزن سے عقل کو اتنا مغلوب کر دے اور دبا دے کہ دعویٰ کا انکار اس کے لئے ناممکن ہو جائے۔ مشرکین کا طبقہ اپنے اعمال و افعال کی جو توجیہ میں پیش نہیں کرسکتا، کیونکہ اس قسم کی دلیل جو صحیح معنی میں ''سلطان بین'' ہو۔ اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں یا ایسے مقدمات سے وہ دلیل مرتب ہوئی ہو جن کی بنیاد مشاہدات ومحسوسات پر قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ ''ربوبیت'' یا پروردگاری میں خالق عالم کے سوا کوئی دوسری قوت بھی شریک ہے، اس کی تائید میں مشاہدات ومحسوسات سے کیا مدد مل سکتی ہے؟ دوسری صورت یہ ہے کہ خالق عالم نے وحی کے ذریعہ سے جو باتیں منکشف فرمائی ہیں جن کا اصطلاحی نام ''منصوصات'' ان پر دلیل مبنی ہوتو مشرک قومیں وحی و الہام کی معلومات سے بھی یقیناً فائدہ حاصل نہیں کرسکتیں، کیونکہ جو ذخیرہ وحی والہام کی معلومات کا دنیا میں موجود ہے اس میں کوئی تائیدی شہادت مشرکانہ کاروبار کے لئے میسر نہیں آسکتی۔ آگے ان ہی نوجوانوں کی تقریر کا یہ فقرہ قرآن نے جو نقل کیا ہے یعنی:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (الکھف:۱۵)

''اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے''

بہ ظاہر اس فقرے سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مشرک اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اللہ ہی نے اس کو مشرکانہ کاروبار کا حکم دیا ہے، یہ خدا پر افترا ہوگا، اور خدا پر جھوٹ باندھنے والوں سے زیادہ بڑا ظالم اور کون ہوسکتا ہے، خلاصہ یہ کہ خالق عالم کی پروردگاری کو ناکافی ٹھہراتے ہوئے دوسری قوتوں کو الٰہ بنانے کی ضرورت کا دعویٰ جو مشرکین کرتے ہیں۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں نہ کوئی عقلی دلیل ہی وہ پیش کرسکتے ہیں اور نہ وحی والہام کی معلومات سے اس سلسلہ میں ان کو کوئی مدد مل سکتی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۲۵۔۱۲۶

آیت : ﴿وَ اِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَ مَا یَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاۡوٗۤا اِلَی الۡكَهۡفِ یَنۡشُرۡ لَكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَ یُهَیِّئۡ لَكُمۡ مِّنۡ اَمۡرِكُمۡ مِّرۡفَقًا﴾ (الکھف:۱۶)

''اور جب تم لوگ (اے نوجوانو) کنارہ کش ہو گئے ان سے (یعنی اپنی قوم سے) اور ان چیزوں سے جنہیں اللہ (خالق عالم) کے سوا وہ پوجتے ہیں تو آؤ پناہ لو کہف (کھوہ) میں کھول دے گا تمہارے لئے تمہارا پروردگار اپنی رحمت کو اور مہیا کرے گا تمہارے معاملہ میں سہولتیں۔''

اپنی پوری قوم جن میں ان کے اعزہ ورشتہ دار بھی ہوں گے، وہ بھی ہوں گے جن سے معاشی ضرورتوں کے حل میں ان کو امداد ملتی ہوگی، دوست ہوں گے، احباب ہوں گے مگر ایمان کی بدولت اسی کا اجر و معاوضہ ان کو اس بلند ہمتی کی شکل ملا کہ اپنی تمام ضرورتوں اور دلچسپیوں کے ساز و سامان کو ٹھکرا کر اٹھ کھڑے ہوئے ان کو بھی چھوڑا اور جن مفروضہ معبودوں کے ساتھ ان کی قوم بلا وجہ الجھی ہوئی تھی، ان سے بھی قطعی بے تعلق ہو کر اب ان میں اس کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی کہ آبادی کو چھوڑ کر پہاڑ کے کھوہ میں بھی اپنے پالنے والے رب کی پروردگاری کا تماشا دیکھیں۔ ان کی اسی صلاحیت کو دیکھ کر ایک نے دوسرے کے سامنے (الکہف) کھوہ کی تجویز پیش کی اور کتنی قوت، کتنی طاقت کے ساتھ پیش کی، بغیر کسی جھجک اور تذبذب کے باہم ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ آبادیوں میں پالنے والے رب کی پروردگاری اور اس کی مہربانیوں کا تجربہ ضرور ضرور وہاں بھی ہم کو کرایا جائے گا جہاں عالم اسباب کے چکروں میں پھڑ پھڑانے والی عقل ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ گویا وہ کہہ رہے تھے جہاں کچھ نظر نہیں آ رہا ہے وہیں سب کچھ تمہیں میسر آئے گا۔

قصہ کی اجمالی تعبیر میں تو ان کی دعا کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن یہاں ان کے ایمان کے بعد اس یقین و اعتماد کی قرآن خبر دے رہا ہے جس سے اپنے رب پر ایمان لانے کے بعد وہ سرفراز ہوئے تھے، سچ پوچھئے تو یہ بھی ایمان ہی کے اجر حسن اور اچھے معاوضہ کا ایک قالب تھا جو دوسرے معاوضوں کے ساتھ ساتھ قدرت کی طرف سے ان کو عطا ہوا تھا، ایمان سے محروم، بد بخت، بے ایمان، شک کے روگی، غریب کو اس یقین، اس اذعان و اطمینان کی ہوا بھی چھو سکتی ہے؟ اور جیسے قصہ کی اجمالی تعبیر میں ان کی دعا دو اجزاء پر مشتمل تھی، ایک کا تعلق جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا تھا بہ ظاہر معاشی سہولتوں سے معلوم ہوتا ہے اور دوسرے جز میں استدعا کی گئی تھی کہ رشد یا فکری و ذہنی سوجھ بوجھ کی حفاظت کی جائے۔ اسی طرح قصہ کی تفصیلی تعبیر میں بھی بجائے ایک کے دو چیزوں کی فراہمی کا یقین باہم ایک دوسرے کو دلا رہے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی ان دونوں اجزاء سے وہی دو باتیں مراد نہ ہو جن کی آرزو اپنی دعا میں انہوں نے کی تھی۔

بہر حال اس وقت تک تو اصحاب کہف کے ایمان کا اجر وصلہ ان کے اندر پیدا ہو ہو کر ان کی تقویت و حفاظت کا ذریعہ بنتا رہا اور اسی کی پشت پناہی میں ایک ایسی جگہ کو چھوڑ کر جوان کا وطن مالوف تھا اور جیسا کہ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ المدینہ یا ایسا شہر تھا جس کے بازاروں میں ''از کی طعاما'' (صاف ستھرا کھانا) خریداروں کو مل جاتا تھا اور بیان کرنے والوں کا یہ بیان اگر صحیح ہے کہ یہ ایشاء کو چک کی قدیم حکومت ایونیا کا مشہور پایہ تخت افسیس تھا۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہاں سب کچھ مل رہا تھا جس کا آدمی اپنی موجودہ زمینی زندگی میں محتاج ہے لیکن سب کچھ چھوڑ کر جہاں کچھ نہ تھا وہیں جانے کے لئے اس یقین کے ساتھ آمادہ ہو گئے کہ سب کچھ وہیں مل جائے گا، وہ بھی جس کے بغیر جسدی نظام قائم نہیں رہ سکتا، اور وہ بھی جس کے بغیر آدمی کی روحانی زندگی موت بن جاتی ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۲۷۔۱۲۹

آیت: ﴿وَ تَرَی الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ کَهْفِهِمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِیْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا﴾ (الکہف:۱۷)

''اور دیکھتا ہے تو آفتاب کو جب طلوع ہوتا ہے تو کترا کر گزرتا ہے ان کے کہف سے داہنی طرف اور جب غروب ہوتا ہے تو کاٹتا ہے بائیں طرف اور وہ لوگ (مقیم ہیں) اسی کہف کے فجوہ میں، یہ ہے اللہ کی نشانیوں سے جس کو دکھائے راہ اللہ وہی راہ پانے والا ہے، اور جسے اللہ گمراہ کردے تو ہرگز نہ پائے گا اس کا کوئی پشت پناہ راہ بتانے والا۔''

دیکھ رہے ہیں آپ ایمان کے اجر حسن کو! جس کوہستانی ٹاپو میں سر چھپانے کا سوال بھی بڑا اہم سوال تھا وہیں پہنچنے کے بعد قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہترین صحت بخش سائنٹفک آرام گاہ ان نوجوانوں کو مل گئی۔

سرسری طور پر اگرچہ قرآن کے مذکورہ بالا بیان کا خلاصہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ایک غار میں وہ چلے گئے تھے جس میں دھوپ کی گزر نہ تھی۔

افسوس ہے کہ میری طوالت بیان سے لوگ گھبرا اٹھے ہیں، ورنہ قرآنی الفاظ پر جی چاہتا تھا کہ سیر حاصل بحث کرتا۔ تاہم اتنا تو بہر حال لوگوں کو سوچنا چاہئے تھا کہ کہف بھی عربی ہی زبان کا لفظ ہے اور غار بھی، قرآن نے بجائے غار کے کہف کا لفظ یہاں کیوں استعمال کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ کہف کا تعلق بھی اس میں شک نہیں کہ عموماً پہاڑوں ہی سے ہوتا ہے جیسے غار کا، لیکن اپنی حقیقت کے لحاظ سے یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ حرا یا ثور کے تاریخی غار بلاشبہ غار تھے، جن میں بہ مشکل چند آدمیوں کے لئے گنجائش پیدا ہوتی ہے اسی لئے ثور کے غار کو قرآن نے بھی غار ہی کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن ان ہی پہاڑوں کی شکم میں خاص قسم کا خلا قدرتی عوامل کے تحت پیدا ہو جاتا ہے جس کی وسعت کبھی میلوں کی ہوتی ہے، جنوبی ہند میں ''بیجا نگر'' کی راجدھانی جن پہاڑوں کے درمیان تھی ان میں بیان کیا گیا کہ ایسے قدرتی طویل تہ خانے پائے جاتے تھے جن میں ہزارہا ہزار آدمی غائب ہو جاتے تھے اور مہینوں ان ہی میں رہتے، کھاتے پیتے تھے۔ اس قسم کے کہوف دنیا کے دوسرے پہاڑوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

عربی زبان میں کہف دراصل ان ہی زیر زمین طویل و عریض تہہ خانوں کو کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اسی کہف میں فجوہ تھا جسے ان نوجوانوں نے اپنا مسکن بنایا تھا، فجوہ کے لغوی معنی کو پیش نظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ باضابطہ وسیع حال یا دالان ہی ان کو اپنے قیام کے لئے اس جبلی تہہ خانہ میں مل گیا تھا، اس قسم کے زیر زمین تہہ خانوں میں سب سے بڑی مصیبت تاریکی، رطوبت، ٹھنڈک اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی کثافت اور جراثیم کی ہوتی ہے۔ یہ ان کے ایمان ہی کے اجر حسن کا نتیجہ تھا کہ ان سارے مضرت بخش خطرات کے ازالہ کی ضمانت جس چیز میں پوشیدہ ہے یعنی آفتاب کا آتشیں کرہ، اس کے متعلق قرآن کا بیان ہے کہ ایک خاص قسم کا تعلق قدرتی طور پر اس کو اس کہف سے پیدا ہو گیا تھا، طلوع و غروب کے وقت آفتاب اور اس کی شعاعوں کی دو مختلف نسبتیں جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے روزانہ قائم ہوتی تھیں۔ طلوع کے وقت بیان کیا گیا ہے کہ خود کہف کے ساتھ تزاور کی نسبت پیدا ہوتی تھی یعنی اس کہف سے آفتاب کترا جاتا تھا لیکن چونکہ عن کے ساتھ تزاور کی نسبت کو قرآن نے ظاہر کیا ہے اس سے عربی محاورے کی رو سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تعلق پیدا ہونے کے بعد آفتاب اور اس کی دھوپ اس کہف سے گزر جاتی تھی۔ میرا خیال یہی ہے کہ جس وقت آفتاب طلوع ہوتا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہف کے دہانے پر اس کی شعاعیں پڑ کر گزر جاتی تھیں، حاصل

یہی ہے کہ دیر تک دھوپ ان کے کہف میں نہیں ٹھہرتی تھی بلکہ رات کی تاریکی کی وجہ سے رطوبت و برودت اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو صاف کر کے گزر جاتی تھی۔ چاہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ طلوع کے وقت کہف کے لئے اور کہف والوں کے لئے آفتاب کی بالائے بنفشی شعاعوں سے استفادہ کا موقع فراہم کیا گیا تھا برعکس اس کے جس وقت آفتاب غروب ہونے لگتا تھا تو قرآن نے کہف کے ساتھ نہیں بلکہ اصحاب کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ آفتاب ان کو کاٹ جاتا تھا۔ یہاں عن کا صلہ نہیں ہے، جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ کہف والے غروب کے وقت کی دھوپ سے کلیتہً محفوظ رہتے تھے، جس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ غروب سے پہلے دن بھر دنیا دھوپ سے گرماتی رہتی ہے اسی لئے شام کی دھوپ نہ مرغوب ہی ہوتی ہے نہ مفید۔ تاہم ایک نکتہ یہاں بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ غروب کے وقت سے بےتعلقی کو قرآن نے کہف کی طرف نہیں بلکہ براہ راست اصحاب کہف کی طرف منسوب کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود کہف میں غروب کے وقت کچھ نہ کچھ دھوپ پہنچتی تھی لیکن فجوہ (یا کمرے) میں اصحاب کہف مقیم تھے وہاں تک اس کی رسائی نہ تھی اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کہف دور خا تھا، ایک رخ اس کا بظاہر سمت جنوب مائل بمشرق تھا اور دوسرا سمت شمال مائل بہ مغرب رخ تھا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو شمال و جنوب کے ساتھ غروب و طلوع کے وقت آفتاب کے ساتھ نسبت اور تعلق کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، بلکہ اسی دنیا پر میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ کہف میں کھلا ہوا تھا۔ گویا یوں روزانہ آفتابی شعاعوں اور ہوائی لہروں سے کہف کی صفائی کا کام قدرت لے رہی تھی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ان غریب نوجوانوں کے گھر شہر کے کس حصہ میں تھے، اور صحت و راحت کے لحاظ سے اس محلہ کی کیا حالت تھی، لیکن دیکھئے قرآن دکھا رہا ہے کہ ان کے ایمان نے اسی بیابان میں جہاں سر چھپانے کا نظم بھی دشوار تھا، گویا ایک ہائی جینک صحت بخش (قیام گاہ) کا مفت بغیر کسی کرایہ کے انتظام کر دیا، آگے اسی کے بعد فرمایا گیا ہے:

ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَلَہٗ وَ لِیًّا مُّرْشِدًا

''یہ ہے اللہ کی نشانیوں سے جس کو دکھائے راہ اللہ وہی راہ پانے والا ہے، اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو ہرگز نہ پائے گا اس کا کوئی پشت پناہ اور راہ بتانے والا۔''

جس کا مطلب میری سمجھ میں تو (واللہ اعلم بالصواب) یہی آتا ہے کہ ''ایت اللہ'' (اللہ کی نشانیوں) کو پا کر جو اللہ کو پاتا ہے، اور خدا کے ان ہی پتوں کو پڑھ کر خدا پر ایمان لاتا ہے، اس کے نزدیک سب کچھ ''اللہ'' ہی ہوتا ہے، جہاں اللہ ہے وہی یقین رکھتا ہے کہ اللہ اپنی آیتوں کو بھی ظاہر کرے گا، جیسے کہف والوں نے اللہ پر ایمان لا کر دیکھا کہ جہاں سر چھپانے کے سامانے کی بھی توقع نہ تھی وہیں ان کے لئے اللہ نے ان کے رہنے سہنے کا معقول نظم کر دیا۔ مگر یقین کی یہ کیفیت ایمان کے معاوضہ میں ارزانی ہوتی ہے، مومن کو خدا اس کے ایمان کا یہ اجر دیتا ہے کہ ہدایت کی راہ اس پر کھول دیتا ہے، لیکن اللہ سے بے گانہ اور بے تعلق ہو کر جو صرف آیات اللہ کی زنجیروں میں الجھے ہوئے ہیں وہ اپنی بے ایمانی کی یہ سزا بھگتتے رہتے ہیں کہ آیات اللہ سے ان کا ذہن اللہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ وہ آیات اللہ یا اسباب کے جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں، ایسوں کو تو اولاً پشت پناہ ہی نہیں ملتا اور پشت پناہ ہی کسی کی مل بھی جائے تو صحیح راہ کی طرف راہ نمائی کرنے والے مرشد سے تو وہ ہمیشہ محروم ہی رہتے ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ ایمان کی راہ سے ہٹ کر جو زندگی گزار رہے ہیں، حالانکہ بڑے بڑے مفکرین، ارباب نظر و فلسفہ کی کتابیں وہ پڑھتے ہیں، لیکن بجائے پانے کے صحیح راہ سے دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب تک اللہ سے توڑ کر ''آیات اللہ'' کا مطالعہ کیا جائے گا یہ لعنت آدمی پر مسلط رہے گی۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۲۹۔۱۳۲

آیت: ﴿وَ تَحْسَبُهُمْ اَیْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَیْهِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ (الکھف:۱۸)

''اور تم خیال کرو گے کہ وہ بیدار ہیں، حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں، اور ہم ان کو الٹتے پلٹتے رہے، دائیں اور بائیں پہلو پر کتا ان کا دونوں ہاتھوں کو پھیلائے در پر (کہف کے) پڑا ہوا تھا اگر تو ان کی طرف جھانکے تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور بھر جائے تو رعب سے ان کو دیکھ کر۔''

اس قرآنی آیت میں اطلاع دی گئی ہے کہ ان پر نیند طاری ہوئی، عجیب و غریب نیند، ایک طرف تو اس کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ جاگ رہے ہیں، اور دوسری طرف اسی نیند کا ایک پہلو یہ بھی قرآن ہی نے اسی کے بعد بیان کیا ہے:

﴿وَ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾

''اور ہم ان کو الٹتے پلٹتے رہے، دائیں اور بائیں پہلو پر۔''

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ایسی گہری نیند ان پر طاری ہوئی تھی کہ نیند میں بھی تھوڑا بہت احساس یا اختیار کروٹ بدلنے کا آدمی میں جو باقی رہتا ہے اس اختیار سے بھی وہ قطعی طور پر خالی ہو چکے تھے اور کروٹ بدلنے کا انتظام براہ راست قدرت کی طرف سے کیا گیا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس گہری نیند کی مدت کتنی تھی۔ قرآن میں قصہ کو ختم کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ تین سو نو سال تک اس کہف میں ان کا قیام رہا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان کے قیام کی مدت ہے نہ کہ نیند کی۔ بہر حال اتنی بات تو ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ان پر گہری نیند طاری ہوئی اور اسی نیند کی بدولت جب تک وہ سوتے رہے کھانے پینے کی ضرورت سے بے نیاز رہے۔ البتہ ایک ایسی جگہ جہاں وہ سوئے تھے نیند کی حالت میں طرح طرح کے خطرات کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ موذی حشرات الارض یا درندے یا چور وغیرہ جیسی چیزوں کا اندیشہ غالباً ان ہی خطرات سے حفاظت کے لئے یہ کہا گیا کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں، اسی کے ساتھ جیسا کہ قرآن ہی میں ہے:

﴿وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ﴾

''کتا ان کا دونوں ہاتھوں کو پھیلائے در پر (کہف کے) پڑا ہوا تھا۔''

اور یہ بھی کتے کے جاگنے کی ہیئت ہے، دیکھنے والوں کو گویا معلوم ہوتا تھا کہ کتا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ ان سب کے سوا ان کے ایمان کا اجر حسن ایک یہ بھی تھا کہ جس کی قرآن نے تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ:

﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَیْهِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾

''اگر تو ان کی طرف جھانکے تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور بھر جائے تو رعب سے ان کو دیکھ کر'' اسی ''ایمانی اجر'' کی روحی تعبیر

ہے۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست　　ہیبت آن مرد صاحب دلق نیست

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزیدا　　ترسداز وے جن انس و ہر کہ دید

واقعہ یہ ہے کہ بے ایمانوں کی عقل ایمانی معاوضوں کے ان تذکروں کو برداشت کرے یا نہ کرے مگر اس وقت تک کہف والوں کے ایمانی اجر کے جن قوالب ومظاہر کو قرآن نے بیان کیا ہے کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی چاہا جائے تو ایمانیوں کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جاسکتا ہے۔اگرچہ روز بروز اب ان کی تعداد گھٹ رہی ہے تاہم اب بھی دنیا ان قدسی نفوس سے قطعی طور پر خالی نہیں ہوئی ہے۔ڈھونڈنے والے چاہیں تو اب بھی دنیا کے دور دراز گوشوں میں ان کو پاسکتے ہیں۔[1]

---

[1] گیلانی،مناظر احسن،سید،دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال،ص ۱۳۴۔۱۳۶

آیت : ﴿وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَ لَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا○ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْا اِذًا اَبَدًا﴾ (الکھف :۱۹، ۲۰)

''اور جس طرح اٹھایا ہم نے ان کو تا کہ ہم ایک دوسرے سے پوچھیں، ایک کہنے والے نے ان میں سے کہا کہ کتنے دن تک ٹھہرے؟ بولے کہ ٹھہرے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ (وقت کے متعلق) ہاہم بولے تمہارا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے کہ تم کتنی دیر ٹھہرے، پھر (انہوں نے کہا) کہ بھیجو تم اپنے میں سے کسی کو شہر کی طرف اس ورق (چاندی) کے ساتھ چاہیے کہ وہ دیکھے صاف ستھرا کھانے کو اور لائے تمھارے لئے روزی، اور چاہیے کہ کھانا لانے جو شہر جائے وہ نرمی سے کام لے اپنے متعلق کسی کو پتہ چلنے نہ دے (کیونکہ) اگر وہ تم سے واقف ہو جائینگے تو سنگسار کر دیں گے تمھیں یا واپس پلٹالیں گے اپنے کیش و ملت کی طرف جس کے بعد تم کبھی کامیاب نہ ہو گے۔''

قرآن نے وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ (اور جس طرح اٹھایا ہم نے ان کو) کے تمہیدی الفاظ کے ساتھ کہف کے ایمانی اجر کے جس رخ کو بے نقاب کیا ہے اور اس تمہید کے بعد جو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ عام آدمی کے لئے تو شاید اس کا سمجھنا بھی دشوار ہو۔

مطلب یہ ہے کہ کہف میں کہف والوں کے قیام کی مدت جو تین صدیوں سے بھی متجاوز ہے۔ اولاً عام حالات کے لحاظ سے بجائے خود یہی ایک غیر معمولی حادثہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر شخصی حالات یا زندگی کی اتنی طوالت کہ صدیوں سے متجاوز ہو جائے چنداں حیرت انگیز بات نہیں ہے، آخر ملائکہ بلکہ شیاطین جیسی زندہ ہستیوں کے متعلق بغیر کسی شک اور تذبذب کے کیا یہ نہیں مانا جاتا کہ پیدا ہونے کے بعد تاریخ کے نامعلوم عہد سے اس وقت تک اپنی شخصی حیات کے ساتھ وہ زندہ ہیں اور خدا ہی جانتا ہے کہ آئندہ بھی ان کی زندگی کا تسلسل کب تک باقی رہے گا بلکہ ان نادیدہ ہستیوں کے سوا دیکھی بھالی چیزوں میں گدھ وغیرہ جانوروں یا زندگی رکھنے والوں کے متعلق طوالت عمر کا دعویٰ کیا لوگ نہیں کرتے؟ تاہم انسانی قالب میں انفرادی و شخصی زندگی کی اتنی طوالت روزمرہ کے عام مشاہدات کے خلاف ضرور ہے، جبرائیل، میکائیل، اسرائیل علیہم السلام جیسے فرشتوں کے متعلق یہ سن کر کہ جب سے پیدا ہوئے ہیں زندہ ہیں اور آئندہ بھی مدتوں زندہ رہیں گے۔ اگر چہ ہمیں تعجب نہیں ہوتا مگر اس کے مقابلہ میں نوح یا عیسیٰ علیہم السلام کی طوالت عمر کی تو ایک گونہ عقلی توجیہ بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن کہف کے ان نوجوانوں کے متعلق تو ان کی بھی گنجائش نہیں اور قصہ اسی پر ختم نہیں ہوا بلکہ بیدار ہونے کے بعد اپنے سونے کی مدت ان کو ایک دن، یا دن کے کچھ حصہ سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں صحیح طور پر قرآن سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ ان کے سونے کی مدت کتنی تھی تاہم قرآن میں اس تمہیدی بیان کے بعد جو یہ الفاظ ہیں کہ:

﴿لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾

''تا کہ ہم ایک دوسرے سے پوچھیں، ایک کہنے والے نے ان میں سے کہا کہ کتنے دن تک ٹھہرے؟ بولے کہ ٹھہرے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔''

اگرچہ یہاں بھی پوچھ گچھ کا تعلق ''لبث ''یعنی قیام کی مدت سے ہے، نہ کہ سونے کی مدت سے، لیکن اٹھنے کے بعد چونکہ سوال و جواب کا ذکر قرآن نے کیا ہے، اس قرینہ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اٹھنے یعنی جاگنے سے پیشتر جس حال میں وہ تھے اسی کی مدت کے متعلق پوچھ رہے تھے اور جاگنے سے پہلے ظاہر ہے کہ نیند ہی کی حالت ہوسکتی ہے۔

بہر حال کچھ بھی ہو، عام طور پر یہ جو قصہ مشہور ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے اور قرآن کے فحویٰ کا اقتضا بھی یہی ہے کہ نیند کی جو واقعی مدت تھی، جاگنے کے بعد صحیح احساس اس مدت کا ان میں نہیں پایا جاتا تھا، حاصل جس کا یہی ہوا کہ ایک دن یا دن کے کچھ حصہ سے جس وقت کی وہ تعبیر کر رہے تھے واقع میں وہ وقت اتنا مختصر نہ تھا۔ نیند میں وقت کا صحیح تخمینہ اگر سونے والا نہ کر سکے تو یہ چنداں تعجب کی بات نہیں ہوسکتی۔ شاعروں کا تو خیال ہے کہ ہجر وقت کے احساس کو ختم کر دیتا ہے اور وصال اسی کے مقابلہ میں اسی وقت کو حد سے زیادہ مختصر کر دیتا ہے، یوں بھی نیند کی حالت میں آدمی خواب اور رویا کے اندر ایسے کاروبار میں اپنے آپ کو مشغول پاتا ہے جو مہینہ دو مہینہ بلکہ سال بھر میں انجام کو پہنچے، بسا اوقات دیکھتا ہے کہ اس کی شادی ہوئی، نو مہینے تک بیوی نے حمل کا زمانہ گزارا، بچہ پیدا ہوا، یہ سب کچھ خواب میں دیکھتا ہے، بیدار ہونے کے بعد مگر گھڑی بتاتی ہے کہ دو ڈھائی گھنٹوں سے زیادہ سونے کا موقع اسے نہ مل سکا لیکن ظاہر ہے کہ، خواب کی بات ہے اور کہف والوں کی نیند پر جو وقت بھی گزرا تھا، زیادہ سے زیادہ خواب والی مثال کو نظیر بنا کر قیاس کی گنجائش تو پیدا ہوتی ہے مگر دونوں کی نوعیت ایک ہے، اس کا دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے؟

خیر زندگی کی غیر معمولی طوالت اور پھر اس طویل مدت کو کہف کے ان نوجوانوں کا حد سے زیادہ مختصر محسوس کرنا یہ دونوں باتیں ان کے ایمان کے اجر و معاوضہ کی ایسی غیر معمولی شکلیں ہیں جن کی عام حالات میں آدمی توقع نہیں کر سکتا اور جہاں تک میرا خیال ہے یہی بتانا مقصود بھی ہے کہ ایمان کے اجر وصلہ یا ثمرات و نتائج کا پیمانہ حدود و معلومات و مشاہدات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عقل کو نہ قرار دینا چاہیے بلکہ سمجھنا چاہیے کہ عقل جن باتوں کو سوچ سکتی ہے ایمان ان آسانیوں کو بھی مومن کے سامنے لاتا ہے، اور عام حالات میں جن امور کا تصور بھی عقل کے لئے دشوار ہو، جس رب پر آدمی کو ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے، وہی رب جب چاہتا ہے تو ان کو بھی بیدار کر کے مومن کی دستگیری فرما سکتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ کہف کے یہ نوجوان کس حال میں گھر سے نکلے تھے، مگر قدرت کی طرف سے ان کے قیام کے لئے کافی آرام بخش جگہ بھی مہیا کی گئی، ان کی حفاظت کے لئے علاوہ کتے کے ایسے حالات خود ان پر بھی طاری کئے گئے کہ اس ویرانے میں بھی ان کو کوئی چھو نہیں سکتا تھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ایمانی اجر کی یہ ایسی شکلیں ہیں جن کا تجربہ عام طور پر ہر زمانہ میں کیا گیا ہے اور آج بھی چاہا جائے تو کیا جاسکتا ہے۔ مگر بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی بلکہ عقل جن باتوں کو سوچ نہیں سکتی، اصحاب کہف کا ایمان ان کو بھی کھینچ کر ان کے سامنے لایا۔ ان کی زندگی دراز ہوگئی اور کتنی دراز پھر وقت کی درازی سے آدمی کو جو ذہنی تکلیف ہوتی ہے، اس تکلیف سے بھی ان کو ان کے ایمان ہی نے بچالیا اور باوجود دراز ہونے کے وہی طویل وقت ان کو محسوس ہوا کہ حد سے زیادہ مختصر تھا اور اسی کے ساتھ اس کا

بھی ان کو تجربہ کرایا گیا کہ اتنے طویل زمانہ کو بغیر آب وخور کے انہوں نے گزار دیا۔ خدا ہی جانتا ہے وہ کتنے دنوں تک سوتے رہے مگر جس وقت بیدار ہوئے تو جیسے رات کو سونے والے صبح بیدار ہو کر کچھ کھانے پینے کی ضرورت یا خواہش عام طور پر محسوس کرتے ہیں انہوں نے بھی محسوس کی۔ قرآن میں اسی کے بعد جو یہ الفاظ ہیں:

﴿قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ﴾

"(وقت کے متعلق باہم) بولے تمہارا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے کہ تم کتنی دیر ٹھہرے، پھر (انہوں نے کہا) کہ بھیجو تم اپنے میں سے کسی کو شہر کی طرف اس ورق (چاندی) کے ساتھ چاہئے کہ وہ دیکھے صاف ستھرا کھانے کو اور لائے تمہارے لئے روزی"۔

ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بھوک کا تقاضا بھی چنداں سخت تھا ورنہ ازکی طعاما (صاف ستھرے لذیذ) کھانے کی تلاش کا حکم وہ نہ دیتے اور یہ بھی ان کے ایمان کے کرشموں میں سے ایک کرشمہ تھا۔

کذلک کے لفظ سے ان کے ایمانی نتائج کو قرآن نے جو الگ کر دیا ہے غالباً ان کی اہمیت ہی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے، یعنی ایمانی اجر ہونے میں یوں تو سب مساوی ہیں لیکن غیر معمولی ہونے کی وجہ سے ان کی نوعیت گذشتہ آثار سے چونکہ مختلف تھی، اس لئے ان کو پہلی فہرست سے قرآن نے جدا کر دیا۔

اسی کے ساتھ ذیلی طور پر ایک سبق تو اس سے یہ ملتا ہے جیسا کہ امام رازیؒ نے بھی لکھا ہے۔

وهذه الاية تدل على ان السعى فى امساک الزّاد امرمهم مشروع و انه لا يبطل التوكل.

"یہ آیت بتاتی ہے کہ زادِ راہ کا ساتھ رکھنا یہ شریعت کا ایک اہم مسئلہ ہے اور توکل پر اس سے زد نہیں پڑتی۔"

نیز "ازکی طعاما" کی تفسیر اگر یہ کی جائے، امام ہی نے دوسرے اقوال کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی بایں الفاظ کیا ہے۔

ايها اطيب والذّ

"یعنی غرض ان کی یہ تھی کہ کھانوں میں جو صاف ستھرا اور لذیذ کھانا ہو، اس کو حاصل کریں"۔

تو اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ طیبات من الرزق یا ایسی غذا جو آدمی کے ذائقہ کے مناسب اور لذت بخش ہو، خواہ مخواہ اس سے نفرت یا چڑ پیدا کرنے کی مشق دینی راہ کے سلوک میں قطعاً غیر ضروری ہے۔

اور اسی کے بعد آگے قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا﴾

"اور چاہئے کہ کھانا لانے جو شہر جائے وہ نرمی سے کام لے، اپنے متعلق کسی کو پتہ چلنے نہ دے (کیونکہ) اگر وہ تم سے واقف ہو جائیں گے تو سنگسار کر دیں گے تمہیں، یا واپس پلٹا لیں گے اپنے کیش وملت کی طرف جس

کے بعد تم کبھی کامیاب نہ ہو گے۔''

یعنی اپنی قوم اور اپنے وطن کو چھوڑ کر کھلی زندگی بسر کرنے کے لئے نوجوانوں کی یہ ٹولی شہر سے جس حال میں نکلی تھی، قرآن نے ان ہی کی زبانی اس حال کے متعلق ان کے اعترافی الفاظ کو یہاں نقل کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قوم سے ان کی مخالفانہ کشمکش شدت کی اس آخری حد تک پہنچ چکی تھی کہ اپنی جان سے ہاتھ دھولیں یا جس دین کے لئے وہ سب کچھ برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے (العیاذ باللہ) اسی سے دست بردار ہو جائیں اور اس کا خطرہ کہف میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے دلوں میں باقی رہا باوجود یہ کہ ایمان یقین کے اس درجہ تک قرآنی شہادت کے رو سے ان کی رسائی ہو چکی تھی جس کا نام ربط ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ بجائے مقابلہ کے اس شخص کے متعلق جو کھانا لانے کے لئے شہر بھیجا جا رہا تھا یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ لطف و نرمی کی راہ اختیار کرے اور اس طریقہ سے بازار میں داخل ہو کہ دوسروں کو پتہ نہ چلے کہ وہ ان کی جماعت کا آدمی ہے۔

ممکن ہے کہ کائنات کے حوادث و واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو خالق کائنات کی مرضی کی تاثیری کارفرمائیوں کے بغیر سوچنے کے جو عادی ہیں ان کو کہف والوں کی اس ''ذہنیت'' کے پیچھے بزدلی اور اخلاقی کمزوری کے عناصر پوشیدہ نظر آتے ہوں اور ان کے نزدیک اخلاقی قوت کے مظاہرے ہی کی یہی واحد شکل ہو کہ بڑی سے بڑی قوت کے ساتھ انتہائی خطرناک حالات میں بھی نتیجہ سے قطعاً بے پرواہ ہو کر آدمی ٹکرا جائے مگر میں نے پہلے بھی نقل کیا ہے اور قرآن نے اصحاب کہف کی زبانی اس موقع پر ان کی طرف جس طرز عمل کو منسوب کیا ہے اس سے بھی یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ خواہ یہ طریقہ کار لاحاصل، بے جا تہور ہو یا نہ ہو مگر فلاح و بہبود کے توقعات و امکانات کے دائرے کو تنگ ضرور کر دیتا ہے۔ آخر خود سوچئے کہ ایسی صورت میں ٹکرانے والے اگر (عیاذاً باللہ) ارتداد کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے تو فلاح و کامیابی کا دروازہ کیا ہمیشہ کے لئے اپنے اوپر بند نہ کر لیتے اور بجائے ارتداد کے اگر رجم (سنگسار) ہونے کی سزا قبول کر کے اپنے آپ کو ختم کرا دیتے تو گو ذاتی طور پر شہادت ہی کا درجہ ان کو کیوں نہ حاصل ہو جاتا مگر دوسروں کے لئے فلاح و بہبود کے جو امکانات ان کے وجود سے تھے یقیناً اس کی راہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی۔

ان کے بیان کے الفاظ:

﴿وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا﴾

''اور نہ کامیاب ہو گے تم لوگ اس صورت میں پھر کبھی''

سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ فلاح سے محرومی کے اس خطرے کا تعلق صرف 'ارتداد' ہی سے نہیں بلکہ رجم اور سنگسار ہونے کے اندیشہ سے بھی بظاہر معلوم ہوتا ہے اور لازم و یہی متعدی فلاح سے شہید ہو کر اپنے وجود کے منافع سے لوگوں کو ضرور محروم کر دیتے ہیں۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۳۶۔۱۴۲

آیت: ﴿وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ (الکھف:۲۱)

> ''اچانک ان پر (کہف والوں پر) مطلع کر دیا ہم نے تا کہ وہ جان جائیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی آنے والی ہے قطعاً اس میں کوئی شک نہیں ہے (اور کہف والوں پر مطلع ہونے کا قصہ اس وقت پیش آیا) جب دیکھوا (شہر والے) باہم جھگڑ رہے تھے ان ہی کہف والوں کے متعلق پس (بعض) بولے کہ بناؤ ان پر کوئی عمارت، ان کا رب خوب جانتا تھا ان کو، کہا ان لوگوں نے جو ان کے معاملہ پر قابو یافتہ تھے کہ ہم بنا کر رہیں گے ان پر مسجد۔''

حاصل آیت کا یہی ہے کہ دشمنوں کی اسی آبادی اور اسی شہر میں دیکھا جا رہا تھا کہ انتہائی مظلومیت اور بے کسی کے حال میں ان کے شہر سے نوجوانوں کی یہ ٹولی جو نکلی تھی ان ہی کے وہ نادیدہ عاشق زار بنے ہوئے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ اپنے شہر کے باشندوں کے ظالمانہ طرز عمل پر وہ ندامت کا اظہار کر کے پچھتا رہے تھے بلکہ مافات کی تلافی کے لئے چاہتے ہیں کہ جن پر ظلم کیا گیا تھا اور صحیح دین کے قبول کرنے کے جرم میں بن باس ہونے پر جنہیں مجبور کیا گیا تھا ان کی کوئی دوامی یادگار قائم کریں۔ بعض لوگوں کی رائے اپنے مذاق کے مطابق یہ تھی کہ ان کی یاد میں کوئی عمارت بطور میموریل کے بنائی جائے اور دوسرا طبقہ ''عمارت برائے عمارت'' کی اس لاحاصل تجویز کی مخالفت کر کے چاہتا تھا کہ جس خدا کے لئے ان نوجوانوں کو مصائب میں مبتلا ہونا پڑا تھا اسی خدا کی عبادت کے لئے ان کی یاد میں مسجد بنائی جائے، خلاصہ یہ ہے کہ جو علاقہ اور شہر کہف کے ان نوجوانوں کے دشمنوں اور مخالفوں سے بھرا ہوا تھا، وہی علاقہ اور شہر اب صرف ان کے عقیدت مندوں، بلکہ نادیدہ عشاق سے اچانک معمور ہو گیا اور طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ٹھیک جن دنوں میں یہ انقلابی ہلچل اس شہر کے اندر برپا تھی اچانک یہ عجیب و غریب حادثہ پیش آیا کہ جن سے ملاقات کا لوگوں کو شان و گمان بھی نہ تھا کہف کے ان ہی نوجوانوں کے متعلق شہر والوں کو یہ خبر ملی کہ وہ تو اس وقت تک اسی کہف میں جیتی جاگتی حالت میں پائے جا رہے ہیں، یہ صورت کیسے پیش آئی؟ قصوں میں تو عموماً یہ بیان کیا گیا ہے اور مشہور ہے کہ بازار میں جب کھانا لینے کے لئے کہف سے آدمی آیا اور جو سکہ اس نے نان بائی کے حوالہ کیا، وہ دقیانوس نامی بادشاہ کے ٹھپہ کا سکہ تھا، جو تین سو سال پیشتر اس شہر میں حکمرانی کرتا تھا۔ نان بائی نے اس نئے سکہ کو دیکھ کر پوچھ گچھ کی، لوگوں میں اس کا چرچا پھیلا۔ آخر اس آدمی کو اقرار کرنا پڑا کہ ہمارا تعلق نوجوانوں کی اس جماعت سے ہے جو دشمنوں کے خوف سے کہف میں روپوش ہو گئے ہیں، اسی ذریعہ سے لوگ کہف میں ڈھونڈھتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں فجوہ میں یہ لوگ بیٹھے ہوئے کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ارباب حکایات و قصص اسی روایت کو کافی رنگ آمیزیوں کے ساتھ کتابوں میں نقل کرتے ہیں لیکن قرآن میں ہم ان تفصیلات کو نہیں پاتے اور سچ پوچھیے تو اس قسم کی دور از کار تفصیلات سے قرآن کا عام دستور ہے کہ عموماً تعرض بھی نہیں کرتا، وہ تو صرف ایمانی اجر کی مختلف شکلوں کو اس موقع پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ کہف والوں کے ایمانی اجر و معاوضہ کی یہ شکل بھی اپنی علیحدہ مستقل نوعیت رکھتی تھی۔ اسی لئے ''کذلک'' کے لفظ سے

شروع کرتے ہوئے یعنی یہ بتاتے ہوئے کہ جیسے گذشتہ قالبوں میں ایمان اجر کہف والوں کے سامنے آیا، اسی طرح ایک نیا مظاہرہ ان کے ایمانی اجر کا اس شکل میں بھی ہوا کہ:

﴿أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوٓا أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ أَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰٓ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا﴾

''اچانک ان پر (کہف والوں پر) مطلع کر دیا ہم نے تا کہ وہ جان جائیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی آنے والی ہے قطعاً اس میں کوئی شک نہیں ہے (اور کہف والوں پر مطلع ہونے کا قصہ اس وقت پیش آیا) جب دیکھو! (شہر والے) باہم جھگڑ رہے تھے ان ہی کہف والوں کے متعلق پس (بعض) بولے کہ بناؤ ان پر کوئی عمارت، ان کا رب خوب جانتا تھا ان کو، کہا ان لوگوں نے جو ان کے معاملہ پر قابو یافتہ تھے کہ ہم بنا کر رہیں گے ان پر مسجد۔''

بہر حال اصحاب کہف پر اعثار یعنی اچانک ان پر واقف ہونے کی صورت جو پیش آئی اس کی تفصیلی وجہ قرآن نے نہیں بیان کی ہے بلکہ بجائے عداوت و دشمنی کے اسی شہر کے باشندوں میں کہف والوں کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی بلکہ نادیدہ عشق کا انقلابی سانحہ جو پیش آیا اور اسی جذبہ عشق سے سرشار ہو کر لوگ ان کی یادگار کی تعمیر کے متعلق مختلف تجویزیں جو پیش کر رہے تھے، قرآن نے صرف یہ خبر دی ہے کہ عین اسی زمانے میں ان سے واقف ہونے کا حادثہ اچانک رونما ہوا۔ اس سلسلہ میں اسی حد تک قرآن نے اپنے بیان کو محدود رکھا ہے کیونکہ وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایمان مومن کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے، کن کن حالات میں دیتا ہے اور یہ ایمانی اجر کے ظہور کی شکلیں صرف ان ہی منطقی حدود تک محدود نہیں ہوتیں جہاں تک سوچنے والوں کی عقل عام معلومات و مشاہدات کی رہنمائی میں پہنچتی یا پہنچ سکتی ہے، الغرض یہ جو دعویٰ قرآن میں کیا گیا ہے، یا اہل ایمان کے لئے صلائے عام دیا گیا ہے کہ:

﴿وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصّٰلِحٰتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا ○ مَّاكِثِينَ فِيهِ أَبَدًا﴾ (الکہف: ۲،۳)

''اور بشارت دے دو ایمان والوں کو جو اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں کہ یقیناً ان کے لئے اچھا اجر و معاوضہ ہے جس میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

اسی دعویٰ یا اسی صلائے عامہ کے عملی تجربات کی یہ مثالی شکلیں ہیں جو مختلف رنگوں میں کہف کے ان مومن نو جوانوں کے سامنے مسلسل پیش آتی چلی گئی ہیں، اتنی دراز مدت جو کہف میں ان پر گزری، چاہئے تو یہ تھا کہ دنیا ان کو بھول جاتی ہے، حافظوں سے لوگوں کے نکل جاتے۔

مگر آپ دیکھ رہے ہیں، بجائے بھلانے کے قدرت ان کی یاد کے نقوش کو چمکاتی ہی چلی گئی۔ نہ صرف دلوں اور دماغوں

میں بلکہ جس شہر کے باشندوں کے مظالم سے تنگ آ کر بیابان اور تاپو کی زندگی انہوں نے اختیار کی تھی، اسی شہر کے رہنے والے ان کے لئے یادگار قائم کرنے کی کوششوں میں مست ہیں، ایک طبقہ ''عمارت برائے عمارت'' والے اصول پر مصر ہے، یہی مذاق عام طور پر آج کل یورپ وامریکہ کے باشندوں پر غالب ہے۔ لاکھوں نہیں بلکہ بلا مبالغہ میموریل کی بعض عمارتوں میں کروڑہا کروڑ روپے لگا دیئے جاتے ہیں لیکن اس عمارت میں اسی شہر کے اس غریب کو سر چھپانے کا بھی موقع نہیں مل سکتا جو موسم سرما کی سرد وتاریک راتوں کو کسی فٹ پاتھ پر ٹھٹھر ٹھٹھر کر بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اور اسی کے مقابلے میں دوسرا طبقہ ''عمارت برائے عبادت'' والی تجویز پیش کر رہا تھا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ثانی الذکر طبقہ کہف والوں کے امر پر غالب تھا، شاید اس کا یہ مطلب ہو کہ کہف والوں کے دین کو صحیح معنوں میں قبول کر کے ان کے معاملہ پر غالب آ گیا تھا اور اول الذکر ''عمارت برائے عمارت'' نظریہ والے محض قوم کے ہیرو ہونے کی حیثیت سے ان کی یادگار میں ایک میموریل تعمیر کروانا چاہتے تھے۔ اس تجویز کے ذکر کے ساتھ بطور جملہ معترضہ کے قرآن میں جو:

﴿ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ﴾

''ان کا رب ان کا زیادہ جاننے والا ہے''۔

کا فقرہ پایا جاتا ہے اس سے ''عمارت برائے عمارت'' کے نظریہ کی اس بنیاد پر شاید ضرب لگانی مقصود ہے جو اس کے جواز میں عموماً پیش کرنے والا پیش کر دیا کرتے ہیں کہ میموریل کی اس قسم کی عمارتوں کو صرف برائے عمارت قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ اس دنیا سے جو چلے گئے ان کی یاد کو آئندہ نسلوں کے اندر تر وتازہ رکھنے کے لئے عمارت بنائی جاتی ہے، اسی بنیاد کے کھوکھلے پن کو قرآن ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ بظاہر مطلب یہ ہے کہ اس دنیا سے جو چلے گئے ہیں ان کی یاد یا تو علم الٰہی میں ہمیشہ ہی قائم ودائم تر وتازہ رہتی ہے اور اس طور پر تر وتازہ رہتی ہے کہ خواہ کتنی ہی مدت اور زمانہ گزر جائے اس کی تازگی میں کسی قسم کا کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں جو عمارتیں خود فانی ہونے والی ہیں ان کے ذریعہ سے فانی ہونے والے حافظوں میں ان کی یاد تازہ رہنے کی غیر ضروری تدبیر بجز اہمال اور بے حاصلی کے اور بھی کچھ ہے؟

اور جیسے یہ ایک معترضہ لیکن حد سے زیادہ پر معنی فقرہ بیان کے اس حصہ میں پایا جاتا ہے اسی طرح شروع میں ''کَذٰلِکَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ'' کے بعد:

﴿ لِیَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیْبَ فِیْهَا ﴾

''تا کہ وہ جانیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور (قیامت) کی گھڑی میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے''۔

ان سے بھی ذیلی طور پر قرآن دو باتوں کی طرف غالباً متوجہ کرنا چاہتا ہے، پہلی بات تو یہی ہے کہ مسلسل کہف والوں کے سامنے جو باتیں پیش ہوتی رہیں ان سے ایک غرض تو یہی تھی کہ ایمان کے متعلق جس اجر حسن کا اور یہ کہ مومن ایمان کے اس اجر سے ہمیشہ بغیر کسی وقفہ کے مستفید ومتمتع ہوتا رہے گا اس کا وعدہ جو کیا گیا ہے، یعنی:

﴿وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا O مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا﴾(الکهف : ۲،۳)

''اور بشارت دے دو ایمان والوں کو جو اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں کہ یقیناً ان کے لئے اچھا اجر و معاوضہ ہے جس میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

کا جو خلاصہ ہے، ان کو یہ دکھایا گیا کہ خدا کا وعدہ کتنا سچا ہے، ایمان کیسی کیسی نازک گھڑیوں میں مومن کی پشت پناہی کرتا چلا گیا ہے۔ اور دوسری بات وہی جو دوسرے فقرے

﴿وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا﴾

''اور (قیامت) کی گھڑی میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے''۔

سے سمجھ میں آتی ہے۔ لکھنے والوں نے تو خدا جانے اس کا کیا کیا مطلب لکھ دیا ہے، مگر میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ حق تعالیٰ کے اس وعدے کو جو ایمان کے متعلق اس نے فرمایا ہے پورا ہوتا ہوا جو دیکھ رہے تھے ان ہی کو یہ بتانا مقصود ہے کہ الساعۃ یعنی قیامت جو ایمان اور بے ایمانی ہی کے فائنل رزلٹ (آخری انجام) کا دوسرا نام ہے اس میں شک کرنے کی گنجائش ہی اب کیا باقی رہتی ہے۔

نیز بعض لوگ جو خواہ مخواہ عقلی تخمینہ میں مبتلا ہو کر ایسی چیزوں کو جن کی نہ نفی ہی عقلی دسترس کے حدود میں داخل ہے اور نہ اثبات۔ ان ہی کے متعلق طرح طرح کی عقلی موشگافیوں سے کام لیتے ہیں مثلاً دعویٰ کرتے پھرتے ہیں کہ ہم جنت و دوزخ، قیامت، عذاب قبر وغیرہ چیزوں کو عقلی دلائل اور سائنٹفک طریقوں سے صحیح ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں اور عقل اس قسم کی بدعقلیوں پر تمسخر کرتی ہے، بھلا اگر عقل ہی ان باتوں کے دریافت کرنے کے لئے کافی ہوتی تو نبوات و رسالات کا عظیم الشان نظام قدرت کیوں قائم کرتی؟

خیر، بات طویل ہو جائے گی، لکھنا یہ ہے کہ اس قسم کے ''غیبی حقائق'' کے ثبوت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سب سے بڑے صادق اصدق الصادقین، خالق تعالیٰ جل مجدہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والوں کو پھر ہم دوبارہ جینے کے عمل جیسے پہلی دفعہ ان ہی لوگوں کے اندر جو زندہ نہ تھے، زندگی بھری گئی تھی اور یہ دوبارہ جینے والے کے سامنے اس کے اعمال کے نتائج آئیں گے، یقیناً یہی سب سے بڑی، سب سے استوار، اور محکم دلیل ان غیبی امور کے یقینی ہونے کی ہو سکتی ہے کہ یہ خدا کا وعدہ ہے۔[1]

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۴۳۔۱۴۷

آیت: ﴿ سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَ يَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَ يَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ رَّبِّيْ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴾ (الکھف:۲۲)

''اور قریب ہے کہ وہ کہیں گے کہ (کہف والے) تین ہیں، چوتھا ان کا کتا ہے اور کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے، الکل پچو طریقے سے اور کہیں گے کہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے، کہہ دو کہ میرا رب ان کی تعداد سے زیادہ واقف ہے نہیں جانتے ان کو مگر کم لوگ پس تم نہ جھگڑو ان کے بارے میں مگر سرسری طور پر اور نہ پوچھو ان کے متعلق کسی سے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے بعد بھی جب اچانک لوگ ان سے واقف ہوئے کہف کے ان نوجوانوں کو آئندہ نسلوں میں بھی کافی اہمیت کا مقام حاصل رہا اور کیسی اہمیت؟ کہ خود نہیں بلکہ ان کے ساتھ جو کتا تھا تاریخ انسانی کا ایک ایسا کتا بن گیا کہ کہف والوں کی تعداد اس کتے کے بغیر اور کتے کے ساتھ مختلف مکتب خیال کی بنیاد بن گئی۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں سال بعد عرب میں بھی عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کے سلسلہ میں ایک بڑا اہم ''خلافی مسئلہ'' کتے کے ساتھ اور کتے کے بغیر اصحاب کہف کی تعداد کا مسئلہ تھا۔ عیسائیوں میں جو فرقہ اس زمانہ میں ''یعقوبیوں'' کے نام سے موسوم تھا، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے قول کا قائل اور معتقد تھا، کہتا تھا کہ تین تو اصحاب کہف تھے چوتھا ان کا کتا تھا اور ''نسطوریوں'' کے نام سے جو فرقہ ملقب تھا وہ پانچ تو تعداد کہف والوں کی بتاتا تھا اور کتے کو چھٹا قرار دیتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تیسرا قول کن لوگوں کا تھا؟ ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ تیسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ امام رازیؒ نے یہ لکھ کر گزشتہ دو قولوں کو قرآن نے جب ''رجما بالغیب'' یعنی الکل پچو قرار دیا ہے تو معلوم ہوا کہ تیسرا قول مقابلۃً واقعہ سے زیادہ قریب ہے پھر واد کے ساتھ تیسرے قول میں کتے کو جو قرآن نے الگ کر کے بیان کیا ہے اس سے امام رازیؒ نے بوجوہ مختلفہ تیسرے قول کی صحت کو ثابت کرنا چاہا ہے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دو مکاتب خیال میں غلو سے کام لیتے ہوئے لوگوں نے اصحاب کہف کے ساتھ کتے کو بھی اتنی اہمیت دی تھی کہ گویا اس کا وجود اصحاب کہف کے برابر ہو گیا تھا، سمجھا یہ جاتا تھا کہ ان ہی میں فانی ہو گیا تھا، اسی لئے اصحاب کہف اور کتے کے ذکر میں واو عاطفہ کے فاصلہ کا اضافہ بھی پسند نہیں کرتے تھے اور ہمارے مفسرین کا یہ خیال اگر صحیح ہے کہ تیسرا ہی قول واقعہ کی صحیح ترجمانی کرتا ہے تو واو کے اضافہ سے شاید کتے کی عینیت یا فنائیت کی غلطی کا ازالہ غالباً قرآن کرنا چاہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہو رہا تھا اصحاب کہف کی تعداد کتے کے ساتھ اور کتے کے بغیر دنیا کا یا کم از کم عرب واطراف عرب کے ممالک کا اہم مسئلہ بنا ہوا تھا۔ قرآن پاک جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے اس قسم کے بے نتیجہ مسائل سے ہمیشہ الگ رہنے کی تاکید کرتا ہے۔

﴿قُل رَّبِّیٓ اَعۡلَمُ بِعِدَّتِہِمۡ مَّا یَعۡلَمُہُمۡ اِلَّا قَلِیۡلٌ فَلَا تُمَارِ فِیۡہِمۡ اِلَّا مِرَآءً ظَاہِرًا وَّ لَا تَسۡتَفۡتِ فِیۡہِمۡ مِّنۡہُمۡ اَحَدًا﴾

''کہہ دو کہ میرا رب ان کی تعداد سے زیادہ واقف ہے نہیں جانتے ان کو مگر کم لوگ، پس تم نہ جھگڑو ان کے بارے میں مگر سرسری طور پر اور نہ پوچھو ان کے متعلق کسی سے''۔[1]

اپنے مقصد کی حد تک اس سرگزشت کے خاص اجزا اور عناصر کا انتخاب کر کے صراحۃً اس کی ممانعت بھی کردی گئی تھی۔ قرآن ہی میں اس کی ممانعت کردی گئی تھی کہ جو کچھ سنا دیا گیا اس سے زیادہ خواہ مخواہ قصے کی دوسری تفصیلات کی جستجو اور تلاش میں مسلمانوں کو مبتلا نہ ہونا چاہیے۔

﴿وَّ لَا تَسۡتَفۡتِ فِیۡہِمۡ مِّنۡہُمۡ اَحَدًا﴾

''اور نہ پوچھنا ان کے (یعنی اصحاب کے) متعلق ان سے (جو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں) کسی سے بھی''۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ قصہ کے متعلق جتنی باتوں کا صراحۃً قرآن نے ذکر کیا ہے جس غرض کے لئے قصہ نقل کیا ہے اس کے لئے وہی باتیں کافی ہیں، مگر نہ اگلوں نے ممانعت کے اس قرآنی نص صریح کی پرواہ کی اور نہ پچھلوں نے۔[2]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۴۹۔۱۵۱

[2] ایضاً، ص ۱۰۴۔۱۰۵

آیت: ﴿وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ وَ اذْکُرْ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیْتَ وَ قُلْ عَسٰٓی اَنْ یَّھْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ ھٰذَا رَشَدًا﴾ (الکھف: ۲۳،۲۴)

''اور ہرگز نہ کہا کرو کہ یہ کام کرنے والے، ہیں ہم کل مگر یہ کہ چاہے اللہ، اور یاد کرا اپنے رب کو جب بھول جائے تو اور کہہ کر میرا رب قریب ہے کہ اس سے زیادہ نزدیک راہ کی طرف راہنمائی فرمائے گا۔''

اس کا بظاہر مطلب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ خدا کے بغیر عالم حوادث و واقعات کو سوچنے اور اسی کی مدد سے زندگی کا پروگرام بنانے کے جو عادی ہیں، ایمان والوں کو شدید تاکید کی گئی ہے کہ اس الحادی بے ایمانہ ذہنیت سے کنارہ کش رہیں۔ اشارہ کیا گیا ہے کہ کہف والوں ہی کی سرگزشت کو دیکھو کن حالات سے ان کی ابتدا ہوئی، ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، انکا دین شدید خطرے میں گھر گیا تھا، عقل کی راہ سے سوچتے تو خدا جانے کن کن ٹھوکروں سے سابقہ پڑتا لیکن انہوں نے ایمان کی راہ اختیار کی اور جس رب پر ایمان لائے تھے اسی کی غیبی دستگیریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے قدم اٹھایا پھر ان کو تجربہ کرادیا گیا کہ ایمان کی راہ اختیار کرنے والے کو کبھی دھوکا نہیں ہوتا، ناموافق بدترین حالات، ایمانی قوت اس سے پیدا ہونے والے نتائج بہترین حالات سے بدل دیتے ہیں۔ جو دررائے جاتے ہیں دھتکارے جاتے ہیں ان ہی کو سر پر چڑھایا جاتا ہے، ان کی نعت گائی جاتی ہے، ان کی یادگار قائم کی جاتی ہے، ان کے ساتھ دلچسپیاں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ ان کی تعداد کے متعلق مختلف سکول قائم ہوجاتے ہیں، ان کے صدقے میں ایک معمولی کتا بھی انسانی تاریخ کا اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ بھلا خدا سے ٹوٹی ہوئی عقل اس وقت جب کہف والے اپنی قوم سے الگ ہوکر نکل رہے تھے یہ سوچ سکتی تھی کہ آئندہ مظلوموں اور لاوارث بےنواؤں کی یہی ٹولی اتنی اہمیت حاصل کرنے والی ہے کہ صدیوں بعد قرآن میں ان کے متعلق وحی نازل ہوگی اور یوں قیامت تک کے لئے جریدہ عالم پر ان کا نام ثبت ہوجائے گا۔

حاصل یہ ہے کہ آج کے حالات کو دیکھ کر کل کے متعلق سوچنے کے جو دو مستقل طریقے ایک طریقہ ان لوگوں کا ہے جو حسی اور عقلی معلومات کے سوا حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کا خطرہ بھی اپنے دل میں نہیں پاتے بلکہ علل واسباب کے حسی وعقلی سلسلے کے ساتھ خدائی کارفرمائیوں پر جو نظر رکھتا ہے اسلئے اسی کا مضحکہ اڑاتے ہیں علانیہ کہتے ہیں:

''خدا کو کیا پڑی میرے تمہارے درمیان کیوں ہو''۔

آج نسل انسانی کی اکثریت پر عقیدہ ولدیت کے آثار نے اسی ملعون طرز خیال کو مسلط کردیا ہے اور دوسرا طریقہ فکر وعمل وہ ہے جس کا سبق ہمیں اصحاب کہف کی قرآنی سرگزشت سے ملتا ہے۔ قرآن نے اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکم دیا ہے کہ

''ہرگز ہرگز نہ کہا کرو کہ ہم یہ کام کل انجام دیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

جس کا ماحصل یہ ہوا کہ مومن کو چاہئے کہ اپنے ہر آئندہ اقدام میں عام علل واسباب کے ساتھ اپنی نظر حق سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت قاہرہ اور اراد باہرہ پر رکھے، یہی ایمانی طریقہ فکر وعمل ہے اور اسی کے متعلق بشارت دی گئی ہے کہ اس کے ایمان کا اجر کبھی ضائع نہ ہوگا اور مومن ان کے نتائج سے بغیر کسی انقطاع کے برابر مستفید ہوتا رہے گا۔ پھر اسی کے بعد یہ حکم دیتے ہوئے کہ۔

﴿وَ اذْکُرْ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیْتَ﴾

''اور یاد کر اپنے رب کو جب بھول جائے تو۔''

جس کا مطلب یہی ہوا کہ خدا پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک دفعہ مان کر دماغ کے کسی گوشے میں اس کی یاد دفن کردی جائے بلکہ چاہئے کہ زندہ خدا کے ساتھ مومن بندگی کے تعلق کو مسلسل زندہ رکھے اور جب کبھی غفلت ہو جائے تو پھر اس کی یاد تازہ کر کے اپنے اندر اس شعور کو بیدار کرتا رہے اور اسی کی آرزو کی جائے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَ قُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا﴾

''اور کہہ کر میرا رب قریب ہے کہ اس سے زیادہ نزدیک راہ کی طرف ہماری رہنمائی فرمائے گا۔''

بظاہر اس کا مطلب وہی ہے کہ جب ''ایمانی زندگی'' آدمی اختیار کرتا ہے جیسا کہ کہف والوں نے اختیار کیا تھا تو ان کی ہدایت اور رہنمائی میں مزید اضافہ کردیا گیا اور بتدریج ترقی کرتے ہوئے۔

﴿ رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ ﴾ (الکھف:۱۴)

''باندھ دیا ہم نے ان کے قلوب پر''۔

کے مقام سکینت تک پہنچ گئے تھے، اسی طرح یہاں بھی ''مومن'' کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ایمان کے اس باطنی اجر کی اپنے رب سے توقع رکھے۔ جس طرح کہف والوں کے ایمان ''ربط قلب'' کے مقام رفیع ومنزل خنک تک چڑھا کر ان کو پہنچا دیا تھا، امید رکھے کہ اس کو بھی اپنے ایمان کا یہ اجر بارگاہ ربانی سے ارزانی ہوگا۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۵۱۔۱۵۴

آیت: ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ کَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِهٖۤ اَحَدًا﴾ (الکھف:۲۵،۲۶)

''اور ٹھہرے اپنے کہف میں تین سو سال اور بڑھا دیا انہوں نے ''نو ماہ'' اور کہو اللہ زیادہ جاننے والا ہے ان کے قیام کی مدت کو، آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ باتیں اسی کے لئے ہیں کیا عجیب دیکھتا ہے وہ اور سنتا ہے نہیں ہے ان کے لئے اللہ کے سوا کوئی پشت پناہ اور نہیں شریک ہے اس کے حکم میں کوئی۔''

سارے قصہ میں ایک جز یعنی انسانی زندگی کی غیر معمولی درازی اور طوالت ان لوگوں کی عقول کے لئے جو عزیز مقتدر کی کارفرمائیوں سے بیگانہ رہ کر جینے کے عادی ہیں ان کے لئے یہ خبر یقیناً باعث گرانی وتشویش بن سکتی تھی۔ اس مسئلہ کو بھی قرآن آخر میں سمجھا دینا چاہتا ہے۔ پہلے کہف کے قیام کی جو واقعی مدت تھی اس کو ان انداز میں قرآن نے بیان کیا ہے۔

﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ کَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا﴾

سنین کے بیان کرنے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے تو تین سو سال ان کے قیام کی مدت بتائی گئی ہے پھر فرمایا کہ نو سال کا اور اضافہ ہوا، اس کی توجیہ میں امام رازی نے نقل کیا ہے کہ:

کانت المدۃ ثلث مائة سنة من سنین الشمسیة و تسع سنین من القمریة

''تین سو سال تو شمسی حساب سے ہوئے اور نو سال قمری حساب سے۔''

خیر یہ تو حساب کی بات ہے ذہنی خرخشے کی بنیاد تو اس مقام پر ہے کہ انفرادی زندگی کی اتنی غیر معمولی درازی کا انسانی قالب میں تجربہ عموماً نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب ''بنیاد'' ہی کی تلاش ہے تو ذرا کرید نے کی اور کوشش کرو اور سوچو کہ حوادث و واقعات جن کا ظہور عالم محسوس میں ہو رہا ہے، اسباب وعلل کے سلسلے میں ان کی کڑیاں کیا صرف ''شہادت'' ہی کی حد تک محدود ہیں، یعنی حسی معلومات کی راہ سے عام انسانی عقل کی رسائی جن کڑیوں تک ہو سکتی ہے، کیا علل واسباب کا یہ قصہ ان ہی پر ختم ہو جاتا ہے؟ کسی معمولی گھاس یا جنگل کی جڑی بوٹی ہی کو اٹھا لو، کون بتا سکتا ہے کہ قدرت کے کن کن عوامل کے زیر اثر اس گھاس یا بوٹی کا وجود منصۂ شہود تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے؟ جڑ، پتے، تنے، شاخیں، پھل پھول، خواص وصفات میں جن نیرنگیوں کا تماشا اس قسم کے نباتات کی مختلف قسموں کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کیا ان بوقلمونیوں کی توجیہ صرف جانے ہوئے اسباب وعلل یا عوامل و موثرات سے جن کا عالم شہادت سے تعلق ہے بآسانی ممکن ہے؟ اصحاب کہف کے قیام کی مذکورہ بالا بات کی خبر دیتے ہوئے اسی کے بعد جو فرمایا گیا ہے کہ:

﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾

''کہو اللہ زیادہ جاننے والا ہے ان کے قیام کی مدت کو، آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ باتیں اسی کے لئے ہیں۔''

ان الفاظ سے قرآن یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ اپنے محدود معلومات کو پیمانہ بنا کر خدائی خبروں کی پیمائش کھلی ہوئی منطقی غلطی ہے۔ حق تعالیٰ کے دائرہ علم میں شہادت یعنی عالم محسوس کے قوانین کے ساتھ غیب کے قوانین بھی داخل ہیں۔ پھر جو نہیں جانتا ہے اسے خود سوچنا چاہئے کہ جاننے والوں کی خبروں کی تنقید کا حق آخر کس بنیاد پر رکھتا ہے۔ علم الٰہی کے اسی احاطہ کو واضح کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

﴿ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ﴾

کیا عجیب دیکھتا ہے وہ اور سنتا ہے۔

جس کا مآل یہی ہوا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ جو کچھ معاملہ کرتے ہیں اس کی مصلحتوں سے ان کے سوا دوسرا کون واقف ہو سکتا ہے؟ یہی کہف والے نوجوان تھے۔ اپنے رب پر ایمان لا کر خدائی امداد کے مستدعی ہوئے تھے، حق تعالیٰ ان کے اخلاص اور راست بازی کو بھی دیکھ رہا تھا اور جو دعائیں اپنے مالک سے انہوں نے کی تھیں انہیں بھی وہ سن رہا تھا اس نے چاہا کہ ان کے ایمان کا اور اپنے رب کے ساتھ حسن ظن کی جس نسبت کو انہوں نے قائم کیا تھا اس کے آثار و نتائج یا اجر و معاوضہ کا ان کو تجربہ کرائے پھر مرنے سے پہلے انہوں نے بھی دیکھا اور دوسروں کو بھی دکھایا گیا کہ غیبی دستگیریوں کی کیسی عجیب و غریب شکلیں ان کے سامنے آئیں جن میں بعض چیزیں ایسی بھی تھیں کہ عقل وقوع سے پہلے ان کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مثلاً یہی تجربہ کہ جس زندگی کی طوالت عام حالات میں اسی، نوے سال سے بھی عموماً متجاوز ہوتے ہوئے نہیں دیکھی گئی، وہی زندگی تین صدیوں سے بھی آگے بڑھ گئی۔

اور یہ تو خیر علم و جہل کا قصہ تھا۔ کہ جاننے والوں کی باتوں میں خواہ مخواہ شک اندازی نہ کرے۔ اس پر اصرار نہ کرے کہ اس کا جہل جن باتوں کے دریافت کرنے سے قاصر ہے عالم کا علم بھی اس کے اسی جہل کا ساتھ دے۔ یقیناً ایسا اصرار جاہلانہ اصرار ہو گا۔

اور اس سلسلے میں اپنی فہمائش کو قرآن نے اسی حد تک پہنچا کر چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ آیت ان الفاظ پر جو ختم ہوئی ہے۔

﴿ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴾

"نہیں ہے ان کیلئے اللہ کے سوا کوئی پشت پناہ اور نہیں شریک ہے اس کے حکم میں کوئی۔"

لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کا شاید یہ کوئی اسلوب بیان ہے، حالانکہ سچ پوچھئے تو جس "راز" سے پردہ مذکورہ بالا الفاظ سے ہٹایا گیا ہے اور "خالق و مخلوق" کے جس تعلق کو بے نقاب کر کے عالم اور اس کے نظام کے سمجھنے کی جو صحیح راہ قرآن نے پیش کی ہے اس کو سمجھ لینے کے بعد زندگی کی اس غیر معمولی طوالت ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ اس نوعیت کے تمام مسائل کے متعلق وساوس و اوہام کے سارے سوراخ چھوٹے ہوں یا بڑے ہمیشہ ہمیش کے لئے قطعی طور پر بند ہو جاتے ہیں۔[1]

اصحاب کہف کی طویل زندگی کے ذکر کے بعد جو یہ فرمایا گیا ہے۔

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۵۴-۱۵۶

''نہ تھا (ان لوگوں کے لیئے) اللہ کے سوا کوئی پشت پناہ''

یعنی ''مالھم من دونہ من ولی '' کا جو ترجمہ ہے اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اتنی مدت تک ان لوگوں کے قیام میں حق تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے کسی قسم کی کوئی مدد نہیں مل رہی تھی اور کیسے ملتی؟ جب واقعہ یہ ہے کہ سارے نظام عالم کا واحد ہمہ گیر قانون ہی یہ ہے کہ:

﴿وَّ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖۤ اَحَدًا﴾

''اور نہیں شریک ہے اس کے حکم میں کوئی''۔

پس یہی واقعہ کی جب اصل حقیقت ہے تو اپنی پیدا کی ہوئی زندگی کو پیدا کرنے والا جب تک اس کا جی چاہے باقی رکھے اور جب چاہے ختم کردے، کسی دوسرے کی دخل اندازی کی گنجائش ہی کیا ہے۔ ''خالق ومخلوق'' کے باہمی تعلق کی یہی عقلی نہیں بلکہ وجدانی یافت، ایمانی زندگی کا معراج کمال ہے۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اسی کی تعبیر ''وحدۃ الوجود'' کے لفظ سے کی گئی ہے لیکن جو نہیں جانتے ہیں انہوں نے ان پر الزام لگایا کہ وہ ''وحدۃ الوجود'' کے نظریہ کے مبلغ ہیں۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۵۸-۱۵۹

آیت: ﴿وَ اتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا﴾ (الکھف: ۲۷)

''اور پڑھتا رہ جو وحی کی گئی تجھ پر تیرے رب کی کتاب سے نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا اور ہرگز نہ پائے گا تو اس کے سوا کہیں چھپنے کی جگہ۔''

حکم کی ابتداء واو عاطفہ سے کی گئی ہے اور اسی کا ترجمہ ''اور'' کیا گیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے اور قاعدہ بھی اسی کو چاہتا ہے کہ عطف کے اس حروف واو کے بعد والا مضمون اس کے ماقبل کی عبارت کے مضمون سے مربوط ہے، اسی ربط کو تلاش کرنا چاہئے۔

یاد ہوگا کہ منجملہ دوسری باتوں کے کہف والوں کے قصہ کے دو لفظ ''الرقیم'' (جس کی تفسیر ''الکتاب'' کی گئی تھی) اور ''فتیة'' (نوجوانوں کی ٹولی جس کا ترجمہ کیا گیا تھا) قرآن کے ان دونوں لفظوں سے یہ اشارہ حاصل کیا گیا تھا کہ کھلی زندگی جس میں تہذیب وتمدن کے ہنگاموں سے آدمی الگ ہو جاتا ہے اس میں دماغی پستی، ذہنی تعطل وجمود کا قدرتا خطرہ جو پیدا ہوتا ہے اسی خطرے کے انسداد کے لئے قصہ کی اجمالی وتفصیلی دونوں تعبیروں میں ''رشدی'' صلاحیتوں کی حفاظت کی طرف خصوصی توجہ کی گئی ہے اور ''رشد'' یعنی سوجھ بوجھ فکر ونظر کے ملکہ وسلیقہ کو زندہ وتر وتازہ برسر کار رکھنے کے لئے عملی تدبیران ہی دو لفظوں الرقیم اور فتیة سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ کھلی زندگی میں کتاب کے ساتھ مشغولیت ومطالعہ کا تعلق جاری رکھا جائے اور بجائے تنہائی کے چاہئے کہ ''کھلی زندگی'' کو چند رفیقوں کے ساتھ گزارا جائے، گویا خواجہ حافظ کی مشہور تمنائی زندگی

دو یار زیرک وز بادہ کہن دو منے   فراغتے وکتابے وگوشہ چمنے

کے جواز کی سند قرآن سے پیدا کی گئی تھی۔[1]

''الرقیم'' اور اس کی تفسیر ''الکتاب'' کے اجمالی اشارہ کو قصہ کہف کے بعد والے اس پہلے قرآنی حکم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس حکم کے الفاظ کو پھر پڑھ لیجئے اور سوچئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں بھی کتاب ہی کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن کیا ہر کتاب کا؟ وہی کتاب جن کے لکھنے والے انسانی زندگی کو اپنی بحث کا موضوع بنا کر لکھتے چلے جا رہے ہیں مگر یہ طے کئے بغیر لکھتے چلے جا رہے ہیں کہ اس زندگی کی ابتداء کیا ہے، انتہا کیا ہے اور ابتداء کی بنیاد پر اس کا مدعا کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے؟

بہر حال ''الرقیم'' یا ''الکتاب'' کا لفظ بھی مجمل یا جس حد تک بھی تشنہ ہو، لیکن مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ (جو وحی کی گئی تجھ پر تیرے رب کی کتاب سے) کے الفاظ میں بھی ''اجمال'' و ''ابہام'' کا کوئی پہلو باقی رہ گیا ہے؟

یقیناً آدمی کے پالنے والے خالق کائنات ہی کی کتاب ایسی کتاب ہو سکتی ہے جس میں پڑھنے والوں کو اس وقت بھی روشنی مل سکتی ہے جب دنیا کا گوشہ گوشہ فتنوں کی تاریکیوں میں ڈوب گیا ہو، ہم اسی کتاب سے اپنی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا صحیح غیر مشتبہ

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۶۲۔۱۶۳

علم حاصل کر سکتے ہیں اور اسی میں ان غیر فانی، اٹل، امٹ اور لازمی محال سچائیوں کو پا سکتے ہیں جو زمانے کے انقلابی جھگڑوں سے نہ بدلے جا سکتے ہیں اور ماضی ہو یا حال واستقبال، زمانے کے کسی حصہ میں نہ وہ کبھی غلط ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہی مطلب ہے۔

﴿لا مبدل لکلمته﴾

''نہیں ہے کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا''

کے الفاظ کا جنہیں اس حکم میں آپ پا رہے ہیں۔ آخر غیب ہو یا شہادت، گزرا ہوا زمانہ ہو یا آنے والا، جس کا علم محیط ہر ایک کو حاوی ہو اس کی باتوں کو کون بدل سکتا ہے اور غلطی کی ان میں گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے اسی لئے تو آخر میں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا﴾

''ہرگز نہ پائے گا اس کے سوا یکسوئی کی کوئی جگہ''

جس کا حاصل یہی ہے کہ کھلی کہئے یا یکسوئی کی ایسی زندگی جو واقعی کامیاب و نتیجہ خیز ہو، ان لوگوں کو بھی نہیں مل سکتی جو مخلوقات کے ساتھ خالق کی باتوں سے بھی گھبرا کر ایسی زندگی گزار رہے ہیں یا گزارنے کا ارادہ کر رہے ہیں جس میں نہ مخلوق ہی کی بنائی کتابوں سے تعلق رکھا جائے نہ خالق کی اتاری ہوئی کتاب سے استفادہ کیا جائے۔

ان کو چونکا دیا گیا ہے کہ یکسوئی کی اس زندگی کے اس قالب میں بھی یکسوئی کی زندگی میسر نہیں آ سکتی، باہر سے ممکن ہے یکسوئی کی زندگی وہ معلوم ہو، لیکن دوسروں کے نہ سہی خود اپنے دماغی بھپاروں اور ذہنی ابخروں کے دروازے تو ان پر کھلے ہی رہیں گے اور جب تک ''انسانی کاسۂ سر'' میں مغز کی جگہ پتھر ہی نہ بھر دیئے جائیں۔ اپنے اندر ابلنے والے اوہام ووساوس کے سیل رواں کو کون روک سکتا ہے؟ تجربہ ان پر ثابت کر دے گا کہ ''ملتحد'' سمجھ کر جہاں انہوں نے پناہ ڈھونڈھی تھی وہاں بھی خود ان ہی کا دماغ خیالات کا ایک ''جہاں'' لئے کھڑا ہوا ہے اور تب ثابت ہو گا کہ رب کی بخشی ہوئی آگاہیوں کے سوا صحیح کھلی زندگی آدمی کو نہ خلوت ہی میں مل سکتی ہے اور نہ جلوت میں۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۶۴۔۱۶۶

آیت: ﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴾ (الکھف: ۲۸)

''اور تھامے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح وشام اور مراد بنائے ہوئے، اسی کے رخ کو، اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے چاہتے ہوئے دنیا (پست زندگی) کی زینت کو، مت ماننا اس کی باتوں کو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور وہ پیچھے چل پڑا اپنی ہوا کے اور کام ہے اس کا فرط (غیر متوازن بے ڈھنگا)۔''

اس حکم میں سب سے پہلے توجہ کا مستحق حکم کا پہلا لفظ اصبر کا ہے جس کا ترجمہ ''تھامے رہ'' کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ''صبر'' کا مطالبہ عموماً نامناسب و ناموافق حالات ہی میں کیا جاتا ہے، اسی بنیاد پر اگر یہ سمجھا جائے کہ کامل ہم آہنگی اور یک جہتی و یک رنگی کی توقع ''رفاقت کی زندگی'' میں نہ کرنی چاہئے تو لفظ کا بھی اقتضاء یہی ہے۔ گویا شروع ہی میں ''رفاقت کی زندگی'' اختیار کرنے والوں کو چونکا دیا گیا ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ''صبر'' کے جذبہ کو ہر رفیق دوسرے رفیق کے متعلق زندہ اور بیدار کر کے رفاقت کے رشتہ کو قائم کرے، کیونکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اول سے آخر تک ایک ایک نقطہ میں اتحاد کی امید تو شاید ایسے دو آدمیوں میں بھی نہیں کرنی چاہئے جو ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہوں، بلکہ نوعی اقتضاؤں کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے جیسے ظاہری شکل وصورت میں ہر آدمی کو قدرت نے دوسرے آدمی سے جدا کر دیا ہے اور اتنا جدا کر دیا ہے کہ چال، ڈھال، آواز، لہجہ میں بھی بنی آدم کے دو فرد بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے بلکہ اپنے ان ہی بیرونی اختلافات کی وجہ سے آدمی پہچانا جاتا ہے حالانکہ نوعی اقتضاؤں کے اعتبار سے دیکھئے گا تو ہر ہر شخص کی آنکھ، کان، ناک بلکہ ہر ہر عضو ہر ایک میں اسی جگہ نظر آتے ہیں جہاں پر دوسروں میں ہم ان کو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ قدرت چاہتی تو جیسے آنکھیں چہرے پر لگائی گئی ہیں، بجائے چہرے کے کسی میں ان ہی آنکھوں کو سر کے پچھلے حصے میں لگا دیتی، مگر باایں ہمہ وحدت وکثرت کا یہ عجیب وغریب کرشمہ ہے اور ٹھیک جو حال بیرونی شکل وشباہت، خدوخال کے شخصی اختلافات کا ہے، تجربہ آپ کو بتائے گا کہ اندرونی احساسات ورجحانات، افتادِ طبع، طریقۂ فکر وغیرہ جیسے باطنی امور میں بھی ہر فرد کسی نہ کسی قسم کی انفرادی خصوصیت اپنے اندر ضرور رکھتا ہے خواہ ابتداء میں ان انفرادی خصوصیتوں کا پتہ نہ چلے۔ اور جب واقعہ کی صورت حال یہی ہے تو رفاقت کی زندگی کے ہر ہر شعبہ کے ہر ہر پہلو میں باہم رفقاء میں کامل ہم آہنگی کی امید ظاہر ہے کہ غلط اور قطعاً غلط، امید اور ایسی امید ہوگی جس کی بنیاد پر دھوکے کی تکلیف سے تجربہ کے بعد دوچار ہونا پڑے گا۔ اور جو رفاقت کے تعلقات کو نباہنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ''آخر وقت تک'' رفاقت'' کے ثمرات ومنافع سے مستفید ہوتے رہیں، ان کے لئے صحیح مشورہ یہی ہوسکتا ہے کہ موافقت کے ساتھ ساتھ بالکل ممکن ہے کہ رفاقت کی اس ''زندگی'' میں ناموافقت کے ناگوار حالات سے بھی سابقہ پڑے، اس لئے قرآن نے اصبر کے ساتھ انتخاب رفقا کے اس حکم کو شروع کیا ہے، اس سے کم از کم میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ گویا اس میں جواب ہے اس سوال کا کہ ''رفقا'' کے ساتھ تعلقات کی کیا نوعیت ہونی چاہئے؟

دوسری مہم اس مسئلہ میں رفقاء کے انتخاب کا معیار ہے، یعنی رفاقت میں جن رفقاء کے انتخاب کا حکم دیا ہے ان کو ہم نشانیوں اور علامتوں سے پہچانیں؟ اسی کے جواب کو آپ آگے ان الفاظ میں پاسکتے ہیں، فرمایا گیا ہے:

﴿ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ﴾

''جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح وشام، مراد بنائے ہوئے ہیں اس پالنے والے کے رخ کو۔''

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے مواقع پر شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآنی الفاظ کا کوئی خود ساختہ خلاصہ لوگ نکال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ بالا الفاظ کا مطلب یہ نکال لیا جاتا ہے کہ رفاقت کیلئے حکم دیا گیا ہے کہ دین داروں کا انتخاب کیا جائے لیکن کم از کم قرآنی الفاظ کے ساتھ تو اس قسم کی لاپروائیاں بڑی محرومی ہے۔

یہ سچ ہے کہ جن میں یہ صفات پائے جاتے ہیں وہ دین دار ہی ہوتے ہیں لیکن ہر دیندار میں ان صفات کا پایا جانا جہاں تک میرا خیال ہے ضروری نہیں، دینی زندگی رکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ ہر زمانے میں پایا گیا ہے جو آئین وقانون کی شکل میں زندگی کی دینی تنظیم ہی کو مذہب کا آخری مطالبہ سمجھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ بہشتی زندگی بطور طبعی نتیجہ کے اس کے سامنے اسی طرح آجائے گی جیسے تریاق کا استعمال صحت کے نتیجے تک مریض کو پہنچا دیتا ہے۔ ان کی نظر صرف قانون کی اہمیت تک محدود رہتی ہے اور قانون کے مقنن سے بجز قانونی تعلق کے نہ کوئی رشتہ وہ رکھتے ہیں اور نہ رکھنا چاہتے ہیں، جیسے مریض صرف طبیب کی بتائی ہوئی دواؤں سے اپنا تعلق رکھتا ہے اور صحت کے لئے جانتا ہے کہ براہ راست طبیب سے تعلق پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور اسی کے مقابلہ میں دینداروں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جن کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت وہی ہوتی ہے جسے نشانی اور علامت ٹھہراتے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ میں قرآن نے ان کو روشناس کیا ہے۔

﴿يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ﴾

''پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح وشام۔''

یہ ان لوگوں کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت اور نشانی ہے۔ علامہ شوکانیؒ ان الفاظ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿كناية عن الاستمر ار على الدعاء في جميع الاوقات﴾

''سارے اوقات میں دعا کرتے رہنا اسی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔''

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ عربی زبان کے محاورہ کا اقتضاء بھی یہی ہے، حاصل جس کا یہی ہوا کہ پرورش کرنے والی قوت رب کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلق کے احساس کو ہمہ دم مسلسل، بغیر کسی انقطاع کے اپنے اندر زندہ اور بیدار رکھنا اور اسی احساس کے زیر اثر چھوٹی بڑی ضرورت میں اسی کی طرف پلٹنا اور اسی کو پکارتے رہنا یہی ان کی زندگی کا مشغلہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا ہوتا ہے اور فقر تام، احتیاج مطلق، فقط سوال، صرف بھیک کی اسی پستی میں جو بلندی ان کو حاصل ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کمتری سے جو برتری پیدا ہوتی ہے۔

یریدون وجهه (مراد بنائے ہوئے ہیں وہ اسی رب کے رخ کو)

کے الفاظ میں اسی کی تصویر پیش کی گئی ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ اپنی دعا اور پکار کے جواب میں جو کچھ بھی ان کو ملتا ہے اس میں اپنی آئینی زندگی کے منطقی نتیجہ سے زیادہ ان کو اپنا رب اور اسی رب کا فضل واحسان نظر آتا ہے۔ ان کی نگاہ کسی حال میں وجہ اللہ (رب کے رخ) سے نہیں ہٹتی حتی کہ بہشت بھی ان کے سامنے جب آئے گی تو وہ بھی رضوان اللہ ہی کا قالب ان کو محسوس ہوگا۔ وہ محسوس کریں گے کہ وہی اپنی رضامندیوں کے ساتھ ان کے آگے بے نقاب ہو کر آگیا ہے۔

الغرض رب کے ساتھ فقر واحتیاج کا دوامی تعلق اور ہر حال میں ''وجہ اللہ'' ہی کو مراد بنائے ہوئے رہنا، ان ہی دو علامتوں

سے ان رفقاء کی قرآن میں شناخت کرائی گئی ہے جن کی ضرورت کا اشارہ اصحاب کہف کے قصہ میں ''فتنہ'' کے لفظ سے کیا گیا تھا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ ''کہفی زندگی'' جس کا مشورہ فتنہ کے خاص زمانہ میں دیا گیا ہے اس میں ایمانی زندگی کے بچانے میں کچھ امداد اگر مل سکتی ہے تو اسی قسم کے دیندار رفیقوں سے مل سکتی ہے جن کی زندگی کا دین ناگزیر اندرونی اقتضا بن گیا ہو، ورنہ باہر سے لادے اور عائد کئے ہوئے آئین وقانون کی شکل میں اپنی زندگی کو جو نباہ رہے ہوں فتنہ کے طوفانی دور کے ان تھپیڑوں کی چوٹ کو صحیح معنوں میں وہ مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں۔ بہر حال رفاقت کے لئے رفقاء کے انتخاب کا کیا معیار ہونا چاہئے؟ انتخاب کے اسی معیار کی نشاندہی مذکورہ بالا دو علامتوں سے جہاں تک میرا خیال ہے قرآن میں کی گئی ہے۔

باقی راہ کے ان رفیقوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ اجمالی اشارہ خود ''اصبر'' کے لفظ سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مل رہا ہے، اسی اجمال کی تفصیل پر غور کیجئے اسی حکم کے ان آخری الفاظ میں آپ کو ملے گی۔ فرمایا گیا ہے:

﴿ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰکَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾

''اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے چاہتے ہوئے دنیا (پست زندگی) کی زینت کو۔''

اس آیۂ کریمہ میں الحیوۃ الدنیا سے پہلے ''زینۃ'' کا لفظ جو پایا جاتا ہے پہلے اسے سمجھ لیجئے۔ بات یہ ہے کہ اپنی موجودہ زمینی زندگی الحیوۃ الدنیا میں جن چیزوں کے استعمال پر آدمی مجبور تو نہ ہو، مگر التذاذی احساسات کی تسکین وتشفی کا سامان ان سے فراہم ہوتا ہو، موجودہ معاشی اصطلاح جس کے لئے (Luxury) بنائی گئی ہے، میرا خیال یہی ہے کہ قرآن میں ان ہی چیزوں کو زینۃ الحیوۃ الدنیا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، زینت کی مد کی ان چیزوں کے استعمال پر یہی نہیں کہ قرآن معترض نہیں ہے، بلکہ اعتراض کرنے والوں ہی کو اس کتاب میں جھڑکا اور ڈانٹا گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں:

﴿تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾

''مراد بناتے ہوئے حیات دنیا کی زینت کو''

یعنی الحیوۃ الدنیا کی زینت کو مراد اور مقصود بنانے کی ممانعت کا منشاء یہی ہو سکتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے کہ اپنی زندگی کا آخری نصب العین زینت کی ان چیزوں کو نہ بنانا چاہئے، بالفاظ دیگر ان ہی کی جستجو اور تلاش میں اپنا سب کچھ لگا دینا، ساری توانائیوں کو ان ہی میں گم کر دینا، ان ہی کے لئے جینا، ان ہی کے لئے مرنا، جیسا کہ معیار زندگی کی بلندی (Rase of Standard of Living) یا قریب قریب اس قسم کی خوشنماء دل آویز تعبیروں میں عہد جاہلیت کے جدید رہنما اسی مقصد کو انسانیت کا واحد نصب العین بنا کر کھلے کھلے صاف صاف لفظوں میں آج کل پیش کر رہے ہیں۔

خیر یہ تو الحیوۃ الدنیا کی ''زینت'' کو مراد بنا لینے یا ترید زینۃ الحیوۃ الدنیا کا مطلب ہوا۔ اب آیئے اور جو تعلیم اس حکم میں دی گئی ہے اسے سمجھئے۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں۔

﴿ لَا تَعْدُ عَيْنٰکَ عَنْهُمْ ﴾

''اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے''

کے الفاظ میں ممانعت کی گئی ہے کہ رفاقت کی زندگی میں رفقاء کی طرف سے نظر نہ ہٹائی جائے، لیکن یہ ممانعت مطلق غیر

مشروط نہیں، بلکہ آگے کے الفاظ۔

﴿تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾

''مراد بناتے ہوئے حیات دنیا کی زینت کو''۔

کا جو مفاد ہے، یقیناً اس حال کے ساتھ ممانعت کا یہ حکم مقید و مشروط ہے، حاصل جس کا یہی ہوا کہ الحیوٰۃ الدنیا کی زینت کو مراد و مقصود بنانے کے لئے رفقاء سے نظر ہٹانے کی ممانعت کی گئی ہے، گویا وہی بات جو ''اصبر'' کے لفظ سے اجمالاً سمجھ میں آتی ہے، اسی کی تفصیلی لمبائش ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کم از کم میری فہم ناقص اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اپنے ذاتی رجحان و افتاد طبع اور شخصی فطرت کے خصوصی اقتضاؤں کے زیر اثر زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً لباس، طعام وغیرہ جیسی باتوں میں ضرورت کے حدود سے آگے بڑھ کر زینت کی مد کی چیزوں کو دینی رفاقت کی زندگی میں کوئی رفیق اگر استعمال کرتا ہو یا استعمال کرنے کا کسی وجہ سے عادی ہو تو ممانعت کے مذکورہ بالا مقید و مشروط حکم کی بنیاد پر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دینی رفاقت کے رشتہ کے منافی اس رفیق کے طرز عمل کو نہیں قرار دینا چاہئے تھا کہ رفقاء سے مطلقاً نظر ہٹانے کی ممانعت کردی جاتی اور یہ حکم دے دیا جاتا کہ زندگی کے کسی شعبہ میں جائز نہ ہوگا کہ رفقاء کے احساسات کی پابندی سے کوئی رفیق اپنے آپ کو آزاد خیال کرتے ہوئے گریز کی راہ اختیار کرے۔ اسی بنیاد پر بغیر کسی دغدغہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دینی دائروں کے نسبتاً بعض کرخت طبقات میں ''زینت'' کے استعمال کو بے دینی نہ سہی لیکن دین کی اعلیٰ معیاری زندگی کے لئے نا مناسب یا ناموزوں خیال کرنے کا رجحان جو پایا جاتا ہے کم از کم قرآن سے تو اس رجحان کی ہمت افزائی مشکل ہے بلکہ صحیح قرآنی مسلک اس باب میں وہی ہے جس کی ترجمانی شیخ سعدیؒ نے اپنے مشہور شعر:

حاجت بہ کلاہ برکی داشتنت نیست

درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

میں فرمائی ہے۔ ''درویش صفت'' کے لفظ سے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی غرض وہی ہے کہ ایمان و عمل صالح کی جس زندگی کی حفاظت کے لئے رفاقت اختیار کی گئی ہے، اس زندگی کا نصب العین جس طرز عمل سے متاثر و مجروح ہوتا ہو، اس میں تو خواہ کچھ ہی ہو جائے کسی رفیق کے ذاتی رجحانات کے ساتھ رواداری کا طریقہ اختیار کرے۔ کچھ گرانی بھی محسوس ہو تو رفاقت کے تعلقات کو نباہنے اور باقی رکھنے کے لئے ''اصبر'' کے قرآنی حکم کی تعمیل کی سعادت حاصل کرنی چاہئے۔[1]

بذات خود جن خطرناک نتائج کو عہد جدید کا یہ دجالی نصب العین اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، آپ کی نظر اگر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی اور نقلی غلاف ان پر جو چڑھائے گئے ہیں، ان کو آپ پھاڑ نہیں سکتے، تعبیری ملمع کاریوں کی سطحی چمک دمک سے آپ کی نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں اس لئے خود ''قول'' کی تنقید کی آپ میں جرات باقی نہیں رہی ہے تو آیئے قرآن بجائے ''قول'' کے آپ کے سامنے دیکھئے اس کے ''قائل'' ہی کو پکڑے لئے کھڑا ہوا ہے۔ پڑھئے اگر آپ پڑھ سکتے ہیں ''لاتطع'' (یعنی مت ماننا ان لوگوں کی باتوں کو) اس امتناعی حکم کو صادر کرتے ہوئے آگے جو فرمایا گیا ہے، اور اسی پر یہ مضمون ختم ہوا ہے، یعنی

﴿مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۶۷-۱۷۳

''جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور وہ پیچھے چل پڑا اپنی ''ہوا'' کے اور کام ہے اس کا ''فرط'' (غیر متوازن بے ڈھنگا)

معیار زندگی کی بلندی و برتری کا صور انسانی آبادیوں میں آج جو پھونک رہے ہیں اور اسی کا شور دنیا میں مچائے ہوئے ہیں، ان کی پیشانی کی یہ قرآنی لکیریں کیا ایسی لکیریں ہیں جن کے لئے کچھ زیادہ غور و تامل کی ضرورت ہے۔ وہ جو بھی ہوں اور جہاں بھی کھڑے ہوں ان کے تمام خصوصیات میں شاید سب سے نمایاں یہی خصوصیتیں ہیں جنہیں ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہے اور ان ہی قرآنی الفاظ سے ان کو پہچان سکتا ہے۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ حدیثوں میں جیسے ''المسیح الدجال'' کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ 'ک' 'ف' 'ر' کفر اس کی پیشانی کی ایسی نمایاں خصوصیت ہوگی جسے پڑھنے والے اور ان پڑھ دونوں ہی پڑھ لیں گے کچھ یہی حال ان الفاظ کا نظر آتا ہے جنہیں پڑھنے والے اور ان پڑھ دونوں ہی اس قول کے قائلین کی پیشانیوں میں چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔

دیکھئے یہ فقرہ تین اجزاء پر مشتمل ہے اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر پچھلا جز پہلے جز کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

﴿اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾

''جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا''۔

یہ اس فقرے کا پہلا جز ہے۔ ارادی طغیانیوں اور اختیار و اقتدار کی بدمستیوں کے عذاب کی یہ عام قرآنی تعبیر ہے۔ ان مجرموں کو پہلی سزا قدرت کی طرف سے یہی ملتی ہے کہ زندگی کے بنیادی حقائق کی تلاش و جستجو کا جو احساس انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وہی احساس بتدریج معطل و مفلوج ہوتے ہوئے تباہی کے ان حدود تک پہنچ جاتا ہے جن کے مختلف مدارج کو قرآن میں ختم، ورین، غشاوۃ، ضلال، اغفال کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ قرآن میں انسانی نفسیات کے جو مسائل ہیں ان میں ذہنی اور فکری سزاؤں کی ان شکلوں اور ان کے باہمی امتیازات کو خاص اہمیت حاصل ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

بہر حال سزایابی کی اس نفسیاتی گرفت کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ جینے کا جو دستور بھی ذہنی عذاب کی اس حالت میں بنانے والے بنائیں گے اس کا زندگی کے بنیادی حقائق سے کوئی تعلق نہ ہوگا جیسا کہ معلوم ہے۔ عربی زبان میں اسی قسم کے بے بنیاد، پادر ہوا، من مانی باتوں کو ''ھویٰ'' کہتے ہیں۔ فقرہ بالا کے دوسرے جز:

﴿وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ﴾

''اور پیچھے چل پڑا وہ اپنی ''ھویٰ'' کے''

کے الفاظ سے اسی لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آخر میں اس مسکین مسافر کے پروگرام کا نام آپ کیا رکھیں گے جو سفر کی ان ساری باتوں سے یعنی کہاں سے آرہا ہے، کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟ ان سب سے ناواقف بھی ہو، لیکن باوجود اس کے یہ بھی سمجھ رہا ہو کہ کسی باضابطہ پروگرام کے تحت اپنے سفر کو وہ پورا کر رہا ہے اول اور آخر کے اوراق جس کتاب کے پھاڑ دیئے گئے ہوں، ایسی کتاب کا جو مطلب بھی بیان کیا جائے گا، ایسا مطلب بیان کرنے والے کے من گھڑت، خود تراشیدہ خیالات کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا ہے؟

تیسرا جز فقرہ کا:

﴿وَ كَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا﴾

''اور ہے کام اس کا ''فرط''

ہر وہ بات یا چیز جو اپنی قدرتی حد و مقدار سے ہٹ گئی ہو یا بالفاظ دیگر ہر بے ڈھنگے، غیر متوازن امر کو عربی میں ''فرط'' کہتے ہیں اور جب بنیاد سے الگ ہو کر ''ہوائی ضابطہ'' کے تحت زندگی گزاری جائے گی تو یقین مانئے کہ اس کا انجام فرط اور غیر متوازن ہی شکل میں سامنے آئے گا، آج دنیا افراط و تفریط کے ان ہی ہچکولوں میں جھول رہی ہے۔

''معیار زندگی کی برتری'' کے نصب العین والوں ہی کو دیکھئے! سرمایہ داری کے خبط میں فیصلہ کیا گیا کہ ایک امیر کے لیے سارے غرباء کو مرنا پڑے تو ان کو مر جانا چاہئے۔ اور اشتراکیت کا بھوت جب سوار ہوا ہے تو اب دھمکایا جا رہا ہے کہ ایک غریب کے لئے سارے امیروں کو غریب بنا دیا جائے گا۔ اور عدم توازن یا فرطیت کی یہ کیفیت زندگی کے کسی ایک شعبہ ہی کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ جس راہ میں بھی ان کا قدم ''ہوائی دستور'' کے زیر اثر اٹھا ہے، قرآن کی بیان کی ہوئی صفت ''فرط'' کی خصوصیتوں ہی کے ساتھ اٹھا ہے۔ ضخیم کتاب بن جائے گی اگر فرط کے لفظ کی تفسیر کو واقعات کی روشنی میں کوئی سمجھنا چاہے گا، لیکن اب مزید گنجائش کم از کم اس مضمون میں زیادہ تفصیل کی میرے لئے باقی نہیں رہی۔

جن خاص حالات میں کھلی زندگی ایمان و عمل صالح کو بچا لینے کا واحد ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے اب تک اسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے ہم سورہ کہف کی اس آیت تک پہنچے ہیں، جس میں ''الحیوۃ الدنیا'' و پست زندگی کی زینت کو مراد و مقصود بنا کر جینے والوں کو ان نشانیوں اور علامتوں سے شناخت کراتے ہوئے یعنی ان کے دلوں کو اپنی یاد سے ان کا پروردگار غافل بنا دیتا ہے، وہ اپنی حرص و ہوا کی اقتضاؤں کے پیچھے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں، ان کے سارے کام حدود سے متجاوز اور فرط ہوتے ہیں۔ شناخت کی یہ علامتیں اور نشانیاں جن میں پائی جاتی ہیں ان کے متعلق ایک تو منفی حکم ''لا تطع'' (مت اطاعت کر ان کی) کا دیا گیا تھا، حاصل یہی ہے کہ ان ہی کو دیکھ کر قدم اٹھانا اور زندگی کے ہر پہلو میں ان ہی کے عملی نمونوں اور عملی مشوروں کی طرف تاکتے اور جھانکتے رہنا، اس کی ممانعت فرمائی گئی ہے ایمانی وفاداریوں کے ساتھ جو جینا اور ان ہی پر مرنا چاہتے ہیں چاہیے کہ ان قرآنی علامتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور شائستہ و متمدن اقوام، مہذب و تعلیم یافتہ نسلوں یا ازیں قبیل جس قسم کی بھی خوشگوار تعبیروں، طمطراق عنوانوں سے روشناس کراتے ہوئے بلانے والے ان کی طرف کیوں نہ بلا رہے ہوں لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق ان کا واقعی حال کیا ہے اگر یہ نشانیاں ان میں پائی جاتی ہیں تو ''مومن'' کا فرض ہے کہ ''لا تطع'' (مت اطاعت کر اس کی) کے ربانی فرمان پر عزم و ارادے کی پوری قوت کے ساتھ ڈٹ جائے اور جب تک ان کی خواہشوں پر مذکورہ بالا سہ گانہ قرآنی علامتوں کے داغ اور دھبے نظر آ رہے ہوں ان کی اطاعت سے چاہیے کہ ''مومن'' بھاگتا ہی چلا جائے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۷۵۔۱۷۸

آیت : ﴿ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَ إِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَ سَاءَتْ مُرْتَفَقًا﴾ (الکھف،۲۹)

''کہہ اجوحق ہے تمھارے پالنے والے کی طرف سے پھر جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے (نہ مانے) انکار کردے ظالموں کے لئے ہم نے وہ آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں انہیں گھیر لیں گی اگر وہ فریادرسی چاہیں گے تو ان کی فریادرسی اس پانی سے کی جائیگی جو پگھلے ہوئے تانبے جیسا ہوگا جو چہرے بھون دے گا بڑا ہی بُراپانی ہے اور بڑی بُری آرام گاہ (دوزخ ہے)۔''

﴿ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾

جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حالات کیسے ہی گزر رہے ہوں اور کچھ بھی ہو رہا ہو،لیکن بہر حال زندگی کی جو حقیقی سچائیاں ہیں ان کا اعلان بھی کئے چلا ہی جانا چاہیے۔تقریر سے ہو یا تحریر سے یا قول کا جو بھی ذریعہ ہو مومن مکلف ہے کہ وہ ان سچائیوں اور صداقتوں کو دہراتا رہے مگر اس تبلیغی فرض کا مکلف بناتے ہوئے خلاف دستور قرآن میں اسی کے بعد:

﴿فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾

''پھر جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے (نہ مانے) انکار کردے''۔

کے الفاظ جو پائے جاتے ہیں ان سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حق کے مبلغ اور پہنچانے والے کو خواہ مخواہ اس کی امید نہ لگانی چاہئے کہ دنیا جن نفسیاتی حالات سے گزر رہی ہے ان میں میری بات سن ہی لی جائے گی۔گویا اس عہد میں صرف پہنچا دینا ''الحق'' کا کہہ دینا یہی بڑا کام ہے شاید اس خاص موقع پر یہ اضافہ اسی لئے کیا گیا ہے کہ اپنی ناکامی اور نامرادی کو دیکھ کر جھنجھلانے اور مایوس ہو کر بیٹھ رہنے کی کیفیت ان لوگ میں پیدا نہ ہو جو حق کے پہنچانے کا کام ان نازک و ناسازگار اور بدترین ناموافق حالات میں انجام دیتے ہیں۔[1]

''الحق'' کو پہنچانا چاہئے ، ماننے اور نہ ماننے کے خیال سے بے تعلق ہو کر پہنچانے کے لئے پہنچانا چاہئے، کھلی زندگی کے اس آخری وایجابی حکم کے بعد قرآن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والے ظاہر ہے کہ اپنے ''فرطی'' یعنی حدود سے متجاوز کاروبار کی وجہ سے ظلم کے مرتکب ہوں گے، کیونکہ ظلم نام ہی ہے قدرت کے نشان زدہ حدود سے ہٹ جانے کا جس کے بعد ظالم کا قدرت اور اس کے مقررہ قوانین سے ٹکراتے ہوئے زندگی بسر کرنا ناگزیر ہے۔

اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری زندگی میں ظالموں کا یہ طبقہ پائے گا کہ اس کے ہر احساس سے اور اس کی ہر خواہش سے قدرت اور اس کے قوانین متصادم ہیں۔ظلم کی زندگی کے اس قدرتی نتیجہ کے قالب کا نام قرآن کی زبان میں جھنم، النار وغیرہ ہے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں۔

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۷۹

ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے قرآن ظالمانہ زندگی کے اس نتیجہ سے مسلسل چونکاتا چلا گیا ہے یہاں بھی حسب دستور اس نتیجہ کا اظہار ''النار'' (آگ) کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ اتنی بات تو عام ہے لیکن اسی کے ساتھ خاص موقع پر ایک نئی چیز بھی ''النار'' کے ذکر کے بعد ملتی ہے جو اس مقام کے سوا اور قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔ کہتے ہیں سرادق کا یہ لفظ خاص عربی لفظ بھی نہیں ہے بلکہ فارسی میں سراپردہ کا جو لفظ ہے، اسی کی یہ معرب شکل ہے۔ بڑی بڑی ڈیوڑھیوں اور شاہی ایوانات کے داخلہ کے ابتدائی پھاٹک پر بہت بڑا پردہ جو پڑا رہتا ہے اس کو فارسی میں سراپردہ کہتے ہیں۔

پس سرادق النار یعنی جہنم کے سراپردہ کا مطلب یہی ہے یا ہوسکتا ہے کہ جہنم بذات خود تو نہیں لیکن جہنم سے اسی قسم کا تعلق رکھنے والی چیز جو ڈیوڑھیوں اور شاہی ایوانوں سے داخلہ کی پھاٹک کے سراپردہ کی ہوتی ہے، کچھ اسی قسم کی کوئی شے جہنم کا سرادق یا سراپردہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ ظلم کی زندگی بسر کرنے والوں کے لئے دوسری زندگی میں جہنم تو خیر تیار ہی ہے لیکن دوسری زندگی سے پہلے قرآن نے خبر دی ہے کہ جن ظالموں کا ذکر اوپر گزرا یعنی وہی جن کی شناخت سہ گانہ علامتوں سے کرائی گئی تھی، ان کو جہنم کا یہی سراپردہ گھیر چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے سامنے نہ جہنم ہے اور نہ جہنم کا سراپردہ پھر قرآن کی اس خبر کی تصدیق کی شکل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کو بھی علامتوں اور نشانیوں ہی سے پہچانا جائے۔ قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خاص بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اپنے لفظوں میں ہم اگر سمجھنا چاہیں تو اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی آرزو اور خواہش کے مطابق یہ دیکھو کہ قدرت کی طرف سے ان کو کیا مل رہا ہے؟ اگر یہ نظر آتا ہو کہ مانگ رہے ہوں وہ پانی اور مل رہا ہو پانی کی جگہ کھولتا ہوا پگھلا ہوا تانبا تو جب یہ ہونے لگے اسی وقت سمجھ لینا چاہئے کہ جہنم کا سراپردہ ان پر چھوڑ دیا گیا اور اس کے احاطے میں وہ داخل ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں قدرت کی طرف سے واقعات کا ظہور اس کے خلاف ہونے لگے وہ امن کے آرزومند ہوں تو جنگ کے شعلے بھڑکنے لگیں، ارزانی پیدا کرنا چاہیں تو گرانی بڑھنے لگے، وہ چاہتے ہوں کہ زندگی کی ضرورتوں کی بڑی سے بڑی مقدار مہیا کی جائے لیکن دیکھا یہ جا رہا ہو کہ عوام تو عوام ان کے خواص بھی معمولی ضرورتوں کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ امیروں اور دولت مندوں کو بھی روزانہ ایک انڈا یا پاؤ بھر گوشت تک مہیا کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہو۔ یہی سرادق النار (جہنم کے سراپردہ) کے احاطے میں داخل ہو جانے کی علامت ہے۔ جو کچھ دکھلایا جا رہا ہے اسے دیکھئے اور سمجھئے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۸۰۔۱۸۲

آیت : ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا O أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا﴾ (الکھف: ۳۰،۳۱)

''یقیناً جو لوگ ایمان لائیں، نیک اعمال کریں تو ہم کسی نیک عمل کرنے والے کا ثواب ضائع نہیں کرتے ان کے لئے ہیشگی والی جنتیں ہیں ان کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی وہاں یہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سبز رنگ نرم وباریک اور موٹے ریشم کے لباس پہنیں گے جہاں تختوں کے اوپر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے کیا خوب بدلہ ہے اور کس قدر عمدہ آرام گاہ ہے۔''

حق کو قبول کر کے جو زندگی گزاریں گے یا گزار رہے ہیں الحیوۃ الدنیا میں زینت کے استعمال سے ان کو منع تو نہیں کیا گیا ہے لیکن آرائش وزیبائش، آرام وآسائش کی ان ہی چیزوں کو مراد بنا کر اپنے وجود کا واحد نصب العین ان ہی کے حصول کو بنا لینا، ظاہر ہے کہ ایمانی زندگی میں اس نصب العین کی گنجائش نہیں ہے۔ سوال یہی ہوتا ہے کہ مومن اس نصب العین سے دست بردار ہونے کا صلہ کیا پائے گا؟ اس کے جواب میں یہ فرماتے ہوئے کہ ایمان اور اسی کے مطابق حسن عمل کو قدرت ضائع نہیں ہونے دے گی اور زینت کے نصب العین سے زندگی کے موجودہ عبوری دور میں دست بردار ہونے والے آخرت کی دوامی زندگی میں عدن (مسرت) والے باغوں کو پائیں گے جن کی شادابی وسیرابی، تازگی وبالیدگی کو مسلسل ہمیشہ بہنے والی نہروں سے باقی رکھا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زندگی کو حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کی کوشش کرنے والے خدا اور اس کے سارے قوانین کو اپنی مرضی کے مطابق جس ماحول میں پائیں اسی کا نام جب ''الجنۃ'' اور جنت کی زندگی ہے، تو زیب وزینت کا کون سا درجہ ایسا ہوگا جس سے استفادہ کا دروازہ اپنے اوپر جنت والے نہ کھلا پائیں گے۔ یقیناً یہاں زینت کے بعض مظاہر سے متمتع ہونے کا موقع اگر نہ بھی ملے تو الآخرۃ میں ان سے کہیں زیادہ بہترین قالب اور شکلوں میں جن کا ہم آج تصور بھی نہیں کر سکتے، زیبائش وآرائش، آرام وآسائش کی چیزیں ان کے سامنے آئیں گی۔ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ زیب وزینت کے بعض مظاہر کا جنت کی زندگی کے متعلق جو ذکر کیا گیا ہے اگر غور کیا جائے تو زندگی کی ناگزیر ضرورتوں کے بعد جن چیزوں میں زینت کو ہم نمایاں کرتے ہیں سب ہی پر زینت کے یہ جنتی مظاہر حاوی نظر آ سکتے ہیں۔

★مطلب یہ ہے کہ ضروریات حیات میں خرچ کرنے کے بعد بھی دنیا میں لوگوں کے پاس زائد سرمایہ باقی رہ جاتا ہے تو پھر مکان، سواری فرش وفروش جیسی چیزوں کی آرائش میں اس زائد سرمایہ کو صرف کرتے ہیں، یعنی رہنے سہنے برتنے کی چیزوں میں جمال پسندی کے شوق کو نمایاں کیا جاتا ہے یا پھر لباس یعنی بدن کے ساتھ انسانی تعلق جن چیزوں کا ہوتا ہے ان کی تحسین سے اس جذبہ کی تسکین کا سامان لوگ مہیا کرتے ہیں۔ سورۃ کہف میں اس خاص مقام پر جنتی زندگی کے تذکرہ کے سلسلہ میں یہ اضافہ جو کیا گیا ہے کہ ''سندس واستبرق'' کے سبز جوڑے ہیں ''ارائک'' چھپر کھٹوں پر جنت والے چین کریں گے۔ ظاہر ہے کہ مظاہر زینت کے ان دونوں قسموں ہی کے تو یہ نمونے ہیں۔ آدمی حسن وجمال کو ان امور کے سوا اپنے اعضاء دست وپا، چشم وآبرو، خدوخال میں بھی پسند کرتا ہے، اسی مقام پر دیکھئے۔ حلوا اساورمن ذھب (آراستہ کئے جائیں گے سونے کے اساور) اس اساور کا ترجمہ لوگ کنگن کر کے گزر جاتے ہیں حالانکہ بقول راغب اصفہانی اصلاً یہ لفظ عربی کا ہے بھی نہیں، ثانیاً جیسے سونے کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ ان ہی

اساور کو فضہ (چاندی) اور کسی کو لولو (موتی) کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ قواریرمن فضۃ (سیسے ہوں گے چاندی کے) سے سمجھا ہے کہ جنت میں تیسرا عنصر ہوگا جس میں شیشے کی شفافیت اور چاندی کی سی چمک دمک جمع ہو جائے گی۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے ان اساور میں بھی سونے، چاندی، موتی کی مجموعی خوبیاں اکٹھی ہوں گی اور ان کے استعمال سے اعضاء کے حسن و جمال میں اضافہ ہوگا۔[1]*

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۸۲۔۱۸۳

آیت: ﴿وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَیْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَیْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَیْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَیْـًٔا وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝ وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ یُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِیْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۝ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً وَّ لَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ یُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ لٰكِنَّاۡ هُوَ اللّٰهُ رَبِّیْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا ۝ وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا﴾ (الکہف ۳۲-۳۹)

''انھیں ان شخصوں کی مثال بھی سنا دے جن میں سے ایک کو ہم نے دو باغ انگوروں کے دے رکھے تھے۔ جنھیں کھجوروں کے درختوں سے ہم نے گھیر رکھا تھا اور دونوں کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی دونوں باغ اپنا پھل خوب لاتے تھے اس میں کوئی کمی نہ تھی اور ہم نے ان باغوں کے درمیان نہر جاری کر رکھی تھی الغرض اس کے پاس میوے تھے ایک دن اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنے ساتھی سے کہا کہ میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور جتھے کے اعتبار سے بھی زیادہ عزت والا ہوں یہ اپنے باغ میں گیا اور تھا اپنی جان پر ظلم کرنے والا، کہنے لگا میں خیال نہیں کر سکتا کہ کسی وقت بھی یہ برباد ہو جائے اور نہ میں قیامت کو قائم ہونے والی خیال کرتا ہوں اور اگر بالفرض میں اپنے رب کی طرف لوٹا یا بھی گیا تو یقیناً میں لوٹنے کی جگہ اس سے بھی زیادہ بہتر پاؤں گا اس کے ساتھی نے اس سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ، کیا تو اس اللہ سے کفر کرتا ہے؟ جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر تجھے پورا آدمی بنا دیا لیکن میں تو عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروں گا تو اپنے باغ میں جاتے وقت کیوں نہیں کہتا کہ اللہ کا چاہا ہونے والا ہے کوئی طاقت نہیں مگر اللہ کی مدد سے اگر چہ تو مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کم دیکھ رہا ہے۔''

الحیوۃ الدنیا کی زینت مراد بنا کر جینے والوں میں یہ ذہنیت جسے قرآن نے ان کی طرف منسوب کیا ہے یعنی اپنے پالنے والے پروردگار کی یاد سے ان کے دلوں میں غفلت کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ جسے سب سے زیادہ یاد رکھنا چاہئے اس کو کیوں بھول جاتے اور نتیجتاً حرص و ہوس کی پیروی کی بیماری میں مبتلا ہو کر زندگی کے طبعی نظام میں افراط و تفریط کی کیفیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟

جہاں تک میرا خیال ہے دو مثالی آدمیوں کا قصہ جو اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے اس میں اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن کی دو صفیں ان حالات میں جو قائم ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں کے طبقاتی خصوصیات کو سمجھانے کے لئے دو آدمیوں کا حال بیان کرو، جن میں سے ایک شخص کے متعلق کہا گیا ہے کہ انگور کے دو باغوں کا مالک حق تعالیٰ نے اس کو بنا دیا تھا اور ان دو تاکستانوں یعنی انگوری باغوں کو کھجور کے درختوں سے گھیر دیا گیا تھا، گویا ان تاکستانوں کی باڑ بھی بجائے خاردار جنگلی درختوں

کے ایسے درختوں سے تیار کی گئی تھی جو خود بھی پھل لانے والے درخت تھے۔ پھر ان دونوں باغوں کے متعلق یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ ان دونوں کے بیچ میں قدرت کی طرف سے نہر بھی جاری کی گئی تھی، باغ کی سیرابی و آبیاری کی ضمانت کی طرف جس سے اشارہ کیا گیا ہے۔ ایسے دو باغ جن کے بیچ میں قدرتی چشمہ پھوٹ پڑا ہے اس کی خشکی اور بے ثمری کا بھلا کیا اندیشہ ہوسکتا ہے؟ نیز ان ہی باغوں کے درمیان کھیتی بھی تھی اور باغ ہو یا کھیت پیداوار میں کوئی کم نہ تھا۔ اسی کے ساتھ وکان لہ ثمر کے تلفظ میں قرا کا اختلاف ہے، بہر حال مستند اہل لغت کے حوالہ سے امام رازیؒ وغیرہ مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ان باغوں کے سوا زر و نقرہ کے مسکوک وغیر مسکوک ذخیرے کا بھی مالک تھا۔ الغرض کافی مال و دولت کا بھی مالک علاوہ کھیتوں اور باغوں کے تھا، جن کی آمدنی ممکنہ خطرات سے محفوظ تھی۔ اس کی ان خصوصیات کا تذکرہ کرنے کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ ایمانی صف کے ایک آدمی سے یہی باغ اور مال و دولت والا گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں دولت میں بھی تم سے بڑھا ہوا ہوں اور میرے ساتھ جو لوگ ہیں اور جس طبقہ سے ہمارا تعلق ہے وہ عزت و جاہ میں بھی تم سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہیں۔ قرآن میں وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کے الفاظ اسی باغ والے دولت مند کی طرف منسوب کئے گئے ہیں جس کا مطلب یہی ہوا کہ قدرتی طبعی مقام سے اپنے آپ کو وہ ہٹائے ہوئے تھا۔ بظاہر اس سے یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ باغ اور اس کی تر و تازگی، بار آوری اور دولت و ثروت کا جو ذخیرہ اس کے پاس تھا اور انسانوں کی جو جماعت اس کے ساتھ جمع ہوگئی تھی ان ساری باتوں کو بجائے حق تعالیٰ کے فضل و کرم کے اپنی جسمانی و دماغی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتا تھا۔

اس سارے قصے میں قرآن کے یہی الفاظ خاص طور پر مستحق توجہ ہیں۔ آگے اسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا وہ منکر نہ تھا اور رب کے نام سے خدا کو موسوم کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا قرآن میں اس کی طرف ''شرک'' کے عقیدے کو منسوب کیا گیا ہے۔

حالانکہ اس پورے قصے میں اس کے کسی مشرکانہ فعل بت پرستی وغیرہ کا ذکر نہ صراحۃً ملتا ہے اور نہ اشارتاً، جہاں تک میرا خیال ہے جس شرک کو اس کی طرف قرآن نے منسوب کیا ہے وہ بت پرستی والا شرک نہیں ہے، بلکہ ہم شرک کی اس شکل کو ان لوگوں میں دیکھ سکتے ہیں جو خدا کے منکر بھی نہیں ہوتے۔ یعنی یہ بات کہ ''عالم کو خدا نے پیدا کیا ہے'' اس کا انکار نہیں کرتے مگر اسی کے ساتھ کہتے ہیں کہ اپنی قسمت کے ہم خود ''بلڈر'' اور معمار ہیں۔ گویا خلق و پیدائش کی حد تک خدا کی ضرورت ان کے نزدیک ختم ہو جاتی ہے۔ آگے کائنات اور اس کے قوانین ہیں جن کے ساتھ انسان کشمکش میں مصروف ہے۔ اس کش مکش میں کامیاب ہونے کے لئے خدائی امداد سے اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خدا کے ساتھ شریک کرنے کی یقیناً یہ ایک مستقل اور شاید بدترین شکل ہوسکتی ہے۔ جس زمانے سے ہم گزر رہے ہیں اس میں شرک کی دقیانوسی شکل جس کی بنیاد اوہام پر قائم تھی یعنی بت پرستی والے شرک سے زیادہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شرک کی یہی جدید شکل عام ذہنیتوں پر مسلط ہے بجائے اوہام کے اس کو حکمت و دانش کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے گویا پرانے شرک کے مقابلہ میں شرک کی یہ ایک سائنٹفک قسم ہے۔ اس نوعیت کی مشرکانہ ذہنیت کے جو شکار ہیں لوگ ان

کو کہتے ہیں کہ وہ ملحد اور دہریے ہیں۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ خدا کے وہ منکر ہیں۔ حالانکہ بجائے انکار کے ان کی ذہنیت کی صحیح تعبیر "اغفال قلب عن ذکر اللہ" ہی ہوسکتی ہے یعنی منکر نہیں بلکہ خالق تعالیٰ کی یاد سے ان کے دلوں کو غافل بنا دیا گیا ہے۔

بہر حال اپنے متعلق اسی ظالمانہ احساس کے ساتھ یعنی جو کچھ بھی ہے سب میری کد و کاوش، میری عقل و دانش، غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اسی احساس کے ساتھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ باغ میں داخل ہوا اور جن سائنٹفک بنیادوں پر اپنے معاشی نظام کو اپنے خیال کے مطابق اس نے قائم کیا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا میں خیال کرتا ہوں کہ یہ نظام میں نے جو قائم کیا ہے لازوال ہے۔ ما اظن ان تبید ھذہ ابدا کے دعویٰ کا جو حاصل ہے۔ یہ خیال کہ یہاں کی ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ ختم ہو جاتی ہے بظاہر اسی عام عقیدے کا الساعۃ (مقررہ وقت) کے لفظ سے ذکر کر کے اس نے یہ بھی کہا کہ اس مقررہ وقت کا خطرہ میں خیال کرتا ہوں کہ میرے قائم کردہ معاشی نظام کے ساتھ پیش نہ آئے گا۔

جس کی وجہ وہی تھی کہ ان حکیمانہ اصول و ضوابط پر اس کو اعتماد تھا جن پر اپنے نزدیک اس نے معاشی نظام کی بنیاد قائم کی تھی۔ آخر میں اپنی اسی سائنٹفک مشرکانہ ذہنیت کا مظاہرہ اس نے ان الفاظ میں کیا کہ وہ مقررہ گھڑی اس نظام پر کبھی آ گئی تو اپنے مخاطب مرد مومن کو خطاب کر کے اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس انقلابی عہد میں بھی تم سے بہر حال بہتر اور اچھا ہی رہوں گا۔ مطلب اس کا یہی ہوسکتا ہے کہ جس دل و دماغ، عقل و فراست، محنت و سعی کے بل بوتے پر اس معاشی نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں جب کامیابی کے یہی سارے ساز و سامان میرے ساتھ ہوں گے تو انقلاب کے اس طوفان میں بھی ان ہی حکیمانہ کاروائیوں سے کام لوں گا اور تمہاری یہ تسبیح و تہلیل، نماز و روزہ، جیسے آج تم کو میرے مقابلے میں آگے نہ بڑھا سکے، اس انقلابی عہد میں بھی یہی ہوگا آگے نہ بڑھا سکیں گے۔ اس کے الفاظ "لا جدن خیر امنھا منقلبا" کا مفاد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے بلکہ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ منقلب یا انقلابی عہد میں موجودہ حالت سے بھی زیادہ بہتر رہوں گا جس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ مشق و تجربہ میں جب زیادہ حذاقت اور پختگی ہو جائے گی تو اپنی عقل و فراست سے زیادہ بہتر کام لے سکوں گا۔

قرآن میں اس کے بعد مرد مومن کی جوابی تقریر نقل کی گئی ہے جس میں سب سے پہلے اغفال قلب کی سزا بھگتنے والے شرک کی اس نئی قسم کے شکار انسان کو مخاطب کر کے سب سے پہلے اس کا خالق اور پیدا کرنے والا یاد دلایا گیا ہے جسے وہ بھلائے ہوئے تھا۔ مرد مومن نے کہا کہ گرد اور دھول سے نکلنے والی غذاؤں سے جس کی قدرت سے نطفہ تیار ہوا اور اسی نطفہ کو تیری شکل میں ترقی دے کر تجھے جس نے آدمی بنایا اس کی ناشکری تو کیوں کرتا ہے؟ اور یہ کہتے ہوئے بھائی تیرے جی میں جو آئے سوچ اور جو جی میں آئے کر لیکن میں تو اپنے خدا کو بھلا نہیں سکتا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرا سکتا۔ پھر جس مغالطے میں مبتلا ہو کر شرک کی جس نئی لعنت میں وہ گرفتار تھا، اسی مغالطے پر تنبیہ کرتے ہوئے مرد مومن نے ایک عجیب سبق دیا۔ کہتے ہوئے کہ باغ جس پر تجھے ناز ہے اس میں داخل ہو کر تجھے سوچنا چاہئے کہ باغ، باغ کی زمین، پانی جس سے وہ سیراب ہوتا ہے، اس کے درخت کے بیج سے نکلنے والی شاخیں، پھل، پھول ان میں سے کوئی ایسی چیز ہے جسے تو نے وجود بخشا اور پیدا کیا ہے؟ یقیناً یہ سب کچھ اسی کی مشیت اور

ارادے کے مظاہر ہیں جس نے عالم کے اس نظام کو پیدا کیا ہے۔ باقی تجھے اپنی عقل وفراست سمجھ بوجھ اپنی محنت ومشقت اور سعی و کوشش کی قوتوں کے متعلق جو یہ خیال ہے کہ ان ہی کی مدد سے ان قدرتی پیداواروں کی تنظیم میں تو کامیاب ہوا ہے تو اسی کے ساتھ تجھے یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ تجھ میں یہ قوتیں کہاں سے پیدا ہوئی ہیں؟ یقیناً اپنے اندران قوتوں کو تو نے خودنہیں بھرا ہے بلکہ یہ ساری توانائیاں تجھ میں وہیں سے آئی ہیں جو کائنات کی ساری قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے مردمومن کے الفاظ:

﴿وَ لَوْ لَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَکَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾

''اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب داخل ہوا تو اپنے باغ میں تو کہتا کہ سب اللہ کا چاہا ہوا ہے (اور جن قوتوں سے باغ کی تنظیم ہوئی) نہیں ہے کوئی قوت مگر اللہ ہی ہے۔''

کم از کم ان لفظوں کا مفاد میرے ذہن میں تو یہی آیا ہے اور ہے بھی یہی واقعہ کہ سارا عالم ''ماشاءاللہ'' (جو کچھ چاہا اللہ نے) اور آدمی اپنے اندر جن توانائیوں اور طاقتوں کو پاتا ہے ان سب کی حقیقت لاقوۃ الا باللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، گو آفاق وانفس دونوں کو صرف ان دو فقروں میں بند کر دیا گیا ہے۔

بہر کیف عہد جدید کا جدید شرک اور اس کے نئے قالب کے مقابلے میں ایمان کی حفاظت کے لئے آپ ہی سوچئے کہ اس سے زیادہ منطقی حکیمانہ طریقہ تفہیم اور کیا ہوسکتا ہے[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۸۳۔۱۸۷

آیت: ﴿فَعَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِکَ وَ یُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا O اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَهٗ طَلَبًا O وَ اُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ كَفَّیْهِ عَلٰی مَآ اَنْفَقَ فِیْهَا وَ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا وَ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِکْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًاO وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا Oهُنَالِکَ الْوَلَایَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَیْرٌ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ عُقْبًا﴾ (الکهف: ۴۰-۴۴)

''مگر بہت ممکن ہے کہ میرا رب مجھے تیرے اس باغ سے بھی بہتر دے اور اس پر آسمانی عذاب بھیج دے تو یہ چٹیل اور پھسلنے والا میدان بن جائے یا اس کا پانی خشک ہو جائے اور تیرے بس میں نہ رہے کہ تو اسے ڈھونڈ لائے اس کے تمام پھل گھیر لئے گئے، تو وہ اپنے اس خرچ پر جو اس نے اس میں کیا تھا اپنے ہاتھ ملنے لگا اور وہ باغ تو اوندھا الٹا پڑا ہوا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ کاش کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرتا اس کی حمایت میں کوئی جماعت نہ اٹھی کہ اللہ سے اس کا بچاؤ کرتی اور نہ وہ خود ہی بدلہ لینے والا بن سکا یہیں سے ثابت ہے کہ اختیارات اس اللہ تعالیٰ ہمیشگی والے کے ہی، ہیں وہ ثواب دینے کے اور انجام کے اعتبار سے بہت ہی بہتر ہے۔''

مکالمہ کو ختم کرتے ہوئے مرد مومن نے نئے قسم کے اس مشرک سے کہا کہ سرمایہ کی کمی اور آبادی کی اقلیت کے ساتھ طنز کرتے ہوئے اپنی برتری اور بڑائی کے جس فخر کا اظہار میرے سامنے تم نے کیا ہے۔اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ باغ اور اس کی زرعی وثمری پیداوار سے جو معاشی آسانیاں آج قدرت کی طرف سے تمہارے لئے مہیا کی گئی ہیں اسی قدرت والے خدا سے میں توقع رکھتا ہوں کہ تم سے بہتر جنت (باغ) مجھے بھی عطا کرے گا گویا تم سے بھی زیادہ آسان، سہل معاشی ذرائع ہمارے لئے خدا مہیا کرے۔

مرد مومن نے صرف اس توقع کا ذکر کیا، علاوہ اس نتیجہ کے دنیاوی زندگی میں بھی معاشی سہولتوں کی توقع ایمانی زندگی کے منافی نہیں ہے۔ایک بات اس موقع پر سوچنے کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مالی قلت اور آبادی کی اقلیت کا جو طعنہ مرد مومن کو دیا گیا تھا اس طعنے کے مقابلہ میں سرمایہ کی فراوانی اور آبادی کی اکثریت کی توقع کا اظہار کیوں نہیں کیا گیا۔ جب امید ہی لگائی تھی تو مقابلتاً ان دونوں باتوں کی بھی امید لگا سکتا تھا۔ بظاہر اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ معاشی سہولتوں کے مہیا ہو جانے کے بعد خواہ مخواہ محض فخر و غرور کے لئے سرمایہ اور آبادی کی کثرت کی فکر میں گھلنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

خیر یہ تو مرد مومن نے اپنے متعلق کہا۔اسی کے ساتھ چوکاتے ہوئے اس مشرک مرد غیر مومن کو اس نے توجہ دلائی کہ جس باغ اور معاش کی جن سہولتوں پر ناز کر رہے ہو اور اپنی کوششوں کا نتیجہ ان کو سمجھتے ہو ڈرو کہ آسمانی ''حسبان'' یعنی ان کے متعلق حساب دینے کی گھڑی تمہارے سر پر نہ آجائے اور جس قدرت کا یہ عطیہ ہے حساب لینے کے بعد وہی قدرت باغ کی زمین کو نشوونما کی صلاحیتوں سے محروم کر دے اور تمہیں پانی کے جس ذخیرے پر اعتماد ہے یا ذخیرہ ختم کر دیا جائے اس طور پر ختم کر دیا جائے کہ آب

برآری کی ساری تدبیریں پانی کے برآمد کرنے میں ناکام ثابت ہوں۔

تاریخ کے صفحات آسمانی ''حسبان'' کے ان دونوں مثالوں سے لبریز ہیں، کتنے زرخیز ممالک آج بنجر میدانوں کی شکل میں پڑے ہوئے۔ مردمومن نے ان ہی تاریخی مثالوں کی طرف گویا اشارہ کیا۔ یہاں تک مکالمہ ختم ہوگیا۔ آگے قرآن میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ مردمومن کی پیشنگوئی یا آسمانی ''حسبان'' کی دھمکی اس عصر کی یا ماڈرن مشرک کے سامنے واقعۃً آگئی۔ معاشی سہولتوں، سرمایہ کی بہتات، برتری و بلندی کے سارے تماشے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور کف افسوس ملتے ہوئے اب اس کو احساس ہوا کہ عقلی وجسمانی جدوجہد کو جاری رکھتے ہوئے بھی میرا قائم کردہ معاشی نظام تہ وبالا جو ہوگیا تو اس کی وجہ بجز اس مشرکانہ ذہنیت کے اور کیا ہوسکتی ہے جس میں مبتلا ہو کر میں نے یہ باور کر لیا تھا کہ قدرتی کاروبار میں خود میری عقل وفراست سوجھ بوجھ سعی ومحنت بھی شریک ہے اور اب اس کی سمجھ میں آیا کہ کائنات کی ولایت ونگرانی صرف خدا ہی کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔ اپنی مشرکانہ ذہنیت پر بچارہ پچھتاتے ہوئے جیسا کہ قرآن میں نقل کیا گیا، کہتا تھا۔

﴿يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّىْٓ اَحَدًا﴾

''اے کاش! نہ شریک کرتا میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو''

اور یہی فقرہ جیسا کہ میں کہتا چلا آرہا ہوں اس سارے قصے میں سب سے زیادہ اہم ہے عرض کر چکا ہوں کہ غیر خدائی قوتوں کی پوجا پاٹ والے شرک کا پورے قصے میں نہ اشارۃً ذکر ہے اور نہ صراحۃً۔ مفسرین بھی حیران ہیں کہ جس شرک پر پچھتا رہا تھا اس کی نوعیت کیا تھی۔ شرک خفی کے نام سے مسلمانوں میں ایک اصطلاح جو مروج ہے جس میں یہ مانتے ہوئے کہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی کارفرمائیاں براہ راست حق تعالیٰ کے ارادہ ومشیت کی تابع ہیں اور اس معاملہ میں خالق کائنات کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں ہے، خیر وشر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے لیکن باوجود اس یقین وایمان کے اسباب کے راہ سے پیدا ہونے والی چیزوں کے متعلق اسباب کی دخل اندازی کا خیال بھی دلوں میں گزر جاتا ہے، ان ہی اسباب میں ارادہ واختیار کا وہ عنصر بھی ہے جس کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہمارے اختیاری اعمال وافعال پر اثر اندازی کا تعلق انسانی وجود کے اس عنصر سے بھی ہے۔ کچھ ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ شرک خفی ہے۔ مومن کے لئے جس کی حقیقت سچ پوچھئے تو وسوسہ اور خطرہ ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن ایمان کے اعلیٰ مدارج کا تقاضا یہی ہے کہ اس وسوسہ کے لئے بھی قلب میں گنجائش نہ چھوڑی جائے۔ بالفاظ دیگر شرک خفی میں بھی استقلالی حیثیت خدا اور اس کے حکم و ارادہ ہی کو حاصل ہوتی ہے اور اسباب وعلل کا خیال محض ایک ضمنی عارضی خیال کی حیثیت سے آجاتا ہے۔ برخلاف اس کے اس باغ والے آدمی پر شرک کی جس ذہنیت کو ہم مسلط پاتے ہیں، اس میں شرک خفی کے قطعی برعکس ساری کارفرمائیوں کو اسباب ہی کی طرف منسوب کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے اور خدا کا انکار تو نہیں کیا جاتا لیکن دنیا کے کاروبار میں اس کی مشیت وارادے کا خیال ہی نہیں آتا، یا آتا ہے تو اسی طرح جیسے شرک خفی میں اسباب وعلل کی طرف بھی کبھی موحد کا دھیان منتقل ہو جاتا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ شرک کی تمام قسموں میں یہ اس کی بدترین قسم ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ دجالی فتنہ سے رسول اللہ ﷺ نے جس سورۂ

کا تعلق بتایا ہے خصوصیات کے ساتھ اسی سورۃ میں شرک کی اس قسم کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ اس فتنہ کے ایام میں اس قسم کی مشرکانہ ذہنیت میں لوگ عام طور پر مبتلا ہو جاتے ہیں ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنے دل و دماغ کا جائزہ لے اور دیکھے کہ شرک کی اس ماڈرن اور عصری شکل سے وہ کتنا متاثر ہے۔ کم از کم ایک مومن کو اس کے سوا اور کچھ سوچنا نہ چاہئے کہ دنیا ہو یا آخرت کسی میں بہترین نتائج اور بہترین انجام کی ضمانت صرف اس یقین میں پوشیدہ ہے کہ عالم کی ولایت اور کارفرمائی صرف حق تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ محدود و مختص ہے اور یہی مفاد و مطلب ہے قصہ کے آخری فقرہ کے الفاظ کا کہ:

﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا﴾

''وہاں معلوم ہوتا ہے کہ سچی ولایت (عالم کی) صرف اللہ ہی کے لئے ہے، بہتر ثواب (نتیجہ کے لحاظ سے بھی) اور بہتر ہے عاقبت (انجام) کے لحاظ سے بھی'' [1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۸۹-۱۹۲

آیت : ﴿وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ○ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ○ وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ○ وَ عُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ م بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ○ وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰهَا وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ (الکھف:۴۵-۴۹)

''ان کے سامنے دنیا کی زندگی کی مثال بھی بیان کر جیسے کہ پانی جسے ہم آسمان سے اتارتے ہیں اس سے زمین کو روئیدگی ملتی ہے پھر آخر کار وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے مال واولاد تو دنیا کی زندگی کی ہی زینت ہے ہاں البتہ باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے نزدیک از روئے ثواب کے اور آئندہ کی اچھی توقع کے بہت ہی عمدہ ہیں جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور زمین کو تو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا اور تمام لوگوں کا ہم حشر کریں گے ان میں سے ایک کو بھی باقی نہ چھوڑیں گے سب کے سب تیرے رب کے سامنے صف بستہ حاضر کئے جائیں گے یقیناً ہم تمہیں اسی طرح لائے جس طرح تمھیں اول مرتبہ ہم نے پیدا کیا تھا لیکن تم تو اسی خیال میں رہے کہ ہم تمھارے لئے کوئی وعدہ گاہ کرنے ہی کے نہیں نامہ اعمال درمیان میں رکھ دیے جائیں گے پس تو دیکھے گا کہ گنہگار اس کی تحریر سے خوفزدہ ہو رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری خرابی یہ کیسی کتاب ہے؟ جس نے کوئی چھوٹا بڑا بغیر گھیرے باقی ہی نہیں چھوڑا جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم وستم نہ کرے گا۔''

زندگی کے موجودہ عبوری دور الحیوۃ الدنیا کو قرآن نے اس تمثیل سے سمجھانا چاہا ہے کہ بارش برستی ہے، زمین پر بکھرے ہوئے دانے بارش کے پانی سے مل کر لہلہا اٹھتے ہیں مگر چند ہی روز کے بعد خشک گھاس بھوسا بن کر اڑ جاتے ہیں اور سارا تماشا اسی پر ختم ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ آدمی زندگی کے موجودہ عبوری دور کا بھی یہی حال ہے کچھ مال و دولت، بال بچے اس کے اردگرد جمع ہو کر دوسروں کے لئے اس کی زندگی قابل رشک بنا دیتے ہیں لیکن موت سارے قصے کو درہم برہم کر دیتی ہے، فہمائش یہ کی گئی ہے کہ المال والبنون (سرمایہ اور اولاد) کے وقتی طمطراق میں اپنی کدوکاوش اور محنت و مشقت کے پسینے کے ایک ایک قطرے کو لگا دینا اور ان پہلوؤں سے قطعی بے تعلق ہو کر لگا دینا جن کے نتائج باقی رہنے والے ہیں اور مستقبل کی ساری روشنی ان ہی کے ساتھ وابستہ ہے کہاں تک عقل کا تقاضا ہو سکتا ہے؟ بارش والی تمثیل کے آخر میں خاص طور پر قابل توجہ اس کے یہ آخری الفاظ ہیں:

﴿وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾

''اور ہے اللہ ہر بات پر قادر''

بظاہر اس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ خشک دانے زمین پر بکھرے ہوتے ہیں لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ پانی برسا کر قدرت ان ہی خشک دانوں کو ہرا بھرا کر کے نمایاں کرتی رہتی ہے اور پھر خشک کر دیتی ہے۔ جس قدرت کے اس عمل کو مسلسل آدمی دیکھتا رہتا ہے۔ اسی قدرت کے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا رہنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ موت کے بعد پھر زندگی کو دوبارہ وہی قدرت نمایاں نہیں کر سکتی؟ آخر زندگی کو شکم مادر و شکم قبر ہی کے وقفے تک محدود قرار دینے پر اصرار کرنے والے اپنے اس تنگ نقطہ نظر کی تصحیح کے لئے قدرت کے متعلق کس مشاہدے کو پیش کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جب اس کی مخالفانہ شہادتوں سے دنیا بھری ہوئی ہے۔

بہر حال جن لوگوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ مر کر تم فنا نہیں ہوتے مگر وہ یہی کہتے جاتے ہیں کہ ہم تو فنا ہی ہو کر رہیں گے، ان کو تسلی دی جاتی ہے کہ ہر پیدا ہونے والا آدمی بہر حال باقی رہتا ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ نہیں ہم معدوم اور نیست و نابود ہو جائیں گے ان ہی کو قرآن نے آگے مطلع کیا ہے کہ اپنی مرضی سے پیدا ہونے والے جس طرح پیدا نہیں ہوتے اسی طرح اپنی خواہش کے مطابق کوئی اپنے آپ کو فانی و معدوم کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ جو کچھ زندگی کے موجودہ دور میں اس نے کیا ہے اس کے نتائج آئندہ زندگی کی شکل میں اس کے سامنے اس وقت آئیں گے جب عالم کا موجودہ نظام پلٹ دیا جائے گا۔ جو چیزیں اس وقت ساکن ہیں وہ اس انقلابی دور میں متحرک ہو جائیں گی اور جو اندر ہے وہ باہر ہو کر سامنے آجائے گا اور اس وقت دیکھنے والے دیکھیں گے کہ ان کے سارے کرتوت چھوٹے ہوں یا بڑے جو بظاہر نا پید ہو چکے تھے ایک ایک کر کے ان کے آگے کھڑے ہیں اور یہ بے بنیاد وہم جن لوگوں نے تراش لیا تھا کہ موت سارے قصوں کو ختم کر دیتی ہے، پائیں گے کہ یہ صرف ان کا وہم اور فقط ایک نفسیاتی دھوکہ تھا جواب دہی کی ذمہ داریوں سے گریز کا ایک خود ساختہ زبردستی کا حیلہ تھا۔

﴿ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾

''اور پائیں گے جو کچھ انہوں نے کیا تھا سب ان کے سامنے حاضر ہے۔''

کے الفاظ میں اسی واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے قرآن نے اسی سے بھی مطمئن کر دیا ہے کہ قدرتی نتائج عمل کرنے والوں کے سامنے جب آئیں گے تو وہ قدرتی نتائج ہی ہوں گے کمی و بیشی کی جن میں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۹۳۔۱۹۴

آیت : ﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا O مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا O وَ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا﴾ (الکھف:۵۰-۵۲)

’’ہم نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کے سامنے سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کرلیا، یہ جنوں میں سے تھا اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی، کیا پھر بھی تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا دوست بنا رہے ہو؟ حالانکہ وہ تم سب کا دشمن ہے ایسے ظالموں کا بہت برا بدلہ ہے میں نے انھیں آسمان وزمین کی پیدائش کے وقت موجود نہیں رکھا تھا اور نہ خود ان کی اپنی پیدائش میں اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا زور بازو بنانے والا بھی نہیں جس دن وہ فرمائے گا کہ تمھارے خیال میں جو جو میرے شریک تھے انھیں پکارو یہ پکاریں گے لیکن ان میں سے کوئی بھی جواب نہ دے گا تو ہم ان کے درمیان ہلاکت کا سامان کردیں گے۔‘‘

اس سورۂ میں بھی آدم اور شیطان کے قصے کا اعادہ کرتے ہوئے جیسا کہ قرآن کا قاعدہ ہے اس خاص مقام کی مناسبت سے اس قصے کے متعلق چند نئے اجزا کا تذکرہ کیا گیا جنہیں سورہ کہف کے سوا اور ہم کہیں نہیں پاتے، حالانکہ اس قصہ کو جیسا کہ معلوم ہے مختلف سورتوں میں اجزاء کی کمی وبیشی کے ساتھ قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے قصہ کے یہی جدید عناصر جنہیں ہم یہاں پاتے ہیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں اور ان ہی پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس موقع پر اس قصہ کا اعادہ کیوں کیا گیا ہے۔

آم اور شیطان کا قصہ تو مشہور ہی ہے یعنی فرشتوں کو جب آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو شیطان اکڑ گیا اور سجدہ کرنے سے اس نے انکار کیا۔ یہ حصہ قصہ کا تو یہاں بھی موجود ہے لیکن جدید عناصر جن کا اضافہ یہاں کیا گیا ہے میرے خیال کے مطابق وہ یہ ہیں۔

۱۔ شیطان ’’جن‘‘ کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا یعنی ’’كان من الجن‘‘ کا جو مفاد ہے۔

۲۔ شیطان تنہا نہیں ہے بلکہ اس کی ذریت (نسل یا بال بچے) بھی ہیں۔

قصے کے ان دونوں نئے اجزا کی طرف مفسرین کا ذہن بھی منتقل ہوا ہے اور بڑی طویل طویل دور دراز کار داستانوں میں لوگ مشغول ہو گئے، لیکن ان دونوں سے بھی زیادہ توجہ کی مستحق جہاں تک میرا اندازہ ہے تیسری نئی بات جو یہاں پائی جاتی ہے اس کی طرف لوگوں کا دھیان شاید نہیں گیا۔ مطلب یہ ہے کہ عام طور پر آدم وشیطان کے قصے میں آدم کے مقابلے میں شیطان کی آڑفونی کے ذکر کا پہلو غالب ہے، حضرت آدم کی تحقیر اور اپنی برتری وبلندی پر اس نے اس موقع پر جو زور دیا تھا زیادہ تر اس کو قرآن میں نمایاں کیا گیا ہے لیکن اس سورۂ میں بجائے اس کے سجدے کے حکم کے بعد:

﴿فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾

''پس خدا کی بات کو پھاڑ کر شیطان نکل بھاگا''۔

کے الفاظ میں صرف شیطان کے طرز عمل کی تعبیر کی گئی ہے جس کا حاصل بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اپنے خالق کے حکم سے سرتابی کے جرم کا شیطان نے جوارتکاب کیا تھا اور خدا کی بات سے لاپروائی اختیار کرتے ہوئے اپنے خودتراشیدہ خیالات اور اپنی رائے پر اسے اصرار تھا شیطان کے جرم کے اسی پہلو کی طرف اس خاص موقع پر قرآن خصوصیت کے ساتھ توجہ دلانا چاہتا ہے۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب غور کیجئے ان امور پر جو اس قصہ کے بعد اس سورۂ میں پائے جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی یاد سے غافل بن جانے کے بعد شرک کی نئی بیماری میں مبتلا ہونے کے ساتھ اپنی ساری کوششوں کو مادرو شکم قبر کی درمیانی وقفہ والی زندگی میں ہی کھپا دینے کے اصول پر آج جو اصرار کر رہے ہیں، ان کی اطاعت سے اہل ایمان کو قرآن نے جو منع کیا ہے بظاہر اس قصہ سے اسی ممانعت کے وجوہ و اسباب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ایمان والوں اور مسلمانوں میں ان غافلوں کی ریس کی جو ہوک اٹھتی ہے اس کی بنیاد ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ غافلوں کا یہ گروہ بھی نظر آتا ہے ہ آدمیوں ہی کا گروہ ہے۔ آدمی کو دیکھ کر اس کے رنگ کو اگر آدمی اختیار کرے تو ہم جنسی کا یہ قدرتی تقاضا ہے لیکن ہم جنسی کے لئے صرف ظاہری شکل و صورت کا اشتراک کیا کافی ہے؟ آدم و شیطان کے قصے کے امتیازی اجزاء جن کا خصوصیت کے ساتھ یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ شیطان جو ''جن'' کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ باوجود جن ہونے کے صفاتی تبدیلیوں کی وجہ سے ملائکہ (فرشتوں) میں شریک ہوگیا تھا اس لئے اس حکم میں جو فرشتوں کو دیا گیا تھا وہ بھی شریک تھا، مگر اس کے بعد اپنے ملکی صفات و خصوصیات کو کھو بیٹھا اور خالق تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں اپنی خود تراشیدہ رائے اور بافیدہ خیالات کا تابع بن گیا ہے اور جیسے صفاتی تبدیلیوں نے شیطان کو ملائکہ کی جماعت میں شریک کر دیا تھا اسی طرح بہت سے آدم زاد جو شکلاً و صورۃً آدم زاد معلوم ہوتے ہیں لیکن انہوں نے بھی خدا کی باتوں کو بے وزن ٹھہراتے ہوئے اپنی سوچی ہوئی باتوں سے علم و عمل کا نظام قائم کیا، ظاہر ہے کہ ذاتاً آدم کی اولاد ہونے کے باوجود صفاتاً وہ شیطان ہی کی ذریت اور نسل میں داخل ہو جاتے ہیں، جیسے جنی شیطان صفات ہی کی وجہ سے کچھ دن کے لئے ملائکہ میں شریک ہوگیا تھا۔

اور یہ بھی سبق اس سے ملتا ہے کہ کائنات کی ابتداء انتہا انسانی وجود کے مدعا وغیرہ سوالات کے جواب کی تعلیم خود خالق کائنات کی طرف سے ہمیں حضرات رسل و انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو ملی ہے اور اسی کی بنیاد پر جس عملی زندگی کا مطالبہ ہم سے کیا گیا ہے اس کی بے وقعتی کرتے ہوئے جب اللہ کی یاد سے ان غافل قلوب کے تصورات و خیالات کے وزن کو ہم محسوس کرنے لگیں تو اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ شیطان اور شیطان کی ذریت و نسل جو صورتاً و شکلاً آدمی معلوم ہوتے ہیں ان ہی کی ولایت اور نگرانی کو ہم قبول کر رہے ہیں۔

فرمایا گیا کہ جو دشمن ہیں، محض صورت و شکل کے اشتراک کی وجہ سے ان ہی کو تم دوست بنا رہے ہو اور جو تمہارا خالق و مالک، رزاق و رب ہے اس کی باتوں کو بے وقعت ٹھہرا رہے ہو۔

﴿ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾

''(فطرت کے نشان زدہ حدود سے ہٹنے والے) ظالموں نے کتنا برا بدل اختیار کیا ہے۔''

کے الفاظ میں اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آگے سمجھایا گیا ہے اور کتنی واضح صاف معقول منطقی بات ان کے آگے رکھی گئی ہے کہ خالق کائنات کی باتوں کے مقابلہ میں ان صفاتی شیطانوں اور صوری انسانوں کی باتوں کے متعلق اپنے اندر غیر معمولی کشش اور وزن جو تم محسوس کر رہے ہو، آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ جو فلسفہ یہ بگھارتے ہیں اور جس فلسفہ کی بنیاد پر عملی زندگی کا نظام انہوں نے قائم کیا ہے کیا اس فلسفہ کی بنیاد کسی علم پر قائم ہے فرمایا۔

﴿مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾

''میں نے ان کو اس وقت اپنے سامنے بلا کر کھڑا نہیں کر لیا تھا جب آسمانوں اور زمین کی آفرینش ہو رہی تھی۔''

ظاہر ہے کہ اس وقت ان کا کیا، ان کے آباؤ اجداد کا بھی پتہ نہ تھا، خود آدم پیدا نہ ہوئے تھے۔ پھر جو کہتے ہیں کہ عالم کی ابتداء یوں ہوئی، پہلے یہ ہوا، وغیرہ وغیرہ بجز لفاظیات کے وہ اور بھی کچھ ہے؟

اسی طرح عالم کے کاروبار سے حق تعالیٰ کو بے تعلق ٹھہراتے ہوئے جو یہ مدعی ہیں کہ اس سارے کاروبار کی باگ ہمارے قبضہ اقتدار میں ہے اور قدرت ان ہی کے بل بوتے پر دنیا کو چلا رہی ہے اطلاع دی گئی ہے کہ جو صرف یہی نہیں کہ بذات خود گمراہ ہیں بلکہ شیطان کی زینت بن کر دوسری قوموں کو سیدھی راہ سے بھٹکا کر گمراہ کر رہے ہیں ان ہی کو خدا کیا اپنا مددگار اور قوت بازو بنا سکتا ہے؟

﴿مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا﴾

''اور گمراہ کرنے والوں کو میں نہیں بنانے والا ہوں قوت بازو''

کا کھلا ہوا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اور اسی لئے کہ اس موقع پر اسی ماڈرن شرک کا ذکر اوپر سے ہوتا چلا آ رہا ہے یہ خیال گزرتا ہے کہ آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک دن وہ بھی ہوگا جب ان سے کہا جائے گا کہ کائناتی کارفرمائیوں میں جن لوگوں کو میرا ساجھی اور شریک تم لوگ اپنے خیال میں ٹھہراتے تھے انہیں پکارو مگر ان کی طرف سے کوئی جواب پکارنے والوں کو نہیں ملے گا۔ اعلان کیا گیا ہے کہ اس دن موبق (ہلاکت کی وادی) کو اپنے اور شرکاء کے درمیان پائیں گے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۹۴۔۱۹۸

آیت : ﴿وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ یَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا﴾ (الکہف: ۵۳)

''اور دیکھا مجرمین نے آگ کو تب خیال کرنے لگے کہ اب تو اسی آگ میں ان کو (بہر حال) گرنا ہی ہے اور (بچنے کے لئے) اس سے بازگشت کی کوئی صورت وہ نہ پائیں گے۔''

قرآن میں

﴿وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ یَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا﴾

کا ایک نظارہ جو پیش کیا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ پرانے جاہلی شرک کرنے والے شرکاء اور مشرکین کے سامنے زندگی کی کس منزل میں یہ تماشا بے نقاب ہوگا، لیکن تعلیم یافتہ مشرکوں کے شرکاء کے لحاظ سے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے سامنے شاید یہ صورت ہو چکی ہے، پہلی جنگ عظیم کے بعد شرک جدید کے علاقوں میں یہی دیکھا جا رہا ہے کہ تابڑ توڑ ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبتوں، ایک آفت کے بعد دوسری آفتوں کا لامحدود سلسلہ ہے جو شروع ہونے کے بعد ختم کرنے کی انتہائی کوششوں کے باوجود بجائے ختم ہونے کے آگے ہی بڑھ رہا ہے جو جہنم بھڑک اٹھی ہے، بجائے بجھنے کے اپنی شدت میں تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی ہے، پکارنے والے شرک جدید کے ان ہی شرکاء کو پکار رہے ہیں، چلا رہے ہیں کہ اپنی عقل و سیاست و دور اندیشی اور دقیقہ سنجی، پالیسی، ڈپلومیسی کے سلیقوں سے کام لو، الجھے ہوئے قصوں کو سلجھاؤ لیکن وہ بیچارے ان کی کیا مدد کریں گے؟ حال جب یہ ہے کہ چھوٹے شرکاء تو خیر چھوٹے ہی ہیں، آئنسٹائن جیسے امام الائمہ کی پوزیشن والے بھی بلی سے بھاگے ہوئے چوہے کی طرح ایک بل سے نکل کر دوسرے بلوں کی تلاش میں آج سرگرداں ہیں اور تیرہ سو سال پہلے جو بات سنائی جا رہی تھی وہی دیکھی جا رہی ہے کہ پکارنے والے اور جنہیں پکارا جا رہا ہے دونوں اپنے آپ کو موبق (ہلاکت کی کھائی) کے کنارے کھڑا پا رہے ہیں اور تقریباً یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تباہی اور بربادی کی جہنم ان کی نگاہوں کے سامنے آ چکی ہے اب اس سے مصرف اور بازگشت کی کوئی امکانی صورت باقی نہیں رہی ہے۔[1]

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۹۹۔۲۰۰

آیت: ﴿وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ۝ وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَ یَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝ وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ وَ یُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَ اتَّخَذُوْۤا اٰیٰتِیْ وَ مَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ۝ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِیَ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ یَّهْتَدُوْۤا اِذًا اَبَدًا ۝ وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ یُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ یَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ۝ وَ تِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا﴾ (الکھف:۵۴-۵۹)

''اور گردش دیے ہیں ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر نمونے سے اور تھا الانسان جدل میں بہت بڑھا ہوا، لوگوں کے پاس ہدایت آچکنے کے بعد انھیں ایمان لانے اور اپنے رب سے استغفار کرنے سے صرف اسی چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں کا سا معاملہ انھیں بھی پیش آئے یا ان کے سامنے کھلم کھلا عذاب آموجود ہو جائے ہم تو اپنے رسولوں کو صرف اس لئے ہی بھیجتے ہیں کہ وہ خوشخبریاں سنا دیں اور ڈرا دیں کافر لوگ جھوٹی باتوں کو سند بنا کر جھگڑے کر کے چاہتے ہیں کہ اس سے حق کو لڑکھڑا دیں وہ میری آیات اور جس چیز سے ڈرایا جائے اسے مذاق میں اڑاتے ہیں اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سے نصیحت کی جائے اور پھر بھی منہ موڑے رہے اور جو کچھ اس کے ہاتھوں نے آگے بھیج رکھا ہے اسے بھول جائے بے شک ہم نے ان کے دلوں پر اس کی سمجھ سے پردے ڈال رکھے ہیں اور ان کے کانوں میں گرانی ہے گو تو انھیں ہدایت کی طرف بلاتا رہے لیکن یہ کبھی بھی ہدایت نہیں پانے کے اور تیرا بہت بڑا بخشنے والا رب رحمت والا ہے جو کچھ انہوں نے کیا اگر ان کو اس پر پکڑ لے تو عذاب کو ان پر فوراً لے آئے بلکہ (ان کی گرفت کے لئے) ایک خاص وقت کا وعدہ ہے ہرگز نہ پائیں گے اس سے کوئی پناہ کی جگہ''۔

﴿وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا﴾

''اور گردش دیئے ہیں ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر نمونے سے اور تھا الانسان جدل میں بہت بڑھا ہوا۔''

اس میں کل مثل یعنی ''ہر نمونے'' کا جو لفظ ہے، ظاہر ہے کہ ان ہی نمونوں سے اس کا تعلق ہونا چاہئے جس کا دین اور مذہب سے رشتہ ہو، پھر مذہب اور دین کے متعلق آج کوئی جدید نقطہ نظر اور طریقہ فکر اگر پیدا ہوا ہے اور قرآن میں ہم اس کے متعلق اشارات پاتے ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے بلکہ اتنا عظیم انقلابی طریقہ فکر جس کا تجربہ شرک کی موجودہ عصری ذہنیت کرا رہی ہے اس سے خاموشی یہی بات ھذا القرآن یعنی اس آخری آسمانی کتاب کے لئے جس کے بعد کوئی کتاب اترنے والی نہ تھی محل حیرت ہو سکتی تھی کچھ نہیں صرف۔ ''ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ'' کے چند لفظی فقرے میں آفاق والنفس (آدمی کے باہر اور آدمی کے اندر)

کے متعلق جتنی استوار و محکم منطقی تعبیر میں حقیقت واشگاف کی گئی ہے کیا اس کے بعد اس تعلیمی شرک کا کوئی رگ و ریشہ باقی رہ سکتا ہے؟ اسی لئے سوال ہوتا ہے کہ قرآن اور قرآن کے ان سکینت آفرین ایمان افروز بیانوں کی روشنی میں گو قدیم شرک کی دیواریں اس میں شک نہیں کہ خود کو ماننے والوں کے اندر بھی مل چکی ہیں لیکن جدید شرک کے بازار کی رونق اگر بڑھ نہیں رہی ہے تو کم بھی نہیں ہوئی ہے اور سر دست اس کمی کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

پھر اس کا انجام آخر کیا ہوگا؟ قرآنی ہدایت کی تیز و تند روشنی کے ہوتے ہوئے بھی دنیا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں کیوں مار رہی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ پہلے بھی دیکھا گیا ہے اور اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ حق کے مقابلہ میں جدلی منہ زوریوں سے کام لینے والے بالآخر تمسخر اور استہزاء پر عموماً اتر آتے ہیں اور استہزاء و تمسخر کا قدرتی یہ نفسیاتی اثر ہے کہ حقائق و واقعات پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کے سلیقہ سے ایسے لوگ محروم ہو جاتے ہیں۔ جو ٹھٹھوں اور قہقہوں میں باتوں کے اڑا دینے کے عادی ہو گئے ہوں۔ کان رکھتے ہوئے وہ نہیں سنتے اور آنکھوں کے باوجود انہیں کچھ نہیں سوجھتا۔ اسی موقع پر یہ اطلاع دیتے ہوئے۔

﴿وَ اتَّخَذُوْٓا اٰیٰتِیْ وَ مَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا﴾

''انہوں نے میری آیتوں کو اور جن باتوں سے ان کو چونکا دیا گیا (سب کو) مذاق اور تمسخر بنالیا۔''

ان مسخروں کے ظلم اور خدا کی باتوں سے ان کی لاپروائیوں کا تذکرہ کر کے یہ جو قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

﴿اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾

''قرآن کو وہ سمجھیں (اس معاملہ میں) ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ٹھونس دی ہے''۔

بظاہر انسانی نفسیات کے اسی باطنی مہلک عارضہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عجب مرض ہے قاعدہ ہے کہ استہزائی خفقان کا دورہ جب کسی پر پڑتا ہے تو قلم اور زبان دونوں سے اس دورے کے ایام میں دیکھا جاتا ہے کہ چبھتے ہوئے چست فقرے بے ساختہ نکل رہے ہیں، اپنی طباعی اور غیر معمولی ذہانت کے دھوکے میں غریب مسخرہ اس کی وجہ سے خود بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور خام کاروں کی طرف سے داد وں کا سیلاب جب امنڈتا ہے تو دوسروں کو بھی وہ وقت کا مجتہد نظر آتا ہے اور خود اپنے متعلق بھی بے چارہ اسی فریب کا شکار ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً اس باطنی اور نفسیاتی سزا کی زنجیریں کستی ہی چلی جاتی ہیں وہ سمجھتا ہے کہ میں کھل رہا ہوں حالانکہ اور زیادہ بندھتا چلا جاتا ہے۔ یہ بڑی خطرناک ذہنی کیفیت ہے۔ ''قبول حق'' کی گنجائش ان حالات میں تقریباً سلب ہو جاتی ہے اور علاج کی کوئی صورت اس کے سوا باقی نہیں رہتی جس کا ذکر یہاں بایں الفاظ فرمایا گیا ہے۔

﴿اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا﴾

''یہ کہ پہلوں کا طریقہ ان کے سامنے آئے یا قسط وار عذاب ان کے آگے آئے۔''

قدرتی مواخذہ کی مستقل شکلوں کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے سنۃ الاولین (پہلوں کا طریقہ) اس کا مطلب وہی ہے جو عام مفسرین نے لکھا ہے کہ جیسے گزشتہ مایوس العلاج اقوام اور امتوں کا کلی صفایا کر دیا گیا۔ اولین کی تاریخی سنت کے

نمونوں کی بکثرت مثالیں خود قرآن میں موجود ہیں اور دوسری شکل اس اجتماعی مواخذہ کی یہ ہے کہ بتدریج مختلف مصائب و آلام کی ایک قسط کے بعد دوسری قسط کا نشانہ ان کو بنالیا جاتا ہے تا ایں کہ بالآخر نیست و نابود ہو جاتی ہیں شاید ہمارے زمانے کے دجالی فتنہ اور ان کی پیدا کی ہوئی طغیانیوں کے ساتھ مواخذہ کی دوسری صورت کا ظہور شروع ہو چکا ہے اور جب شروع ہوا ہے تو بہر حال انجام تک پہنچ ہی کر رہے گا۔

اور سچ پوچھئے تو ارحم الراحمین کی رحمت عامہ اور اس کی صفت غفوریت کے تقاضوں کے یہ کرشمے ہیں کہ گرفت میں قدرت کی طرف سے بجائے عجلت کے تاخیر و تمہیل سے کام لیا جارہا ہے اور میرا کوئی ذاتی احساس یا صوفیانہ حسن ظن ہی نہیں ہے بلکہ:

﴿وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا﴾

''اور اب اگر تو ان کو ''الہدیٰ'' کی طرف بلائے گا بھی تو وہ کبھی راہ پر نہیں لگ سکتے۔''

کی فیصلہ کن اطلاع کے ساتھ قرآن ہی میں یہ فرمانے کے بعد:

﴿وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ﴾

''اور تیرا بہت بڑا بخشنے والا رب رحم والا ہے جو کچھ انہوں نے کیا اگر ان کو اس پر پکڑ لے تو عذاب کو ان پر فوراً لے آئے۔''

یہ اعلان کیا گیا ہے:

﴿بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا﴾

''بلکہ (ان کی گرفت کے لئے) ایک خاص وقت کا وعدہ ہے ہرگز نہ پائیں گے اس سے کوئی پناہ کی جگہ۔''

ظاہر ہے کہ جن کے متعلق قطعی فیصلہ کی صورت میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی ہو کہ وہ راہ پر نہیں لگ سکتے اور ہدایت نہیں پا سکتے، ان ہی کے متعلق یہ خیال کہ توبہ واستغفار کی گنجائش پیدا کرنے کے لئے ان کو ڈھیل دی جارہی ہے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ گرفت میں عدم تعجیل حق تعالیٰ کی اس رحمت عامہ کا تقاضا ہے جس سے کوئی محروم نہیں ہے اور اس کی اسی رحمت واسعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ غفوریت یعنی گناہوں کے نتائج کو دبا دینے کی الٰہی صفت سے ان کو بھی مستفید ہونے کا موقع عطا کیا جاتا ہے جن کو توبہ اور بازگشت کی توفیق کبھی میسر نہ آئے گی۔ لیکن خدا کی غفوریت ان کی شرارتوں اور نافرمانیوں کے نتائج کو کب تک اور زندگی کی کن کن منزلوں میں دبائے رکھے گی۔ اس کا صحیح علم تو خدا ہی کے پاس ہے با ایں ہمہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ نیک کاروں اور بدکاروں، مجرمین وغیر مجرمین دونوں کو برابر کر دیا جائے۔ اس لئے بہر حال خدا کے انصاف اور عدل کے تقاضے بھی پورے ہوں گے اور وہی موعد (وعدہ کا وقت و مقام خاص) ہے۔ جس منزل پر پہنچنے کے بعد فرماں برداروں، اطاعت شعاروں کا انجام دیکھا جائے گا کہ نافرمانوں اور باغیوں کے انجام سے جدا قطعاً جدا ہو گیا جو کچھ ایک کے سامنے آ گیا وہ اس سے قطعاً مختلف تھا، جس سے دوسرے طبقہ کو دوچار ہونا پڑا۔ اسی کے بعد چونکہ:

﴿وَ تِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا﴾

''اور یہ بستیاں تباہ کر دیا جنہیں ہم نے جب انہوں نے ظلم کیا اور ان کی تباہی کے لئے بھی موعد (وعدہ کا خاص زمانہ) ہم نے مقرر کیا تھا۔''

کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ موعد اور وعدے کا تعلق ہر ایک شخص کی انفرادی زندگی سے ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے اپنی انفرادی زندگی کے نتائج بہر حال آکر رہیں گے اور ان نتائج سے بچ کر نکل بھاگنے میں ''موئل'' یا جائے پناہ کی تلاش کرنے میں کوئی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ انفرادی زندگی کے ان نتائج کے ظہور کا حقیقی مقام مستقل دوامی زندگی کی وہ منزل ہے جس میں موجود عبوری گزشتنی اور گزاشتنی دور کے بعد آدم کی اولا د داخل ہوگی۔

لیکن قوموں کے اجتماعی جرائم کے متعلق کچھ دیر پہلے آپ سن چکے کہ قرآن مجید میں مواخذہ اور گرفت کی دو شکلیں بتائی گئی ہیں۔ یعنی سنۃ الاولین (اگلوں کا طریقہ) جس کا مطلب جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے یہ ہے کہ اچانک ان پر ایسا عذاب آجاتا ہے جس کے بعد اس قوم کا کلی صفایا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوجاتا ہے، عرض کر چکا ہوں کہ اولین (اگلوں) کی اس سنت (طریقہ) کے تاریخی نمونوں اور مثالوں کے ذکر سے قرآن معمور ہے، قوم نوح، عاد، ثمود، ایکہ وغیرہ وغیرہ کی گرفت قدرت کی طرف سے اسی رنگ میں ہوئی اور اجتماعی مواخذہ کی دوسری شکل وہ ہے جسے ''او یاتیھم العذاب قبلا'' (یا آئے عذاب ان پر قسط وار تھوڑا تھوڑا کر کے) کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جس فتنے سے سورہ کہف کا تعلق ہے میں نے کہا تھا کہ اس فتنہ کی طغیانیوں کے مقابلہ میں مواخذہ اور گرفت کی اسی دوسری شکل کی ابتداء بظاہر ہو چکی ہے اور یہ دوسرا فقرہ جس میں ظالم قوتوں کی تباہ شدہ آبادیوں کی طرف اشارہ کر کے قرآن نے جس ''مہلک''، یعنی پیش آنے والے ہلاکت خیزیوں کی دھمکی دی ہے اور اطلاع دی ہے کہ اس کا بھی ایک موعد (وعید کا وقت) مقرر ہے۔ اس کا تعلق اخروی زندگی والے مواخذے کے مقابلہ میں اجتماعی زندگی کی اس گرفت اور مواخذے سے ہے جس کا ظہور زمین کے اس کرہ پر ہونے والا ہے۔ آخر میں پوچھتا ہوں کہ ظالموں کی جن برباد شدہ اجڑی ہوئی بستیوں کی طرف عبرت حاصل کرنے کے لئے قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ یہ بستیاں جب زمین کے اسی خاکی کرہ پر برباد ہوئیں تو اس فقرے میں جس ''مہلک'' یا ہلاکت خیزیوں کی خبر دی گئی ہے اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ حادثہ بھی خاک دان ارضی پر ہی پیش آئے گا۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے سنۃ الاولین کے قبلا (قسط وار) ہی کی شکل میں مہلک کی یہ وعید پوری ہوگی اور عذاب کی جن قسطوں کا آغاز ہو چکا ہے بہر حال وہ انجام تک پہنچ کر ہی رہے گا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اسی سورہ کہف کی ابتدائی آیات میں جس من لدنی عذاب شدید کی دھمکی دیتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ ما علی الارض زمین پر جو کچھ ہے سب کو میں صعید جرز (چٹیل اجاڑ میدان) بنا دینے والا ہوں، ان ابتدائی باتوں کا سورہ کے آخری اجزا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یقیناً جو کچھ اب تک دکھایا جاچکا ہے۔ قرآنی پیشینگوئیوں کے سمجھنے اور سمجھانے کیلئے وہی کافی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدو خال، ص۲۰۰۔۲۰۵

آیت : ﴿اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (الکھف:۶۵)

''دے رکھا تھا اپنے پاس سے ہم نے اسے رحمت اور سکھایا تھا ہم نے اپنے حضور سے اس کو علم''۔

بجائے نام کی ان دو صفات یعنی:

﴿اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾

سے جس شخصیت کو روشناس کرایا گیا ہے ان کا نام کیا تھا؟ واقعہ کی تحقیق کے لحاظ سے علم تاریخ کا تو یہ مسئلہ ہوسکتا ہے لیکن قرآن جس کام کے لئے نازل ہوا ہے شاید اس مقصد کے لئے ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، ضرورت ہوتی تو یقیناً قرآن ہی میں ان کو واضح کر دیا جاتا، تاہم صحیح بخاری کی مشہور روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ یہ موسیٰ کون تھے؟ حضرت ابی بن کعب کے حوالہ سے ابن عباس نے بیان کیا کہ بنی اسرائیل والے موسیٰ بن عمران تھے۔ بہر حال قرآنی الفاظ کے رو سے سوچنے کی بات اگر ہوسکتی ہے تو یہ دونوں فقرے ہوسکتے ہیں جن کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے کہ جس شخص کی ملاقات سے بلیغ جستجو اور پختہ عزم کے بعد موسیٰ علیہ السلام کامیاب ہوئے تھے ان کی ذات ایک نہیں بلکہ دو مستقل کمالات اور خوبیوں کی جامع تھی۔ دوسری بات یعنی ''علمنه من لدنا علما'' کا مطلب تو ظاہر ہے کہ حسی و عقلی ذرائع کے سوا براہ راست علم و آگہی کی روشنی حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے سینے میں چمکتی رہتی تھی، اور اسی روشنی میں بعض مخفی حقائق جن کا علم صرف عقل و حواس کے ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا، ان سے واقف ہو جاتے تھے۔ یقیناً ان کے عملی درس کے عملی نمونوں میں بھی اس علم لدنی کی شہادتیں مل رہی ہیں، لیکن دریافت طلب پہلا فقرہ ''اتینـاه رحمة من عندنا'' کا ہے۔ ہم نے اپنے پاس سے اس کو رحمت عطا کی تھی۔ یہ تو اس کا ترجمہ ہوا لیکن مطلب کیا ہے۔ صحاح کی مشہور حدیث:

ان لله تعالیٰ مائة رحمة فمنها رحمة يتراحم الخلق بينهم[1]

''اللہ تعالیٰ کی رحمت کو سو حصوں پر مشتمل سمجھا جائے تو ان میں سے صرف ایک حصہ رحمت کا ہے (جو مخلوق کو ملا ہے) اسی کی وجہ سے ایک مخلوق دوسری مخلوق پر رحم کرتی ہے''۔

نیز اسی کے قریب قریب دوسرے الفاظ میں جس واقعہ کا اظہار روایتوں میں کیا گیا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر یہ سمجھا جائے کہ خالق کے ساتھ جیسے علم لدنی کا تعلق وہ رکھتے تھے اسی طرح مخلوق کے ساتھ رحمت و کرم، غمگساری و بہی خواہی و ہمدردی کے جذبات سے بھی قدرت نے ان کے قلب کو معمور فرما دیا تھا۔ اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ کھلی زندگی اور اس کے مشاغل کی دشواریوں کے حل کی طرف اس قصے میں جو اشارے کئے گئے ہیں، ان اشاروں پر عمل اور اس جرات آزما عمل پر اقدام کی جسارت اسی قسم کے پاک نفوس میں پیدا ہوسکتی ہے جن کی ذات مذکورہ بالا دونوں خوبیوں کی جامع ہو ورنہ جن میں صرف خلقت کی ہمدردی و بہی خواہی کا جذبہ تو پایا جاتا ہے مگر ''لدنی علم'' کی نعمت سے محروم ہیں وہ کسی قوم کے مخلص قائد اور لیڈر تو بن سکتے ہیں لیکن دجالی فتنے کے عبوری دور میں جن ہمت شکن اقدامات کی ضرورت ہے ان کو وہ شاید چھو بھی نہیں سکتے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ ان بزرگوں کے کاموں پر معترض ہی ہوں اور کچھ یہی دیکھا بھی جا رہا ہے۔

---

[1] مسلم بن حجاج بن مسلم، القشیری، صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانھا تغلب غضبہ [۶۹۷۵] ۲۰۔ (۲۷۵۳)، ص ۱۱۵۵

اسی طرح کشف والہام کی لذتوں میں جو غرق ہیں، وہ ایک صوفی باصفا، درویش، نیک اندیش تو ہو سکتے ہیں لیکن کھلی زندگی کی ان خدمات کی بجا آوری شاید ان کے بس کی بات بھی نہیں اور اسی بنیاد پر اگر یہ سمجھا جائے کہ جن بزرگوں سے یہ کام بن پڑا ان کو بھی ان دونوں خضری کمالات سے حصہ ملا تھا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، سچ پوچھئے تو عہد فتنہ کی راہ نمائی کے جائز حقدار وہی تھے، اس عہد میں وہی کامیاب و بامراد ہو کر نکلے گا جس نے ان کا دامن تھام لیا۔[۱]

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۲۲۔۲۲۳

آیت : ﴿اَمَّا السَّفِیْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ یَّاْخُذُ كُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا﴾ (الکھف:۷۹)

''کشتی تو چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کاج کرتے رہتے تھے میں نے اس میں کچھ توڑ پھوڑ کرنے کا ارادہ کرلیا کیونکہ ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو جبراً ضبط کرلیتا تھا۔''

کشتی والے نمونے سے جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے خود ہی تصریح کی یہ بتانا اور سمجھانا مقصود تھا کہ ایسے مواقع بھی کبھی پیش آجاتے ہیں جن میں ظالم کو اس کی ظالمانہ چیرہ دستیوں سے ہٹانے کے درپے ہونا وقت کے اقتضاء کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ ایسے زمانہ میں مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ظالم اپنی ظالمانہ کاروائیوں کا نشانہ جس چیز کو بنانا چاہتا ہو اسی میں بظاہر کچھ ایسے نقائص اور عیوب چاہئے کہ عمداً اور قصداً پیدا کردیئے جائیں جن کی وجہ سے ظالم کے حرص وآز کی نگاہوں سے تو وہ چیز گر کر اس کے سامنے سے ہٹ جائے لیکن بذات خود وہ شے بھی باقی رہ جائے اور جو کام اس سے نکل رہا ہو، اس میں خلل پیدا نہ ہو۔

الغرض ظالم کو ظلم سے ہٹانے کی گنجائش جہاں نہ معلوم ہوتی ہو تو اس وقت یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز پر اپنے (ظلم وتعدی) کی مشق ظالم کرنا چاہتا ہو اسی کو ظالم کے سامنے سے ہٹا دیا جائے خواہ اس کی وجہ سے کچھ عیب اور نقص ہی کا نقصان مظلوموں کو کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔ اور ہے بھی عقل کی یہی بات کہ کلیتہً جس چیز سے محرومی کا خطرہ جہاں محسوس ہو رہا ہو وہاں نقص اور عیب ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو، خود اصل چیز کا بچ جانا اسی کو غنیمت خیال کرنا چاہئے۔ شگاف یافتہ ہی سہی لیکن غریب ملاحوں کی وہ کشتی بچ تو گئی اور ملاحوں کا کام بھی اس سے نکلتا رہا۔ حالانکہ خرق اور شگاف کا عیب اگر اس میں نہ پیدا کردیا جاتا تو دریا کے اس پار کا ظالم حکمران غریب ملاحوں سے زبردستی چھین کر ہمیشہ کے لئے اس کشتی اور کشتی کے منافع سے ان کو محروم کردیتا۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۰۷

آیت : ﴿وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَکَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَیْنِ فَخَشِیْنَآ اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّ کُفْرًا ۝ فَاَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَکٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا﴾ (الکہف: ۸۰، ۸۱)

''اور اس نوجوان کے ماں باپ ایماندار تھے ہمیں خوف ہوا کہ کہیں یہ انھیں اپنی سرکشی اور کفر سے عاجز و پریشان نہ کر دے اس لئے ہم نے چاہا کہ انھیں ان کا پروردگار اس کے بدلے اس سے بہتر، پاکیزگی والا اور اس سے زیادہ محبت و پیار والا بچہ عنایت فرمائے۔''

دوسرا عملی درس حضرت خضر علیہ السلام نے غلام یا اس کے صاحبزادے کو ختم کر کے دیا جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دریافت فرمانے پر کہ ایسی شخصیت جو اندرونی گندگیوں سے پاک بھی تھی (نفس زکیہ کے الفاظ سے ان کی یہی مراد تھی) اور اس بے چارے نے کسی کی جان بھی نہ ماری تھی، اس کی گردن بلاوجہ آپ نے کیوں اڑا دی؟ یعنی کہا تھا:

﴿اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَکِیَّةً بِغَیْرِ نَفْسٍ﴾ (الکہف: ۷۴)

''آپ نے قتل کر دیا ایک پاک (ذکیہ) نفس کو کسی جان کے بدلہ کے بغیر''۔

اس موسوی اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے سامنے جس حقیقت کا انکشاف فرمایا تھا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسری بات، یعنی اس نے کسی کی جان نہیں ماری تھی، اس الزام سے تو شاید وہ بری تھا لیکن پاک باطن اور نفس زکیہ ہونے کا دعویٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے متعلق جو کیا تھا، اسی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے خضر علیہ السلام نے اس واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کو مطلع کیا کہ پیدا تو ہوا تھا مومن والدین سے یعنی ایمان والی خاتون کی گود میں اس کی پرورش ہوئی تھی اور نشو و نما بھی اس کی ہوئی تھی ایک مومن باپ ہی کے زیر سایہ، دودھ بھی پیا تھا اس نے اسی مومنہ ماں کا، اور عقل و شعور ہوش و حواس کے درجے تک بھی پہنچا تھا اپنے مومن باپ کی دستگیریوں ہی سے، اسی کی انگلیاں پکڑ کر سن تمیز و رشد کے پانے میں کامیاب ہوا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اسباب پیش آئے اور کسی ایسے ماحول میں جا کر پھنس گیا کہ بجائے احترام و تعظیم کے اس کے اندر طغیان اور سرکشی کے جذبات والدین کے مقابلے میں ابھرتے ہوئے ترقی کر کے اس حد تک پہنچ گئے کہ مومن والدین کا یہ بچہ کفر یعنی ارتداد کے جرم تک کا مجرم بن گیا اور اور اپنے طغیان و سرکشی، کفر و ارتداد کا دباؤ ڈال ڈال کر اپنے ان مومن والدین کو بھی پریشان کر رہا تھا یا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ آئندہ پریشان نہ کرے۔ حاصل جس کا یہی ہوا کہ اخلاقی اور اعتقادی غلاظتوں میں وہ لت پت تھا اور مستحق ہو چکا تھا کہ اس کے عدم کو اس کے وجود پر ترجیح دے دی جائے۔ قصاص یعنی قتل کے جرم میں تو قاتل عموماً اس لئے قتل کیا جاتا ہے کہ دوسروں کو آئندہ اس جرم کی جرات نہ ہو لیکن اپنی اخلاقی و اعتقادی گندگیوں میں گرتے ہوئے جو یہاں تک پہنچ گیا ہو کہ اور تو اور والدین جنھوں نے اس کو پوسا پالا تھا ان کے لئے اس کا وجود صرف خطرہ بن کر رہ گیا ہو۔ کسی ایمانی گھرانے کے ایسے ماؤف عضو کا علاج ہی اس کے سوا اور کیا تھا کہ اس کو کاٹ کر جدا کر دیا جائے، تا کہ اپنے جرم ارتداد کی سزا بھی بھگت لے اور دوسرے بھی اس کی اخلاقی و اعتقادی سمیتوں سے محفوظ ہو جائیں اور اس کا زہر دوسروں تک نہ پہنچے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے اس سلسلہ میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ اس ایمانی خانوادے کو گندے، نجس، سڑے ہوئے وجود سے پاک ہی کرنا میرا مقصود نہ تھا بلکہ اسی کے ساتھ۔

﴿اَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَھُمَا رَبُّھُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَکٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا﴾

''ہم نے (یہ بھی) چاہا کہ ان دونوں مومن والدین کو بجائے (اس گندے لڑکے کے) ان کا رب ایسا لڑکا دے جو اس سے پاکیزگی میں بھی بہتر ہو اور ''رحم'' میں بھی قریب تر ہو''۔

پہلی بات یعنی خَیْرًا مِّنْهُ زَکٰوةً (مقتول لڑکے سے یہ لڑکا جو بطور بدل دیا جائے وہ پاکیزگی میں بہتر ہو) اس کا مطلب تو ظاہری ہی ہے کہ اخلاقی واعتقادی گندگیوں سے وہ پاک ہو لیکن دوسری صفت اس نعم البدل لڑکے کی وَّاَقْرَبَ رُحْمًا جو بتائی گئی ہے، عام مفسرین اور ترجمہ والے یہ لکھ کر گزر جاتے ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ رحم وکرم کے برتاؤ کرنے میں قریب تر ہو لیکن قرآنی الفاظ کے سب سے مستند محقق راغب اصفہانی نے لفظ ''رحم'' کے ذیل میں یہ ارقام فرمایا ہے۔

الرحم رحم المرأة ، ومنه استعیر الرحم للقرابة لکونهم خارجین من رحم واحدة یقال رحم و رحم قال تعالیٰ و اقرب رحما

''رحم'' عورت کے رحم (بچہ دانی) کو کہتے ہیں، رشتہ اور قرابت کو بھی اسی لئے رحم کہنے لگے کہ سارے رشتہ دار ایک ہی رحم سے برآمد ہوتے ہیں اسی لئے رحم ورحم کے الفاظ مستعار لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واقرب رحما فرمایا''۔

علامہ راغب اصفہانی کی مذکورہ بالا معنوی تشریح کی روشنی میں میری سمجھ میں تو اقرب رحما کا مطلب یہی آتا ہے کہ رحمی رشتوں کے اقتضاؤں کے جو قدرتی حدود ہیں ان سے یہ نعم البدل بچہ قریب تر ہوگا۔ بالفاظ دیگر حاصل یہ ہوا کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رحم وکرم اور حسن سلوک کے برتاؤ میں اپنی حد میں سے، بجائے دور ہونے کے قریب تر رہے گا۔ ان رشتہ داروں میں ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اپنے والدین ہی کو داخل سمجھنا چاہئے۔ بہر حال مفسرین نے صرف والدین کے ساتھ حسن سلوک کے تعلقات کو اس بچے کے متعلق عموماً جو محدود کر دیا ہے، بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآن میں خصوصیت کے اس دعوے کی تصحیح کے لئے کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اس لئے سمجھنا چاہئے کہ عام رشتہ داروں میں والدین کے ساتھ بھائی، بہن اور کنبے کے دوسرے لوگ بھی شریک ہیں[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۰۷۔۲۱۰

آیت: ﴿وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ﴾ (الکھف:۸۲)

''اور دیوار کا قصہ یہ ہے کہ اس شہر میں دو یتیم بچے، ہیں جن کا خزانہ ان کی اس دیوار کے نیچے دفن ہے ان کے باپ بڑے نیک شخص تھے تو تیرے رب کی چاہت تھی یہ کہ دونوں یتیم اپنی جوانی کی عمر میں آ کر اپنا یہ خزانہ تیرے رب کی مہربانی اور رحمت سے نکال لیں، میں نے اپنی رائے اور اختیار سے کوئی کام نہیں کیا۔''

تیسرا عملی نمونہ حضرت خضر علیہ السلام نے اس آبادی میں پہنچ کر پیش کیا تھا جس کے باشندوں نے ان دونوں بزرگوں (موسیٰ و خضر) کی درخواست پر بھی مہمان بنانا ان کو منظور نہ کیا اور ہر ایک نے گویا اپنے دروازے سے ان کو دھتکار کر صرف یہی نہیں کہ جسمانی تکلیف پہنچائی بلکہ ان کی توہین بھی کی لیکن باایں ہمہ اسی آبادی کی ایک دیوار جو گرنا ہی چاہتی تھی بغیر کسی معاوضہ و مزدوری کے خضرؑ نے اس کو درست فرما دیا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

﴿لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ (الکھف:۷۷)

''اگر تم چاہتے تو اس کی مزدوری لے سکتے تھے''۔

کے الفاظ کے ساتھ گویا ان پر اعتراض کیا تو جواب میں حضرت خضر علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ اس آبادی کے دو یتیم بچوں کا موروثی کنز (خزانہ) اس دیوار کے نیچے دبا ہے۔ ان بچوں کا باپ صالح اور نیک آدمی تھا حق تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس نیک آدمی کے ان یتیم بچوں تک یہ سرمایہ اس وقت پہنچ جائے جب وہ ہوش گوش والے ہو جائیں اور اس وقت اپنے باپ کے موروثی مال سے مستفید ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان بچوں میں اپنے موروثی کنز سے استفادہ کی پوری صلاحیت جب تک نہ پیدا ہو جائے، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ مرد صالح کے متروکہ مال کی حفاظت کا انتظام میرا فرض تھا جسے میں نے انجام دیا خواہ جس آبادی کے یہ بچے تھے وہاں کے باشندوں نے میرے ساتھ کیسا ہی برا سلوک کیا ہو، اس لئے اس فرض کی انجام دہی میں مزدوری اور اجر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ ہمیں مہمان رکھتے یا نہ رکھتے بہر حال اپنا فرض مجھے انجام دینا چاہیے تھا۔ یہی سبق ہے جو حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے تیسرے عملی نمونے سے دیا۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۱۰-۲۱۱

آیت: ﴿حَتّٰى إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ٥ كَذٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا﴾ (الکھف:۹۰،۹۱)

''یہاں تک کہ جب سورج نکلنے کی جگہ پہنچا اسے ایک ایسی قوم پر نکلتا ہوا پایا کہ ان کے لئے ہم نے اس سے اور کوئی پردہ اور اوٹ نہیں بنائی یوں ہی ہے اور جو کچھ بھی ذوالقرنین کے آگے پیش آیا تھا ہم واقفیت کے لحاظ سے اس پر حاوی تھے''۔

سفر کے درمیانی مرحلہ میں ذوالقرنین کی رسائی جب اس مقام پر ہوئی۔

جہاں انہوں نے آفتاب کو دیکھا کہ:

﴿تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا﴾

''طلوع ہو رہا ہے ایک ایسی قوم پر جن کے اور آفتاب کے درمیان ہم نے کوئی اوٹ نہ رکھی تھی۔''

تو آگے صرف یہ فرماتے ہوئے کہ:

﴿كَذٰلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا﴾

''یوں ہی ہے، اور جو کچھ بھی ذوالقرنین کے آگے پیش آیا تھا ہم واقفیت کے لحاظ سے اس پر حاوی تھے۔''

اس مرحلہ کا تذکرہ ختم کر دیا گیا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے اور تیسرے مرحلہ میں جن لوگوں سے ذوالقرنین ملے تھے وہ ذوالقرنین کی امداد کے محتاج تھے، قلب و روح کی اصلاح کی ضرورت جن کو تھی ان کی بھی ضرورت پوری کی گئی اور دماغی و ذہنی پستی کے جو شکار تھے ان کی ان کمزوریوں کا علاج بھی کیا گیا لیکن درمیانی مرحلے کے ملنے والے غالباً اس قسم کے نقائص سے پاک تھے اسی لئے ان کے متعلق ذوالقرنین کے خدمات کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا گیا۔

اور ان کی خصوصیت کا اظہار جن الفاظ میں کیا گیا ہے یعنی یہ کہ آفتاب جس وقت طلوع ہوتا تھا اس وقت ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا اوٹ نہ تھا۔ ان الفاظ سے میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے کہ یہ حالت صرف طلوع آفتاب کے وقت تک محدود تھی، ورنہ یہ احتمال کہ نہ وہ مکانوں ہی میں رہتے تھے اور نہ کسی قسم کا لباس پہنتے تھے بلکہ ان کی ساری زندگی کھلے میدانوں میں ننگے بدن گزرتی تھی۔ اسی لئے ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا کوئی پردہ نہ تھا، کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، وحشی سے وحشی قومیں بھی کم از کم دھوپ، بارش، سردی، گرمی وغیرہ سے بچنے کے لئے مصنوعی مکانوں میں نہ سہی لیکن غاروں اور قدرتی گڑھوں میں پناہ لیتی ہیں۔ اسی طرح سوت اور اون کے بنے ہوئے کپڑے نہ سہی مگر چمڑوں یا پتوں ہی سے بدن کو ڈھانکتی ہیں۔

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس حال کو صرف اس خاص وقت کے ساتھ اگر محدود سمجھا جائے جس وقت آفتاب طلوع ہوتا ہے اور یہ قرار دیا جائے کہ ان کے مکانات کی تعمیر اس طریقہ پر ہوئی تھی کہ طلوع کے وقت کی شعاعوں سے مستفید ہونے کا موقع ان کو بھی اور ان کے گھروں کو بھی روزانہ میسر آتا تھا تو قطع نظر اس کے اس قسم کے تعمیری سکیم بعید از عقل بھی نہیں ہے، ہم اس سے اگر اس نتیجہ تک پہنچیں کہ قدرتی قوانین سے استفادہ کے سلسلہ میں اس قوم کا شعور کافی روشن اور بیدار ہو چکا تھا وہ جسمانی صحت کے گر سے بھی واقف تھے اور جسمانی صحت کا اثر دماغی اور قلبی صحت پر کیا اور کس حد تک پڑتا ہے اس کا بھی عملی تجربہ ان لوگوں کو تھا اور شاید

اسی وجہ سے ذوالقرنین کی خدمات کی ضرورت ان کو نہ ہوئی تو قرآنی الفاظ میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس ذہنی انتقال کے لئے گنجائش ضرور پائی جاتی ہے خواہ یہ گنجائش کسی درجہ کی ہو بلکہ اس مقام پر پہنچ کر جسمانی و دماغی وقلبی صحت مندیوں کے جو غیر متوقع نمونے ذوالقرنین کے سامنے پیش ہوئے تھے ہوسکتا ہے کہ قد احطنا بما لدیہ خبرا۔(اور ہم حاوی تھے واقفیت کے لحاظ سے ان باتوں پر جو ذوالقرنین کے سامنے پیش آئی تھی) کے الفاظ سے ممکن ہے کہ ان ہی کی طرف اشارہ ہو۔

بہر حال یہ بھی جو کچھ عرض کیا گیا ہے صرف ایک ذہنی انتقال ہے۔قرآنی الفاظ کا یہی یقینی مطلب اور مراد ہے اس کا دعویٰ نہ کیا گیا ہے اور نہ کیا جاسکتا ہے۔زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ سفر کے درمیانی مرحلہ میں ذوالقرنین کی کسی خدمت اور کام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۳۰۔۲۳۲

آیت: ﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ۝ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوْنِيْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا﴾ (الکھف: ۹۳۔۹۶)

''یہاں تک کہ جب دو دیواروں کے درمیان پہنچا ان دونوں کے ادھر اس نے ایک ایسی قوم پائی جو بات سمجھنے کے قریب بھی نہ تھی، انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین یاجوج ماجوج اس ملک میں بڑے فسادی ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے کچھ سرمایہ اکٹھا کر دیں؟ اس شرط پر کہ آپ ہم میں اور ان میں کوئی دیوار بنا دیں، اس نے جواب دیا کہ میرے اختیار میں میرے پروردگار نے جو کر رکھا ہے وہی بہتر ہے تم صرف اپنی قوت و طاقت سے میری مدد کرو میں تم میں اور ان میں مضبوط حجاب بنا دیتا ہوں، مجھے لوہے کی چادریں لا دو یہاں تک کہ جب ان دونوں پہاڑوں کے درمیان یہ دیوار برابر کر دی تو حکم دیا کہ آگ تیز جلاؤ تاوقتیکہ لوہے کی ان چادروں کو بالکل آگ کر دیا تو فرمایا کہ میرے پاس لاؤ تاکہ میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دوں۔''

سفر کے اس تیسرے مرحلہ کے متعلق یہ اطلاع دی گئی ہے کہ دونوں، پہاڑوں کے درمیان والی سرزمین کے باشندوں کی ذہنی پستی انحطاط کے اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی کہ جانوروں میں جیسے یہ دیکھا جاتا ہے کہ گو وہ دیکھتے، سنتے، چلتے، پھرتے بھی ہیں لیکن اسی کے ساتھ افہام وتفہیم اور مخاطبت کو قبول کرنے کی گویا ان میں صلاحیت نہیں ہوتی اور ان سے جو کچھ کہا جائے تو اسے نہیں سمجھتے، تقریباً یہی ذہنی حال ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں رہنے والے باشندوں کا معلوم ہوتا ہے قرآن میں اس قوم کی اس خصوصیت کا اظہار

﴿لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا﴾

''نہ قریب تھے اس کے کہ بات سمجھیں۔''

کے الفاظ سے جو کہا گیا ہے یہ خصوصیت ظاہر ہے کہ اسی وقت تک خصوصیت باقی رہ سکتی ہے جب ان الفاظ کا وہی مطلب سمجھا جائے جو فقیر کے ذہن میں آیا ہے، ورنہ محض زبان کی ناواقفیت کا نتیجہ اس کو اگر قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس میں اس قوم کی کیا خصوصیت ہے، بولنے والے کی زبان سے جو بھی ناواقف ہوتا ہے، ان کی گفتگو نہیں سمجھتا، خواہ تہذیب وتمدن کے بلند ترین مقام ہی پر کیوں نہ ہو۔

بہر حال مذکورہ بالا الفاظ میں ان کے ذہنی انحطاط و پستی کا ذکر کر کے، آگے جو باتیں اسی قوم کے متعلق بیان کی گئی ہیں ان سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے واللہ اعلم بالصواب

کہ ذوالقرنین کی حکومت نے ان کی دماغی تربیت و پرداخت کی طرف توجہ کی اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یاجوج و ماجوج نامی قوم ان غریبوں کے علاقہ میں آ کر فتنہ و فساد کے ہنگامے جو مچاتی رہتی تھی اس کے مقابلہ میں اپنی مظلومیت کا احساس بھی ان میں زندہ ہوا، اور ان کے مظالم سے نجات پانے کی خواہش بھی ان میں پیدا ہوئی۔ جس کے لئے ذوالقرنین کی حکومت سے امداد کے وہ طالب ہوئے۔ پھر حیرت ہوتی ہے کہ جو حیوانوں سے اپنی ذہنی پستی کے لحاظ سے بہ مشکل ممتاز تھے ان ہی کے آگے ذوالقرنین کی طرف

سے ایسی فرمائشیں پیش ہو رہی ہیں جن کی تعمیل حکمت وسائنس کی علمی وعملی مہارت کے بغیر ناممکن ہے۔

آخر خود سوچئے کہ لوہے، تانبے جیسی دھاتوں کو پہاڑوں کے اندر سے برآمد کرنا اور آلائشوں سے پاک کر کے چادروں اور تختوں کے قالب میں اسی لوہے کو ڈھالنا، یہ اور اسی قسم کی باتوں کی قدرت غیر معمولی دماغی تربیت اور عملی مشق ومہارت کے بغیر کیا پیدا ہو سکتی ہے؟ آپ ذوالقرنین کے اس قصہ میں غور کیجئے کہ قرآن خود اطلاع دے رہا ہے کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان رہنے والی قوم نے جب یاجوج وماجوج کے مفسدانہ حرکات کی شکایت کی اور ان کی حکومت سے دستگیری کے متوقع ہوئے تو ان سے ذوالقرنین نے

﴿اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ﴾

''کی بھی فرمائش کی اور لوہے کی تختیاں میرے لئے مہیا کرو''۔

﴿اٰتُوْنِیْ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا﴾

''اور آؤ انڈیل دیں اس پر پگھلے ہوئے تانبے کو''۔

کا حکم بھی دیا تھا اور یہ ساری چیزیں ذوالقرنین کی خدمت میں ان کی فرمائش کے مطابق اسی قوم کی طرف سے پیش کر دی گئیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ جب دونوں پہاڑوں کے بیچ میں اپنی مشہور تاریخی دیوار (سدّ) کی تعمیر کا فیصلہ ذوالقرنین نے کر لیا تو اس عجیب وغریب سائنٹیفک تعمیر میں منجملہ اور باتوں کے اس قوم کی عملی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا تھا، خصوصاً جب گرم کر کے لوہے کی تختیوں کو چاہا گیا کہ دہکا کر ان کو گویا آگ ہی بنا دیا جائے تو اتنی طویل وعریض دیوار کی آہنی تختیوں کو جو اینٹوں کی طرح تہہ بہ تہہ ایک دوسرے پر نیچے سے اوپر تک جما دی گئی تھیں، ان کو ہوا دے کر تپانے اور گویا آگ بنا دینے کا کام قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی قوم کے ان ماہروں نے انجام دیا جو اس کام میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، قرآنی الفاظ:

﴿قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا﴾

''ذوالقرنین نے کہا کہ پھونکو تا ایں کہ بنا دیا اس آہنی دیوار کو آگ''۔

سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے پھر اس کاروائی کے بعد تہہ بہ تہہ جمائی ہوئی ان آہنی اینٹوں کے متعلق یہ ارادہ کیا گیا کہ بجائے مٹی یا گچ وغیرہ کے قطرا (پگھلے ہوئے تانبے) کے گارے سے ان کو جوڑا جائے، دہکتی ہوئی ایسی دیوار جو نیچے سے اوپر تک آگ ہی آگ ہو اس کی ہر ایک اینٹ تک پگھلے ہوئے تانبے کو پہنچانا، میرے نزدیک تو اب بھی ناقابل تصور ہی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن جس واقعہ کو ہم سوچ نہیں سکتے، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی خاص حکیمانہ اور سائنٹفک تدبیروں سے کام لے کر اسی کو کر کے انہوں نے دکھا ہی دیا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ''اتونی افرغ علیه قطرا (آؤ اس قطر (پگھلے ہوئے تانبے) کو انڈیل دیں) مذکورہ بالا قرآنی الفاظ کا اقتضا بظاہر یہی ہے کہ اس حیرت انگیز عمل میں بھی ذوالقرنین نے ان لوگوں کی عملی چابک دستیوں سے استفادہ کیا تھا۔[1]

دونوں پہاڑوں کے درمیان کی رہنے والی آبادی کی طرف سے ذوالقرنین کے پاس جب یاجوج ماجوج کے مظالم کی شکایات پہنچائی گئی اور اسی کے ساتھ یہ پیشکش بھی ان کے آگے رکھی گئی۔

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۲۸۔۲۳۰

﴿هَلْ نَجْعَلُ لَکَ خَرْجًا عَلٰی اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهُمْ سَدًّا﴾

''ہم آپ کے لئے خراج (ٹیکس) ادا کریں اس مہم کے لئے ہمارے اور یاجوج و ماجوج کے درمیان دیوار بنا دیجئے''۔

شاید ان کی خواہش تھی کہ اس کام کے مقابلہ میں کوئی دوامی ٹیکس ان پر عائد کر دیا جائے اور بخوشی اس بار کو برداشت کرنے پر آمادہ تھے تو وہی خرج یا خراج وباج یعنی ٹیکس جسے مختلف نام نہاد ناموں اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے حکومتیں اپنی رعایا سے عموماً وصول کرتی رہتی ہیں اور ان کو جائز حق اپنا سمجھتی ہیں اس خرج کو خود رعایا کے نمائندہ بصد خندہ جبینی اپنی طرف سے حکمران کی خدمت میں پیش کرتے ہیں مگر حکمران کی طرف سے انہیں جواب ملا:

﴿مَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ﴾

''میرے رب نے (جن چیزوں پر) مجھے قابو دے رکھا ہے وہی میرے لئے بہتر ہے''۔

جس کے معانی یہ ہی ہیں کہ اس خرج (ٹیکس) کو ذوالقرنین نے ان لوگوں پر لگانا بھی منظور نہ کیا بلکہ ان کی دستگیری کے لئے ان کی حکومت جو کچھ کر سکتی تھی اس کو اپنی طرف سے خود ان ہی کے آگے پیش کرتے ہوئے، ان سے صرف انہی چیزوں کا مطالبہ کیا جو ذوالقرنین کے پاس غالباً نہ تھیں، یا ہوں گی تو اس کام کے لئے کافی نہ ہو سکتی تھیں جن کی ضرورت تھی۔[1]

﴿اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ﴾

''یاجوج و ماجوج زمین میں بگاڑ پیدا کرنے والے لوگ ہیں''۔

ذوالقرنین پہاڑوں کے بیچ رہنے والی قوم میں جب پہنچے تو اس قوم نے ان ہی الفاظ میں ''یاجوج و ماجوج'' والوں کے متعلق ان کے یعنی ذوالقرنین کے دربار میں رپورٹ پیش کی۔ یہ واقعہ دنیا کے کس خطہ کا ہے؟ اور کس زمانہ کا ہے؟ اس کا پتہ چلانا آسان نہیں ہے لیکن واقعہ کہیں کا ہو اور جس زمانہ میں بھی پیش آیا ہو۔ اتنا تو بہرحال رپورٹ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں فساد پیدا کرنا یہی اس قوم کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ رہی اس فساد پیدا کرنے کی تفصیلات تو ظاہر ہے کہ فساد عربی زبان کے لفظ اصلاح کا مدمقابل ہے۔ بنی آدم کے مختلف افراد میں تعلقات کے سلجھانے اور ان کے امن و امان کے ساتھ رہنے کی کوشش کا نام اصلاح ہے، اسی کے بالمقابل اس قسم کی حرکات جن سے باہم لوگوں میں پھوٹ اور نفاق، لاگ، ڈانٹ، عداوت و بغض کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور ملک کے آبادکاروں میں باہم ایک دوسرے پر اعتماد باقی نہ رہے۔ ایک دوسرے کی فکر میں لگ جائے جان و مال، عزت و آبرو لوگوں کی خطرے میں پڑ جائے یہی شکلیں ہیں جن کی تعبیر صلاح کے مقابلہ میں فساد کے لفظ سے کی جاتی ہے۔

بہرحال یاجوج و ماجوج کی یہ پہلی قومی خصوصیت ہے۔ قرآن نے ان کی قومی زندگی کے پہلے دور میں اسی خصوصیت یعنی ''فساد فی الارض'' (زمین میں بگاڑ پیدا کرنے) کی نشاندہی کی ہے۔[2]

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۳۳۔۲۳۴
2. ایضاً، ص ۲۴۰۔۲۴۱

آیت: ﴿فَمَا اسۡطَاعُوۡۤا اَنۡ یَّظۡهَرُوۡهُ وَ مَا اسۡتَطَاعُوۡا لَهٗ نَقۡبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّیۡ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَهٗ دَکَّآءَ وَ کَانَ وَعۡدُ رَبِّیۡ حَقًّا﴾ (الکھف ۹۷۔۹۸)

''پس وہ (یاجوج ماجوج والے) نہ اس دیوار پر چڑھنے ہی کی قدرت رکھتے تھے اور نہ ان کے بس میں یہ تھا کہ اس دیوار میں نقب لگائیں یعنی سوراخ کریں یہ میرے رب کی مہربانی ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا تو کردے گا اس کو ریزہ ریزہ۔''

﴿فَمَا اسۡطَاعُوۡۤا اَنۡ یَّظۡهَرُوۡهُ وَ مَا اسۡتَطَاعُوۡا لَهٗ نَقۡبًا﴾

بھلا نقب لگانا بھی جس دیوار میں ان کے بس کی بات نہ رہی تھی قرآن کی اس واضح اور صاف خبر کے بعد باور کرنا کہ وہی یاجوج و ماجوج والے اسی دیوار کو دکـاء یعنی ڈھا ڈھو کر برابر کردیں گے یا انہوں نے برابر کردیا، قرآنی بیان سے لاپروائی کے سوائے اور کیا کہا جاسکتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ''جعله دكاء'' (بنادے گا میرا رب اس دیوار کو ریزہ ریزہ) کی قرآنی اطلاع سے بھی ان کو چشم پوشی ہی کرنی پڑتی ہے جو اس خبر کے مقابلہ میں کہتے ہیں کہ رب نہیں بلکہ یاجوج و ماجوج والے اس کو دکـاء (ریزہ ریزہ) کر دیں گے۔

یہ صحیح ہے کہ تفسیری روایتوں میں بھی بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن سے اسی عام پھیلے ہوئے خیال کی تائید ہوتی ہے، شاید اس عام پھیلے ہوئے خیال کا منشاء ممکن ہے تفسیری کتابوں کی یہی روایتیں ہوں لیکن، حضرت مولانا انور شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) جیسے ناقد علامہ اسی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب فرماتے تھے کہ:

انا لم نجده في القرآن و لا في حديث صحيح

یعنی (یاجوج و ماجوج کا خروج دیوار توڑ کر ہوگا) اس مسئلہ کو ہم نہ قرآن ہی میں پاتے۔ اور نہ کسی صحیح حدیث میں۔

تو اسی سے ان روایتوں کا حال معلوم ہوجاتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس سلسلہ میں ترمذی کی اس روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس میں ہے کہ:

''یاجوج و ماجوج والے روزانہ دیوار کو کھودتے ہیں، پھر جب کچھ حصہ باقی رہ جاتا ہے تو گھروں کو یہ کہتے ہوئے پلٹ جاتے ہیں کہ کل ہم باقی کام کو پورا کردیں گے، مگر ان شاء اللہ تعالیٰ نہیں کہتے، پس جب دوسرے دن واپس ہوتے تو کھودی ہوئی دیوار کو اسی حال میں پاتے ہیں، یعنی کھودنے سے پہلے جیسی تھی ویسا ہی اس کو پائیں گے، یوں ہی یہ سلسلہ جاری رہے گا، تا آنکہ ایک دن ان شاء اللہ ان میں سے کسی کی زبان سے نکل جائے گا تب صبح کو جب آئیں گے تو دیوار کھدی ہوئی حالت میں ملے گی اس کے بعد اس دیوار کو ڈھادیں گے اور زمین میں فساد پھیلانے کے لئے نکل پڑیں گے''۔

مگر تفسیری روایات کے سب سے بڑے مشہور ناقد ابن کثیر کے نزدیک اس روایت کی سند میں غیر معمولی الجھنیں ہیں، خود حضرت شاہ صاحب کا ذاتی فیصلہ تو یہ ہے کہ مشہور نومسلم یہودی عالم ''کعب احبار'' کا یہ قول ہے اور اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے اور جب آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآنی الفاظ ہی نے ان روایتوں کی تصحیح کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے قرآن خبر دے رہا ہے کہ دیوار

میں نقب زنی بھی ان کے بس کی بات نہ تھی تو پھر اسی دیوار کے متعلق یہ باور کرنا کہ یاجوج و ماجوج والے اس میں صرف نقب لگانے ہی میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ اس کا دکاء (یعنی ریزہ ریزہ) کر کے رکھ دیا، یہ کچھ سمجھ میں آنے کی بات ہے؟[1]

﴿هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ﴾

اس میں بھی ان لوگوں کے لئے جنہیں حکومت کا اقتدار قدرت کی طرف سے عطا ہوتا ہے، یہ درس پوشیدہ ہے کہ اپنے اقتدار کے متعلق ہمیشہ اس واقعہ کے احساس کو اپنے اندر زندہ رکھنا چاہئے اور اس سے کبھی غافل نہ ہونا چاہئے کہ دوسرے کا یہ فقط بخشا ہوا اختیار ہے، بخشنے والے کی صرف رحمت اور مہربانی ہے کہ اقتدار کی اس قوت سے اس نے ان کو نوازا اور سرفراز فرمایا ہے۔ یہی حقیقت ہے، یہی واقعہ ہے، اس کے سوا سوچنے والے جو کچھ بھی سوچتے ہیں یا سوچ سکتے ہیں۔ وہ قطعاً جھوٹ اور ایسا تصور ہوگا جس کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یقین کیجئے کہ حکمرانوں میں اس احساس کا دباؤ جب تک اور جس حد تک رہے گا اسی حد تک ان کی سمجھ میں یہ آئے گا کہ حکومت حکمرانوں کے لئے نہیں، بلکہ ان محکموں کے لئے ہوتی ہے جن کی انفرادی توانائیاں اجتماعی شکل میں سمٹ کر حکومت کا اقتدار اور قوت بن جاتی ہیں۔ رعایا کی طرف سے جو فرائض حکمرانوں پر عائد ہوتے ہیں، ان فرائض سے صحیح معنوں میں وہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو اپنے اقتدار کی جوہری بنیاد کو اپنی نگاہوں سے اوجھل ہونے نہیں دیتے۔[2]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۳۸-۲۴۰

[2] ایضاً، ص ۲۴۲-۲۴۳

آیت : ﴿وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا﴾ (الکھف:۹۹)

''اور چھوڑ دیا ہم نے بعض ان کے بعض کے ساتھ موج مارنے لگے، اور پھونک دیا جائے صور پھر ہم ان کو (یاجوج ماجوج) کو اچھی طرح سمیٹ کر سمیٹ لیں گے۔''

﴿وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ﴾

جس کا مطلب یہی ہوا کہ غیر قوموں کے مقابلے میں فساد فی الارض (زمین میں بگاڑ پیدا کرنے کی) کاروائیوں کو وہ اختیار کرتے تھے لیکن غیروں سے رخ جب ان کا دیوار بن جانے کی وجہ سے پھر گیا تو آپس ہی میں باہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسی زندگی گزارنے لگے جسے قرآن نے خاص الفاظ یعنی بعضھم یومئذ یموج فی بعض کے ذریعہ ادا کیا ہے۔ اس میں ان تعلقات کی کس نوعیت اور کیفیت کی تعبیر ہے؟ غیروں سے مایوس ہوجانے کے بعد یاجوج و ماجوج والے زندگی کے اس دور میں لڑتے بھڑتے اور باہم دست و گریبان رہتے تھے اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے عربی زبان میں بیسیوں تعبیریں مل سکتی تھیں۔

اسی طرح میل ملاپ، باہمی امداد و مواساۃ، موانست کی زندگی کی تعبیر کے لئے بھی اس زبان میں الفاظ کی کمی نہ تھی۔ لیکن تعبیر و بیان کے ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر قرآن نے بعضھم یومئذ یموج فی بعض کے الفاظ جو یہاں استعمال کئے ہیں واضح طور پر ان دونوں حالتوں میں سے کسی خاص حالت کو متعین کرنا دشوار ہے۔

لغۃً موج کے لفظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تلاطم اور طوفان کے وقت سمندر اور دریا میں موجوں کی جو کیفیت ہوتی ہے، یعنی سمندر کی سطح بجائے ساکن کے صرف لرزش و اضطراب، بے چینی اور بے قراری کی تصویر بن جاتی ہے۔ اور لامحدود بے شمار موجیں اٹھ اٹھ کر ایک دوسرے کو دھکیلتی ہی چلی جاتی ہیں اور اسی طرح ہر پچھلی موج پہلی کو آگے بھی بڑھاتی رہتی ہے۔ ہم ان موجوں کے متعلق یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ایک دوسرے پر چڑھ جانا بھی چاہتی ہے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں ان میں ہر ایک کی ہستی دوسری ہستی سے وابستہ بھی ہے اور ایک دوسرے کو آگے بڑھنے اور بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی بھی چلی جاتی ہے۔ آپس میں موجیں ایک دوسرے سے گویا لڑتی بھی ہیں لیکن ان میں ہر ایک کی بقا کی ضامن بھی باہم یہی موجیں اور ان کے تموجی تعلقات ہی ہوتے ہیں۔

الغرض بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ کے الفاظ سے صرف یہ مطلب نکالنا کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد یاجوج و ماجوج والے باہم ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے ہی رہتے تھے یا اس کے بالمقابل یہ سمجھنا کہ جیسے سمندر کی موجوں کا وجود باہم ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و ہم رشتہ رہتا ہے۔ اور ہر موج دوسری موج کو آگے بڑھاتی ہے، اسی طرح یاجوج و ماجوج والے بھی آپس میں بجائے دست و گریباں رہنے کے ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق رکھتے تھے، یعنی غیروں میں تو بجائے اصلاح اور سنوار کے فساد اور بگاڑ پیدا کرتے تھے، لیکن آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے باہم ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ان دونوں مطالب میں سے کسی ایک مطلب کے ساتھ قرآنی الفاظ اور تعبیر کو محدود کر

دینا غالباً صحیح نہ ہوگا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر یہی سمجھانا قرآن کا مقصود تھا تو ان دونوں مطالب میں سے ہر ایک کی تعبیر کے لئے عربی زبان میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، سرمایہ کی کیا کمی تھی؟ پھر جب ان ساری تعبیروں کو ترک کر کے ایک مخصوص تعبیر اس موقع پر قرآن میں جو اختیار کی گئی ہے۔ ہمیں اس کی مصلحت سے چشم پوشی نہ کرنی چاہئے اور لا پروائی سے کام لیتے ہوئے ان دونوں مطالب میں سے کسی ایک مطلب کا سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ جانا قرآنی الفاظ کی ناقدری ہوگی۔ ہمیں اس ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہئے کہ خالق کائنات کے کلام پر غور کر رہے ہیں۔ ہر بولنے والے آدمی کے کلام پر اس لاہوتی کلام کو قیاس کرنا مناسب نہ ہوگا۔

سوال یہی ہوتا ہے کہ پھر ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھا جائے؟ ظاہر ہے کہ موج کا لفظ سمندر اور دریا کی متلاطم سطح اور اس پر ابھرنے والی موجوں کی جس تصویر کو بے نقاب کر رہا ہے۔ اسی تصویر کو ہم اپنے سامنے رکھ کر قرآن جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے اسے کیوں نہ سمجھیں؟ کوئی مانے یہ نا مانے لیکن فقیر کا ذہن تو یہی پاتا ہے کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں یاجوج و ماجوج کی قوم کی زندگی صرف اضطراب اور بے قراری، ہنگامہ اور لرزش و جنبش بن کر رہ گئی تھی۔ ایسے مشاغل میں وہ مبتلا تھے، جن میں صبح و شام، شب و روز تگ و دو، دوڑ دھوپ، آمد و رفت، چلنے، پھرنے، دوڑنے، بھاگنے کے ہنگامے ہی برپا رہتے ہیں۔

یہ تو ان کی عام زندگی کا غالباً نقشہ تھا باہم اس قوم کی مختلف ٹولیاں ایک دوسرے کے ساتھ الجھی بھی رہتی تھیں، لیکن اسی کے ساتھ ان میں کوئی ٹولی دوسری ٹولی کو کلیۃً ختم کرنے کا بھی فیصلہ اس لئے نہیں کر سکتی تھی کہ اس میں خود اپنے وجود کے اختتام کا خطرہ اس کو محسوس ہوتا تھا، کچھ حالات ہی اس قوم کے ایسے تھے کہ نہ ایک دوسرے سے کلیۃً الگ ہی ہو سکتے تھے اور نہ ان میں کوئی دوسرے سے ٹوٹ کر یا جدا ہو کر فنا ہونے ہی کے لئے تیار تھا۔ گویا ان میں وہی تعلقات قائم تھے جو باہم دریا کی موجوں میں ہوتے ہیں، بایں طور کہ باہم ایک دوسرے کو دھکیلتے بھی رہتے تھے لیکن اسی کشمکش میں ارادی یا غیر ارادی طور پر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے میں مدد بھی مسلسل ملتی چلی جاتی تھی۔

اسی کے ساتھ میرا دھیان بَعۡضَهُمۡ يَوۡمَئِذٍ يَّمُوۡجُ فِىۡ بَعۡضٍ کے الفاظ سے کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ تبعیض و تجزی یعنی یاجوج ماجوج کی تقسیم بھی محدود نہ تھی، بلکہ موجوں کا جو حال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی گننا چاہے تو گن نہیں سکتا۔ ان میں بڑی موجیں بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی، کچھ یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں ان کا ہو گیا تھا کہ ان گنت بے شمار ٹولیوں میں وہ بٹے ہوئے تھے۔ شروع میں تـرکـنـا (چھوڑ دیا ہم نے) کا لفظ جو پایا جاتا ہے کیا اس سے بھی کسی خاص واقعہ اور یاجوج و ماجوج والوں کے متعلق کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۴۱۔۲۴۴

''ترکنا'' (چھوڑ دیا ہم نے) کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں جب وہ سراپا اضطراب اور ہمہ تن حرکت وگردش بن کر رہ گئے تھے۔ قدرت نے بھی ان کو چھوڑ دیا تھا اور آسمانی رہنمائی نے ان کی دستگیری نہیں کی۔ اسی لئے ان کی تاریخ کا یہ عہد نبوت ورسالت اور ان کے آثار سے بالکل خالی ہوگیا اور ایسی قوم یا امت جو آسمانی رہنمائی کی روشنی سے محروم ہو، مجبور ہے کہ اپنی شخصی، خاندانی، قومی عام انسانی تعلقات کے لحاظ سے اپنے آپ ہی قوانین بنائے۔ قدرت کی چھوڑی ہوئی یا متروک اللہ قوم، خود سوچئے کہ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہے۔[1]

﴿وَّ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا﴾

''اور پھونک دیا جائے صور پھر ہم ان کو (یاجوج و ماجوج) کو اچھی طرح سمیٹ کر سمیٹ لیں گے''۔

مطلب وہی ہوا کہ نفخ صور کے بعد جیسے ساری انسانی نسلیں، ان کے اگلے پچھلے، بڑے چھوٹے، مرد وعورت سب ہی دوبارہ جمع کئے جائیں گے، اسی طرح ''یاجوج وماجوج'' بھی اپنے آپ کو پائیں گے کہ ایک ایک کر کے اول سے آخر تک سب اکٹھے کر لئے گئے ہیں۔[2]

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۴۶
2. ایضاً، ص ۲۵۲

آیت : ﴿وَّ عَرَضۡنَا جَهَنَّمَ يَوۡمَئِذٍ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ عَرۡضَا ۞ الَّذِيۡنَ كَانَتۡ اَعۡيُنُهُمۡ فِىۡ غِطَآءٍ عَنۡ ذِكۡرِىۡ وَ كَانُوۡا لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ سَمۡعًا﴾ (الکھف: ۱۰۰، ۱۰۱)

''اس دن (یعنی نفخ صور سے اکٹھے ہونے کے بعد) جہنم ان ہی کافروں پر ہم پیش کریں گے۔ خاص طور پر پیش کرنے کی شکل میں۔ یعنی وہ لوگ جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں رہیں اور وہ سننا بھی (میرے ذکر کا) برداشت نہیں کر سکتے تھے۔''

ظاہر ہے کہ پہلا جز یعنی جہنم کے پیش ہونے کی کیا صورت ہوگی، اس حقیقت کا انکشاف تو اسی دن ہوگا اور انہی کو جن پر جہنم اپنے خاص رنگ میں پیش ہوگی، لیکن دوسرے جز کے لئے قیامت کے قائم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی دنیا کی بات ہے۔ ڈھونڈھیے اس بات کو کہ کن قوموں میں یہ صفات اور خصوصیات پائی جاتی ہیں، مشرکین اور بت پرست یا ان کے سوا مختلف ملل و ادیان کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والی قوموں کے لئے مفید ہو یا غیر مفید لیکن خالق کے ذکر سے قطعاً بے تعلق رہنے کا دعویٰ ان کے متعلق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دوسرے معبودوں ہی کے ساتھ سہی لیکن بہر حال عالم کے خالق کی یاد سے کوئی قوم خالی نظر نہیں آتی۔ پھر اسی اطلاع کا یہ حصہ ''یعنی اور وہ سننا بھی (میرے ذکر کا) برداشت نہیں کر سکتے''۔

دیکھ لیجئے کہ ذکر اللہ کے سننے کو بھی آج جو برداشت نہیں کر سکتے وہ کون لوگ ہیں؟ ان کی تقریروں میں، تحریروں میں تلاش کیجئے، ہر چیز کے ذکر کے ساتھ جس کے ذکر سے وہ خالی نظر آئیں گی، یہ اپنے پیدا کرنے والے خالق پروردگار ہی کا ذکر ہوگا؟ اس باب میں اس کی نفرت کا درجہ استہزاء و تمسخر یہ کے حدود تک کن لوگوں میں پہنچ چکا ہے؟ کیا اس کے لئے کسی ریسرچ اور جستجو کی ضرورت ہے؟

رپٹ لکھوائی ہے یاروں نے جا جا کر یہ تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اکبر مرحوم کا یہ شعر آج جو زبان زد عوام بنا ہوا ہے، کیا یہ کوئی اتفاقی بات ہے یا ان کی اس ظرافت میں کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں ہے؟

این سخن راچہ جواب است تو ہم میدانی [1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۷۶، ۲۷۷

آیت: ﴿اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ نُزُلًا﴾ (الکھف:۱۰۲)

''کیا وہی لوگ جنہوں نے انکار کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ بنالیں میرے بندوں کو میرے سوا اپنے پشت پناہ۔
ہم نے تیار کررکھی ہے جہنم ان کی مہمان نوازی کے لئے۔''

خالق عالم حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی یاد اور ذکر سے کلی انحراف اور بغاوت کے بعد فطرت انسانی کے ایک خاص رجحان کی طرف ایک خاص قسم کا اشارہ سوچنے سے آپ کو اس آیت میں مل سکتا ہے، کم از کم خاکسار کا ناچیز احساس یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے یا نکل بھاگنے کا زندگی کے موجودہ ابتلائی وعبوری دور میں یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ خالق سے اپنا رشتہ توڑ لیا جائے اور ''خدا کو کیا پڑی، میرے تمہارے درمیان کیوں ہو'' کہتے ہوئے جو جی میں آئے آدمی کرتا چلا جائے۔ عموماً الحاد کی زندگی کے نیچے کچھ اسی قسم کی شعوری وغیر شعوری ذہنی چالاکیاں اور بے باکیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ الحاد اور بے دینی کی زندگی کا ایک پہلو تو یہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ انسان جو سراسر احتیاج اور اپنے خاص حالات کے لحاظ سے صرف فقر اور کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ مجسم بھیک اور صرف سوال ہی سوال کے سوا وہ اور کچھ نہیں ہے، اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بیرونی امداد کے بغیر وہ بسر نہیں کرسکتا، کھانے، پینے اور پہننے حتیٰ کہ سانس تک لینے میں غیر کی محتاجی غریب آدمی کی زندگی کا ایسا کھلا ہوا خاصہ ہے، جس سے قطع نظر کرنے کی صورت ہی نہیں۔ وہ بیمار پڑتے ہوئے جس علاقہ میں رہتا ہے وہاں عموماً وبائیں پھوٹتی رہتی ہیں، قحط، خشک سالی کے حملے ہوتے رہتے ہیں، جنگوں کا خلفشار مچتا رہتا ہے، بے آئینی اور بدامنی کا دور دورہ شروع ہوجاتا ہے، یہ اور اسی قسم کے پیش آنے والے حوادث وواقعات کے مقابلہ میں کیا کیا جائے؟ ایک سوال ہے جو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے بنی آدم کے دل ودماغ میں ہل چل مچائے ہوئے ہے۔ خالق عالم کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی پشت پناہی یا ولایت میں اپنی زندگی کو ڈال دیا جائے، یہ حل تو اس سوال کا بظاہر آسان نظر آتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ انسان جو جس نصب العین کی تکمیل کے لئے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے اس کی ذمہ داریاں اس راہ میں قدرتاً عائد ہوجاتی ہیں، قرآن میں اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرہ:۱۸۶)

''میرے بندے جب پوچھیں میرے متعلق تو کہہ دو کہ میں قریب اور پاس ہی رہتا ہوں اور پکارنے والوں کی پکار کا جواب دیتا ہوں''۔

آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾ (البقرہ:۱۸۶)

''بس چاہئے کہ وہ بھی مجھے جواب دیں اور مجھے مانیں تا کہ وہ سیدھی راہ پر چل پڑیں۔''

اس میں کاروائی کے اسی دوطرفہ پہلو کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے۔ حاصل یہی ہے کہ مجھ سے کچھ لینا چاہتے ہو تو جو کچھ

تم سے میں چاہتا ہوں اسے تم بھی تو پیش کرتے رہو''لعلھم یرشدون'' تاکہ وہ سیدھی راہ پر چڑھ جائیں کا مطلب یہی ہے، راہ یابی کا فطری طریقہ یہی ہے لیکن جو خود سب کچھ لینا چاہتے ہوں مگر خود کسی قسم کی ذمہ داری اپنے اوپر اپنے پیدا کرنے والے کی لینا نہیں چاہتے، ان میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جنہوں نے خالق عالم اور اپنے درمیان ''الٰہہ'' یعنی دیوتاؤں اور مخلوق معبودوں کا ایک سلسلہ فرض کر رکھا ہے۔ شعور اس کا ان کو ہو یا نہ ہو، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس تدبیر سے اپنی کاربرآریوں کی ایک ایسی راہ اپنے خیال، صرف خیال میں انہوں نے نکال لی ہے جس میں ان کے زعم یا وہم کے مطابق ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام ہو جاتا ہے، مگر خود ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ صرف ان درمیانی وسائط اور مخلوق معبودوں کے متعلق ان کا احساس ہوتا یہی ہے کہ نذر و نیاز وغیرہ چڑھاوے کی وقتی پیشکشوں سے خوش ہو کر ہماری حاجتوں کو ہمارے یہی ''آلہہ'' یا دیوتا پوری کرا دیتے ہیں، لیکن ان کے معبودوں کی طرف سے کسی قسم کا کوئی آئینی مطالبہ ان پر عائد نہیں ہوتا۔ غرض ان کی ذمہ داری ہوتی بھی یہی ہے کہ آئینی ذمہ داری کے بغیر ان کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔ اپنے ان معبودوں کی نذر و نیاز کے سلسلے میں بیش قرار رقوم صرف کر دینا، ان کو اس سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ مشرکانہ کاروبار کرنے والوں میں کسی قسم کی ایسی اخلاقی اور آئینی ذمہ داری جو ان کے دیوتاؤں کی طرف سے ان پر عائد کی گئی ہو، اس کا احساس نہیں پایا جاتا۔ خواہ ان معبودوں کی پوجا پاٹ میں ان کا جتنا بھی خرچ ہو جائے، گویا خدا کی ذمہ داریوں کے احساس کو دبانے کی یہ ترکیب اس طبقہ نے تراش لی ہے کہ خدا کے سامنے انہیں آنا ہی نہ پڑے بلکہ خود تو وہ اپنے خودتراشیدہ معبودوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کے معبودوں سے چونکہ خدا راضی ہے، اس لئے اللہ میاں سے ان کی ضرورتوں کی تکمیل وہ کرا لیں گے۔

اسی طریقہ کے مقابلہ میں ایک دوسری تدبیر یہ بھی ہے کہ خدا کے سامنے سے تو اپنے آپ کو مطلق العنان اور آزاد رکھنے کے لئے وہ بھاگ جاتے ہیں، بھول کر بھی نہ خدا کا نام لینا چاہتے ہیں اور نہ ان کو وہ یاد ہی آتا ہے۔ باقی زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لئے مشرکوں کے نادیدہ وخودتراشیدہ اور ان کے خیال کے مطابق خدا رسیدہ معبودوں کی جگہ انہوں نے ہر ضرورت اور حاجت کے لئے فنی خلاق یا ٹیکنیکل ایکسپرٹوں کا وہ طبقہ کھڑا کر لیا ہے جس کی تعلیم و تربیت پر اس سے زیادہ توجہ اور زیادہ خرچ کرتے ہیں، جتنی توجہ اور جتنے مصارف کا بار مشرکانہ کاروبار والے اپنے معبودوں کو راضی رکھنے کے لئے برداشت کرتے ہیں اور ہر پیش آنے والی ضرورت کے لئے وہ ان ہی خلاق اور اکسپرٹوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ان ہی کی ولایت اور پشت پناہی میں ان کی ساری زندگی بسر ہوتی ہے۔ کسی ایسی جگہ قیام ان کے لئے دوبھر بلکہ شاید ناقابل تصور ہوتا ہے جہاں اپنے ان اولیاء یا پشت پناہوں کے دست یاب ہونے میں کسی قسم کی دشواری کا خطرہ ہو۔ ان ہی ایکسپرٹوں کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ان میں لیڈروں اور قائدوں کا بھی ہوتا ہے اور عموماً اجتماعی حاجات میں ان ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ الغرض خدا کی ذمہ داریوں سے بچتے ہوئے ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیش آئے، اس کے لئے ان ہی مذکورہ بالا دو طریقوں میں سے کسی ایک یا دونوں کو ساتھ ساتھ اختیار کرنے والوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ قرآن میں مشرکانہ کاروبار والوں کے طرز عمل کی تعبیر کے سلسلے میں عموماً اس قسم کے الفاظ پائے

جاتے ہیں۔ مثلاً

﴿اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً﴾ (الفرقان:۳)

''انہوں نے میرے سوا معبود بنالئے ہیں۔''

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں جن پر مشرکین بھروسہ کیا کرتے تھے اور جن کی طرف اس راہ میں رجوع ہوتے تھے، ان کو آپ دیکھیں گے۔ عموماً ''آلھۃ'' کے نام سے قرآن موسوم کرتا ہے، لیکن سورۂ کہف کی مذکورہ بالا آیت میں بجائے اس کے ''عبادی من دونی اولیاء'' کے الفاظ پائے جاتے ہیں، یعنی یہاں بجائے وہ آلہہ کے ''اولیاء'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرکوں کے عام معبودوں اور الٰہہ کے متعلق قرآن میں یہ جتلایا گیا ہے کہ عموماً وہ نام ہی نام ہوتے ہیں، لیکن ان ناموں اور اسماء کو مسمی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بایں معنی کہ درحقیقت ان ناموں سے جن چیزوں کی تعبیر کہتے ہیں وہ معدوم اور کچھ نہیں ہوتیں۔

زیادہ مشرکوں کے معبودوں کی عام نوعیت یہی ہوتی ہے کہ وہ صرف مفروضہ اسما اور نام ہی نام ہوتے ہیں اور اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ جن کمالات و تصرفات کو ان معبودوں کی طرف اپنے خیال میں مشرکین منسوب کرتے ہیں، ان سے قطعاً ان کو کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، گویا پتھر کا نام جیسے پانی رکھ لیا جائے اور نام رکھ کر توقع دلائی جائے کہ پانی کا کام اس پتھر سے لیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی فرضی نام اسم بے مسمی ہی کی ایک شکل ہے اور مشرکوں کے معبودوں پر قرآنی تنقید کے یہ الفاظ

﴿اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ﴾ (النجم:۲۳)

''نہیں ہیں وہ لیکن صرف چند نام جو رکھ لئے ہیں خود تم نے یا تمہارے باپ دادوں نے۔''

ہر حال میں صادق آتے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں حق تعالیٰ کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے والوں نے پشت پناہوں اور اولیاء کا جو طبقہ ایکسپرٹس (خلاق) اور لیڈررز (قواد) وغیرہ ناموں سے بنالیا ہے ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت مشرکوں کے معبودوں سے اس باب میں مختلف ہوتی ہے، یعنی حذاق و قواد کا یہ گروہ اسی طرح خدا کے واقعی بندے اور مخلوقات ہوتے ہیں جیسے ان پر بھروسہ کرنے والے خدا کے بندوں اور مخلوقات میں شامل ہیں اور جن ضرورتوں اور حاجتوں میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے ان سے ان کی بے تعلقی کا حال بھی وہ نہیں ہوتا جو مشرکوں کے معبودوں کا ہے بلکہ قدرتی قوانین کا علم حاصل کر کے اسی علم کے مطابق علمی نتائج حاصل کرنے کا طریقہ ان فنی ماہرین کو سکھایا جاتا ہے اور خواہ ہر حال میں ان سے متوقعہ ضرورتیں پوری ہوں یا نہ ہوں، لیکن ان مشرکوں کے خود تراشیدہ معبودوں کی طرح ان کو قطعاً بے تعلق بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے مذکورہ بالا آیت میں بجائے ''الھۃ من دونی'' کے ''ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء'' (یعنی میرے بندوں کو میرے سوا یا مجھے چھوڑ کر انہوں نے اپنے اولیاء اور پشت پناہ بنا رکھا ہے) یہ الفاظ جو پائے جاتے

ہیں ان میں بظاہر حق تعالیٰ کی آئینی ذمہ داری سے آزاد رہنے کی جیسا کہ میرا ناچیز خیال ہے، اسی دوسری تدبیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس میں بجائے خود تراشیدہ، نام نہاد او ہامی الہہ اور معبودوں کے ایکسپرٹوں، لیڈروں کو بنانے والے اپنے پشتبان اور اولیاء بنا لیتے ہیں اور یوں اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہ سے بے تعلق قطعاً بے تعلق رہ کر زندگی بسر کرنے کی ایک راہ انہوں نے جو نکال لی ہے تو فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴾

''بلاشبہ ہم نے تیار کر رکھا ہے ان ہی انکار کرنے والے کافروں کے لئے جہنم مہمان نوازی کے واسطے''۔

مطلب یہی ہے کہ زندگی کا موجودہ عبوری دور جو بہر حال گزر رہی جاتا ہے، سب ہی کی گزر جاتی ہے، ان سے پہلے مشرکانہ کاروبار والوں نے خدائی ذمہ داریوں سے بچنے کی جو صورت نکال لی تھی، برے بھلے وہ بھی اپنی زندگی کے دن پورے کر کے دنیا سے گئے اور تم نے جو یہ نئی راہ نکالی جسے سائنٹیفک راہ زندگی گزارنے کی تم سمجھتے ہو، یہ بھی گزرے گی، لیکن تم ہو یا وہ ہوں بہر حال قدرت کے مقرر کردہ نتیجے اور انجام سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ پیدا کرنے والے نے جس مقصد اور جس نصب العین کی تکمیل کے لئے تمہیں پیدا کیا تھا تم اس مقصد اور نصب العین کو لا حاصل قرار دے کر اپنے کرتوت کے خمیازہ کو نہ بھگتو، بلکہ نتیجہ کا دن جب آئے گا تو قدرت کی طرف سے ان کے آگے وہ دردناک قالب پیش ہوگا جس کا اصطلاحی نام جہنم ہے۔

بہر حال مشرکانہ کاروبار کی تنقید جن خاص الفاظ میں عموماً قرآن بیان کرنے کا عادی نظر آتا ہے، بجائے ان کے یہاں الفاظ میں ردوبدل جہاں تک میرا خیال ہے، بلاوجہ نہیں کیا گیا ہے۔ دوسروں سے بھی یہی عرض کروں گا کہ قرآن کے طریقہ بیان کی خصوصیتوں کی قدر و قیمت پر اگر غور کریں گے تو تجربہ ان کو خود بتائے گا کہ ان تبدیلیوں میں کوئی خاص اور اہم نقطہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ کچھ طول بیانی سے کام تو ضرور لینا پڑا، لیکن کیا کیا جائے پہلے سے سوچی سمجھی باتیں ہوتیں تو مختصر اشارے بھی کافی ہو سکتے تھے، لیکن اچانک نئے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانی پڑتی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۷۷۔۲۸۲

آیت : ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا O اَلَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾ (الکھف:۱۰۳،۱۰۴)

''کہہ دو ہم آگاہ کریں ان لوگوں سے جو اپنے کاروبار کے حساب سے بدترین خسارے کے شکار ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی اور کوشش کھوگئی اسی حیات دنیا (پست زندگی) میں اور وہ خیال پکار رہے ہیں کہ کارستانی کے لحاظ سے وہ بہت اچھا کر رہے ہیں۔''

﴿ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾

''کھوگئی کوشش ان کی اسی حیات دنیا (پست زندگی) میں''۔

سب سے زیادہ فکر و تامل کی دعوت اس آیت کا یہی جزء دے رہا ہے۔ دیکھ لیا جائے کہ ''الاخرۃ'' کی ابدی زندگی سے اپنی توانائیوں کے سارے ذخیرے کو موڑ کر قطعی طور پر موڑ کر اسی ''الحیوۃ الدنیا'' پست زندگی میں کون گم کر رہے ہیں اور گم کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ سب کچھ کر کے اور سب کو چھوڑ چھوڑ کے اس دنیا سے ان میں کا ہر ایک بایں طور روانہ ہو رہا ہے کہ پانے والے جو کچھ بھی پاتے ہیں کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاتے ہیں اور نہ لے جا سکتے ہیں۔ اور یوں اپنی ساری توانائیوں اور ان کے نتائج کو دن کی کھلی روشنی میں ہر ایک کے سامنے مسلسل ہر ایک کھوتا چلا جا رہا ہے۔ مگر بایں ہمہ اپنی کوششوں کی ان ہی ناکامیوں کے ساتھ مطمئن بھی ہیں اور اسی کو صحیح اور کامیاب زندگی قرار دینے پر ان کی خودستائیوں کا سلسلہ اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ بنی آدم کے اکثر و بیشتر افراد پر اپنی اسی عجیب و غریب ناکام و نامراد زندگی کی پرچھائیوں کو ڈال ڈال کر عمومیت کو تقریباً اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ الآخرۃ کا خیال اور اس خیال کا دباؤ دماغوں سے نکل چکا ہے یا نکل جانے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ وہ خیال پکار رہے ہیں کہ کارستانی کے لحاظ سے ہم بہت اچھا کر رہے ہیں ''یعنی'' وھم یحسبون الھم یحسنون صنعا '' کے الفاظ کا جو ترجمہ ہے، آج کون ہے جس کے کان کو اس خدا بےزار (Godless) تمدن کی خودستائیوں سے بہرا نہیں بنا دیا گیا ہے۔

سچ پوچھئے تو ''یاجوجیت وماجوجیت'' کی حقیقی روح ان ہی الفاظ میں پوشیدہ ہے اور یہ ان کی رونمائی کا ایسا آئینہ ہے جسے دیکھ کر ہر دیکھنے والی آنکھ ان کو پہچان سکتی ہے۔

لیکن لوگوں نے چوڑے چوڑے کانوں، چھوٹے چھوٹے بالشتی قدوں کی راہ نمائی میں ان کو پہچاننا چاہا۔ جاننے والوں نے ''تمسح'' (زبردستی کی مسیحیت) اور ''تمہد'' (زبردستی کی مہدویت) کے بے وقت اور بے ہنگام غل غباڑوں کو دیکھا جو درحقیقت اسی خدا بےزار تمدن اور انسانیت آزار تہذیب کی آندھیوں سے برپا ہوئے تھے، بلکہ تمسح و تمہد کا دعویٰ پیداوار ہی اسی تمدن و تہذیب کی دسیسہ کاریوں کا تھا اور اسی کا وہ ''خود کاشتہ پودا'' تھا۔ دعوے کے مدعی کا یہ خود اعترافی اقرار ہے، کہیں حق کے کلمہ سے باطل کی تعبیر میں کام نہ لیا جائے، حق کے جاننے والوں نے بھی حق پوشی ہی کو احتیاط کا تقاضا قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کم از کم سب سے پہلے دنیا کی جس امت کو ''حق'' کی گواہی ادا کرتے ہوئے قرآنی بینات کی روشنی میں ''حق'' کا اعلان کرنا چاہئے تھا، صرف یہی نہیں کہ اس سے

خاموشی سے کام لیا بلکہ اس کو سمجھنا بھی نہ چاہا جو کچھ قرآن سمجھا رہا تھا۔ لوگ قرآن بھی پڑھتے رہے اور خودستائیوں کی اسی قوالی میں شریک ہو کر تالیاں پیٹ پیٹ کر حال وقال بھی رہے۔ دن کو رات ٹھہرایا گیا تو ماہ و پروین کی شہادت دینے والے قرآن کے پڑھنے والوں اور ماننے والوں میں سے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجی ست

جو کچھ کمایا جا رہا ہے سب کھویا چلا جا رہا ہے۔ ہر شخص کے سامنے واقعہ اپنی اس کھلی ہوئی واضح خصوصیت کے ساتھ موجود ہے، مگر اسی ناکام و نامراد بے نتیجہ قطعی لا حاصل عبث اور سدوی زندگی کے ساتھ تقریباً انسانیت مطمئن ہو چکی ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۸۳۔۲۸۵

آیت : ﴿أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾ (الکھف:۱۰۵)

''یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے پالنے والے کی نشانیوں کے بھی منکر ہو گئے ہیں، اور اس کا بھی انکار کر دیا ہے کہ اپنے اسی رب سے ان کی ملاقات ہو گی پس برباد ہو کر رہ گئے ان کے سارے اعمال اور کاروبار پس نہ ٹھہرائیں گے ہم قیامت کے دن ان لوگوں کا کوئی وزن۔''

جس مسئلہ کی طرف مذکورہ بالا الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے اس کے سمجھنے کے لئے ایک مثال کو پیش نظر رکھئے۔

کشتی گیری اور پہلوانی کے کمالات کا دعویٰ کر کے ایک شخص آپ کے سامنے اس طرح اپنے آپ کو پیش کرتا ہے کہ کشتی گیری اور پہلوانی کے سارے ساز و سامان سے بھی وہ لیس ہے گرد ملے، چٹ چڑھائے، دنگل میں اتر کر اپنے جوڑ کے پہلوان کو پچھاڑ پچھاڑ کر بھی دکھا رہا ہے۔ دوسری طرف پہلوانی ہی کے مدعی بن کر ایک اور صاحب آتے ہیں، لکھنو کے بانکوں کے لباس میں جلوہ گر ہیں، پہلوانی کی کوئی علامت اور نشانی اپنے ساتھ نہیں رکھتے ہیں، لیکن مدعی ہیں ان ہی کمالات کے جو پہلوانی کے ساتھ مختص ہیں۔ بتائیے کہ پہلوانی کے لحاظ سے کس کا وجود آپ کے لئے دیکھا بھالا قرار دیئے جانے کا زیادہ مستحق ہے؟

اب اسی مثال کی روشنی میں دیکھئے۔ کائنات جن میں حجر، شجر، نباتات، جمادات، حیوانات، انسان، چاند، سورج، تارے، الغرض گونا گوں مخلوقات میں اپنی تخلیقی کارفرمائیوں کو نمایاں کر کے خالق عالم نے اپنے آپ کو ہمارے سامنے جو ظاہر کیا ہے، ظہور حق کی اس شکل کے مقابلہ میں دلوں کا یہ تقاضا کہ موجودہ کائنات و کائناتی کمالات کے بغیر خدا ہمارے سامنے آتا، ظہور کی ان دونوں شکلوں میں کیا وہی نسبت نہیں ہے جو ان دونوں پہلوانوں میں تھی جن میں سے ایک پہلوانی کے سارے آثار اور نشانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہے اور دوسرا پہلوانی کے کمالات کا مدعی بن کر بجائے اپنے کمالی صفات کے صرف اپنی ذات کو پیش کر کے مطالبہ کر رہا ہے کہ اسے پہلوان مان لیا جائے۔

پھر کیسی عجیب بات ہے کہ اپنی کارفرمائیوں کے کمالات کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ ہمارے سامنے موجود ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہی کمالات جن کا قرآنی نام آیات اللہ یا اللہ کے پتے اور نشانیاں ہیں، ان آیات اور نشانیوں کے ساتھ ہم ان کو پائیں اور مانیں، لیکن کچھ لوگ یہ حیلہ تراش کر کے کہ کمالات سے معرا اور خالی ہو کر چوں کہ خدا ہمارے سامنے نہیں آیا، اس لئے ہم اس کو نہیں مان سکتے۔ بتلائیے کہ بجز ایک شیطانی حیلہ کے یہ اور بھی کچھ ہے؟ پہلوانی کے کمالات کے ساتھ پہلوان جب آپ کے سامنے آیا تو اس کے پہلوان ہونے سے آپ نے اس لئے انکار کر دیا کہ ہم تو اسی کو پہلوان مانیں گے جو پہلوانی کے سارے آثار و علامتوں سے معرا اور پاک ہو کر ہمارے سامنے آجائے۔ خدا بے زاری کی عام ذہنیت میں آپ ٹٹولیں گے تو اسی غیر منطقی طفلانہ مطالبہ کے جراثیم کے سوا یقین ماننے۔ آپ کو اور کچھ نظر نہ آئے گا اسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ

''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور نشانیوں کا انکار کر دیا''۔

یعنی کمالات رب کی ان کھلی ہوئی نشانیوں سے انہوں نے طے کر لیا ہے کہ ہم خود بھی خدا کو نہ پائیں گے اور نہ مانیں گے اور نہ دوسروں کو پانے اور ماننے دیں گے اور اسی بنیاد پر انہوں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ زندگی میں خالق کائنات کی ملاقات

کا خیال بھی صرف خیال ہی ہے۔ یہی خود بھی باور کئے بیٹھے ہیں اور دوسروں میں بھی چاہتے ہیں کہ اپنے اسی بے بنیاد فیصلہ کو منتقل کر دیں۔ اسی رجحان کے پھیلانے اور عام کرنے میں وہ سرگرم ہیں۔

الغرض خدائی آئین کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے زبردستی کا یہ غیر منطقی فلسفہ انہوں نے تراش لیا اور اپنی زندگی اور زندگی کے سارے کاروبار پر سے خدا اور خدا کے عقیدے کا دباؤ خود بھی اٹھا دیا ہے اور چاہتے ہیں کہ دوسروں سے بھی یہ دباؤ جس حد تک اٹھایا جا سکتا ہو اٹھا دیا جائے، حتیٰ کہ ان کاموں میں بھی جن کو جانتے ہیں کہ خدا ان سے خوش ہوتا ہے، ان کو بھی وہ یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ ہم خدا کے لئے انہیں نہیں کرتے۔ بہرحال ان کا جو قدم بھی اٹھتا ہے خدا کے لئے نہیں اٹھتا اور نہ خدا کے لئے وہ کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خدا کے پاس ان کی اور ان کے اعمال کی اگر کوئی قیمت نہ ہو تو اس کے سوا منطقی نتیجہ اس قسم کی خدا بیزار زندگی و افعال کا اور ہو ہی کیا سکتا ہے آپ نے کروڑ ہا کروڑ صرف کر دیئے ہوں، ساری دولت لٹا دی ہو، یا ایک کوڑی ہی دی ہو، ہر حال میں دیکھا جائے گا کہ یہ یا وہ جو کچھ بھی آپ نے کیا ہے کس لئے کیا ہے؟ کوڑی بھی خدا کے لئے اگر دی ہے تو چاہئے کہ خدا سے اس کوڑی کے معاوضہ کی توقع کریں، لیکن کروڑوں روپے اگر خدا کے لئے آپ نے نہیں دیئے'' تو خدا کے پاس خود سوچئے کہ معاوضہ کی امید کا حق آخر کس بنیاد پر آپ کو حاصل ہوتا ہے یا حاصل ہو سکتا ہے، پھر قدرتی نتیجہ اس کا جب

﴿فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾

''پس برباد ہو کر رہ گئے ان کے سارے اعمال اور کاروبار''۔

کی صورت میں آپ کے سامنے آئے تو عقل بھی اس کے سوا خود ہی بتایئے کہ اور سوچ ہی کیا سکتی ہے؟ اور اسی کی اطلاع قرآن نے اپنے ان الفاظ سے دی ہے۔ پس واقعہ وہی ہے کہ بذات خود عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ قیمت کے لئے ہمیشہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کس لئے وہ عمل کیا گیا۔ مشہور ہی ہے کہ تربیت و تادیب کے لئے یتیم کو تھپڑ ہی کیوں نہ مارا جائے تو یہ ثواب کا کام ہے اور مارنے والا یتیم کے خیر خواہوں میں کیا جائے گا، لیکن اس یتیم کو آوارہ بنانے کے لئے کوئی کھلاتا پلاتا اور پہناتا ہی کیوں نہ ہو وہ سمجھا جائے گا کہ بدترین جرم کا مرتکب ہے۔

﴿فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾

کے بعد جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾

''پس نہ ٹھہرائیں گے ہم قیامت کے دن ان لوگوں کا کوئی وزن''۔

ایک مطلب تو اس کا وہی ہے کہ خدا کے سامنے حاضر ہو جانے کے بعد ایسی ساری زندگیاں بے قیمت اور بے وزن ہو کر رہ جائیں گی جن میں خدائی نصب العین شریک نہ تھا اور جی چاہے تو آپ موجودہ تحقیق کے رو سے ''وزن'' کی حقیقت کا پتہ چلائیں، دنیا میں بھاری یا ہلکی چیزیں کیوں ہو جاتی ہیں؟ اور پھر سوچئے کہ مرکزی وجود کے احاطہ سے باہر نکل کر وزنی سے وزنی چیزوں کا وزن کیا باقی رہتا ہے یا رہ سکتا ہے۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۸۵۔۲۸۸

آیت : ﴿ذٰلِکَ جَزَآؤُھُمْ جَھَنَّمُ بِمَا کَفَرُوْا وَ اتَّخَذُوْٓا اٰیٰتِیْ وَ رُسُلِیْ ھُزُوًا﴾ (الکھف:۱۰۶)

''وہ ہے ان کا بدلہ جہنم، بدلہ ہے اس بات کا کہ وہ کفر کے مرتکب ہوئے اور بنالیا میری آیتوں اور میرے رسولوں (یعنی ان آیتوں کے پہنچانے والوں) کو ہنسی مذاق۔''

غور کرنا چاہئے کہ اس کے سوا ان کا انجام اور کیا ہوتا یا کیا ہوسکتا تھا؟ بادشاہی کے سارے ساز و سامان، تاج و تخت، تیغ و نگیں، اورنگ و دیہم، حذم و حشم کے ساتھ بادشاہ ہمارے سامنے جلوہ افروز ہے لیکن یہ حیلہ تراش کر کے شاہی ساز و سامان سے خالی ہو کر بادشاہ کی ذات چوں کہ ہمارے سامنے نہیں آئی، اس لئے بادشاہ کے احکام و فرامین اور ان احکام و فرامین کے لانے والوں کا ہم انکار کرتے ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس حیلہ کی آڑ لے کر بغاوت کی راہ اختیار کرنے والے اگر شاہی دار و گیر کی مصیبتوں میں اپنے آپ کو مبتلا پائیں تو اس کے سوا آخر ان کو کس بات کی توقع کرنی چاہئے؟

میں تو یہ سوچ کر حیران ہو جاتا ہوں کہ ایسا خوشنویس جب ہمارے سامنے آیا جو ازسرتاپا ان اوراق اور وصلیوں میں لپٹا ہوا تھا جو اس کی خطاطی کے کمالات سے معمور اور پٹے ہوئے تھے تو اس وقت اس سے زیادہ! احمقانہ کہیے یا پاجیانہ مغالطہ اور کیا ہوسکتا ہے، اگر کہا جائے کہ ہمارے سامنے خوشنویس نہیں، بلکہ خوش نویس کی تو صرف خوش نویسی آئی۔

بہر حال اپنے اس کرتوت کا قدرتی خمیازہ تو خود ان مغالطہ بازوں کے سامنے آئے گا، آ کر رہے گا اسی لئے ان کے اسی جہنمی انجام کو ان ہی کے حوالہ کر کے ہم جب اسی فقرے کے آخری جز یعنی

﴿وَ اتَّخَذُوْٓا اٰیٰتِیْ وَ رُسُلِیْ ھُزُوًا﴾

''اور بنالیا میری آیتوں اور میرے رسولوں کو ہنسی مذاق''۔

پر غور کرتے ہیں تو پھر ایک جدید علامت اور نئی نشانی ہمارے سامنے آجاتی ہے جس سے اس خاص گروہ کی شناخت میں ہمیں کافی مدد ملتی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ آیات کے لفظ کا ایک مطلب تو صحیفہ قدرت اور اوراق عالم پر اپنی کارفرمائیوں کے کمالات کو ظاہر کر کے حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات قدسی سمات کا عنوان اور پتہ کائنات اور کائناتی آثار کو جو بنا دیا ہے، آیات کے لفظ کا ایک قرآنی اطلاق تو یہ ہے، اسی کے ساتھ آیات ہی کے اسی لفظ کا اطلاق حق تعالیٰ ہی کے ان کلامی مظاہر پر بھی ہوتا ہے جن کے لباس میں اپنی مرضی اور اپنے منشاء کو خداوند قدوس جل مجدہ نے ظاہر فرمایا ہے۔ ہیں تو دونوں اصطلاحیں اور محاورے قرآن ہی کے، لیکن اصل واقعہ وہی ہے کہ قدرتی صحیفہ، اور قرآنی صحیفہ دونوں ہی کے آیات، آیات ہی ہیں۔

صحیفہ قدرت کے آیات کو آیات کی حیثیت سے استعمال کرنے کا نقطہ نظر جن کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے، ان کے دل میں لقاء رب کی آرزو بھی بجھ کر رہ جاتی ہے اور اسی کا لازمی نتیجہ ہے کہ اپنے رب قیوم کی مرضی و منشاء کی تلاش و جستجو کا جذبہ بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے، جس کے بعد ان کی نگاہوں میں نہ ان بزرگوں ہی کی کوئی قدر و قیمت باقی رہتی ہے، جن کا انتخاب اپنے مرضیات

سے آگاہ کرنے کے لئے قدرت کرتی رہی ہے۔ ''الرسل والانبیاء'' کے عنوان اور ناموں سے ہم جنہیں پہچانتے ہیں (صلوات اللہ علیہم والسلام) اسی کے ساتھ اس پیغام اور کلام کی بھی اہمیت ان کے دلوں سے نکل جاتی ہے اور نکال دی جاتی ہے جس کا مخاطب اپنے بندوں کو حضرات انبیاء و رسل (علیہم السلام) کے توسط سے ان کا پیدا کرنے والا خالق بناتا ہے، ذہنی انحطاط اور فکری پستی کی یہی ملعون نفسیاتی کیفیت تیرہ درونی اور شور بختی کی اس گستاخانہ منزل تک پہنچا دیتی ہے جس میں حکمت و نادانی اور شرافت و کبریائی کا سب سے بڑا ابلیسی سرمایہ اللہ کی آیتوں کا استہزا اور ان آیتوں کے پہنچانے والے رسولوں کا صرف ٹھٹھا اور تمسخر رہ جاتا ہے۔

کائنات کو اس پیدا کرنے والے خالق قیوم کی آیات اور نشانیوں کی حیثیت سے استعمال کرنے کے نقطہ نظر سے محرومی کا یہی آخری انجام اور انتہائی بلکہ شاید لازمی نتیجہ، ایسا لازمی نتیجہ کہ مرنے سے پہلے اسی زندگی میں پھوٹ پھوٹ کر اس کی گندگی اور عفونت ان سے بہ نکلتی ہے، ہر گلی کوچے میں اسی کی بدبو سے وہ پہچانے جاتے ہیں بلکہ اسی کی بھبھک اور بھپھارے سے اپنی شناخت وہ خود ہی کراتے پھرتے ہیں۔ یہی استہزا ان کی منطق اور یہی تمسخر ان کا فلسفہ بن جاتا ہے، ان کی تقریروں، تحریروں، رسالوں اور اخباروں، قصوں اور کہانیوں حتیٰ کہ تھیٹروں اور سینماؤں تک کا لازمی جزو یتی استہزاء کا یہی سنڈاس بنا ہوا ہے اور یہ ان کی آخری علامت اور امتیازی خصوصیت ہے جس پر ان کے متعلقہ قرآنی اشارے ختم ہو جاتے ہیں۔[1]

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۸۹۔۲۹۱

آیت : ﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۞ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ۞ قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ﴾
(الکھف:۱۰۷-۱۰۹)

''قطعاً جن لوگوں نے مان لیا اور صالحات سلجھے ہوئے کام کئے ہوں گے ان کے لئے فردوس کے باغات مہمان نوازی کے لئے، ہمیشہ رہیں گے ان ہی باغوں میں، نہ چاہیں گے ان باغوں سے منتقل ہونا، کہہ دو اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات لکھنے کے لئے تو وہ بھی میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا گو ہم اسی جیسا اور بھی اس کی مدد میں لائیں۔''

قرآن اور قرآن کے لانے والے رسول علیہ السلام پر ایمان لانے والوں اور اسی ایمان کے مطابق اپنی عملی زندگی کے سنوارنے والوں کو یہ بشارت آخر میں سنائی گئی ہے۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۞ خَالِدِينَ فِيهَا ﴾

''قطعاً جن لوگوں نے مان لیا اور صالحات وسلجھے ہوئے کام کئے ہوں گے ان کے لئے فردوس کے باغات مہمان نوازی کے لئے، ہمیشہ رہیں گے ان ہی باغوں میں۔''

اگرچہ یہ بشارت ایمان وعمل صالح والوں کے لئے قرآن کی عام بشارت ہے، قدم قدم پر اس کو دہرایا گیا ہے، یعنی چند روزہ خاکی زندگی کو کائنات کی مرکزی قوت اور محوری وجود کے مطابق رکھنے کی کوشش ہر کوشش کرنے والے کو اس ماحول تک پہنچا دیتی ہے جس میں اپنی ہر خواہش اور دل کے ہر تقاضے، ہر احساس کے ہم آہنگ عالم کی اسی مرکزی قوت اور محوری وجود کو پایا جائے گا۔ وفاقی نتیجہ میں پیدا ہونے والی اسی زندگی کا نام فردوسی زندگی ہے، لیکن اس عام بشارت میں خاص اس موقع پر ایک خاص اضافے کو بھی ہم پاتے ہیں۔ یہ

﴿لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا﴾

''نہ چاہیں گے ان باغوں سے منتقل ہونا''۔

کا اضافہ ہے۔ میں اسی اضافہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جیسا کہ معلوم ہے وفاقی نتیجہ سے پیدا ہونے والی فردوسی زندگی کے متعلق اس قسم کے خیالات کہ اس زندگی کے پانے والے انسان، انسان باقی نہ رہیں گے بلکہ فرشتہ یا اس سے بھی بڑھ کر (العیاذ باللہ) بجائے مخلوق کی ذات میں محو اور گم ہو کر ان میں ہر ایک خالق ہی بن جائے گا۔ اسی طرح مجازاۃ کی سزائی شکل میں باور کرایا جا رہا ہے کہ آدمی بجائے آدمی رہنے کے گھوڑا، ہاتھی، بیل، چوہا وغیرہ بن جاتا ہے۔ قرآن نے ان مالیخولیائی افکار اور خود تراشیدہ اوہام کے لئے اپنے اندر کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ صاف صاف کھلے کھلے لفظوں میں ہر جگہ اسی حقیقت کا مسلسل اعلان اور اعادہ اس کتاب میں کیا گیا ہے کہ جزائی اور سزائی، مکافات و

مجازات کی دونوں حالتوں میں انسان بہر حال انسان اور اپنے سارے انسانی جذبات اور خصوصیات کے ساتھ نتیجہ کی آنے والی زندگی میں باقی رہے گا۔ایسی صورت میں انسانی فطرت کی اسی خصوصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ لذیذ شئے کا مسلسل بار بار استعمال آدمی میں ملال یعنی اکتا جانے کی کیفیت کو پیدا کر دیتا ہے۔ بلند سے بلند ترین پیانے پر راحت وآرام عیش وسکون کا ہی نظم کیوں کر دیا جائے، لیکن ایک ہی حال کے دوام واستمرار سے راحت وآرام کی ایسی زندگی بھی آدمی کے لئے اجیرن ہی بن جاتی ہے۔ عموماً بورڈنگوں اور اقامت خانوں کا کھانا طلبہ پر اسی لئے ناگوار اور دوبھر بن کر رہ جاتا ہے کہ چند گنے چنے خاص کھانے کے تسلسل سے دل اکتا جاتے ہیں۔آدمی کی فطرت کا یہی جبلی قانون اور تقاضا ہے۔وسوسہ یہی ہوتا ہے کہ خلود ودوام کے ساتھ آدمی کی فردوسی زندگی کی لذت وسرور کا تسلسل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ بظاہر یہاں نئی آگاہی

﴿لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا﴾

''نہیں چاہیں گے ان باغوں سے منتقل ہونا''۔

کے الفاظ سے جو بخشی گئی ہے ان سے اسی وسوسہ کا ازالہ شاید مقصود ہے اور اس کی آیت یعنی:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾

''کہہ دو! اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات کے (لکھنے) کے لئے تو ختم ہو جائے گا سمندر کا پانی قبل اس کے کہ ختم ہوں میرے رب کے کلمات، اگرچہ لاتے ہی چلے جائیں اسی قسم کے سمندر (کے پانی) کو مدد کے لئے''۔

اس آیت کا دہلہ اولیٰ یا سرسری نظر میں اپنے ماسبق سے بظاہر تعلق محسوس نہیں ہوتا، لیکن اگر فکر معقول سے کام لیا جائے تو وہی وسوسہ یعنی فردوسی زندگی میں استمرار ودوام کی وجہ سے اکتا اور گھبرا جانے کا خطرہ فطرت انسانی کے عام اقتضاء کے مطابق دلوں میں جو پیدا ہوتا ہے اسی خطرے سے محفوظ ہونے کی ضمانت ان آیتوں میں ہم پا سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی احساسات لذت وسرور کو جنت کی زندگی میں جن چیزوں سے حاصل کریں گے، ان کے متعلق یہ مفروضہ ہی صحیح نہیں ہے کہ ایک دفعہ جو کچھ دیا جائے گا وہی ہمیشہ ملتا رہے گا۔سورہ بقرہ کی مشہور آیت:

﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾

''جب کبھی کوئی پھل جنت والوں کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو دیا گیا تھا ہمیں پہلے (حالانکہ یہ واقعہ نہ ہوگا) بلکہ بخشی جائیں گی ان کو ملتی جلتی چیزیں''۔

اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب کبھی جس چیز کے متعلق یہ خیال پیدا ہوگا کہ وہی بجنسہ مکرر دی گئی ہے تو فوراً اس خیال کا ازالہ تجربہ سے ہو جائے گا کہ صرف صورت میں مشابہت تھی لیکن معنوی حیثیت سے کبھی جنت کی کوئی چیز

دہرائی نہ جائے گی۔ جہاں کا یہ کلی قانون ہو جو کلما کے لفظ کا اقتضاء ہے، وہاں تکرار و اعادہ کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ایک دن سمجھاتے ہوئے فرمایا تھا:

لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ شی ء الا الا سماء

''نہیں ہے دنیا میں بہشت کی چیزوں سے لیکن صرف نام''۔

گویا یوں سمجھنا چاہئے جنت میں جو سیب مثلاً ملے گا، تو وہ بھی سیب ہی ہے، لیکن ہر لحاظ سے جنت والا سیب دنیا والے سیب سے اتنا مختلف ہوگا کہ دونوں میں کہنا چاہئے صرف لفظ اور نام ہی کا اشتراک ہوگا پھر فردوسی زندگی والے سیب کی ہر جہتی نوعیت کیا ہوگی؟ اسی کی طرف

مالا عین رات و لا اذنٌ سمعت و لا خطر علی قلب بشر[1]

''نہ دیکھا کسی آنکھ نے، نہ سنا کسی کان نے، اور نہ خیال گزرا اس کا کسی دل میں۔''

﴿فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ﴾ (حم سجدہ:۱۷)

''پھر نہیں جانتا ہے کوئی جو آنکھوں کی خنکی ان کے لئے چھپا کر رکھی گئی ہے''۔

کی یہ حدیث تفسیری توضیح ہے۔ اور یہ سب درحقیقت قرآن ہی کی آیت

﴿لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَزِیَادَةٌ﴾ (یونس:۲۶)

''جنہوں نے اچھے کام کئے ان کے لئے اچھا معاوضہ ہے اور ''زیادہ''۔

کے اجمال کی تفصیل ہے، اس آیت کریمہ میں ''زیادہ'' کے جس لفظ کو پا رہے ہیں، صحیح روایت و آثار میں اس کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ فردوسی زندگی میں براہ راست حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات مبارک سے انسانی فطرت کا رشتہ قائم کر دیا جائے گا۔

وہی ذات مبارک جس کے اسماء و صفات، کمالات، وشیونات کی نہ حد ہے اور نہ انتہا، پھر ان لامحدود کمالات کی باہمی ترکیب کے مظاہر جن کے مدارج کا کیفاً و کماً، نہ اور ہے نہ چھور، اپنے ان ہی بے تھاہ معلومات کو کلمہ ''کن'' سے حق تعالیٰ شہودی وجود عطا کرتے ہیں۔ معلومات کی لامحدودیت سے کن کا یہی ''کلمہ'' لامحدود کلمات بنا ہوا ہے اور ان کی اسی لامحدودیت کی تعبیر جیسا کہ ارباب تحقیق نے لکھا ہے، مذکورہ بالا آیت میں اس طریقے سے کی گئی ہے کہ سمندر میں سمندر ہی کا اضافہ کیوں نہ کیا جائے لیکن ''رب'' کے ان لامحدود کلمات کو لکھنے کے لئے وہ کافی نہیں ہو سکتے، وجہ ظاہر ہے کہ محدود لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسیح علیہ السلام کو قرآن میں ''کلمۃ اللہ'' جو فرمایا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ کلمہ کن سے براہ راست ان کی تخلیق ہوئی۔ بہشتی حقائق بھی چونکہ براہ راست کلمہ کن سے پیدا ہوتے رہیں گے اسی لئے وہ بھی کلمات ہی کے

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، ابی عبداللہ، صحیح البخاری، کتاب التوحید باب قول اللہ تعالیٰ یریدون ان یبدلوا کلام اللہ) [۷۴۹۸] ص ۱۲۹۱، مکتبہ دارالسلام، الطبعۃ الثانیہ ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ

نام سے موسوم ہوئے۔ بہرحال اب سوچئے اس بات کو کہ براہ راست جب اسی ذات بابرکات سے انسانی فطرت کا تعلق قائم ہو جائے گا، جس کے کلمات کی حدو انتہا نہیں ہے تو کسی خاص نقطہ تک پہنچ کر انجماد اور ٹھہراؤ کے خطرے کی گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف ہماری فطرت کے طلب اور تشنگی کی وہ لامحدودیت ہوگی جو کسی نوبت پر پہنچ کر بس کرنے پر راضی نہیں۔ دنیا کی زندگی میں بھی ''خوب سے خوب تر'' کی جستجو یہی ہماری جبلت اور فطرت کا قدرتی تقاضا ہے، پیدا کرنے والے نے طلب و تلاش کی اسی لامحدودیت کے ساتھ ہمیں پیدا کیا ہے۔

اور اس کے مقابلے میں لامحدود کمالات وصفات والی اپنی ذات ہی کو ہمارا فطری مطلوب بنا دیا ہے اور یہی میرا مطلب تھا کہ مذکورہ بالا آیت بظاہر اپنے ماسبق کی آیت سے غیر مربوط ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، لیکن قرآن کا تتبع بتاتا ہے کہ سب سے زیادہ ربط اسی مقام میں ہوتا ہے جہاں دہلہ اولی میں سرسری نظر والوں کو بے ربطی محسوس ہوتی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ فردوسی زندگی میں جب تجدد اور نو بہ نو، تازہ بہ تازہ ہی کے قانون کو استمرار بخشا جائے گا۔ تولا یبغون عنها حولا (نہ چاہیں گے جنتی اس سے منتقل ہونا) کے سوا اور سوچا ہی کیا جاسکتا ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۹۱۔۲۹۶

آیت: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ (الکھف:۱۱۰)

''کہہ دو کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ میں بھی آدمی تم ہی جیسا ہوں، مجھ پر یہ وحی نازل کی گئی ہے کہ تم لوگوں کا الٰہ (معبود) ایک ہے، پھر جو امیدوار ا ہوا اپنے رب کی ملاقات کا تو اسے چاہئے کہ کرے بھلے اور سلجھے ہوئے کام اور ساجھی نہ بنائے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔''

جو کچھ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے، بظاہر اس آیت کا بھی اس سے چنداں تعلق نظر نہیں آتا، لیکن غور کیجئے اپنے پیدا کرنے والے کی آئینی ذمہ داریوں سے بچنے کیلئے بجائے مشرکانہ کاروبار کے اکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت اور پشت پناہی کے نظریہ کا ذکر کر کے اس پر جو تنقید کی تھی، اس تنقید کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدرتاً کیا یہ سوال نہیں پیدا ہوتا یا نہیں ہوسکتا ہے کہ دون اللہ (اللہ کے سوا) کسی دوسرے کو اولیاء بنانا اور ان ہی کی پشت پناہی ڈھونڈھنی اگر جرم ہے تو اسی جرم کے مجرم وہ بھی ہیں جو رسولوں اور پیغمبروں کو خدا اور اس کے درمیان واسطہ اور ایلچی مانتے ہیں اور ان کی ولایت اور پشت پناہی سے امداد حاصل کرتے ہیں، خود قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ﴾ (المائدۃ:۵۵)

''تمہارا ولی (پشت پناہ) اللہ اور اللہ کے رسول ہیں''۔

یقیناً یہ ایک شبہ ہے اور چاہئے تھا کہ جو واقعہ ہے اس کو واشگاف کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بندوں اور ان کا خالق میں واسطہ کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس کی واقعیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہر ایک دیکھ رہا ہے کہ روشنی میں آفتاب کو، دودھ میں مثلاً گائے کو بھینس کو واسطہ بنایا گیا ہے، اس لئے بندوں اور خدا میں واسطہ نہیں ہے۔ مشرکانہ کاروبار والوں کے طریقہ عمل کی جو خصوصیت ہے یعنی خدائی ذمہ داریوں سے بھاگنے کی راہ انہوں نے یہ نکالی کہ ضرورتوں اور حاجتوں کے لئے وہ ان ہی درمیانی وسائط کو آگے بڑھا دیتے ہیں اور خود ان ہی درمیانی واسطوں کو کچھ لے دے کر ان ہی کی اپنے خیال کے مطابق منت وساجت کر کے فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا کام نکل جائے گا۔ اور ان کے مقابلے میں ان ہی ذمہ داریوں سے گریز کی دوسری راہ یہ ہے کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں ماہر اور حاذق بنا کر اپنی ساری ضرورتوں میں خدا سے قطعاً بے تعلق رہتے ہوئے ان ہی ایکسپرٹوں اور لیڈروں کی ولایت پر بھروسہ کر لیا جائے۔ چونکہ یہ دونوں صورتیں اپنے پیدا کرنے والے سے باغیانہ انحراف اور اپنے وجود کے نصب العین کی تکمیل سے گریز ہے، اس لئے درمیانی وسائط کی ولایت کی ان شکلوں کو قرآن نے مسترد کر دیا ہے اور ولایت کا وہ طریقہ جس میں اپنے اور اس کی مرضی کے پانے کی ضمانت پوشیدہ ہے اور اپنی پیدائش کے قدرتی نصب العین تک جس ذریعہ سے آدمی پہنچ جاتا ہے، ولایت کا یہ طریقہ تو موجود ہوطی زندگی کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس سے الگ ہو کر کامیابی تک انسانی زندگی پہنچ ہی نہیں سکتی۔ زمین کی طرف رخصت کرتے ہوئے انسان اول یعنی

ہمارے پدر اول کو اسی لئے یہ وصیت کی گئی تھی۔

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرہ، ۳۸)

''پھر آتے رہیں میری طرف سے تمہارے پاس راہ بتانے والے۔ ان راہ بتانے والوں کے پیچھے پیچھے جو چلیں گے نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ کبھی کڑھیں گے۔''

بہر حال اسی حقیقت کا اظہار جہاں تک میرا خیال ہے سورہ کہف کی اس آخری آیت میں بھی کیا گیا ہے۔ پیغمبر ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ صاف صاف کھلے لفظوں میں کہہ دیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں، قدرت نے صرف اپنے اس منشاء کے اظہار اور ترجمانی کے لئے میرا انتخاب فرمایا ہے، جس کی جوہری روح اور مرکزی عنصر یہ ہے کہ خالق کائنات ہی کو ساری انسانیت کا ''الٰہ'' اور ہر چھوٹی بڑی دینی و دنیوی ضرورت کا مرجع و ماویٰ بنالیا جائے اور وہی سب کا آخری ٹھکانہ بن جائے۔ یہ تو

﴿اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

''اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تمہارا الٰہ (معبود) ایک ہے۔''

کا مطلب اور خلاصہ ہوا لیکن آخر میں یہ جو فرمایا گیا ہے۔

﴿فَمَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾

''پھر جو امیدوار ہوا اپنے پالنے والے کی ملاقات کا تو اسے چاہئے کہ کرے بھلے (اور سلجھے ہوئے) کام اور ساجھی نہ بنائے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔''

جہاں تک میرا خیال ہے، خالق کائنات کو صحیح معنوں میں اپنا تنہا معبود اور واحد الٰہ بنانے کے عملی طریقہ کی طرف ان الفاظ سے جو توجہ دلائی گئی، اس کا حاصل بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ذات حق کے ساتھ براہ راست رشتہ پیدا کرنے کی جن دلوں میں امنگ اور آرزو ہو، ان کو اپنی دینی زندگی میں ترتیب کی پابندی پر اصرار کرنا چاہئے کہ ان کی زندگی عمل صالح کی زندگی بن جائے۔ اگرچہ عمل صالح عام لفظ ہے، لیکن آگے خالق کی عبادت اور خالق کے ساتھ بندوں کو جو تعلق رکھنا چاہئے، اس کا ذکر چونکہ کیا گیا ہے، اس لئے مقابلۃً یہی سمجھنا چاہئے مخلوقات کے ساتھ تعلقات کو سلجھاتے ہوئے خالق کی عبادت میں سرگرمی ہی صحیح نتیجے تک آدمی کو پہنچائے گی۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ خالق کی عبادت (نماز روزہ) وغیرہ میں جو چوکس نظر آتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ مخلوقات کے تعلقات میں لاپروائیوں سے کام لیتے ہیں اس کے برعکس مخلوقات یا حقوق العباد کو اہم قرار دیتے ہوئے خالق کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے کے ذوق سے جو محروم ہیں یہ دونوں ہی طبقے انسانی سلوک کی صحیح فطری راہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ٹھیک راستے پر وہی چل رہے ہیں جن کی نگاہوں میں دونوں ہی کی اہمیت ہے۔

اسی کے ساتھ اگر اس نکتے پر بھی نظر رکھی جائے کہ عمل صالح کا ذکر عبادت رب سے پہلے کیا گیا ہے۔ تو بظاہر اس سے یہ اشارہ بھی مل سکتا ہے کہ بین الخلوقاتی تعلقات کو الجھا کر خالق سے رشتے جوڑنے والے غیر طبعی طریقہ عمل میں مشغول ہیں۔[1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۹۸۔۳۰۰

باب سوم
مولانا گیلانی کا تفسیری منہج و اسلوب

فصل اول
تفسیری منہج واسلوب

فصل اول:

تفسیری منہج واسلوب

علم تفسیر کی معروف دو اقسام میں سے قرآنی آیات، سنت رسول اور اقوال صحابہ کے ذریعے کی جانے والی تفسیر، تفسیر بالماثور جبکہ اجتہاد کی مدد سے کی جانے والی تفسیر، تفسیر بالرائے کہلاتی ہے، مؤخذ الذکر کو مزید دو قسموں تفسیر بالرائے المحمود اور تفسیر بالرائے المذموم میں تقسیم کیا گیا ہے تفسیر بالرائے کی ان دو قسموں کے متعلق امام ذھبی لکھتے ہیں۔

"قسم جار علی موافقة کلام العرب و مناحیهم فی القول، مع موافقة الکتاب والسنة و مراعاة سائر شروط التفسیر، و هذا القسم جائز لا شک فیه و علیه یحمل کلام المجیزین للتفسیر بالرأی. وقسم غیر جار علی قوانین العربیة، ولا موافق للأدلة الشرعیه ولا مستوف لشرائط التفسیر، و هذا هو مورد النهی و محط الذم "[1]

"ایک رائے وہ ہے جو کلام عرب کے موافق اور کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہو اور اس میں تفسیر کی تمام ضروری شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہو اس قسم کی رائے بلا شک وشبہ جائز اور درست ہے جن علماء نے تفسیر بالرائے کی اجازت دی ہے ان کی مراد اسی قسم سے ہے۔ ایک قسم وہ ہے جو قوانین عربیت کے خلاف ہو اور شرعی دلائل سے موافقت نہ کرتی ہو اور اس میں تفسیر کی ضروری شرائط کا فقدان ہو اس قسم کی رائے ممنوع اور مذموم ہے۔"

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اگر چہ عام مفسرین کی طرح قرآن مجید کی با قاعدہ تفسیر تحریر نہیں کی البتہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی مختلف آیات کو اپنے مضامین وتصنیفات میں استعمال کیا ہے اور ان آیات پر کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً بحث کی ہے۔

مولانا گیلانیؒ آیات قرآنیہ کی توضیح وتشریح کے سلسلے میں دیگر قرآنی آیات، احادیث نبوی ﷺ اور بعض مقامات پر اقوال صحابہ سے بھی استفادہ کرتے ہیں اسکے علاوہ اپنی رائے اور اجتہاد سے کام لیتے ہوئے لطیف استنباطات بھی پیش کرتے ہیں مولانا کے تفسیری منہج واسلوب کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن

قرآنی آیات کی تفسیر میں دیگر آیات قرآنیہ سے استفادہ کرنا تفسیر کا ماخذ اول ہے کیونکہ قرآن کا بعض حصہ، بعض حصے کی وضاحت کرتا ہے مولانا گیلانی کے تفسیری مواد میں تفسیر بالقرآن کا التزام کیا گیا ہے۔

مثال

قرآن مجید میں

﴿لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (ھود:۱۲۳)

"اللہ ہی کی ہیں آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ باتیں، پلٹتی ہے بات سب کی سب اسی کی طرف تو اسی کو پوجے چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگاؤ۔"

---

[1] الذھبی، محمد حسین، التفسیر والمفسرون، دار الکتب الحدیثة، الطبعة الثانیه؛ بیروت ۱۳۹۶ھ، ۲۶۴/۱

کی جو تعلیم دی گئی ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ عقل سے تم زیادہ سے زیادہ پیدائش کے ان ہی آئین وقوانین کو دریافت کر سکتے ہو جو حواس وعقل کی رسائی کے حدود میں ہوں لیکن ''السموت والارض'' کے قوانین کا وہ حصہ جو حواس وعقل سے غائب ہے یعنی ''غیب السموت والارض'' ان کے متعلق تمہارے لئے چارہ کار ہی کیا ہے، بجز اس کے کہ وہی ذات جس کے ساتھ تمام چیزوں کی پیدائش وابستہ ہے سارے کاروبار کی جس پر انتہا ہے اسی کو اپنا بنا کر اسی کو پوجتے اسی سے مانگتے چلے جاؤ اور اسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ، گویا عقل وحواس کی راہوں سے جو معلومات حاصل ہو سکیں ان کا جو اقتضاء ہو اس کو پورا کرنے کے بعد واقعہ یہی ہے کہ آخری پناہ آدمی کے لئے پیدا کرنے والے کی پناہ اور اس پر توکل اعتماد کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے جب ساری باتیں اسی کی طرف لوٹ کر جاتی ہیں اور وہی مختار کل ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنے اوپر ٹیک لگانے والوں کو وہ بے ٹیک اور بے سہارا کر دے گا۔

﴿مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ (الطلاق:۳)

''جس نے ٹیک لگایا اللہ پر پس وہ بس ہے اس کو''

کا یہی مطلب ہے کہ بہر حال ایسا آدمی بے سہارا نہیں ہو سکتا اور یہی مقصد ہے اس کا کہ

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ (البقرہ:۲۵۶)

''اور الطاغوت (یعنی ہر وہ چیز جو خدا سے طغیان وسرکشی پیدا کرے) اس کا جس نے انکار کیا اور اللہ کو مان لیا تو اس نے پکڑ لیا مضبوط ترین کڑے کو۔''

تفسیر القرآن بالحدیث

نبی پاک ﷺ چونکہ شارح قرآن ہیں اسلئے آپ ﷺ کی احادیث مبارکہ تفسیر قرآن کا دوسرا ماخذ ہیں مفسرین قرآنی آیات کے مطالب ومعانی متعین کرنے میں احادیث نبوی سے بھی استفادہ کرتے ہیں مولانا گیلانی بھی تفسیر کرتے ہوئے احادیث نبوی سے استفادہ کرتے ہیں۔

مثال

﴿اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (الکھف:۶۵)

''دے رکھا تھا اپنے پاس سے ہم نے اسے رحمت اور سکھایا تھا ہم نے اپنے حضور سے اس کو علم''

اس آیت میں یہ دونوں فقرے جن کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ جس شخص کی ملاقات سے بلیغ جستجو اور پختہ عزم کے بعد موسیٰ کامیاب ہوئے تھے۔ ان کی ذات ایک نہیں بلکہ دو مستقل کمالات اور خوبیوں کی جامع تھی۔ دوسری بات یعنی ''علمنہ من لدنا علما'' کا مطلب تو ظاہر ہے کہ حسی وعقلی ذرائع کے سوا براہ راست علم وآگہی کی روشنی حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے سینے میں چمکتی رہتی تھی اور اس روشنی میں بعض مخفی حقائق جن کا علم صرف عقل وحواس کے ذریعے نہیں ہو سکتا تھا ان سے واقف ہو جاتے تھے یقیناً ان کے عملی درس کے عملی نمونوں میں بھی اس علم لدنی کی شہادتیں مل رہی ہیں لیکن دریافت طلب پہلا فقرہ ''اتیناہ رحمۃ من عندنا'' کا ہے ہم نے اپنے پاس سے اس کو رحمت عطا کی تھی یہ تو اس کا ترجمہ ہوا لیکن مطلب کیا ہے صحاح کی مشہور حدیث

ان للہ تعالیٰ مائۃ رحمۃ فمنھا رحمۃ بھا یتراحم الخلق بینھم (مسلم)[1]

1. النیساپوری، القشیری، مسلم بن الحجاج بن مسلم، صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ، وانھا تغلب غضبہ، [۶۹۷۵] ۲۰۔(۲۷۵۳)، ص ۱۱۵۵

''اللہ تعالیٰ کی رحمت کو سو حصوں پر مشتمل سمجھا جائے تو ان میں سے صرف ایک حصہ رحمت کا ہے (جو مخلوق کو ملا ہے) اسی کی وجہ سے ایک مخلوق دوسری مخلوق پر رحم کرتی ہے''۔

یہ یا اسی کے قریب قریب دوسرے الفاظ میں جس واقعہ کا اظہار روایتوں میں کیا گیا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر یہ سمجھا جائے کہ خالق کے ساتھ جیسے علم لدنی کا تعلق وہ رکھتے تھے اسی طرح مخلوق کے ساتھ رحمت وکرم، غمگساری و بہی خواہی و ہمدردی کے جذبات سے بھی قدرت نے ان کے قلب کو معمور فرما دیا تھا اس سے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ کھلی زندگی اور اس کے مشاغل کی دشواریوں کے حل کی طرف اس قصے میں جو اشارے کئے گئے ہیں ان اشاروں پر عمل اور اس جرات آزمائی عمل پر اقدام کی جسارت اسی قسم کے پاک نفوس میں پیدا ہو سکتی ہے جن کی ذات مذکورہ بالا دونوں خوبیوں کی جامع ہو۔[1]

تفسیر القرآن باقوال الصحابۃ

مولانا گیلانیؒ نے قرآنی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ کے تفسیری اقوال سے بھی بعض مقامات پر استفادہ کیا ہے۔

مثال

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً وَّ ہَیِّیٴۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا﴾ (الکھف: ۱۰)

''اے پروردگار عطا فرما اپنے پاس سے ہمیں رحمت اور فراہم فرما ہمارے معاملے میں رشد۔''

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں مولانا ''الرقیم'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں، تفسیر کی عام کتابوں میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف جن کے متعلق اگرچہ یہ قول بھی منسوب کیا گیا ہے کہ

لا ادری ما الرقیم

میں نہیں جانتا کہ ''رقیم'' کیا چیز ہے۔

تو ان ہی تفسیروں میں ان ہی کا یہ قول بھی ملتا ہے درمنثور میں ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

''من طریق علی عن ابن عباسؓ قال الرقیم الکتاب ''

علی کی یہ روایت ابن عباسؓ سے یہ ہے کہ ''الرقیم'' الکتاب ہے۔

لغت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اور لکھی ہوئی چیز کو ''الرقیم'' کہتے تھے اور صحابہ کے اقوال میں بھی مستند ترین قول یہی ہے کہ ''الرقیم'' سے مراد الکتاب ہے۔[2]

مثال

﴿ قُلۡ لَّوۡ کَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیۡ وَ لَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِہٖ مَدَدًا ﴾ (الکھف: ۱۰۹)

''کہہ دو، اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات کے (لکھنے) کے لئے تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے اگرچہ لاتے ہی چلے جائیں اسی قسم کے سمندر (کے پانی) کو مدد کے لئے۔''

۱۔ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۲۲۔۲۲۳

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۵

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہ معنوی حیثیت سے کبھی جنت کی کوئی چیز دہرائی نہ جائے گی حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول کو نقل کیا گیا ہے۔

لیس فی الدنیا مما فی الجنة شئی الا الاسماء (درمنثور)

''نہیں ہے دنیا میں بہشت کی چیزوں سے لیکن صرف نام''۱

تفسیر بالرائے

مولانا گیلانیؒ کو قدرت نے بہت اخاذ ذہن عطا فرمایا تھا آپ اپنی رائے اور اجتہاد سے بھی دوران تفسیر کام لیتے تھے آپ کے تفسیری مواد میں ذاتی استنباطات بھی بیشتر مقامات پر ملتے ہیں آپ نے اپنی رائے کو ہمیشہ سنجیدہ پیرائے میں بیان کیا ہے اور کبھی اپنی رائے کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو رائے آپ نے دی ہے یہی آیت قرآنی کا حتمی اور آخری مطلب ہے آپ کے تفسیری مواد کا مطالعہ کرنے کے بعد مولانا کی تفسیر بالرائے کو ہم بلاشبہ تفسیر بالرائے المحمود قرار دے سکتے ہیں۔

مثال

سورہ کہف کی آیت

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا﴾ (الکھف : ۹۰، ۹۱)

کے تحت ذوالقرنین کے سفر کے درمیانی مرحلہ میں ذوالقرنین جن لوگوں سے ملے ان کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

ان کی خصوصیت کا اظہار جن الفاظ میں کیا گیا ہے یعنی یہ کہ آفتاب جس وقت طلوع ہوتا تھا اس وقت ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا اوٹ نہ تھا ان الفاظ سے میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے کہ یہ حالت صرف طلوع آفتاب کے وقت تک محدود تھی ورنہ یہ احتمال کہ نہ وہ مکانوں ہی میں رہتے تھے اور نہ کسی قسم کا لباس پہنتے تھے بلکہ ان کی ساری زندگی کھلے میدانوں میں ننگے بدن گزرتی تھی اسی لئے ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا کوئی پردہ نہ تھا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے وحشی سے وحشی قومیں بھی کم از کم دھوپ بارش، سردی، گرمی وغیرہ سے بچنے کے لئے مصنوعی مکانوں میں نہ سہی لیکن غاروں اور قدرتی گڑھوں میں پناہ لیتی ہیں اسی طرح سوت اور اون کے بنے ہوئے کپڑے نہ سہی مگر چمڑوں یا پتوں ہی سے بدن کو ڈھانکتی ہیں۔

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس حال کو صرف اس خاص وقت کے ساتھ اگر محدود سمجھا جائے جس وقت آفتاب طلوع ہوتا ہے اور یہ قرار دیا جائے کہ ان کے مکانات کی تعمیر اس طریقہ پر ہوئی تھی کہ طلوع کے وقت کی شعاعوں سے مستفید ہونے کا موقع ان کو بھی اور ان کے گھروں کو بھی روزانہ میسر آتا تھا تو قطع نظر اس کے اس قسم کی تعمیری سکیم بعید از عقل بھی نہیں ہے، ہم اس سے اگر اس نتیجہ تک پہنچیں کہ قدرتی قوانین سے استفادہ کے سلسلہ میں اس قوم کا شعور کافی روشن اور بیدار ہو چکا تھا وہ جسمانی صحت کے گر سے بھی واقف تھے اور جسمانی صحت کا اثر دماغی اور قلبی صحت پر کیا اور کس حد تک پڑتا ہے اس کا بھی علمی تجربہ ان لوگوں کو تھا اور شاید اسی وجہ سے ذوالقرنین کی خدمات کی ضرورت ان کو نہ ہوئی تو قرآنی الفاظ میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس ذہنی انتقال کے لئے گنجائش ضرور پائی جاتی ہے خواہ یہ گنجائش کسی درجہ کی ہو۔۲

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۹۴

۲ ایضاً ص ۲۳۱-۲۳۲

ذاتی رائے بیان کرنے کا انداز

تفسیری نکات کا بغور مطالعہ کرنے والے کو مولانا کے کچھ مخصوص الفاظ بار ہا ملیں گے جن کو ان کی ذاتی رائے کہا جا سکتا ہے۔مولانا گیلانی بیشتر مقامات پر مندرجہ ذیل الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

کم از کم میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے ۱؎

میرا خیال یہی ہے ۲؎

کم از کم میری فہم ناقص اس نتیجہ پر پہنچی ہے ۳؎

میں یہ کہنا چاہتا ہوں ۴؎

ان الفاظ سے میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے ۵؎

کوئی مانے یا نہ مانے لیکن فقیر کا ذہن تو یہی پاتا ہے ۶؎

میرا ناچیز خیال ہے ۷؎

جہاں تک میں سمجھتا ہوں ۸؎

معلوم نہیں قرآن کے ان الفاظ کا مطلب دوسرے کیا سمجھتے ہیں لیکن مجھ پر تو یہی کھولا گیا ہے ۹؎

میرا صرف یہ ایک ذہنی انتقال ہے ۱۰؎

کم از کم میرا اپنا ذاتی خیال یہی ہے ۱۱؎

ربط مضامین آیات قرآنیہ

قرآن کریم کے ایک روشن معجزہ ہونے کی دلیل اس کا اسلوب بیان اور حیرت انگیز نظم تالیف بھی ہے اس کی ہر آیت کا مقتضا یہ ہے کہ اس آیت کا اپنے سے ماقبل آیت سے تعلق اور ربط و مناسبت معلوم کی جائے، آیات کے باہمی ربط و مناسبت کو بیان کرنے سے پڑھنے والے کے لئے یہ آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ قرآنی مفہوم کو بہتر انداز سے سمجھ سکے اور اس کے رموز و اسرار تک رسائی حاصل کر سکے اسی لئے مولانا آیات قرآنیہ کے باہمی ربط کو بیان کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

مثال

آیت قرآنی:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکھف: ۱۰۹) کا اپنی ماقبل آیت ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ (الکھف: ۱۰۸) سے ربط بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں۔

۱؎ گیلانی، مناظر احسن، سید دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۶۸ ۲؎ ایضاً، ص ۱۷۱

۳؎ ایضاً، ص ۱۷۲ ۴؎ ایضاً، ص ۲۳۱

۵؎ ایضاً ۶؎ ایضاً، ص ۲۴۳

۷؎ ایضاً، ص ۲۸۲ ۸؎ گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۸۹

۹؎ ایضاً، ص ۲۰۶ ۱۰؎ ایضاً، ص ۲۱۹

۱۱؎ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۶۸

اس آیت کا دہلہ اولیٰ یا سرسری نظر میں اپنے ماسبق سے بظاہر تعلق محسوس نہیں ہوتا لیکن اگر فکر معقول سے کام لیا جائے تو وہی وسوسہ یعنی فردوسی زندگی میں استمرار و دوام کی وجہ سے اکتا اور گھبرا جانے کا خطرہ فطرت انسانی کے عام اقتضاء کے مطابق دلوں میں جو پیدا ہوتا ہے اسی خطرے سے محفوظ ہونے کی ضمانت ان آیتوں میں ہم پا سکتے ہیں.... براہ راست جب اسی ذات بابرکات سے انسانی فطرت کا تعلق قائم ہو جائے گا جس کے کلمات کی حد وانتہا نہیں ہے تو کسی خاص نقطہ تک پہنچ کر انجماد اور ٹھہراؤ کے خطرے کی گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے ایک طرف ہماری فطرت کے طلب اور تشنگی کی وہ لامحدودیت ہوگی جو کسی نوبت پر پہنچ کر بس کرنے پر راضی نہیں دنیا کی زندگی میں بھی ''خوب سے خوب تر'' کی جستجو یہی ہماری جبلت اور فطرت کا قدرتی تقاضا ہے پیدا کرنے والے نے طلب و تلاش کی اسی لامحدودیت کے ساتھ ہی ہمیں پیدا کیا ہے اور اس کے مقابلے میں لامحدود کلمات وصفات والی اپنی ذات ہی کو ہمارا فطری مطلوب بنا دیا ہے اور یہی میرا مطلب تھا کہ مذکورہ بالا آیت بظاہر اپنے ماسبق کی آیت سے غیر مربوط ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، لیکن قرآن کا تتبع بتاتا ہے کہ سب سے زیادہ ربط اسی مقام میں ہوتا ہے جہاں دہلہ اولیٰ میں سرسری نظر والوں کو بے ربطی محسوس ہوتی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ فردوسی زندگی میں جب تجدد اور نو بہ نو، تازہ بہ تازہ ہی کے قانون کو استمرار بخشا جائے گا تو لا یبغون عنھا حولا (نہ چاہیں گے جنتی اس سے منتقل ہونا) کے سوا اور سوچا ہی کیا جا سکتا ہے۔[1]

لغوی تشریح

آیات قرآنی کی لغوی تشریح بھی تفسیر کے لئے ضروری علم ہے اسی بناء پر مولانا آیات قرآنی کی لغوی تشریح بھی دوران تفسیر بیان کرتے ہیں۔

مثال

﴿فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا﴾(الکھف: ۶)

''تو کیا ایسا ہوگا کہ تم اپنی جان کھو دینے والے بن جاؤ گے ان (عقیدہ ولدیت کے ماننے والوں) کے آثار پر اگر ایمان نہ لائے وہ اس بات پر (قرآن پر) مارے غم واندوہ کے''

اس آیت کے تحت لغوی تشریح بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

اثارھم کا جزو غیر معمولی توجہ کا مستحق ہے آثار کا لفظ اثر کی جمع ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے جس سے شاید وہ صحیح مفہوم دماغوں میں نہ آئے جو خالص عربی زبان میں اثر کے اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے لغت میں اس کی تشریح فارسی کے ان الفاظ سے کی گئی ہے منتھی الارب میں ہے ''اثر بقیہ چیزے ونشان'' آگے بیان کیا گیا ہے کہ نقش قدم کو بھی اسی لئے اثر کہتے ہیں پھر عربی کا محاورہ نقل کیا ہے کہتے ہیں اثر ابعد عین ''درحق کسے گویند کہ حاصل از دست دادہ وآثار ونشان او طلب غاید'' یعنی اپنی چیز کو کوئی کھو بیٹھا ہو اور اس کے بعد اس چیز کے آثار اور نشانیوں کو تلاش کرتا ہو۔

حاصل یہی ہے کہ اپنے بعد جن نتائج اور نشانیوں کو چیز چھوڑتی ہے ان ہی کی تعبیر عربی زبان میں آثار کے لفظ سے کرتے ہیں یہ لغوی تشریح تو آثار کے لفظ کی ہوئی۔

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۹۳-۲۹۶

دوسرا لفظ آیت میں باخع کا ہے جس کا مادہ بخع عام طور پر بخع کا ترجمہ ہلاک کرنا کر دیا جاتا ہے مگر عربی زبان کے ایسے محاورے اور زبان زد عام فقرے مثلاً بخع الارض بالزراعۃ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زمین پر اتنی کاشت کی گئی کہ روئیدگی کی صلاحیت جاتی رہی، اس طرح ''بخع الرکیۃ'' اس وقت بولتے ہیں جب کھودتے ہوئے زمین کے اس طبقہ تک آدمی پہنچ جائے جہاں سے کنویں کا پانی ابلنے لگے بہرحال کسی معاملہ میں جدوجہد کو اس کے آخری حدود تک پہنچا دینا بخع کا عربی اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

تیسرا لفظ اسف کا ہے، غم واندوہ اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ غم واندوہ حزن وملال کی ایک تو عام کیفیت ہوتی ہے لیکن یہی کیفیت شدت اور تیزی میں جب آخری شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے بعد قلبی کلفت اور بے چینی کا کوئی درجہ سوچا نہیں جا سکتا، تب اسف کے لفظ سے قلب کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے اسی لئے ایسی زمین جس میں روئیدگی کی صلاحیت قطعی طور پر باقی نہ رہی ہو، ایسی زمین کو ارض اسفۃ کہتے ہیں۔[1]

صرفی نحوی تشریح

تفسیر قرآن کے لئے دیگر علوم کے ساتھ مفسر کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم صرف ونحو سے بھی آگاہ ہو علم صرف میں لفظوں کی پہچان اور ان کے مشتقات کے قاعدوں کا ذکر کیا جاتا ہے جبکہ علم نحو میں الفاظ کے باہمی تعلق اور ان کی اعرابی حالت کی پہچان کے قاعدے بیان کئے جاتے ہیں مولانا گیلانیؒ بھی الفاظ قرآنی کی صرفی نحوی وضاحت کا اہتمام کرتے ہیں۔

مثال

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ﴾ (الفجر:۱۵)

اس آیت کے تحت مولانا لکھتے ہیں:

''ابتلاہ کے آخر میں ہ کا جو حرف ہے یہ تو ضمیر ہے اور انسان اس کا مرجع ہے رہ جاتا ہے اب صرف ابتلا یہ ماضی کا صیغہ ہے مصدر اس کی ابتلاء ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے امتحان یا آزمانا، چنانچہ اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے تو اب ابتلاہ کا ترجمہ ہوا، آدمی کے رب نے آدمی کا امتحان لیا یا آزمایا''[2]

مثال

﴿بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ (الفجر: ۱۷، ۱۸)

''بلکہ تم یتیموں کا اکرام نہیں کرتے اور المسکین کے کھانے پر لوگوں کو آمادہ نہیں کرتے۔''

اس آیت کے تحت مولانا لکھتے ہیں:

آیت میں تحاضون کا لفظ فرمایا گیا ہے جس کا مصدر محاضہ ہے محاضہ کے معنی ہیں باہم مل کر لوگوں کو آمادہ کرنا، تو اب مطلب یہ ہوا کہ ارباب ثروت کو ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے جس کی وجہ سے نہ صرف خود بلکہ دوسرے دولتمندوں میں بھی مسکینوں کی امداد واعانت کا جذبہ پیدا ہو گویا ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ لوگ امداد مساکین میں ایک دوسرے پر سبقت چاہنے لگیں۔[3]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۶۸۔۶۹

[2] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۶۷

[3] ایضاً، ص ۱۷۷

دعائیہ کلمات کا استعمال

دوران تفسیر دعائیہ کلمات کا استعمال مولانا گیلانی کے منہج کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

مثالیں

i) وما توفیقی الا باللہ ان ارید الا صلاح ما استطعت [۱]

ii) و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب [۲]

iii) واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل واخرو دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین [۳]

اشعار کا استعمال

دوران تحریر اشعار کا استعمال مولانا گیلانی کی تصانیف کی اہم خوبی ہے آپ تنوع اور قارئین کی دلچسپی کیلئے زیادہ تر اردو اور فارسی اشعار استعمال کرتے ہیں چند مقامات پر عربی اشعار کا بھی استعمال کیا ہے مولانا اپنی تحریرات میں علامہ اقبال، شیخ سعدی، اکبر الہ آبادی، مرزا داغ، غالب، شخصے، عارف شیرازی، رومی، جامی، عراقی، مرزا بیدل وغیرہ کے اشعار نقل کرتے ہیں۔

مثالیں

ـ رپٹ لکھوئی ہے یاروں نے جا جا کر یہ تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں [۴]

ـ عبادت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست [۵]

خاص وعام اور مطلق ومقید کا بیان

قرآنی آیات کے متعلق بعض مقامات پر مولانا گیلانیؒ خاص وعام اور مطلق ومقید کے احکام بھی بیان کرتے ہیں۔

مثال

﴿ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا﴾ (طٰہٰ : ۱۲۴)

''جو کترایا میری یاد سے تو قطعاً ہے اس کے لئے زندگی ضیق اور تنگی سے بھری ہوئی۔''

﴿مَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ ﴾ (الزخرف : ۳۶)

''اور جو آنکھیں چراتا ہے الرحمٰن کی یاد سے پیچھے لگا دیتے ہیں ہم اس کے شیطان کو۔''

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص۱۰۴

۲ گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص۸۷

۳ گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص۱۹۶

۴ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص۲۷۷

۵ گیلانی، مناظر احسن، سید، الدین القیم، ص۲۱۹

ان دونوں آیات کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

''دونوں میں من (جو) کا لفظ عام ہے جیسے بسطی معیشت والوں کو حاوی ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی یہی قاعدے منطبق ہوں گے جو اپنی قدری معیشت میں خدائی ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر زندگی گزارتے ہیں۔''[1]

مثال

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰکَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (الکهف : ۲۸)

''اور تھامے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام اور مراد بنائے ہوئے ہیں اسی کے رخ کو اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے چاہتے ہوئے دنیا (پست زندگی) کی زینت کو''۔

اس آیت کے تحت مولانا لکھتے ہیں:

''لا تعد عینک عنھم کے الفاظ میں ممانعت کی گئی ہے کہ رفاقت کی زندگی میں رفقاء کی طرف سے نظر نہ ہٹائی جائے لیکن یہ ممانعت مطلق غیر مشروط نہیں بلکہ آگے کے الفاظ ترید زینۃ الحیوۃ الدنیا کا جو مفاد ہے یقیناً اس حال کے ساتھ ممانعت کا یہ حکم مقید و مشروط ہے حاصل جس کا یہی ہوا کہ الحیوۃ الدنیا کی زینت کو مراد و مقصود بنانے کے لئے رفقاء سے نظر ہٹانے کی ممانعت کی گئی ہے''۔[2]

امام رازی و قاضی بیضاوی کے تفسیری اقوال سے استفادہ

مولانا گیلانی نے دوران تفسیر امام رازیؒ اور قاضی بیضاوی کے تفسیری اقوال سے متعدد مقامات پر استفادہ کیا ہے اسکے علاوہ چند مقامات پر علامہ جصاص اور علامہ شوکانی کے تفسیری اقوال بھی نقل کرتے ہیں۔

مثال

﴿فَابْعَثُوْٓا اَحَدَکُمْ بِوَرِقِکُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْکٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِکُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ﴾ (الکهف:۱۹)

''بھیجو تم اپنے میں سے کسی کو شہر کی طرف اس ورق (چاندی) کے ساتھ چاہیے کہ وہ دیکھے صاف ستھرا کھانے کو اور لائے تمہارے لئے روزی۔''

اس آیت کی تفسیر میں مولانا گیلانی امام رازی کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

وھذہ الا یۃ تدل علی ان السعی فی امساک الزاد امر مھم مشروع و انہ لا یبطل التوکل

''یہ آیت بتاتی ہے کہ زادراہ کا ساتھ رکھنا یہ شریعت کا ایک اہم مسئلہ ہے اور توکل پر اس سے زد نہیں پڑتی''۔[3]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۲۵۱

[2] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۷۲

[3] ایضاً، ص ۱۴۰

مثال

﴿ وَ لَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَ ازْدَادُوا تِسْعًا ﴾ (الکھف:۲۵)

''اور ٹھہرے اپنے کہف میں تین سو سال اور بڑھا دیا انہوں نے نو ماہ''۔ اور اس آیت کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

سنین کے بیان کرنے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے تو تین سو سال ان کے قیام کی مدت بتائی گئی ہے پھر فرمایا کہ نو سال کا اور اضافہ ہوا اس کی توجیہ میں امام رازی نے نقل کیا ہے کہ۔

كانت المدة ثلث مائة سنة من سنين الشمسية و تسع سنين من القمرية [1]

''تین سو سال تو شمسی حساب سے ہوئے اور نو سال قمری حساب سے''۔

مثال

﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾ (الزخرف:۳۲)

''ہم ہی نے بانٹ دی ہے الحیوۃ الدنیا (پست زندگی) میں ان کی معیشت کو ان کے درمیان اور اونچا کر دیا ہم نے بعض کو بعض سے مدارج کے لحاظ سے (یہ اس لئے کیا گیا) تا کہ انسانوں میں بعض بعض سے کام لیں۔''

اس آیت کے تحت مولانا گیلانیؒ مفسر قرآن قاضی البیضاوی کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

اى يستعمل بعضهم بعضا فى حوائجهم فيحصل بينهم تالف و تضام ينتظم بذالك نظام العالم [2]

''یعنی انسانوں میں بعض بعض سے اپنی حاجتوں میں کام لیں اور اسی ذریعہ سے باہم انسانوں میں باہمی الفت پیدا ہوتی ہے اور بعض بعض کے ساتھ مل گئے ہیں عالم کے نظام کا انتظام اسی پر قائم ہے۔''

مولانا انور شاہ کشمیری کی توضیحات سے استفادہ

مولانا گیلانیؒ اپنے استاد محترم مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی توضیحات سے بھی دوران تفسیر استفادہ کرتے ہیں اور ان توضیحات کو بطور دلیل بھی نقل کرتے ہیں۔

﴿ فَمَا اسْطَاعُوٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ﴾ (الکھف:۹۷،۹۸)

''پس وہ (یعنی یاجوج و ماجوج والے) نہ اس دیوار پر چڑھنے ہی کی قدرت رکھتے تھے اور نہ ان کے بس میں یہ تھا کہ اس دیوار میں نقب لگائیں (یعنی سوراخ کریں) یہ میرے رب کی مہربانی ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آ جائے گا تو کر دے گا اس کو ریزہ ریزہ۔''

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص۱۵۴

[2] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص۱۵۲

ان آیات کے تحت مولانا لکھتے ہیں کہ تفسیری روایتوں میں بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یاجوج ماجوج والے اس دیوار کو ڈھا ڈھو کر برابر کر دیں گے یا انہوں نے کر دیا ہے، اگر چہ یہ قرآنی بیان سے لاپروائی ہے پھر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ

انا لم نجده فی القرآن ولا فی حدیث صحیح

''یعنی (یاجوج و ماجوج کا خروج دیوار توڑ کر ہوگا) اس مسئلہ کو ہم نہ قرآن ہی میں پاتے ہیں اور نہ کسی صحیح حدیث میں''

پھر مولانا گیلانی ترمذی کی یہ روایت نقل کرتے ہیں:

''یاجوج و ماجوج والے روزانہ دیوار کو کھودتے ہیں پھر جب کچھ حصہ باقی رہ جاتا ہے تو گھروں کو یہ کہتے ہوئے پلٹ جاتے ہیں کہ ہم کل باقی کام کو پورا کر دیں گے مگر ان شاء اللہ تعالیٰ نہیں کہتے پس جب دوسرے دن واپس ہوتے تو کھودی ہوئی دیوار کو اسی حال میں پاتے ہیں یعنی کھودنے سے پہلے جیسی تھی ویسا ہی اس کو پائیں گے یوں ہی یہ سلسلہ جاری رہے گا تا آنکہ ایک دن ان شاء اللہ ان میں سے کسی کی زبان سے نکل جائے گا تب صبح کو جب آئیں گے تو دیوار کھدی ہوئی حالت میں ملے گی اسی کے بعد اس دیوار کو ڈھا دیں گے اور زمین میں فساد پھیلانے کے لئے نکل پڑیں گے''۔

پھر اس روایت کے متعلق مولانا کشمیریؒ کا فیصلہ نقل کرتے ہیں کہ:

''خود حضرت شاہ صاحب کا ذاتی فیصلہ تو یہ ہے کہ مشہور نومسلم یہودی عالم ''کعب احبار'' کا یہ قول ہے اور اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے۔''[1]

خاتمہ سورۃ پر دعائیہ کلمات

قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق مولانا کا تمام مواد باقاعدہ تفسیر قرآن کے انداز میں نہیں ہے البتہ مولانا نے سورہ کہف کی مکمل تفسیر لکھی ہے اور اس سورہ کے اختتام پر مولانا نے دعائیہ کلمات بھی درج کئے ہیں مولانا لکھتے ہیں:

''سورہ کہف کے متعلق ایک ظلوم وجہول کے واردات واحساسات پورے ہوئے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ربنا لا تواخذ نآ ان نسینآ او اخطانا ربنا و لا تحمل علینا اصراً کما حملته علی الذین من قبلنا ربنا و لا تحملنا ما لا طاقة لنا به و اعف لنا و اغفرلنا و ارحمنا انت مولانا فانصر نا علی القوم الکفرین Oسبحنک لا علم لنا الا ماعلمتنا انک انت العلیم الحکیم Oو اخر دعونا ان الحمد لله رب العالمین Oالذی بعزته و جلاله تتم الصالحات هذا والسلام علی من اتبع الهدی''[2]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۳۸۔۲۳۹

[2] ایضاً ص ۳۰۱

منفرد ذاتی اصطلاحات

دوران تفسیر مولانا گیلانیؒ نے چند ذاتی اصطلاحات بھی استعمال کی ہے۔

مثالیں

لحافیات

مولانا لکھتے ہیں:

''لحافیات میری ذاتی اصطلاح ہے مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ابتداء وانتہا وغیرہ جیسے امور جو قطعی طور پر انسانی حواس کی گرفت سے خارج ہیں ان ہی کے متعلق بجائے اعتراف جہل کے محض شاعرانہ تمثیلوں کے سہارے کسی قسم کا فیصلہ ایسی بات ہے کہ منہ پر لحاف ڈال کر آدمی پڑ جائے اور وہ وسوسہ جو دماغ میں آتا جائے اسی کو واقعہ ٹھہرالیا جائے مابعد الطبیعات کے اکثر مسائل کی نوعیت یہی ہے اسی لئے ان مسائل کا نام ہی میں نے لحافیات رکھ دیا ہے۔''[1]

یہ اصطلاح مولانا گیلانی نے سورہ الکھف کی آیت(مَآ اَشۡهَدۡتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ) (الکھف :۵۱) کے تحت ان لوگوں کے متعلق استعمال کی ہے جو کہتے ہیں عالم کی ابتداء یوں ہوئی، پہلے یہ ہوا، وہ ہوا وغیرہ۔

قانون مدوعد

اس قانون کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

یہ میری ایک اصطلاح ہے اور قرآن سے ماخوذ ہے مد کے قانون سے میرا اشارہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف ہے۔

﴿وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ زَہۡرَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۬ۙ لِنَفۡتِنَہُمۡ فِیۡہِ﴾ (طٰہٰ :۱۳۱)

بعض الفاظ کی کمی بیشی سے اس حکم کا اعادہ دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ﴾ (الحجر:۸۸)

ان دونوں آیات میں مد عین سے منع کیا گیا ہے مد کے معنی کھینچنے اور بلند کرنے کے ہیں اور عین کے معنی آنکھ مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو ان کی طرف اٹھانے سے منع کیا گیا ہے جنھیں گویا بسطی پیمانے پر روزی عطا کی گئی ہے۔[2]

اسی قانون کا دوسرا جز جسے عد کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے یہ اصطلاح بھی قرآن ہی کے الفاظ سے ماخوذ ہے۔

﴿وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا﴾ (ابراہیم:۳۴)

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۹۷۔۱۹۸
2. گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۸۹

اس آیت میں نعمتوں کے عد (شمار) کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اسی لئے جو قانون اس سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام مد کی مناسبت سے عد رکھ دیا گیا ہے مد کا قانون تو سلبی حکم پر مشتمل ہے یعنی مد عین سے روکا گیا ہے اور عد والا قانون ایجابی واثباتی ہے یعنی جن نعمتوں میں آدمی زندگی کے ہر لحہ میں ڈوبا ہوا ہے ان ہی کے گننے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔[1]

سلطانی وغیر سلطانی قوانین

﴿ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ﴾ (النجم:۲۳)

اس آیت کے تحت مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں کہ:

''اس دنیا کے کچھ قوانین تو ایسے ہیں جن میں خدا نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے یعنی اپنے آثار ونتائج کے لحاظ سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ ان کی واقفیت کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہو جاتا ہے قدرت کے ان ہی قوانین کو مذکورہ بالا قرآن کی آیت کی اصطلاح کی بنیاد پر میں ''سلطانی قوانین'' قرار دیتا ہوں اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں جن کے ساتھ انسان کی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے وہی غیر سلطانی باتیں سمجھی جائیں گی۔''[2]

قانون امالہ

ازالہ کے مقابلہ میں مولانا گیلانیؒ امالہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ازالہ کے معنی ہیں کسی چیز کا زائل کر دینا جبکہ امالہ کے معنی ہیں کسی چیز کے رخ کو پھیر دینا ایسے اعمال یا صفات جو انسان کے لئے تکلیف دہ ہوں ان کے لئے اسلام امالہ کا حکم دیتا ہے مثلاً ''عداوت'' ایک اخلاقی رذیلہ ہے اس لئے قرآن میں ازالہ کی بجائے اس کے لئے امالہ کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے (اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا) (فاطر:٦) یعنی عداوت ودشمنی کا رخ شیطان کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔

اس قانون کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''آدمی کے باہر ہو یا اندر یہاں جو کچھ ہے سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے غلطی ہو یا ظلم جس کی ذات اس کے شائبہ سے بھی برتر و پاک ہے اس کی پیدا کی ہوئی چیز قطعاً غلط نہیں ہو سکتی۔ اس لحاظ سے آدمی کے اندر ہو یا باہر قدرتی کارفرمائیوں کے کسی اثر کے ازالہ کا سوال ہی اسلام میں پیدا نہیں ہوتا خواہ دنیا نے اس کا کچھ ہی نام رکھا ہو اور جن الفاظ سے چاہے اسے بدنام کیا ہو رہے وہ نتائج جو ان قدرتی آثار و قوانین سے پیدا ہو کر انسانیت کے لئے تکلیف دہ اور زندگی کو تلخ بنا رہے ہیں بجائے ازالہ کے اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ان آثار وقوانین کے صحیح استعمال کی راہیں پیدا کی جائیں، ازالہ کے مقابلہ میں استعمال کی صحیح راہوں کا دریافت کرنا اور ان ہی کے مطابق عمل کرنا اسی کا نام قانون امالہ رکھا گیا ہے۔ جیسے ازالہ کے معنی ہیں کسی چیز کا زائل کر دینا اسی طرح امالہ کے معنی ہیں کسی چیز کے رخ کو پھیر دینا۔''[3]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۹۳

[2] ایضاً ص ۸۴

[3] ایضاً ص ۱۲۵۔۱۲۶

اطناب

مولانا گیلانیؒ کے منہج کی ایک اہم خصوصیت ان کی تحریر کا اطناب بھی ہے بعض اوقات ایک مسئلہ کی وضاحت میں ضمنی مباحث اس قدر طوالت اختیار کر جاتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ اصل موضوع ہی یہی ہے اس بات کا اظہار مولانا یوں فرماتے ہیں:

''طول کلامی کے الزام سے پھر ڈر رہا ہوں لیکن جو کہنا چاہتا ہوں اگر الزام کے ڈر سے اسی کو چھوڑتا چلا جاؤں تو پھر لکھنے کی اس دردسری کے خریدنے کی حاجت ہی کیا تھی قرآن میں تو سب ہی کچھ لکھا ہوا ہے خواہ اسے سمجھا جائے اور سمجھایا جائے یا نہ سمجھا جائے نہ سمجھایا جائے'' [1]

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۱۳۱

فصل دوم

تفسیری تفردات

فصل دوم:

تفسیری تفردات

مولانا مناظر احسن گیلانی ذہانت وفطانت میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے احکام وسائل میں آپ کی گہری نظر تھی معقول و منقول دونوں علوم میں ماہر تھے قدیم ومعاصر افکار کا بھی بنظر عمیق مطالعہ کیا۔ آپ قرآن کریم کی تفسیر کرتے ہوئے سابقہ مفسرین کی رائے کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے لیکن اگر کسی مسئلے کے متعلق آپ کی رائے دیگر علمائے وقت سے مختلف ہوتی تو اسے سنجیدہ پیرائے میں علماء کی خدمت میں پیش کرتے تاکہ دوسروں کو بھی غور وفکر کا موقع ملے نیز مخالف آراء کو غور سے سنتے اور پڑھتے اور اشکال کو حل کرنے کی کوشش کرتے میرے زیر مطالعہ مولانا کی جو کتب رہیں ان میں آپ کے تفسیری تفردات بکثرت ملتے ہیں جن کو اس مقالہ کے قارئین دوران مطالعہ محسوس کریں گے۔ مولانا کے تفسیری تفردات کو یکجا کرتے ہوئے چند دیگر تفاسیر مثلاً تفسیر حقانی، تفسیر جلالین، تفسیر مدارک التنزیل کا بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مولانا کے تفسیری تفردات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

i) نظریہ خلود بخشی

سورہ ہمزہ کی آیت

آیت : ﴿يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهٗ أَخْلَدَهٗ﴾ (الھمزہ:۳)

''خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشتا ہے۔''

اس آیت نے میرے ذہن کو ایک عجیب مسئلہ کی طرف منتقل کر دیا ہے، میں نہیں کہتا کہ قرآنی الفاظ کی یہ تفسیر ہے، بلکہ میرا صرف یہ ایک ذہنی انتقال ہے، غور کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دیتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے قصے میں جس ''الشجرہ'' کا ذکر ہے، اگرچہ کتابوں میں اس کے متعلق بیسیوں اقوال پائے جاتے ہیں، اور ان ہی اقوال میں سے عوام میں ایک قول یعنی یہ بات کہ وہ گیہوں کا درخت تھا، جس کے قریب جانے سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، زیادہ مشہور ہوگیا ہے، اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ کسی صحیح روایت سے نہ یہ ثابت ہے اور نہ دوسرے اقوال کی تائید کسی صحیح حدیث سے ہوتی ہے، اسی لئے علامہ شہاب محمود آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھ دیا ہے کہ۔

الا ولیٰ عدم القطع بها

''زیادہ بہتر ہے کہ کسی قول کے متعلق قطعی فیصلہ نہ کیا جائے''۔

اسی لئے میرا عقیدہ بھی اگرچہ یہی ہے کہ جس چیز کو خدا نے مبہم چھوڑ دیا، ہم خواہ مخواہ اس کی تعیین میں کیوں سر کھپائیں، خصوصاً جب اس کا کوئی نفع بھی نہ ہو، آخر اگر یہ متعین بھی ہو جائے کہ وہ گیہوں یا انگور، یا عقل یا حیات ہی کا درخت تھا تو اس سے کوئی خاص علمی یا عملی نتیجہ کیا حاصل ہوتا ہے۔

لیکن اگر حضرت آدمؑ کے اس قصہ کو صرف قصہ کی حیثیت سے نہ پڑھا جائے، بلکہ اولاد آدم کی موجودہ زندگی میں اس قصہ کے اجزاء سے نفع اٹھانے کا ارادہ کیا جائے، تو اس وقت دوسرے اجزاء سے قطع نظر کرتے ہوئے میں ''الشجرہ'' کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں جب یہ موجود ہے کہ بہکاتے ہوئے ''الشیطان'' نے حضرت آدم کو کہا کہ

﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ (طہٰ:۱۲۰)

''کیا راہ نمائی کروں تمہاری ہمیشگی کے درخت کی طرف''۔

اور دوسری جگہ اسی کی شرح کرتے ہوئے شیطان ہی کی زبان سے یہ ادا کرایا گیا ہے کہ اس نے آدمؑ وحواؑ کو یہ سمجھایا تھا کہ خدا نے اس ''الشجر ۃ'' سے تم دونوں کو اس لئے روکا ہے کہ اس ''الشجر ۃ'' کے استعمال کے بعد تم دونوں کو ''خلود'' حاصل ہو جائے گا، یعنی تکونا من الخالدین (ہو جاؤ گے تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں میں) کا جو حاصل ہے۔

اب ایک طرف اس مسئلے کو سامنے رکھ لیجئے، اور دوسری طرف سورہ ہمزہ کے اس مضمون پر غور کیجئے کہ آدمی مال اور سرمایہ ہی کے متعلق خیال کرتا ہے کہ اس میں ''خلود بخشی'' کی کیفیت پائی جاتی ہے، اس کے بعد اگر یہ سمجھا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام جس عالم میں اس وقت تھے اس وقت ان کے سامنے خواہ کسی صورت میں وہ چیز پیش ہوئی ہو، لیکن آدم کی اولاد کے سامنے وہی آج مال اور سرمایہ کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ہے، تو جہاں تک قرآن کا اقتضاء ہے، یہ خیال چنداں بعید نہیں قرار دیا جاسکتا، آخر ان امور پر غور کیجئے۔

۱) حضرت آدم اور ان کی بیوی حوا علیہا السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ

﴿كلا منها رغدا حيث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظالمين﴾

''دونوں کھاؤ اس باغ میں جی بھر کر جہاں سے جی چاہے۔ اور نہ قریب پھٹکنا اس درخت کے، کیونکہ تب ہو جاؤ گے تم اپنی حد سے نکلنے والے، یعنی ظالموں میں ہو جاؤ گے''۔

آج یہی دیکھا جاتا ہے کہ اولاد آدم کے سوا زندگی کی تمام ضرورتوں کی محتاج ہستیاں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اس طور پر زندگی گزار رہی ہیں کہ صبح سے شام تک خوب کھاتی پیتی چرتی چگتی رہتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی اپنی ضرورتوں کے متعلق خلود اور دیرپائی کی ضمانت میں سرگرداں نہیں ہے۔ ان سب میں صرف ایک آدم زاد ہے جو آج کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد ''کل'' کے متعلق ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے عدم اطمینان کی اسی کیفیت کے ازالہ کے لئے وہ اس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہے، جس کے متعلق ''خلود بخشی'' کا خیال اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی مال اور سرمایہ گویا آج جو مل رہا ہے، کل وہی ملتا رہے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ضمانت مال اور سرمایہ ہی میں مستور ہے۔

۲) حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ ''شجرہ الخلد'' کے چکھنے کے ساتھ ہی ان کے سواۃ (چھپانے کی چیزیں) کھل گئیں، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے، بلکہ قرآن ہی کے حوالہ سے گذر چکا کہ مال کی محبت میں جب بخل کی راہ آدمی اختیار کرتا ہے تو ''الحسنیٰ'' یعنی اچھی باتوں کی تکذیب شروع کر دیتا ہے، گویا یوں مال اور سرمایہ کی محبت اس کے عیوب کو کھول دیتی ہے۔

۳) اسی ''الشجر ۃ'' کے چکھنے کا نتیجہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ان کو ہبوط اور اتر جانے کا حکم دیا گیا۔ حق تعالیٰ کی درگاہ میں قرب کا جو مقام ان کو حاصل تھا اسی سے وہ اتار دیئے گئے، آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے سارے احتیاجی تعلقات اسی مال کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ بندے اور خدا کے درمیان جو احتیاجی تعلق رہنا چاہیے، وہ تعلق باقی نہیں رہتا۔ قرآن میں بھی من بخل و استغنیٰ کے الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۴) مال میں جیسے غنا بخشی کی کیفیت بہ ظاہر لوگوں کو محسوس ہوتی ہے۔ گویا عدم احتیاج کا جو ایک پہلو فرشتوں میں پایا جاتا ہے، اسی ملکوتی پہلو کی تکمیل کی ایک شکل مال میں پائی جاتی ہے۔ حضرت آدم کو بھی شیطان نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ اس ''الشجرۃ'' کے استعمال سے چوں کہ ملک (فرشتہ) بن سکتے ہو، اس لئے خدا نے تم کو اس سے روکا ہے۔

۵) شیطان نے اس ''شجرۃ الخلد'' کی ایک صفت ملک لا یبلیٰ بھی بیان کی تھی، یعنی یہ ایک ایسی چیز ہے جو پرانی اور کہنہ نہیں ہوتی، معاشیات کے ماہرین اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ فرسودگی اور کہنگی دنیا کی دوسری چیزوں پر جلد طاری ہو جاتی ہے، لیکن سونا اور چاندی میں یہ بات نہیں پائی جاتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ ہی ایک ایسی چیز ہے کہ کسی کو قرض میں اگر آج دیا جائے اور سو سال بعد واپس لیا جائے۔ تو نہ دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ سو سال کی اس مدت میں تمہارے روپے پرانے اور فرسودہ ہو گئے، اور نہ لینے والا واپس لیتے ہوئے یہ خیال کر سکتا ہے، بلکہ جس تر و تازہ حال میں روپیہ دیا جاتا ہے، خواہ کتنی ہی مدت بعد واپس ہو، اسی حال میں واپس بھی لیا جاتا ہے، ایسی مملوکہ شئے جو پرانی نہ ہو، میں تو خیال کرتا ہوں کہ دنیا میں روپے کے سوا شاید ہی کوئی دوسری چیز ہو۔

٦) ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسی ''شجرۃ الخلد'' کی سزا میں ہبوط اور نزول کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ ''تمہارے بعض بعض کے دشمن رہیں گے۔'' یعنی بعضکم لبعض عدو۔ آدمؑ کی اولاد میں بھی آج جتنے جھگڑے رگڑے، جنگ و جدال چھوٹے پیمانوں پر ہوں یا بڑے پیمانوں پر، آخری چیز ان تمام لڑائیوں اور جھگڑوں کی تہہ میں عموماً یہی مال و دولت ہی ہوتی ہے۔

میرے ذہنی انتقال کے اسباب یہی تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک صحیح ہے، صرف دماغ میں ایک بات آئی تھی، مدتوں سے کھٹک رہی تھی، اس کا اظہار کر دیا گیا و العلم عند اللہ تعالیٰ وھوا علم بمرادہ [1]

ii) جہنم کا عذاب

مومن کو جہنم کا عذاب ہوگا یا نہیں اس کی تمہید میں مولانا لکھتے ہیں۔

''اس مضمونچہ کی حیثیت جواب کی نہیں بلکہ لکھنے والا کچھ پوچھنا چاہتا ہے گویا مفتی نہیں بلکہ اہل علم کے سامنے مستفتی بن کر حاضر ہو رہا ہے.... دین اور علم دین سے دلچسپی رکھنے والے میرے صحیح مخاطب ہیں''۔

مولانا کی رائے میں مومنین اپنے عقیدے کی بنیاد پر عذاب جہنم کا شکار نہیں ہوں گے اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے سورۃ النساء کی یہ آیتیں استدلال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

﴿لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءً ا يُّجْزَ بِهٖ﴾ (النساء:۱۲۳)

''نہ تمہاری آرزوؤں اور نہ کتاب والوں کی آرزوؤں کا تابع بلکہ قدرت کا فیصلہ ہے کہ جو بھی کرے گا کوئی برائی بدلہ اس کا، اسے دیا جائے گا''۔

اسی کے مقابل قرآن ہی میں ہے۔

﴿وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءً ا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (النساء:۱۱۰)

''اور جو کوئی کرے برائی یا اپنے آپ پر جو ظلم کرے پھر بخشش اور مغفرت چاہے اللہ سے تو ہے اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا مہربان۔''

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، اسلامی معاشیات، ص ۲۱۹-۲۲۲

تیسری آیت یہ نقل کرتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء:۱۱۶)

''قطعاً اللہ نہ بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شریک اور ساتھی ٹھہرایا جائے اور بخش دے گا اس کے سوا جس کے لئے چاہے۔''

پھر یہ آیت لکھتے ہیں۔

﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰی O لَا یَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَی O الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی﴾ (الیل:۱۴،۱۵،۱۶)

''میں نے دھمکایا تم کو آگ سے جو بھڑک رہی ہے نہ گھسے گا اس میں جو سب سے زیادہ بدبخت ہے وہی جس نے جھٹلایا اور پیٹھ پھیری''۔

اس کے بعد بخاری کی حدیث نقل فرمائی ہے جس کے راوی معاذ بن جبلؓ صحابی ہیں۔

ما من احد یشهد ان لا اله الا الله محمد ارسول صدقامن قلبه الا حرمه الله علی النار

''رسول اللہ نے فرمایا کہ ایسا کوئی آدمی نہیں جو گواہی دے اس بات کی کہ نہیں ہے الٰہ (معبود) مگر اللہ ہی اور یہ کہ قطعاً محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں دل کی سچائی کے ساتھ جس نے ان دونوں باتوں کی گواہی دی اور اقرار کیا تو نہیں ہے اس کے لئے کوئی صورت بجز اس بات کے کہ حرام کردے اللہ اس پر آگ کو یعنی جہنم کو۔''

دوسری روایت عتبان بن مالکؓ صحابی کی ہے۔

ان الله حرم علی النار من قال لا اله الا الله یبتغی بذلک وجه الله

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قطعاً اللہ نے آگ یعنی جہنم پر حرام کر دیا اس کو جس نے لا الہ الا اللہ کہا۔ اللہ کے چہرے کو اس کے ذریعے تلاش کرتا ہے۔''

اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ ان دونوں حدیثوں کا مفہوم بھی وہی ہے جو سورہ واللیل والی آیت کا مفاد ہے یعنی جہنم میں صرف وہی جائیں گے جنھوں نے اللہ کے رسول کے لائے ہوئے پیغام کو جھٹلا دیا ہو اور جھٹلا کر پیغمبر سے رشتہ توڑ لیا ہو بالفاظ دیگر تکذیب وتولی کا مجرم بن کر جس نے اپنے آپ کو شقاوت اور بدبختی کی آخری منزل تک پہنچا دیا ہو یعنی الاشقی الذی کذب وتولّٰی کا جو مصداق بن گیا ہو ان صفات سے موصوف ہونے کے بعد چونکہ کوئی مسلمان باقی نہیں رہ سکتا اس لئے آیت کا واضح اور کھلا ہوا مطلب یہی ہوا کہ جہنم میں وہی جائے گا اور اس کے سوا کوئی نہ جائے گا جو مسلمان نہیں ہے''۔

ان دلائل کی روشنی میں مولانا کہنا چاہتے ہیں کہ جہنم کا عذاب غیر مسلموں کے لئے مخصوص ہے مومن پر جہنم کی آگ حرام کر دی گئی ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

''کسی قسم کا مسلمان ہو جہنم کی آگ اس کے لئے حرام ہے اور جہنم کی آگ کے لئے وہ حرام ہے گویا نہ جہنم ہی

مسلمانوں کے لئے ہے نہ مسلمان ہی جہنم کے لئے ہے بتایا جائے اس عقیدہ کو غیر قرآنی عقیدہ قرار دینے کی کیا صورت ہے خصوصاجب بخاری کی دو دو صحیح حدیثوں کا صریح وواضح مفاد بھی یہی ہے''۔

گناہ گار مسلمان کی سزا کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

''جو مسلمان ہے وہ اس عذاب جہنم سے تو بچ جائے گا مگر عذاب کی اور بھی توقسمیں ہیں یعنی جہنم میں داخل ہونے سے پہلے جسد (پل صراط) میدان حشر کی فوقانی وتحتانی، ظاہری وباطنی پریشانیاں، نیز اس سے پہلے برزخی عذاب کا بھی ایک مستقل سلسلہ ہے یہ تو مرنے کے بعد جہنم میں داخل ہونے سے پہلے سزاؤں کی مختلف غیبی شکلیں ہیں جو آئندہ اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد پیش آئیں گی اوران کے سوا موت سے پہلے خود اسی دنیا میں مصائب وآلام کی گوناگوں شکلوں کا حصہ بھی ہے ظاہر ہے کہ جہنم کے عذاب سے بچ جانے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ سزاؤں کی دوسری شکلیں جو موت کے بعد یا موت سے پہلے اسی زندگی میں مجرموں کو پکڑتی ہیں، ان سے بھی مسلمان ہونے سے آدمی محفوظ ہو جاتا ہے۔''

مولانا محمد بن سیرین تابعی کے متعلق لکھتے ہیں کہ سورہ واللیل کی مذکورہ بالا آیت کا مطلب وہ بھی بیان کرتے تھے کہ مسلمان خواہ عملاً کسی حال میں ہو جہنم کی سزا سے بری ہو جاتا ہے اور آخر زمانے میں ہندوستان کے مشہور مجدد اسلام حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی اپنے مکتوب ۲۶۶ جلد اول میں فرماتے ہیں۔

''اہل کبائر گناہاں ایشاں بمغفرت نہ آمدہ اندبہ توبہ یا شفاعت بالمجرد عفو و احسان و نیزآں کبائر راباآ لام و محن دنیوی یا شدائد سکرات موت مکفرنہ ساختہ امید کہ در عذاب آنہا جمعے رابعذاب قبر کفایت کنند و جمعے دیگر راباوجود مختہائے قبر یا اہوال قیامت و شدائدآں روز اکتفا فرمایند

کبیرہ گناہوں کے مجرموں کے گناہ توبہ کی وجہ سے یا شفاعت حق تعالیٰ کی عام مہربانی وعفو وکرم کی وجہ سے نہ بخشے گئے نیز ان کبیرہ گناہوں کا ازالہ دنیا کی مصیبتوں اور تکلیفوں سے نہ ہوا ہو تو اس کی توقع ہے کہ بعضوں کے لئے عذاب قبر کی سزا کافی ہوگی اور بعضوں کے لئے عذاب قبر کے ساتھ قیامت کے دن کے مصائب اور سختیاں کافی ہو جائیں گی''۔

اخیر میں مجدد صاحب فرماتے ہیں:

''از گناہاں باقی نہ گزادند کہ محتاج بعذاب نار گردند''

''جس کا حاصل یہی ہوا کہ مسلمان ہونے کے بعد خواہ کسی قسم کے کبیرہ اور بڑے بڑے اہم گناہوں میں کوئی بتلا ہو پھر بھی سزا پانے کے لئے عذاب نار یعنی جہنم کی ضرورت اس مسلمان کے لئے باقی نہ رہے گی۔''

مولانا گیلانی نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ کی عبارت بھی اسی مفہوم کی اپنے مضمون میں نقل فرمائی ہے اور دوسری مختلف حدیثیں بھی کہ مسلمانوں کے گناہوں کا ازالہ کس کس طرح دنیا میں ہوتا رہتا ہے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، وضو، مسجد

کی حاضری، توبہ، استغفار پھر دنیاوی مصائب وآلام یہ ساری چیزیں مکفرات بنتی ہیں۔

آخر میں مولانا لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ جہنم سے پہلے سزاؤں کے مختلف منازل اور مختلف قالبوں میں ان کے ظہور کی خبریں جو دی گئی ہیں جیسے مکفرات یعنی اعمال صالحہ توبہ واستغفار، صلوۃ وصیام، حج وزکوۃ وغیرہ ان سزاؤں کا قالب بھی اوران کا محل ومقام بھی تخفیفاً بدلتا چلا جاتا ہے جسر سے ہٹ کر حشر میں، حشر سے ہٹ کر قبر میں، قبر سے ہٹ کر خود اسی الحیوۃ الدنیا اور پست زندگی میں مجازاۃ کا قانون اپنے قدرتی اقتضاء کو پورا کرتا ہے۔۔۔ یہاں تک کہ تحویل و تخفیف کا قانون اترتے ہوئے چلا آتا ہے۔۔۔ اسی طرح سزاؤں کی ان ہی منزلوں میں حق تعالیٰ کی رحمت بھی دستگیری فرماتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت بھی اپنا کام کرتی ہے بلکہ جرائم کے نتائج سے پاک ہونے کے بعد بہشتی زندگی سے استفادہ تو زیادہ تر فضل حق اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کبری کے ساتھ وابستہ ہے بینوا توجروا علی اللہ اجرکم''[۱]

iii) عقیدہ ولدیت

﴿وَّ یُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا﴾ (الکھف:۴)

''تاکہ دھمکائے ان لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ اللہ نے صاحبزادہ بنالیا''۔

اس آیت میں ولدیت کے جس عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے مولانا گیلانیؒ اسے عیسائیوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خالق عالم کی طرف ولدیت کے عقیدے کا انتساب، یہ عیسائیوں کا صرف عقیدہ ہی نہیں ہے بلکہ اسی ''اعتقاد پر عیسائیت یا کرسچیٹی کی بنیاد قائم ہے عیسائیت کا اول بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے۔''[۲]

پھر اس آیت کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

''سب سے زیادہ توجہ کا مستحق میرے نزدیک ''ولد'' کا لفظ ہے۔۔۔ ولد اس شخص سے جس کا ولد ٹھہرایا گیا ہے ولادت اور زائیدگی یعنی جننے کا تعلق رکھتا ہے۔۔۔ ولد میں صفات وکمالات کا جو سرمایہ پایا جاتا ہے اس میں والد کو قطعاً دخل نہیں ہوتا والد بے چارہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جس نطفہ کو اس نے منتقل کیا وہ مرد بن کر پیدا ہوگا یا عورت بن کر، اس کی ظاہری شکل وصورت کیا ہوگی اور باطنی صفات اس کے کیا ہوں گے ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو وہ جانتا ہی نہیں ان ہی کو وہ غریب بنائے گا کیا؟''[۳]

رب تعالیٰ کی طرف ولدیت کا عقیدہ منسوب کرنے سے جو مہیب نتائج سامنے آتے ہیں اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، برہان دہلی، مسلمانوں کے دنیوی مصائب کے دینی اسباب، جنوری ۱۹۴۹ء

۲ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۴۹

۳ ایضاً، ص ۵۰-۵۱

''سوچئے کہ اللہ یا خالق عالم ''تعالیٰ عما یقولون علوا کبیرا'' کے لئے ولد ٹھہرانے والوں نے ولدیت کے اس دعویٰ کو اپنا عقیدہ بنا کر درحقیقت کیا مانا ہے اور اپنے دین و ایمان کی بنیاد انہوں نے کس چیز پر قائم کر رکھی ہے یقیناً یہی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی بھی ایسی ہے جو خدا کی مخلوق نہیں ہے نہ خود خدا کی مخلوق ہے اور نہ اس کے صفات و کمالات خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔۔۔خدا کے لئے عقیدے کو منسوب کرنے کے کیا یہی معنی نہ ہوئے کہ خدائی کے سارے کمالات کے متعلق ہم یہ مان رہے ہیں کہ خدا کے اس ولد میں بھی پائے جاتے ہیں'' [1]

عیسائیوں کے اس عقیدہ ولدیت کی مزید توضیح کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک براہ راست قرآن کا یہی ایک لفظ سمجھا رہا ہے کہ درحقیقت عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خالق عالم کے سوا ایک اور ہستی بھی ہے جو خدا کی مخلوق بھی نہیں ہے اور سارے خدائی صفات و کمالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اگر چہ عیسائی اس کو اللہ نہیں بلکہ ''ولد اللہ'' کہتے ہیں مگر ''ولد اللہ'' کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ بھی اللہ ہے۔'' [2]

آخر میں عقیدہ ولدیت کے ایک اور گھناؤنے نتیجہ کا ذکر مولانا ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''ولد کا لفظ والد'' کے ساتھ قدرتاً والدہ کے مسئلہ کو بھی ذہن کے سامنے لے آتا ہے جس کے بعد اب آگے میں کیا عرض کروں؟ ہم جن کے ذکر سے کیا معنی! خیال سے بھی کانپ اٹھتے ہیں مگر ولدیت کے اسی حیرت انگیز بدترین گھناؤنے نظریہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ماننے والوں نے ولد کے ساتھ والد کو مانا اور والد کے ساتھ والدہ کو اور والدہ کے ساتھ (العیاذ باللہ) والدین کے سارے فرائض کو اپنے ایمان کا جز بنانے پر وہ مجبور ہوئے''۔ [3]

iv) اصحاب کہف کی دعا

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا﴾ (الکھف: ۱۰)

''اے ہمارے پروردگار! عطا فرما اپنے پاس سے ہمیں رحمت اور فراہم فرما ہمارے معاملے میں رشد''۔

اصحاب کہف نے رب تعالیٰ سے اپنی کہفی زندگی کے متعلق جو دعا کی اس دعا کی توضیح و تشریح مولانا گیلانیؒ کے ذاتی خیالات و غور و فکر کے مطابق درج ذیل ہے۔

''رشد'' عربی زبان کا لفظ ہے جسے قرآن میں بار بار استعمال کیا گیا ہے خصوصاً ''غیی'' کے مقابلہ میں ''الرشد'' کے اسی لفظ کو استعمال کر کے قرآن ہی بتا رہا ہے کہ انسان کی فکری و نظری قوت سے اس کا تعلق ہے یہی فکری و نظری قوت جب غلط نتیجہ تک پہنچتی ہے تو اس کا نام ''غیی'' ہے اور ٹھیک اصل حقیقت تک فکر و نظر کی رسائی کی صلاحیت کا نام ''رشد'' ہے بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دعا کے دوسرے فقرے کا تعلق چونکہ باطنی احساسات اور معنوی رجحانات سے ہے تو مطلب اس کا یہی ہوا کہ سوسائٹی کے

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خد و خال، ص ۵۲

[2] ایضاً، ص ۵۳

[3] ایضاً، ص ۵۹

گندے اور خبیث رجحانات کے مقابلہ میں جس ایمانی مسلک کی توفیق ان کو میسر آئی تھی جس کی تعبیر امرنا کے لفظ سے دعا میں کی گئی ہے اپنے اسی ایمانی مسلک کے متعلق حق تعالیٰ سے وہ آرزو کر رہے تھے کہ غی اور گمراہی سے بچاتے ہوئے ان کی فکر ونظر کی قوتوں میں رشد کی روشنی پیدا کی جائے یعنی ایمانی ترقی اور باطنی سلوک کی راہ میں چاہتے تھے کہ جو قدم بھی اٹھے رشد کی یہی معنوی روشنی ان کو آگے بڑھاتے ہوئے لئے چلی جائے اس تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی دعا کے پہلے فقرے میں ''رحمت'' کا جو لفظ پایا جاتا ہے اس کا مطلب بھی متعین ہو جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ یوں تو رحمت اور وہ بھی رب السموت والارض کی قرآنا ہر چیز میں سمائی ہوئی ہے ورحمتی وسعت کل شی (ہر شے میں میری رحمت پھیلی ہوئی ہے) قرآن ہی کی آیت ہے مگر یہاں ''رحمت'' کے اس لفظ کا استعمال جب ''رشد'' کی معنوی و باطنی صفت کے مقابلہ میں کیا گیا ہے تو اس قرینہ سے یہی سمجھنا چاہیے کہ معنوی و باطنی ضرورتوں کے مقابلہ میں ان حاجتوں کے متعلق پروردگار عالم کی رحمت کی استدعا وہ کر رہے تھے جن کی تعبیر ہم ظاہری و معاشی ضرورتوں سے کر سکتے ہیں حاصل یہی ہوا کہ ملک کی عام سوسائٹی سے علیحدگی کے بعد قدرتاً یہی دو باتیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں یعنی معاشی ضرورتوں کا مسئلہ اور فکری ونظری قوتوں کے انحطاط وزوال کا خطرہ الغرض ظاہر و باطن کی ان ہی دونوں اہم ضرورتوں میں حق تعالیٰ کی غیبی پشت پناہیوں کی درخواست پر ان کی یہ دعا کم از کم اس خاکسار کو مشتمل نظر آ رہی ہے۔[۱]

۷) انسانی عمل اور منشائے الٰہی

﴿وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا O اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ﴾ (الکھف: ۲۳، ۲۴)

''اور ہرگز نہ کہا کرو کہ یہ کام کرنے والے ہیں ہم کل مگر یہ کہ اللہ چاہے''۔

اس آیت میں اہل ایمان کو جس راہ عمل کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا اس کے متعلق مولانا گیلانیؒ کا موقف یہ ہے کہ:

''اس کا بظاہر مطلب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ خدا کے بغیر عالم حوادث و واقعات کو سوچنے اور اسی کی مدد سے زندگی کا پروگرام بنانے کے جو عادی ہیں، ایمان والوں کو شدید تاکید کی گئی ہے کہ اس الحادی بے ایمانہ ذہنیت سے کنارہ کش رہیں''۔[۲]

اس آیت کے ضمن میں معاملات زندگی کے متعلق سوچ و فکر کے دو مستقل طریقوں کا ذکر مولانا یوں کرتے ہیں کہ:

''ایک طریقہ ان لوگوں کا ہے جو حسی اور عقلی معلومات کے سوا حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کا خطرہ بھی اپنے دل میں نہیں پاتے بلکہ علل و اسباب کے حسی و عقلی سلسلے کے ساتھ خدائی کارفرمائیوں پر جو نظر رکھتا ہے الٹے اسی کا مضحکہ اڑاتے ہیں علانیہ کہتے ہیں ''خدا کو کیا پڑی میرے تمہارے درمیان کیوں ہو''....
دوسرا طریقہ فکر و عمل وہ ہے جس کا سبق ہمیں اصحاب کہف کی قرآنی سرگزشت سے ملتا ہے قرآن نے اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکم دیا ہے کہ ہرگز ہرگز نہ کہا کرو کہ ہم یہ کام کل انجام دیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''[۳]

آخر میں مولانا لکھتے ہیں:

''ماحصل یہ ہوا کہ مومن کو چاہیے کہ اپنے ہر آئندہ اقدام میں عام علل و اسباب کے ساتھ اپنی نظر حق سبحانہ و تعالیٰ کی مشیت قاہرہ اور ارادہ باہرہ پر رکھے یہی ایمانی طریقہ فکر و عمل ہے''۔[۴]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۱۳۔۱۱۴

۲ ایضاً ص ۱۵۱

۳ ایضاً ص ۱۵۲۔۱۵۳

۴ ایضاً ص ۱۵۳

vi) سفر ذوالقرنین

حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا (الکھف:۹۰)

''جب وہ سورج طلوع ہونے کے مقام پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ طلوع ہو رہا ایک ایسی قوم پر جن کے اور آفتاب کے درمیان ہم نے کوئی اوٹ نہ رکھی تھی''۔

ذوالقرنین کی رسائی اپنے سفر کے دوسرے مرحلے میں جس قوم تک ہوئی ان کی خصوصیت یہ تھی کہ آفتاب جس وقت طلوع ہوتا تھا اس وقت ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا اوٹ نہ تھا مذکورہ بالا آیت کے تحت اس قوم کے متعلق مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''ان الفاظ سے میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے کہ یہ حالت صرف طلوع آفتاب کے وقت تک محدود تھی ورنہ یہ احتمال کہ نہ وہ مکانوں ہی میں رہتے تھے اور نہ کسی قسم کا لباس پہنتے تھے بلکہ ان کی ساری زندگی کھلے میدانوں میں ننگے بدن گزرتی تھی اسی لئے ان کے اور آفتاب کے درمیان کسی قسم کا کوئی پردہ نہ تھا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے''۔[1]

اس قوم کے متعلق مولانا مزید لکھتے ہیں:

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس حال کو صرف اس خاص وقت کے ساتھ اگر محدود سمجھا جائے جس وقت آفتاب طلوع ہوتا ہے اور یہ قرار دیا جائے کہ ان کے مکانات کی تعمیر اس طریقہ پر ہوئی تھی کہ طلوع کے وقت کی شعاعوں سے مستفید ہونے کا موقع ان کو بھی اور ان کے گھروں کو بھی روزانہ میسر آتا تھا تو قطع نظر اس کے اس قسم کے تعمیری سکیم بعید از عقل بھی نہیں ہے ہم اس سے اگر اس نتیجہ تک پہنچیں کہ قدرتی قوانین سے استفادہ کے سلسلہ میں اس قوم کا شعور کافی روشن اور بیدار ہو چکا تھا وہ جسمانی صحت کے گر سے بھی واقف تھے اور جسمانی صحت کا اثر دماغی اور قلبی صحت پر کیا اور کس حد تک پڑتا ہے اس کا بھی عملی تجربہ ان لوگوں کو تھا اور شاید اسی وجہ سے ذوالقرنین کی خدمات کی ضرورت ان کو نہ ہوئی تو قرآنی الفاظ میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس ذہنی انتقال کے لئے گنجائش ضرور پائی جاتی ہے۔''[2]

vii) یاجوج وماجوج کے تعلقات کی نوعیت

﴿وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ﴾ (الکھف : ۹۹)

''اور چھوڑ دیا ہم نے بعض ان کے بعض کے ساتھ موج مارنے لگے''۔

اس آیت کے متعلق مولانا یوں رقمطراز ہیں:

۱۔ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص۲۳۱

۲۔ ایضاً، ص۲۳۱۔۲۳۲

''جب ذوالقرنین نے اپنی سائنٹیفک دیوار قائم کر کے دوسری قوموں تک ان کی رسائی کی راہ بند کر دی تھی قرآن نے اس دور کے حال کی تعبیر وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض کے الفاظ سے کی ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ غیر قوموں کے مقابلے میں فسادفی الارض (زمین میں بگاڑ پیدا کرنے) کی کاروائیوں کو وہ اختیار کرتے تھے لیکن غیروں سے رخ جب ان کا دیوار بن جانے کی وجہ سے پھر گیا تو آپس ہی میں باہم ایک دوسرے کیساتھ ایسی زندگی گزارنے لگے جسے قرآن نے خاص الفاظ یعنی بعضھم یومئذ یموج فی بعض کے ذریعے ادا کیا ہے''۔[1]

پھر آیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''بعضھم یومئذ یموج فی بعض کے الفاظ سے صرف یہ مطلب نکالنا کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد یاجوج وماجوج والے باہم ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے ہی رہتے تھے یا اس کے بالمقابل یہ سمجھنا کہ جیسے سمندر کی موجوں کا وجود باہم ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و ہم رشتہ رہتا ہے اور ہر موج دوسری موج کو آگے بڑھاتی ہے اسی طرح یاجوج وماجوج والے بھی آپس میں بجائے دست وگریبان رہنے کے ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا تعلق رکھتے تھے.... ان دونوں مطالب میں سے کسی ایک مطلب کیساتھ قرآنی الفاظ اور تعبیر کو محدود کر دینا غالباً صحیح نہ ہوگا''۔[2]

اس آیت کے متعلق اپنے افکار و خیالات کو مولانا ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''کوئی مانے یہ نہ مانے لیکن فقیر کا ذہن تو یہی پاتا ہے کہ غیروں سے ہٹ جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں یاجوج وماجوج کی قوم کی زندگی صرف اضطراب اور بے قراری، ہنگامہ اور لرزش وجنبش بن کر رہ گئی تھی ایسے مشاغل میں وہ مبتلا تھے جن میں صبح وشام، شب وروز، تگ ودو، دوڑ دھوپ، آمدورفت، چلنے پھرنے، دوڑنے، بھاگنے کے ہنگامے ہی برپا رہتے ہیں.... کچھ حالات ہی اس قوم کے ایسے تھے کہ نہ ایک دوسرے سے کلیۃً الگ ہی ہو سکتے تھے اور نہ ان میں کوئی دوسرے سے ٹوٹ کر یا جدا ہو کر فنا ہونے کے لئے تیار ہی تھا گویا ان میں وہی تعلقات قائم تھے جو باہم دریا کی موجوں میں ہوتے ہیں بایں طور کہ باہم ایک دوسرے کو دھکیلتے بھی رہتے تھے لیکن اسی کشمکش میں ارادی یا غیر ارادی طور پر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے میں مدد بھی مسلسل ملتی چلی جاتی تھی''۔[3]

آخر میں لکھتے ہیں:

''اسی کے ساتھ میرا دھیان بعضھم یومئذ یموج فی بعض کے الفاظ سے کچھ ادھر بھی جاتا ہے کہ موجوں کا جو حال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی گننا بھی چاہے تو گن نہیں سکتا ان میں بڑی موجیں بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی کچھ یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے اس دور میں ان کا ہو گیا تھا کہ ان گنت بے شمار ٹولیوں میں وہ بٹے ہوئے تھے''۔[4]

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص۲۴۱-۲۴۲
2. ایضاً، ص۲۴۳
3. ایضاً، ص۲۴۳-۲۴۴
4. ایضاً، ص۲۴۴

viii) خدا کی بجائے بندوں پر اعتماد

﴿اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ﴾ (الکھف : ۱۰۲)

''کیا وہی لوگ جنہوں نے انکار کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ بنالیں میرے بندوں کو میرے سوا پشت پناہ اپنے۔''

اس آیت کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

''فطرت انسانی کے ایک خاص رجحان کی طرف ایک خاص قسم کا اشارہ سوچنے سے آپ کو اس آیت میں مل سکتا ہے کم از کم خاکسار کا ناچیز احساس یہی ہے''۔[۱]

پھر منکرین کے متعلق سب سے پہلے یہ لکھتے ہیں کہ:

''اپنے پیدا کرنے والے خالق کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے یا نکل بھاگنے کا زندگی کے موجودہ ابتلائی وعبوری دور میں یہ ایک آسان طریقہ ہے کہ خالق سے اپنا رشتہ توڑ لیا جائے اور'' خدا کو کیا پڑی میرے تمہارے درمیان کیوں ہو'' کہتے ہوئے جو جی میں آئے آدمی کرتا چلا جائے عموماً الحادی زندگی کے نیچے کچھ اسی قسم کی شعوری وغیر شعوری ذہنی چالاکیاں اور بے باکیاں پوشیدہ ہوتی ہیں۔''[۲]

خدا کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بھاگنے والوں اور انکار کرنے والوں کے دو گروہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جنہوں نے خالق عالم اور اپنے درمیان'' آلہہ'' یعنی دیوتاؤں اور مخلوق معبودوں کا ایک سلسلہ فرض کر رکھا ہے شعور اس کا ان کو ہو یا نہ ہو لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس تدبیر سے اپنی کار برآریوں کی ایک ایسی راہ اپنے خیال میں انہوں نے نکال لی ہے جس میں ان کے زعم یا وہم کے مطابق ان کی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام ہو جاتا ہے مگر خود ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی.... اسی طریقہ کے مقابلہ میں ایک دوسری تدبیر یہ بھی ہے کہ خدا کے سامنے سے تو اپنے آپ کو مطلق العنان اور آزاد رکھنے کے لئے وہ بھاگ جاتے ہیں بھول کر بھی نہ خدا کا نام لینا چاہتے ہیں اور نہ وہ ان کو یاد ہی آتا ہے باقی زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں کے لئے مشرکوں کے نادیدہ وخود تراشیدہ اور ان کے خیال کے مطابق خدا رسیدہ معبودوں کی جگہ انہوں نے ہر ضرورت اور حاجت کے لئے فنی خلاق یا ٹیکنیکل ایکسپرٹوں کا وہ طبقہ کھڑا کر لیا ہے جس کی تعلیم و تربیت پر اس سے زیادہ توجہ اور زیادہ خرچ کرتے ہیں جتنی توجہ اور جتنے مصارف کا بار مشرکانہ کاروبار والے اپنے معبودوں کو راضی رکھنے کے لئے برداشت کرتے ہیں.... ان ہی ایکسپرٹوں کے ساتھ ساتھ ایک طبقہ ان میں لیڈروں اور قائدوں کا بھی ہوتا ہے اور عموماً اجتماعی حاجات میں ان ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہے''۔[۳]

---

۱ گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۷۷

۲ ایضاً، ص ۲۷۸

۳ ایضاً، ص ۲۷۹۔۲۸۰

قرآن میں جا بجا مذکورہ مشرکین کے معبودوں اور سورہ کہف کی مذکورہ بالا آیت کے اولیاء کا موازنہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں جن پر مشرکین بھروسہ کیا کرتے تھے اور جن کی طرف اس راہ میں رجوع ہوتے تھے عموماً ''آلھۃ'' کے نام سے قرآن موسوم کرتا ہے لیکن سورہ کہف کی مذکورہ بالا آیت میں بجائے اس کے ہم ''عبادی من دونی اولیاء'' کے الفاظ پائے جاتے ہیں یعنی یہاں بجائے ''آلہہ'' کے ''اولیاء'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مشرکوں کے عام معبودوں اور الہہ کے متعلق قرآن میں بتلایا گیا ہے کہ عموماً وہ نام ہی نام ہوتے ہیں لیکن ان ناموں اور اسماء کو مسمی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا.... لیکن اس کے مقابلہ میں حق تعالیٰ کی عائد کی ہوئی آئینی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے والوں نے پشت پناہوں اور اولیاء کا جو طبقہ ایکسپرٹس اور لیڈرز وغیرہ ناموں سے بنالیا ہے ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت مشرکوں کے معبودوں سے اس بارے میں مختلف ہوتی ہے یعنی حذاق وقواد کا یہ گروہ اسی طرح خدا کے واقعی بندے اور مخلوقات ہوتے ہیں جیسے ان پر بھروسہ کرنے والے خدا کے بندوں اور مخلوقات میں شامل ہیں اور جن ضرورتوں اور حاجتوں میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے ان سے ان کی بے تعلقی کا حال بھی وہ نہیں ہوتا جو مشرکوں کے معبودوں کا ہے۔''[1]

آخر میں مولانا لکھتے ہیں:

''جہاں تک میرا خیال ہے مذکورہ بالا آیت میں بجائے ''الھۃ من دونی'' کے 'ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء '' کے یہ الفاظ جو پائے جاتے ہیں ان میں بظاہر حق تعالیٰ کی آئینی ذمہ داری سے آزاد رہنے کی جیسا کہ میرا ناچیز خیال ہے اسی دوسری تدبیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس میں بجائے خود تراشیدہ نام نہاد اوہامی الہہ اور معبودوں کے ایکسپرٹوں، لیڈروں کو بنانے والے اپنے پشتبان اور اولیاء بنا لیتے ہیں اور یوں اپنے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہ سے بے تعلق قطعاً بے تعلق رہ کر زندگی بسر کرنے کی ایک راہ انہوں نے نکال لی ہے.... مشرکانہ کاروبار کی تنقید جن خاص الفاظ میں عموماً قرآن بیان کرنے کا عادی نظر آتا ہے بجائے ان کے یہاں الفاظ میں ردوبدل جہاں تک میرا خیال ہے بلا وجہ نہیں کیا گیا۔''[2]

ix) احکام سورہ کہف

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَ اتَّبَعَ ھَوٰهُ وَ کَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾ (الکھف:۲۸)

''اور تھامے رکھ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے رہتے ہیں اپنے پالنے والے کو صبح و شام اور مراد بنائے ہوئے ہیں اسی کے رخ کو، اور نہ پھریں تیری آنکھیں ان رفیقوں سے چاہتے ہوئے دنیا (پست

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۲۸۰-۲۸۱

[2] ایضاً، ص ۲۸۱-۲۸۲

زندگی) کی زینت کو مت ماننا ان لوگوں کی باتوں کو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے اور وہ پیچھے چل پڑا ہے اپنی "ہوا" کے اور کام ہے اس کا "فرط" (غیر متوازن، بے ڈھنگا)"۔

اس آیت میں ایمان والوں کو رفاقت کی زندگی اختیار کرنے کے متعلق جو احکام دیے گئے ہیں ان کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

"اس حکم میں سب سے پہلے توجہ کا مستحق حکم کا پہلا لفظ اصبر کا ہے جس کا ترجمہ "تھامے رہ" کیا گیا ہے اگر یہ سمجھا جائے کہ کامل ہم آہنگی اور یک جہتی و یک رنگی کی توقع "رفاقت کی زندگی" میں نہ کرنی چاہیے تو لفظ کا بھی اقتضاء یہی ہے.... جو رفاقت کے تعلقات کو نباہنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آخر وقت تک "رفاقت" کے ثمرات و منافع سے مستفید ہوتے رہیں ان کے لئے صحیح مشورہ یہی ہو سکتا ہے کہ موافقت کے ساتھ ساتھ بالکل ممکن ہے کہ رفاقت کی اس "زندگی" میں ناموافقت کے ناگوار حالات سے بھی سابقہ پڑے اس لیئے قرآن نے اصبر کے ساتھ انتخاب رفقاء کے اس حکم کو شروع کیا ہے اس سے کم از کم میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے گویا اس میں جواب ہے اس سوال کا کہ "رفقاء" کے ساتھ تعلقات کی کیا نوعیت ہونی چاہیے"۔[1]

رفاقت میں رفقاء کے انتخاب کا جو معیار ہے یعنی رفقاء کو جن علامتوں اور نشانیوں سے پہچان سکتے ہیں ان کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

"پرورش کرنے والی قوت رب کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلق کے احساس کو ہمہ دم مسلسل، بغیر کسی انقطاع کے اپنے اندر زندہ اور بیدار رکھنا اور اسی احساس کے زیر اثر چھوٹی بڑی ضرورت میں اسی کی طرف پلٹنا اور اسی کو پکارتے رہنا یہی ان کا مشغلہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا ہوتا ہے اور فقر تام، احتیاج مطلق، فقط سوال، صرف بھیک کی اسی پستی میں جو بلندی ان کو حاصل ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کمتری سے جو برتری پیدا ہوتی ہے "یریدون وجهه" کے الفاظ میں اسی کی تصویر پیش کی گئی ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ اپنی دعا اور پکار کے جواب میں جو کچھ بھی ان کو ملتا ہے اس میں اپنی آئینی زندگی کے منطقی نتیجہ سے زیادہ ان کو اپنا رب اور اسی رب کا فضل و احسان نظر آتا ہے ان کی نگاہ کسی حال میں "وجہ اللہ" سے نہیں ہٹتی"۔[2]

رفقاء کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

"لا تعد عینک عنھم" کے الفاظ میں ممانعت کی گئی ہے کہ رفاقت کی زندگی میں رفقاء کی طرف سے نظر نہ ہٹائی جائے لیکن یہ ممانعت مطلق غیر مشروط نہیں بلکہ آگے کے الفاظ "ترید زینة الحیوة الدنیا" کا جو مفاد ہے یقیناً اس حال کے ساتھ ممانعت کا یہ حکم مقید و مشروط ہے حاصل جس کا یہی ہوا کہ الحیوۃ الدنیا کی زینت کو مراد و مقصود بنانے کے لئے رفقاء سے نظر ہٹانے کی ممانعت کی گئی ہے گویا وہی بات جو اصبر کے لفظ سے اجمالاً سمجھ میں آتی ہے اس کی تفصیلی نمائش ان الفاظ سے کی گئی ہے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کم از کم میری فہم ناقص اس نتیجہ پر پہنچتی

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۶۷۔۱۶۸
2. ایضاً، ص ۱۶۹۔۱۷۰

ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً لباس طعام وغیرہ جیسی باتوں میں ضرورت کی حدود سے آگے بڑھ کر زینت کی مد کی چیزوں کو دینی رفاقت کی زندگی میں کوئی رفیق اگر استعمال کرتا ہو یا استعمال کرنے کا کسی وجہ سے عادی ہو تو ممانعت کے مذکورہ بالا مقید و مشروط حکم کی بنیاد پر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دینی رفاقت کے رشتہ کے منافی اس رفیق کے طرز عمل کو نہیں قرار دینا چاہیے تھا''۔[1]

جن بدبختوں کے دلوں کو رب تعالیٰ اپنی یاد سے غافل بنا دیتا ہے ان کے متعلق مولانا یہ لکھتے ہیں:

''ان مجرموں کو پہلی سزا قدرت کی طرف سے یہی ملتی ہے کہ زندگی کے بنیادی حقائق کی تلاش و جستجو کا جو احساس انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وہی احساس بتدریج معطل و مفلوج ہوتے ہوئے تباہی کے ان حدود تک پہنچ جاتا ہے جن کے مختلف مدارج کو قرآن میں ختم، درین غشاوۃ، ضلال، اغفال کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔''[2]

انہی کور بختوں کی اغفال قلوب کے سزا کے بعد دو مزید سزاؤں کا تذکرہ مولانا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''سزایابی کی اس نفسیاتی گرفت کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ جینے کا جو دستور بھی ذہنی عذاب کی اس حالت میں بنانے والے بنائیں گے اس کا زندگی کے بنیادی حقائق سے کوئی تعلق نہ ہوگا عربی زبان میں اسی قسم کے بے بنیاد، پادر ہوا من مانی باتوں کو ''ھویٰ'' کہتے ہیں.... ہر وہ بات یا چیز جو اپنی قدرتی حدود و مقدار سے ہٹ گئی ہو یا بالفاظ دیگر، ہر بے ڈھنگے، غیر متوازن امر کو عربی میں ''فرط'' کہتے ہیں اور جب بنیاد سے الگ ہو کر ''ہوائی ضابطہ'' کے تحت زندگی گزاری جائے گی تو یقین مانئے کہ اس کا انجام فرط اور غیر متوازن شکل ہی میں سامنے آئے گا۔''[3]

x) حیاۃ العسریٰ

﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى﴾ (الیل:۱۰)

''پس قریب ہے کہ ہم آسان بنا دیں گے اس کے لئے ''العسریٰ'' کو یعنی دشواریوں اور سختیوں سے بھری ہوئی زندگی کو''۔

بخیل آدمی کے لئے اس کی بخالت کے سبب العسریٰ کی زندگی کس طرح آسان بنا دی جاتی ہے اس کے متعلق مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

معلوم نہیں قرآن کے ان الفاظ کا مطلب دوسرے کیا سمجھتے ہیں لیکن مجھ پر تو یہی کھولا گیا ہے یعنی عوام ظاہر ہے ایسوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے لیکن جس نے اسے یہ دولت دی ہے کیا اس کے پنجہ اقتدار سے بھی وہ نکل جاتا ہے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا

---

1. گیلانی، مناظر احسن، سید، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، ص ۱۷۲
2. ایضاً، ۱۷۶
3. ایضاً، ۱۷۶-۱۷۷

چاہے تو اس دولت کو اس سے چھین لے یا دولت ہی کیا، وہ تو قادر ہے کہ زندگی اور زندگی کے جن احساسات پر یہ بولیاں وہ بولتا رہتا ہے اسی زندگی سے جب چاہے اسے محروم کر دے یہ تو خیر عام بات ہے اور رات دن یہ ہوتا ہی رہتا ہے مذکورہ بالا قرآنی الفاظ میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اس سے الگ بات ہے یعنی سب کچھ کو اس کے قبضہ اقتدار میں دیتے ہوئے قدرت کی یہ عجیب مخفی تدبیر ہے کہ جس دولت وثروت روپے پیسے کو آدمی زندگی کی سہولتوں کے لئے حاصل کرتا ہے اور غالباً بخل زدہ آدمی بھی مال اندوزی کی راہ میں ابتداء جب قدم رکھتا ہے تو اسی عام خیال کے زیر اثر ہی رکھتا ہے لیکن قدرت کی تہایت کا یہ کیسا عجیب نظارہ ہے کہ جب روپے پیسے پر اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو بجائے الیسری (آسان زندگی) کے العسری (سخت دشواریوں سے بھری زندگی) اس پر آسان کر دی جاتی ہے وہ سب کچھ کھا سکتا ہے لیکن کچھ کھا نہیں سکتا سب کچھ پہن سکتا ہے لیکن کچھ پہن نہیں سکتا الغرض اپنے اپنے دائرے کے اعتبار سے آرام وعیش کی جن جن صورتوں کو وہ مہیا کر سکتا ہے دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک سے محروم کر دیا گیا ہے اتنا محروم کہ غربت انتہائی غربت کی زندگی رکھنے والوں کو بھی جو سہولتیں میسر آتی ہیں عموماً بخل کے ان روگیوں کو وہ بھی نصیب نہیں ہوتیں سچ پوچھئے تو ایسوں کو دیکھ کر بے ساختہ

ایں طرفہ تماشا بیں لب تشنہ بآب اندر

کا مصرعہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے گویا بہتی ہوئی خنک ریز موجوں کے نیچے حالانکہ اسے بٹھایا جاتا ہے موجوں پر موجیں گزرتی رہتی ہیں اسی پر سے گزرتی رہتی ہیں لیکن اس کور بخت کور نصیب کی تشنہ لبی اور محرومی اپنے حال پر باقی رہتی ہے۔[1]

xi) بسطی طبقات کی ایک منفرد خصوصیت

﴿وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ﴾ (طٰہٰ: ۱۳۱)

''اور نہ اٹھائیو اپنی دو آنکھوں کو ان کی طرف جنہیں جوڑے جوڑے کی شکل میں ہم نے نعمتیں بخشی ہیں یہ پست زندگی کی تازگی ہے (اس لئے ان کو دی گئی ہیں) تاکہ ہم امتحان لیں ان کا اس میں۔''

اس آیت میں لوگوں کو اپنی آنکھوں کو ان کی طرف اٹھانے سے منع کیا گیا ہے جن کو بسطی پیمانے پر روزی عطا کی گئی ہے آیت میں بسطی طبقات کی ایک اہم خصوصیت کی توضیح مولانا نے اپنے منفرد انداز میں کی ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ بسطی رزق پانے والوں کو جوڑے جوڑے کی شکل میں نعمتیں بخشی گئی ہیں اس خصوصیت کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

پہلی بات اس سلسلے کی ''ازواجا'' کا لفظ ہے بسطی طبقات کی ایک خاص خصوصیت کی طرف اس میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں اشارہ کیا گیا ہے مشاہدے سے اس کی توثیق ہوتی ہے یعنی دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ آمدنیوں پر جن لوگوں کو یہاں اقتدار بخشا جاتا ہے عموماً ان کے قلوب میں ایک عجیب جذبہ اس بات کا پیدا ہو جاتا ہے کہ ضرورت کی ایک ہی چیز مثلاً سواری، لباس پوشاک، مکان وغیرہ وغیرہ ہر ایک میں ان کی تشفی کسی ایک شکل سے نہیں ہوتی باوجودیکہ ان کے پاس مثلاً موٹر موجود ہوتی ہے لیکن ایک موٹر سے ان کا جی نہیں بھرتا دل دوسری موٹر کے لئے بے چین رہتا ہے۔ پھر شکل وصورت، رنگ وروپ کا معمولی فرق بھی کسی دوسری موٹر کی ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے یہی حال زندگی کی دوسری ضرورتوں میں ان کا ہوتا ہے اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص ۲۰۶

امیروں کے کمروں میں جب آپ داخل ہوں گے تو عموماً ایک طرف قطار در قطار مختلف شکلوں، صورتوں کے جوتے نظر آئیں گے دوسری طرف کسی کونے میں دیکھئے تو صرف چھڑیوں کا ایک بوجھا ٹھیک اس شکل میں جیسے ترکش میں تیر ہوتے ہیں ان کی چھڑی دانیوں میں رکھا نظر آئے گا اور یہ تو ان کا حال ہے، جن کا شمار نسبتاً متوسط طبقات بلکہ کہئے تو عوام کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ چھٹ بھیوں میں جو گنے جاتے ہیں ازواجی مذاق میں ان کی یہ کیفیت ہے باقی ان میں جو بڑے ہیں ان کو تو دیکھا جاتا ہے کہ ایک بلڈنگ کے بعد دوسری بلڈنگ اور ایک محل کے بعد دوسرے محل کا شوق کسی طرح ختم ہونے ہی کو نہیں آتا ہر چیز میں زوج اور جوڑے کے ذوق نے اس حد تک ان لوگوں کو پہنچا دیا ہے کہ کسی عمارت کے ایک پہلو میں اتفاق سے اگر کوئی مسجد آگئی ہے تو صرف ''ازواجیت'' اور جوڑا بنانے کے ذوق کی تکمیل کے لئے سنا ہی نہیں گیا بلکہ دیکھا گیا ہے کہ مسجد کے مدمقابل دوسری سمت میں ٹھیک مسجد ہی کی شکل و صورت رکھنے والی عمارت بنوائی گئی ہے۔[1]

---

[1] گیلانی، مناظر احسن، سید، اسلامی معاشیات، ص۱۸۹

خلاصہ بحث

خلاصۂ بحث

مولانا گیلانیؒ ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے عالموں کے گھرانے میں پیدا ہوئے انہی کی گودوں میں پروان چڑھے زندگی کا بیشتر حصہ مدارس دینیہ اور تعلیمی درسگاہوں سے منسلک رہے ارباب فضل وکمال اور شیدائیان کتاب وسنت کی صحبت میں دن رات گزارے اسی کا نتیجہ تھا کہ اخلاق واعمال کی پاکیزگی اور عقائد واصول دین میں پختگی آپ کے کردار کے نمایاں اوصاف تھے نہایت رحیم وشفیق اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا گیلانیؒ کونہایت اخاذ اور نکتہ رس ذہن عطا فرمایا تھا آپ کی تصانیف میں علوم وحقائق اور استنباط و استخراج مسائل کا گراں بہا ذخیرہ موجود ہے جس موضوع پر قلم اٹھاتے قابل قدر معلومات کا انبار لگا دیتے ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا مجلہ ہو جس کے صفحات مولانا کے مضامین سے مزین نہ ہوں آپ کے علمی مقالات کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اتنا مفصل مواد قلمبند فرمادیتے جو آسانی سے کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتا تھا۔

مولانا ساری عمر توحید اور شمع رسالت کے شیدائی بنے رہے قرآن سے خاص لگاؤ رکھتے تھے قرآن کی وہی آیات جو ہم روزانہ تلاوت کرتے ہیں انہی آیات سے مولانا ایسے نتائج اخذ کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔قرآنی آیات میں غور وفکر اور تدبر سے کام لیتے اور منشائے الٰہی کو پالینے کی جستجو میں سرگرداں رہتے آپ نے باقاعدہ تفسیر قرآن تحریر نہیں فرمائی بلکہ مختلف آیات کے متعلق آپ کے افکار وخیالات آپ کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں البتہ سورہ کہف کی قریبا تمام آیات کی آپ نے تفسیر فرمائی اس سورہ کے احکام وہدایات کو آپ نے دجالی فتنہ کے تناظر میں پیش کیا ہے آپ کی یہ تفسیر قرآن فہمی کا منفرد انداز اختیار کئے ہوئے ہے۔
مولانا دین اسلام کی حفاظت اشاعت میں آخری دم تک کوشاں رہے آپ کی تصانیف قرآنی آیات سے اخذ کردہ افکار ومعلومات سے معمور ہیں قرانی آیات سے متعلق اپنی رائے کو علماء کے سامنے سنجیدہ طریقے سے پیش کرتے اور اصلاح وتصحیح کے خواہاں رہتے قرآنی آیات سے متعلق مفاہیم میں اپنی رائے دیتے ہوئے آپ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آیت سے مراد وہی ہے جو انہوں نے بیان کی ہے۔

مولانا کا علم ہمہ جہت اور قلم ہر دم رواں دواں تھا آپ کا کلام عقل وقلب دونوں کو اپیل کرتا ہے۔مولانا کی تحریروں سے اسلامی لٹریچر میں جو گراں قدر اضافہ ہوا ہے ممکن نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے۔

مصادر و مراجع

مصادر و مراجع

☆ القرآن الکریم

☆ ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید، القزوینی، سنن ابن ماجہ، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء

☆ ابوداؤد، سلیمان بن الاشعث، السجستانی، سنن ابی داؤد، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء

☆ ابوعبداللہ، احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، عالم الکتب للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت لبنان، الطبعۃ الاولی ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء

☆ البخاری، محمد بن اسماعیل ابوعبداللہ، الجامع الصحیح البخاری، مکتبہ دار السلام، الریاض، الطبعۃ الثانیہ، ۱۴۱۹ھ

☆ الترمذی، ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ، الجامع الترمذی، دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء

☆ الذھبی، محمد حسین، التفسیر والمفسرون، دار الکتب الحدیثۃ، الطبعۃ الثانیہ: بیروت ۱۳۹۶ھ

☆ السیوطی، جلال الدین، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، جلالین، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۹۹۸ء

☆ النسفی، عبداللہ بن احمد بن محمود، مدارک التنزیل و حقائق التاویل، قدیمی کتب خانہ کراچی، س۔ن

☆ حقانی، عبدالحق، ابومحمد، تفسیر فتح المنان المشھور بہ تفسیر حقانی، بیت العلم اردو بازار لاہور، س۔ن

☆ دریابادی، عبدالماجد، مولانا، معاصرین، گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور، س۔ن

☆ دریابادی، عبدالماجد، مولانا، وفیاتِ ماجدی، مجلس نشریات اسلام، س۔ن

☆ شاہ جہان منصور پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، مولانا مناظر احسن گیلانی شخصیت و سوانح، مکتبہ رشیدیہ کراچی، ۱۴۳۰ھ/ ۲۰۰۹ء

☆ فیوض الرحمٰن، حافظ، مشاہیر علماء دیو بند، المکتبۃ العزیزیہ، ۱۹۷۶ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، سوانح قاسمی، مکتبہ رحمانیہ لاہور، س۔ن

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، النبی الخاتم، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور، اگست ۲۰۰۵ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، بیاض مناظر (مولانا مناظر احسن گیلانی کی ذاتی ڈائری)، شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۳ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۹۷۶ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مقالات احسانی، مکتبہ اسعدیہ کراچی، ۱۴۳۲ھ/ ۲۰۱۱ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، احاطہ دار العلوم دیو بند میں بیتے ہوئے دن، مکتبہ رشیدیہ کراچی، ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ/ اپریل ۲۰۰۹ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، اسلامی معاشیات، دار الاشاعت کراچی، س۔ن

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، ظہور نور، اسلامک پبلیکیشنز سوسائٹی، حیدر آباد دکن، ۱۳۷۳ھ

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، المیزان ناشران وتاجران کتب لاہور، ۲۰۰۷ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، عالم بے بدل، مرتب: محمد اکرام چغتائی، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۹ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، نفیس اکیڈمی کراچی، طبع چہارم جون ۱۹۶۵ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، دجالی فتنہ کے نمایاں خدوخال، المیزان ناشران وتاجران کتب لاہور، ۲۰۰۷ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، سوانح ابو ذر غفاری، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۰۵ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، تدوین قرآن، مکتبۃ البخاری کراچی، ۲۰۰۵ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، فیوضات گیلانی، مرتب: حافظ محمد بلال اعجاز، مکتبہ احمد ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور، ۲۰۰۸ء/۱۴۲۹ھ

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، الدین القیم، مکتبہ اسعدیہ کراچی، یکم نومبر ۲۰۰۱ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، س۔ن

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، تدوین حدیث، مکتبہ اسحاقیہ کراچی، ۱۹۸۷ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مقالات گیلانی، شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب لاہور (مرتبہ)، ۲۰۰۴ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مقالات گیلانی، مرتب: سید حافظ اکبر شاہ بخاری، مکتبہ عمر فاروق کراچی، ۲۰۱۲ء

☆ گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، ہزار سال پہلے، بیت العلم کراچی، ۲۰۰۴ء

☆ محبوب رضوی، سید، تاریخ دار العلوم دیو بند، ادارہ اہتمام دار العلوم دیو بند، یوپی، ۱۹۷۸ء

☆ محمد اکبر شاہ، حافظ، چالیس بڑے مسلمان، ادارۃ القرآن کراچی، نومبر ۲۰۰۱ء

☆ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بہترین تحریریں، مرتب: سید قاسم محمود، بیکن بکس لاہور، ۲۰۰۷ء

☆ مسلم بن الحجاج بن مسلم ابی الحسین، النیسابوری، الجامع الصحیح المسلم، دار السلام للنشر والتوزیع الریاض، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء

☆ مفتاحی، محمد ظفیر الدین، حیات مولانا گیلانی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۹۴ء

رسائل وجرائد

☆ البینات، ماہنامہ، کراچی

☆ الرشید، ماہنامہ، دیو بند

☆ الفرقان، ماہنامہ، لکھنو

☆ القاسم، ماہنامہ، دیو بند

☆ برہان، ماہنامہ، دہلی

☆ سچ، ہفت روزہ، لکھنو
☆ صدق جدید، ہفت روزہ، لکھنو
☆ صدق، ہفت روزہ، لکھنو
☆ معارف ماہنامہ، دارالمصنفین، اعظم گڑھ